رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نگار بک ایجنسی نے، رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات فراہم کرنے کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے حسن ترتیب وطباعت کے لحاظ سے
ہندو پاک میں ممتاز مقام رکھتی ہیں اور خوبصورت نسخ ایرو ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں۔ ہمارے مشہور ومعروف محقق اور ادیب مولانا امتیاز علی عرشی کا نام
اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے اس لیے کہ ان کتابوں کی ترتیب و تصحیح کا کام موصوف نے خود انجام دیا ہے یا انکی زیر نگرانی ترتیب و اشاعت کے مراحل طے ہوئے۔

دستور الفصاحت: یہ احمد علی یکتا لکھنوی کی کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ ہے جسے تذکرہ شعراء کے طور پر علیحدہ چھاپا گیا ہے۔ اس میں ۵۱
اساتذہ اردو کا حال اور منتخب کلام درج ہے۔ مولانا عرشی کے مبسوط دیباچے اور تفصیلی حواشی نے اس کی اہمیت میں چند در چند اضافے کیے ہیں۔ ۱۱
کے کلاسکی شاعروں پر کام کرنے والوں کیلیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لیے کہ مرتب نے حواشی میں سارے غیر مطبوعہ تذکروں سے
احوال شعراء کا اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سے تذکروں سے بے نیاز کردیتی ہے۔ یہ کتاب اردو میں اعلیٰ ایڈیٹنگ کا نمونہ ہے
جسے بغیر جھجک ہم کسی بھی زبان کے تحقیقی کارناموں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ قیمت ——— ۶ روپے مجلد

مکاتیب غالب: یہ مرزا غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو فرمانروایان رام پور اور ان کے متوسلین کو لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں بیان
رامپوری اور ناظم رامپوری کے اشعار پر اصلاحیں، نیز مولانا حالی، صفیر بلگرامی، رنج میرٹھی اور نیر دہلوی کے غیر مطبوعہ قصائد و قطعات بھی موجود ہیں
یہ متفقہ امر ہے کہ خطوط پر مشتمل کوئی بھی مجموعہ اتنے تفصیلی مباحث کے ساتھ آج تک شائع نہیں ہوا۔ اردو میں انداز ترتیب و تہذیب کی
متعین راہ بتانے والی یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے پاس ہونا ضروری ہے۔ قیمت ——— ۸ روپے مجلد

فرہنگ غالب: اس کتاب میں مولانا عرشی نے مختلف ماخذ کے ذریعے غالب کے بتائے ہوئے عربی فارسی اردو وغیرہ زبانوں
الفاظ ومعانی جمع کردیئے ہیں۔ اور اپنے دیباچے میں ہندو پاک کے ان فرہنگ نگاروں کی خدمات سے بحث بھی کی ہے جن کے مرہون
منت خود ایرانی بھی ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم نیز خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ زبان و لغت کے بارے میں غالب کا رہبر جلد
کے لیے یہ کتاب بے حد ضروری ہے۔ (طباعت لیتھو) قیمت ——— ۶ روپے

نگار بک ایجنسی رام پور، یوپی

بقلم غالب

یوں تو غالب کی تمام تحریریں ہمیں عزیز ہیں۔ لیکن اگر وہ خود غالب کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی اصل تحریریں ہوں یعنی جن پر "بقلم خود" کا اطلاق ہوسکتا ہو تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسی بہت سی تحریریں اِدھر اُدھر کتاب خانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ کچھ تحریروں کے عکس مختلف اوقات میں اخبارات رسائل اور کتب کے ذریعے سامنے بھی آتے رہے ہیں۔ ایسی تمام تحریروں کے عکس کتابی شکل میں شایع کیے جارہے ہیں۔ گویا اس کتاب کی ہر ہر سطر "بقلم غالب" ہوگی جیسے مندرجہ ذیل ایک مکتوب ہے جو غالب نے اپنے شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کو لکھا تھا ——— مرتبہ: اکبر علی خاں

زیر ترتیب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب بجا لاتا ہوں غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر حضور میں بھیجتا ہوں مسودات اپنے پاس رکھ لیتا ہوں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو میں پھر اس کو صاف کر کے بھیجدوں ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہیگا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم اصلی اور نام نامی تخلص رہے ناظم عالی اور شوکت نیاں ان میں سے جو پسند آئے وہ رکھیے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب غالب

روز یکشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷

عکس خط میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

جلد ۴۲ | فہرست مضامین جنوری ۱۹۶۳ء | شمارہ ۱

ملاحظات

چینی جارحیت اور پاکستان چینی جارحیت نے ہندوستان جیسے صلح پسند ملک کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ہر لحاظ سے لائق نفرین ہے۔ چین کا یہ جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان نے بین الاقوامی سیاسی محاذ پر پورے مغربی گروپ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چین کی مسلسل حمایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے تعلقات روسی گروپ اور امریکی گروپ دونوں کے ساتھ ہیں اس لیے اس کا اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھتے ہوئے اتنا اہم اقدام بیحد قابلِ ستایش اور لائق شکر گزاری تھا۔ مگر چین کے موجودہ ارباب سیاست کا یہ رویہ بہت افسوسناک تھا کہ انھوں نے ہندوستان جیسے بے غرض دوست کو دھوکا دیا۔ اور جھوٹے بہانے تراش کر اچانک حملہ آور ہو گیا۔

اس موقع پر بجا تھا اگر ہندوستان اپنے ہمسایہ ملکوں سے ہمدردی اور بھرپور حمایت کی توقع رکھتا۔ خصوصاً اُن ملکوں سے جو نسلی ذہنی تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں ظاہر ہے کہاں میں قریب ترین ہمسایہ ملک پاکستان ہے۔ چین کے حملے سے پہلے وہاں کے سربراہوں نے ہندوستان کے سامنے مشترکہ ڈیفنس کی پیشکش کی تھی جو بہت امید افزا ارادہ تھا مگر جب سچ مچ اُن کی حمایت اور ہمدردی کا وقت آیا تو انھوں نے کشمیر کے مسئلے کو لا کھڑا کیا جو حقیقت میں گوناگوں مسائل اور رنگ برنگ مشکلات سے بھرا ہوا ہے۔ اور جس کے لیے پہلا قدم یہ ہوتا کہ دونوں ملکوں کے خواص و عوام میں ناقابل شکست دوستانہ فضا پیدا کرنے کی جاں توڑ کوشش کی جاتی۔ اس کوشش کا نقطۂ آغاز یہی ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان غیر مشروط طور پر چین کے مقابلے میں ہندوستان کی حمایت کے لیے میدان میں آجاتا اور دونوں ملک کشمیر جیسے مسئلے سے خالی الذہن ہو کر اُس ایک درندے کے مقابلے کے لیے کمربستہ ہو جاتے جو صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے لیے بھی ایک زبردست خطرہ ہے ——— مگر پاکستان کے ارباب سیاست و حکومت کو کون سمجھائے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے۔

نگار اور اُس کے منصوبے نگار لکھنؤ سے رام پور آگیا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو کا اہم ترین ماہنامہ ہے جس استقامت کا ثبوت اس نے دیا ہے اُس کا دعویٰ اردو کے گنے چنے رسائل ہی کر سکتے ہیں اس کی اشاعت جس پابندی کے ساتھ ہوتی رہی ہے وہ سب جانتے

ہیں۔ اب کہ یہ اپنے تیس سالہ گھر کو چھوڑ کر ایک تازہ بستی میں آباد ہوا ہے یقیناً اس کے سلجھنے کچھ مشکلات بھی آئیں گی۔ لیکن جس سرزمین میں اس نے دم لیا ہے وہ ہمیشہ سے مہمانوں کو گلے لگاتی رہی ہے۔ صاحبان علم و فن کی جو پزیرائی رام پور کی چھوٹی سی ریاست نے کی تھی اُس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ یہ ایک نئے ولولے اور نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ علم و ادب کی خدمات انجام دیگا۔

نگار نے بڑے معرکے کے سالنامے نکالے ہیں۔ اب بھی اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دیئے جائیں گے۔ یہ مناسب سمجھا گیا کہ اُن کا اعلان ابھی سے کر دیا جائے تاکہ اس ذیل میں جو حضرات ضروری اور مناسب مشورے دے سکیں انکو علم ہو جائے۔

نگار نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جلد از جلد مندرجہ ذیل عنوانات پر دقیع و ضخیم خاص نمبر شایع کرے:

● ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر ● رشید احمد صدیقی نمبر ● خواجہ حسن نظامی نمبر ● اختر شیرانی نمبر ● خود نوشت سوانح نمبر ● مطبوعہ مکاتیب نمبر۔ اور ● غالب نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دور ابتلا میں جو ہمت اُن کی ذات سے ملی ہے اور اُس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ ذاکر صاحب ہی کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر اُن کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور اُن میں سے بھی کئی ترجمے ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے اس نمبر میں یہی کوشش کی جائے گی کہ ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے ایک بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

رشید صاحب کے بارے میں کسی نمبر کا اعلان کرنا اپنی عافیت کو خطرے میں ڈالنا ہے اس لیے کہ وہ اپنے انداز تحریر کے اعتبار سے اردو کی نمایاں پر عظمت پیچ در پیچ اور پہلو دار شخصیت ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نگار جس کے وہ مستقل لکھنے والے آغاز ہی سے رہے ہیں اگر یہ خدمت انجام نہ دے تو اس پر ایک احساس جرم طاری رہیگا۔ یہ اقدام تعریف کی شکل اس لیے بھی اختیار کر لیتا ہے کہ نگار کا موجودہ مرتب علی گڑھ کا طالب علم ہے۔ اُس علی گڑھ کا جس کی محبت رشید صاحب کے نزدیک اول و آخر سب کچھ ہے۔ اس نمبر میں رشید صاحب کی شخصیت و فن پر مضامین کے علاوہ اُن کے سارے بکھرے ہوئے مضامین اور خطوط شامل ہوں گے۔

خود نوشت سوانح اردو میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور چند گنی چنی تحریروں کو چھوڑ کر اس صنف سے ہم محروم ہیں ۱۹۴۱ء میں نگار نے اُس دور کے شعرا کو خود نوشت سوانح لکھنے کی دعوت دی تھی اُس نمبر میں شایع شدہ خود نوشت حالات کے علاوہ اور جو کچھ ادھر ادھر بکھرا ہوا مل جائے گا اُس سب کو سمیٹ کر ایک نمبر شایع کرنے کا ارادہ ہے تاکہ ایک انداز کی چیزیں یکجا ہو کر زیادہ مفید اور کار آمد بن جائیں۔

مطبوعہ مکاتیب نمبر میں ایسے سارے مکتوبات جمع کرنے کی سعی کی جائیگی جو پرانے اخبارات و رسائل نیز مختلف کتابوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن کے دوبارہ چھپ جانے سے ہماری بہت سی ادبی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ زبان و بیان کے بہت سے معرکے زندہ ہو جائیں کہ اس کا داک دور میں اُن کا زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ کام بھی بہت جانفشانی کا ہے اور نہ معلوم کتنا وقت لے آیا ہے کہ لاتعداد کتابوں رسالوں اور اخباروں کی ورق گردانی کوئی سہل کام تو نہیں۔

غالب نمبر میں جو کچھ ہوگا وہ خالص تحقیقی نقطۂ نظر سے ہوگا اور اس کیفیت و کمیت کا ہوگا کہ باطمینان حوالے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اس کی تفصیلات کو شایع کرنا ابھی ہم مناسب نہیں جانتے۔ مگر اتنا یقین دلانا ضروری ہے کہ وہ نگار سے وابستہ توقعات کو بدرجۂ اتم پورا کرے گا۔

خواجہ حسن نظامی اور اختر شیرانی اردو نثر و نظم کے دو موڑ ہیں۔ ہماری موجودہ نسل نہ ان کی اہمیت کو جانتی ہے اور نہ اُس ارتقائے ادب سے واقف ہے جس کی یہ دین ہیں۔ دونوں کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ عام سطحی ذہن کے لیے باعث کشش ہیں۔ اس جملے میں کہنے والے کے نزدیک سراسر اپنی ذہنی برتری کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اب غالب فیشن ہے اور اس کے علاوہ نظروں میں سماتا ہی کون ہے۔

آخر میں ذاکر صاحب اور رشید صاحب کے احباب تلامذہ، خصوصاً جامعہ اور علی گڑھ کے ادب دوست حلقوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ اِن دونوں بزرگوں سے متعلقہ نمبروں کے لیے نگار کو ضروری مواد کی فراہمی میں مدد اور مشوروں سے نوازیں۔

مدیر نگار کو اپنے کرم فرما دوستوں جناب رشید حسن خاں جناب نثار احمد فاروقی جناب گوپی چند نارنگ جناب خلیق انجم جناب تنویر علوی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے نگار کیلئے اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے لکھنے والوں کی یہ نئی نسل جو قلمی کام کر رہی ہے وہ اپنی سنجیدہ روش کی بنا پر قابل قدر ہے اور نگار کے صفحات پر بھی وقتاً فوقتاً آتا رہیگا۔

سیرت کی تعمیر

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (نائب صدر جمہوریہ ہند)

سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے: ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جماعتی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائداری۔ ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کر دوں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں، دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوتِ فیصلہ آشکار ہوتی ہیں، ارادے کے بعد میں اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔ خود مختاری جب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو۔ دوسرے نے کر کے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو، جن طبائع میں خود اپنے بل پہ ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ قوتِ فیصلہ سے ارادہ بروقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلہ میں برابر لیت و لعل ہی ہوتی رہے تو ارادے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک نیتی قوتِ ضعیف کے چکر سے عمل کے میدان میں نہیں آسکتی اور سیرت کی تعمیر میں یہ تضعیف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہو جاتا ہے۔ ورنہ ہر فیصلے کے بعد نظرِ ثانی و نظرِ ثالث کا سلسلہ جاری رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوتِ ارادہ بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت، یعنی ثباتِ قدم ارادے کو خارجی رکاوٹوں اور مخالف قوتوں کے اثر سے بچاتی ہے، ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے نامساعد ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دیے جاتے یا بالکل ترک کر دیے جاتے ہیں۔

قوتِ ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں جن میں تغیر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض پر مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار معلم اپنے بچوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اچھی ارادہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور بچہ شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے۔ ارادے کی قوت کے اندازے میں ایک بات نوجوانوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ ارادے کی قوت اس کی ابتدائی شدت سے عبارت نہیں، اس لیے کہ کتنے کام ہیں جو ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کونسی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو۔ ضبط ارادہ در اصل شدت اور مدت کا حاصل ضرب ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں اور ہماری قومی زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتہ مار کر مصروف ہونا ضروری ہے۔ قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر فرطِ جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا تصور کر لیں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلہ میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انھیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگِ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لیے دوسری شرط قوتِ فکر ہے۔ منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت، صحیح نتیجے پر پہنچ سکنے، نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک ٹھیک سوچ سمجھ نہ سکے وہ بھلا عمل میں یکسوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربی معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا ہے جیسے اندھا ٹٹول ٹٹول کر چلے۔ لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے، جسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوتِ عمل کو اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتا ہے یا بخت و اتفاق

کے سہارے ڈگمگاتا آگے بڑھتا ہے، ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے۔ منطقی استدلال اور حکمی فکر کی صلاحیت کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے، ارادہ کر کے اس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر نتیجہ پر جرح کی جائے اسے جانچا جائے پرکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کوشش کر کے ان فطری موانع کو دور کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ جذبات کے طوفان، تخیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خودغرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی تیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکر منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کی ان جھاڑیوں کو پیہم کوششوں سے دور بھی کر دیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی فکر کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشوونما دے لی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہوگئی۔ بس ہر قضیہ پر شبہ کرنے اور اسے پرکھنے کی عادت راسخ کی جاسکتی ہے۔ مگر علمی مسائل پر غور کرنے کی کوشش عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی۔ نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو کچھ اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں اور اصول ہی کافی نہیں ان پر عمل کرنے کا موقع بھی ہونا ضروری ہے۔ اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا، نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی لازم ہے۔

آپ جہاں زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر قدم پر ملیں گے۔ سیاسی اور مذہبی انجمن فروشوں کی صدائیں، وقت کی سہانی راگنیاں، مرغوب عام، مقبول عام سطحی دلیلیں، نامکمل مطالبے، مقدمے، ہٹ دھرمیاں، جماعتی خودغرضیاں۔ یہ سب اور نہ جانے کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح نتیجوں پر پہنچنے سے روکیں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اسے اپنے لیے گوارا نہ کریں گے۔ اپنے فکر کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی کے متاع عزیز کی، اور سیرت سازی کی۔ اسی شرط دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے، شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں، لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے، دوسروں کا عکس رہیں گے اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر منزل سے بہت پہلے ختم ہو چکا ہوگا۔

سیرت کی تربیت کے لیے تیسری شرط ہے اشیا اور اشخاص سے دوچار ہونے میں ذکاوت حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے، یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے جو اس لحاظ سے کہ فطرت میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا سنتا ہے جس کے لئے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں۔ کوئی رنگ کے وہ فرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ بو سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھتے، مزے چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھو کر وہ محسوس کر لیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے۔ مصور، ماہر موسیقی، بو پرکھنے والے، جواہرات کے بیوپاری، چاک پر کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوت حس سے دوسرے لوگوں کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقات انسانی میں بھی ایسی ذکاوت حس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں کچھ بے حس سے۔ کچھ بہت تیز کچھ بہت کند، کچھ ذکی، کچھ غبی۔ بعض بہت جلد دوسروں کے دل کو سمجھ لیتے ہیں، آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں، جبلی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں۔ دوسروں کے مافی الضمیر تک آن کی آن میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اس کے برعکس انسانوں اور چیزوں کے برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشوونما پاتی ہے، کتاب کے کیڑے اور تجریدی علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم ہوتے ہیں۔ زندگی کی ناکامیاں، بچپن میں دل شکستگی، آلام روزگار کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کر دیتے ہیں خودغرضی کی شدت، خودپرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکۂ لطیف سے عاری کر دیتی ہے۔ خوش قسمتی سے بہت سے موقعے ایسے ہیں جو اس کو جلا دیتے ہیں آدمیوں سے سابقہ میں، عمل کے متنوع تجربہ میں، طرح طرح کی صحبتوں میں، زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتا ہے۔ خلوت میں اکثر مرجھا جاتا ہے، جلوت میں نکھرتی ہے، تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشوونما میں اس کا بڑا حصہ ہے، جو اس سے محروم ہو جاتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی اجنبی سے رہتے ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے، یعنی یہ کہ نفس مشاہدات و افکار و تصورات سے کتنا اثر لیتا ہے اور اسے کتنی دیر تک قائم رکھتا ہے ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں اور کتنی مدت تک چلتی ہیں۔
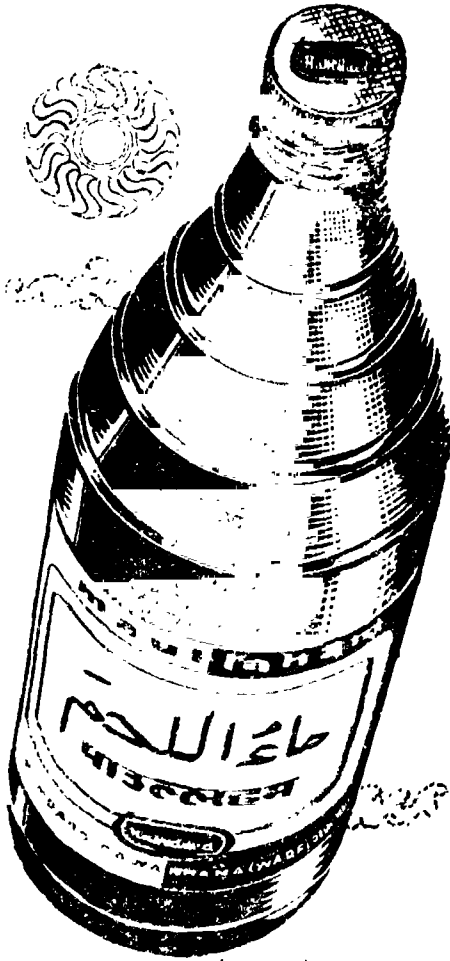
ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ پتھر کوئی آدمی کیسے بنا دے، اور گوبر کا تودہ انسان کے دل کی طرح کیسے دھڑکنے لگے؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بدل بھی جاتی ہے۔ ان کی سیرت میں یکسوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے۔ ان پہ ہر رنگ چڑھ جاتا ہے، یہ ہر تیز رو کے پیچھے چلنے ہیں، مگر بس تھوڑی دور، یہ ہر تحریک کے علمبردار بن جاتے ہیں مگر بس چند دن کو، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں، زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں، آئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں، سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے درپے ہوتے ہیں۔ ہر اشتہاری دوا کو آزمانا چاہتے ہیں! بڑے دلچسپ ہوتے ہیں یہ نیک دل، ہلکے پھلکے لوگ، مگر سیرت کی یکسوئی انھیں نصیب نہیں ہوتی۔ سیرت تنی ہے ان کی جن کے ذہن میں آکر کوئی نیا خیال جگہ پاتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا ہے۔ ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر دیتے اس کو سب نئے تجربات و واردات کا محور بناتے ہیں بجز زندگی کی ہر ہوا کو اپنی اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے اور یہ وابستگی فکر و ضمیر اگر اقدار متعلقہ سے ہو جائے تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا، جاگنا، مرنا جینا سب کچھ اسی کے لیے ہے۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری میں ایسی گہرائی اور ایسی پائداری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یکسو سیرت میں بدل جاتی ہیں۔

آئندہ شمارے کے متوقع مضامین

غالب کے چند نایاب فارسی خطوط ——— نثار احمد فاروقی
دیوان حسین علی خاں شاداں (شاگرد غالب) ——— رشید حسن خاں
غالبیہ (دوسرا باب) ——— اکبر علی خاں
غالب کے یہاں سہل ممتنع ——— راز یزدانی
غالب اور صہبائی ——— مالک رام

کچھ فن کے بارے میں

ڈاکٹر عبد العلیم

فن انسان کے جذبات اور احساسات کی تصویر ہے۔ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرقع ہے۔ اُس کے ارتقا اس کی تہذیب، اور اس کے تمدن کا آئینہ دار ہے۔ فن افراد کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماج کے اجتماعی واردات کی ترجمانی کرتا ہے۔ سماج کے تصور سے الگ فن کا تصور ناممکن ہے۔ اگر افراد سماجی رشتوں میں منسلک نہ ہوتے اور ان سماجی رشتوں کو مرتب اور مضبوط کرنے کے لئے انھیں ہمکلامی، ہمدردی، ہمرنگی اور ہم آہنگی کی ضرورت نہ ہوتی تو نہ زبان و ادب کا وجود ہوتا نہ نقاشی اور مصوروں کا ظہور ہوتا اور نہ رقص و موسیقی نمودار ہوتی۔ ضروریات زندگی کی پیدائش اور فن کی تخلیق میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

جب سے انسان نے فن کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی تحصیل بھی شروع کی اسی وقت سے یہ خیال عام ہے کہ جس طرح فن سماجی زندگی کا آئینہ دار ہے اسی طرح وہ سماج کو بہتر بنانے کا ذریعہ بھی ہے اور اسی وقت سے انسان نے اس کو شعوری طور پر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ غیر شعوری طور پر وہ ہمیشہ سے ایسا کرتا آیا ہے۔ ادیان و مذاہب کی تبلیغ میں فن کا جو نمایاں کارنامہ ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں نظم اور نثر، مصوری، نقاشی، رقص اور موسیقی غرض یہ کہ فن کی ہر صنف کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اسی طرح سماج کے دوسرے مسائل کو بھی فن کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان نے ہمیشہ فن کو سماجی عمل کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے اور اس کے تقاضوں سے ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ فن برائے فن کے نظریہ کو انسان نے بحیثیت مجموعی کبھی تسلیم نہیں کیا۔ صرف موجودہ دور میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس نظریہ کی علمبرداری کی ہے، مگر اس زمانے میں بھی اگر ساری دنیا کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کو قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوئی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرانے زمانے میں ایسا فن تخلیق نہیں ہوا جو سماجی اور اخلاقی اقدار کے منافی ہو۔ ہوا اور اکثر ہوا۔ لیکن کسی نے نظری اعتبار سے ایسے فن کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔ جاگیردارانہ سماج میں فن کو امرا کی تفریح کا سامان بنایا گیا اور بے شمار ہنرمند فن کار درباروں کی خدمت میں اپنے فنی فرائض سے بے نیاز ہو گئے۔ لیکن اس قسم کے فنکاروں کو کبھی سراہا نہیں گیا اور نہ خود ایسے فن کاروں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا کہ محض تفریحی فن کی تخلیق کوئی عظیم کارنامہ ہے۔ یہ افتخار صرف موجودہ دور کے ایک محدود گروہ کو حاصل ہے کہ وہ فن کو سماج سے الگ کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے عجیب و غریب نظریے تراشتا ہے۔

فن برائے فن کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ فن مقصود بالذات ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ان لوگوں کا مطالبہ ہے جو انفرادیت پسندی کی شدت کی وجہ سے سماج سے اپنا رشتہ توڑنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر اس بے نیازی کو اس کی منطقی حد تک پہنچایا جائے تو زندگی سے بھی رشتہ توڑنا پڑے گا۔ بود و باش، کھانے پینے اور زندگی کی دوسری ضروریات کے لیے تو وہ سماج کا سہارا بڑی خوشی سے لیتے ہیں لیکن جب سماجی ذمہ داریوں کا ذکر آتا ہے تو آزادی فکر و فن کی آڑ لے کر ان سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کے کچھ بنیادی لوازم ہیں جن سے فنکار کو بے نیاز نہیں ہونا چاہیئے۔ تبلیغ کے جوش میں جمالیات کو نظر انداز کر دینا فن کار کے لئے سم قاتل ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ فن کا اچھا نمونہ نہیں پیش کر سکتا بلکہ اپنے تبلیغی مقصد میں بھی ناکام ہوگا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے اور مقصدی فن کے حامیوں کو اس کی تفصیلات پر برابر نظر رکھنی چاہیے فن کے مقصد اور منہاج کے بارے میں عمومی اتفاق کے باوجود اس سے متعلق بنیادی اختلافات بھی ہیں مثلاً ایک گروہ

ہیئت پسندوں کا ہے جو فن کو ابدی قدروں کا حامل بنانا چاہتا ہے، اور دوسری جماعت حقیقت پسندوں کی ہے جو زمانے اور ماحول کی بدلتی ہوئی حقیقتوں اور مستقبل کے امکانات کی عکاسی کو فن کی بنیادی فرائض میں شمار کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جن ابدی قدروں کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

سچائی، نیکی اور حسن۔ یہ قدریں اس معنی میں تو ضرور ابدی ہیں کہ ان کا مجرد یا بسیط تصور ہمیشہ انسانوں کے لئے کشش کا باعث رہا ہے۔ لیکن اگر ان قدروں کے اجزائے ترکیبی کی تفصیل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ عہد بہ عہد انسانوں نے ان تصورات کی شرح و تفسیر کس طرح کی ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابدی قدریں بھی زمان و مکان کی پابندیوں سے یکسر آزاد نہیں ہیں۔ فن اور اخلاق کے باہمی ربط کو ہر دور کے ارباب فکر نے موضوع بنایا ہے اور اس کے بارے میں شدید اختلافات ظاہر ہوئے ہیں۔ فن کی طرح اخلاق سے متعلق بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فن کی ابدی قدریں اور اخلاق کی ابدی قدریں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فن کو اگر اخلاق کا پابند کیا گیا تو وہ بے رنگ اور بے جان ہو جائے گا۔ اخلاق کے بارے میں بھی یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس کی اہمیت اور ضرورت کو تو ہر دور اور ہر قسم کے سماج نے تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کی ہیئت ترکیبی اور اس کے بنیادی اصولوں میں بھی وقتاً فوقتاً تغیر اور تبدیلی رونما ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف اخلاق کی ماورائیت پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کی اضافیت پر اصرار ہے۔ سماجی نظام میں جب بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو اخلاق کا معیار بھی بدلتا ہے۔ خیر مطلق کا تصور ایک مفروضہ ہے جس کے سانچے میں انسانی عمل کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انسانی سماج کے ارتقاء کے تقاضے اس سانچے کو اکثر غیر محسوس طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ نکالا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ فن ہر دور کی اخلاقی قدروں سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ قدریں بدلتی رہتی ہیں اس لیے اس تاثر کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ نہ تو فن کار معلم اخلاق ہے اور نہ اس کا فن پارہ تہذیب اخلاق کی درسی مشق۔ اگر فن کار شعوری طور پر یہ درس دینے بیٹھے گا تو یہ خطرہ غالب ہے کہ اس میں تخیل اور احساس کی وہ کیفیت باقی نہ رہ سکے گی جو فنی شاہکار کی تخلیق کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو فن کو اخلاق سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور فن کے ذریعہ اخلاقی مزاج قائم کرنا چاہتے ہیں میری ناچیز رائے میں سماج کے دشمن ہیں۔

اس مختصر بحث میں ایک مزید پہلو کی طرف صرف اشارہ ہی ممکن ہے اور وہ ہے جمالیات کی بحث۔ اس کے بارے میں بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے لیکن سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاقیات سے بھی زیادہ جمالیات کے اصول بدلتے ہوئے سماجی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہر دور کی چند جمالیاتی قدریں ہوتی ہیں اور ہر سماج میں ان کو پرکھنے کا ایک حد تک مشترک معیار رہتا ہے۔ ہر فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس معیار کو مد نظر رکھتا ہے اور ہر کامیاب فن کار وہی ہے جو اس میدان میں تقلید اور اجتہاد کا توازن قائم رکھ سکتا ہے۔ فنی اسلوب میں اگر ایک طرف جامد تقلید اکتا دینے والی چیز ہے تو دوسری طرف بے پناہ جدت پسندی بھی بیزاری کا باعث ہوتی ہے۔ فن کا بنیادی مقصد یہی تو ہے کہ فن کار اپنی جمالی احساسات کو اپنے ناظرین یا سامعین تک پہنچا سکے اور ان کے احساسات میں حرکت پیدا کر سکے۔ کبھی کبھی یہ کام چونکا دینے والی جدت سے بھی لیا جاسکتا ہے لیکن اگر جدت میں روایت بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو فن کار کوئی دیرپا مقام نہیں حاصل کر سکتا اور اس کی جدت کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو سطح آب پر حباب کی۔ فن میں جمالیات کا صحیح مقام متعین کرنا بھی ضروری ہے اس میں عام طور پر افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ فن کی بنیاد جمالیات پر ہے اور جو فن کار جمالیات کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا وہ بڑا فن کار نہیں ہو سکتا لیکن جمالیات کو مطلق یا مقصود بالذات سمجھنا اور اس کو سماجی ماحول یا انسانی فلاح کے مقصد سے بے نیاز تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔

حالی کی وطن دوستی

پروفیسر ہارون خاں شروانی

۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب آمیز موڑ سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو انگریزوں نے ۱۸۰۳ء ہی سے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے تھے، اور ملک کا سیاسی و سماجی مرکز، یعنی مغل دربار ان کا وظیفہ خوار بن گیا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مغلوں کے آخری نام لیوا بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلا وطن کر دیا گیا جہاں انھوں نے اور ان کی ملکہ زینت محل بیگم نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں گزارے۔ اب انگریز تمام ملک پر چھا گئے، اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے لگے۔ سرسید احمد خاں نے ہندوستان کی نکبت اور سیاسی بدحالی دیکھی تو انھوں نے اس کا مداوا یہ قرار دیا کہ ہندی مسلمان اگر تعلیم سے بہرہ ور ہو جائیں تو وہ ملک کی ترقی میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ مولانا حالی اس نتیجے پر پہونچے کہ عالمی مسلمان عموماً اور ہندی مسلمان خصوصاً جس ابتذال اور پستی کی طرف جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی قدریں فنا ہو گئی ہیں جن کے سبب سے وہ کسی زمانہ میں معزز و سربلند ہوئے تھے۔ وہ ہندی مسلمانوں کو ہندوستان کی آبادی کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور ان کی اخلاقی ترقی کو وہ پورے دیس کی اخلاقی ترقی سے منسوب کرتے تھے۔

ساٹھ باسٹھ برس کی بات ہے۔ مسدس حالی کا شمالی ہندوستان میں بڑا چرچا تھا۔ ہر پڑھا لکھا اس مسدس مدوجزر اسلام کو شوق سے پڑھتا اور اور اس مناجات کو جو اس مسدس کے تتمے کی طور پر چھپی ہوئی ہے گنگناتا تھا۔ میرے والد ماجد موسیٰ خاں صاحب مرحوم نے مجھے اسکول میں داخل کرنے سے پہلے تھوڑی بہت اردو، فارسی، عربی گھر پر ہی پڑھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میرے لیے جو گھریلو نصاب بنایا گیا تھا اس میں مسدس حالی بھی شامل تھی، اور میرے استاد مولوی امان الرحمٰن صاحب دہلوی نے مجھے یہ مسدس پڑھا کر حفظ کرا دی تھی۔ اسکول فائنل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میرے والد ماجد نے مجھے اوائل عمر ہی میں انگلستان بھیج دیا۔ ۱۹۰۹ء میں بڑی تعطیلیں گزارنے کے لئے ڈھائی مہینے کے لئے گھر آیا۔ اس زمانہ میں علیگڑھ کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک مرحوم تھے جن سے والد مرحوم کے گہرے روابط تھے۔ مولانا حالی علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب مرحوم نے انھیں ٹھہرانے پر مدعو کیا اور والد مرحوم کو بھی بلایا گیا۔ اس موقع پر مجھے مولانا کی بالکل برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا فخر حاصل ہوا۔

۱۹۰۹ء میں میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور بچپن میں مسدس حالی کے جو اثرات میرے دل و دماغ پر پڑے تھے وہ اس وقت تک قائم تھے۔ میرے اوپر مولانا حالی کی ہم نشینی کا بہت اثر ہوا۔ آج بھی ان کا نورانی چہرہ، سفید گول داڑھی، کالی ٹوپی، کالی اچکن، گلے میں رومال بندھا ہوا، گٹھا ہوا بدن، دل پر نقش کئے ہوئے ہیں اور ان مٹ ہیں۔ یہ میری پہلی اور آخری ملاقات مولانا حالی سے تھی۔ میرے ولایت سے واپس آنے کے چند مہینے بعد حالی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اردو ادیبوں کے حلقوں میں عام طور پر اور علیگڑھ کے حلقوں میں خاص طور پر ان کی وفات کا کس قدر اثر پڑا تھا۔ میں یہاں اس نظم کے دو بند پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں جو اس زمانے کی مشہور شاعرہ اور شروانی خاندان کی مایہ ناز خاتون ز۔ خ۔ ش مرحومہ نے حالی کی موت پر لکھا تھا وہ کہتی ہیں:-

سوکھنے پائی نہ تھی چشم گہر بار ابھی　　اور تھی سیرابی صد کشت کو طیار ابھی
بھرنے پایا تھا نہ زخم دل افگار ابھی　　گھٹنے پایا تھا نہ رنج و غم بسیار ابھی
ہم نہ بھولے تھے غم شبلی غمخوار ابھی　　مٹنے پائے تھے نہ اس سوگ کے آثار ابھی
کردیئے زخم ہرے پھر فلک اخضر نے　　پھر کیا خون دل مے سرخی چشم تر نے

جانے دے جانے دے اے سائل حال حالی دشمن صبر و تحمل ہے خیال حالی
کیوں حسد چاک کرے دل کو ملال حالی نہ ملی ہے نہ ملے ہم کو مثال حالی
دائمی زیست کا ساماں ہے کمال حالی نظر آئیں گے کتب میں خد و خال حالی
نام چمکے گا مسدس سے سدا جوں خورشید مرنے دے گی نہ کبھی اس کو حیات جاوید[1]

جیسا کہ اس مرثیے میں بیان کیا گیا ہے مولانا حالی کی مسدس مد و جزر اسلام' موسومہ مسدس حالی، اور ان کی سوانح عمری سر سید احمد خاں' موسومہ حیات جاوید' دو ایسے جواہر پارے ہیں جو اردو زبان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دونوں علیگڑھ تحریک کے آفریدہ ہیں[2]۔

مولانا مسدس کے پہلے دیباچہ میں جو ۱۲۹۶ھ - ۱۸۷۹ء کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:۔

"ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے دشوار گذار راستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہر قدم پر بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں، بوڑھے پر چھالے پڑے ہیں، دم چڑھ رہا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ وہ اولوالعزم آدمی جوان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے نہ اسے راستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے اس کی چتونوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے اس کی ایک نگاہ ادھر پڑ گئی اور اپنا کام کر گئی ..

در فیض است منشیں از کشاکش نا امید اینجا برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑی میں ایک ابال آیا افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متعدد حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے ان سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی ...."

اس سے پہلے دیباچہ کی ابتدا مولانا اس مشہور رباعی سے کرتے ہیں :۔

بلبل نے چمن میں ہم زبانی چھوڑی بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی[3]

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا دل ۱۸۵۷ء کے واقعات اور دلی کی بربادی کی وجہ سے پرانی قسم کی عشقیہ شاعری سے اچاٹ ہو گیا تھا۔
انھوں نے دلی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ان کے حب وطن کا آئینہ دار ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

---

[1] ز۔خ۔بش ! فردوس تخیل، لاہور، ۱۹۴۱ء، صفحہ ۳۲۴
[2] بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ حیات جاوید کے لکھے جانے کے محرک راقم الحروف کے تائے صاحب نواب اسمٰعیل خاں مرحوم تھے۔ مولانا حالی اس کتاب کے دیباچے طبع اول میں لکھتے ہیں :۔ "کچھ دنوں بعد سرسید کے نہایت خالص مخلص ذات آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو اردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جائے .... ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیے۔"
[3] مد و جزر اسلام، پہلا دیباچہ، ۱۲۹۶ھ

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم — دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ رلانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی — یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز [1]

یہ نظم پوری کی پوری قنوطیت میں ڈوبا ہوا ایک مرثیہ ہے، دل سے نکلی ہوئی ایک آہ ہے۔ جیسے کوئی مرجائے تو پس ماندوں کے لئے رونے کے علاوہ کوئی دوسری کیفیت نہیں ہوتی، اسی طرح حالی کے نزدیک دلی مرچکی تھی اور دوبارہ اس کا جنم لینا ناممکن تھا۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ انگریزوں نے آزادی کے متوالوں کو کس بے دردی اور بے رحمی سے ختم کیا تھا اور اب حالی کسی قسم کی بہتری سے نا امید ہو چکے تھے۔ وہ کہنے لگتے ہیں :-

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے [2]

سرسید کے اثر نے اس قنوطی رجحان کو اس یاس کو آس سے تبدیل کر دیا۔ سرسید ایک عملی انسان تھے۔ انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء کی خونچکاں داستان اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی مگر بیدار رہ کر وہ اس فکر میں تھے کہ ملک کی حالت میں جو عظیم تبدیلی ہوئی ہے اور ملک پر تاریکی کی جو گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے ان کا مداوا کیا ہے۔ اور یہی وہ محرک تھا جس نے حالی کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ملک پستی کے جس گڑھے میں گر گیا ہے اس پر صرف رونے سے فائدہ نہیں۔ بلکہ ان تدبیروں کو سوچنا ہے جن کو اختیار کرنے سے شاید وہ از سر نو ابھر آئے۔ حالی ۱۸۷۱ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

" رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بنیاد اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک ہے اور جس کی حقیقت نہ ماننے سے سلطنت کی بڑی خوبی آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی اگر سچ پوچھیے تو اس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا اس کی کنجی سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں .... مگر مسلمانوں نے اب بھی بے پروائی کو کام فرمایا اور سید صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ پودا نہ لگائی تو ان کی وہی مثل ہوگی جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے ......" [3]

ایک اور مضمون میں جو ۱۸۷۹ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا وہ علی گڑھ کا حال لکھتے ہیں :-

" اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کی حاضری میں کمی تھی، مگر جس قدر مدرسے کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی، اس سے جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے ممبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں ہم حال

---

[1] نوائے آزادی، ادبی پبلشرز بمبئی، ۱۹۵۷ء "مرثیہ دہلی" ص ۱۸
[2] مد و جزر اسلام، دیباچہ ۱۲۹۶ ہجری۔
[3] حالی : سید احمد خاں اور ان کے کام، مقالات حالی، ص ۳

وقاّل کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں ہم نے پیران طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلانے والے نعرے بھی سنے ہیں مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت..... اس مدرسہ کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی .... ہم مدرستہ العلوم کے اس وسیع میدان میں عین دھوپ کے وقت ایک پیرمرد سفید پوش، نورانی صورت اور عالی دماغ آدمی کو باوجود کبرسن اور فربہی مفرط کے نہایت ذوق وشوق اور امنگ کے ساتھ دو دو گھنٹے پیادہ پھرتے دیکھ آئے ہیں اور اس کے سوا اسے رات اور دن اس کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو اس شخص سے بڑ عظیم الشان کام لینا ہے۔ نہ رئیسوں اور تعلقہ داروں کی بے پروائی اس کے ارادوں کو روک سکتی ہے اور نہ زید وعمر کی مخالفت اس کی ہمت توڑ سکتی ہے[1]........

"حیف ہے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی"[2]

انھوں نے غزل کی بجائے نظم کو اپنا شیوہ بنایا اور مبالغہ پسندی کی بجائے حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے، تو حسن اتفاق سے انھیں اس میدان کا ایک ہمسفر مل گیا۔ انھیں سات، آٹھ برس تک نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے ساتھ ان کی جاگیر جہانگیرآباد ضلع بلند شہر رہنے کا موقع ملا۔ نواب صاحب بھی "مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا اسی کو منتہائے شاعری سمجھتے تھے۔"[3]

ایک طرف آسان زبان میں نظم لکھنے کی طرف میلان دوسری طرف سرسید کی "ترغیب" یہ دونوں مسدس اور بعض دوسری نظموں اور مثنویوں کے لکھنے کے محرک ہوئے اور یہ سب نظمیں اور مثنویاں ایسی ہیں کہ ان میں سماج کی برائیوں اور ان کی اصلاح کا طریقہ دکھایا گیا ہے۔

مسدس کے اصل میں دو حصے ہیں ایک کو قنوطی کہنا چاہیئے اور دوسرے کو جسے حالی نے "ضمیمہ" کا لقب دیا ہے۔ رجائی۔ دونوں حصے ایک اعتبار سے ایک دوسرے کا تتمہ ہیں پہلے حصے میں اسلام کے سچے اور اچھے اصول، ان اصول کی باعث مسلمانوں کا دنیا میں پھیلنا اور تہذیب وتمدن علم وعمل کی تلقین اس کے بعد ان کا زوال، تہذیب کے اصولوں کی بھول، دوسروں سے تعصب، آپس کی نفرت، بداخلاقی، غیبت، حسد، تکبر، کوراطنی، کذب ومبالغہ، ایسی بدعادتوں سے ایک عظیم الشان قوم کو کیسے تنزل ہوا۔ یہ سب بیان کیا گیا ہے مسدس کے پہلے حصے کے آخر میں وہ حسرت ویاس سے کہتے ہیں:-

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے　　　سر انجام ہر قوم وملت یہی ہے
سدا سے زمانہ کی عادت یہی ہے　　　طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے
بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر
کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی　　　کہاں ہیں وہ گردان زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی　　　مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کہیں کھوج کلدانیوں کا
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کا[4]

---

[1] حالی: مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ، مقالات حالی، صفحہ ۱۳۱
[2] مدوجزر اسلام، دیباچہ ۱۲۹۶ ہجری
[3] ترجمۂ حالی، مقالات حالی صفحہ ۲۶۷
[4] مدوجزر اسلام خاتمہ

دوسرا حصہ، یعنی ضمیمہ، ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں اسکول میں جملہ ۲۷۰ طلبہ اور ۱۸۸۵ء میں کالج میں جملہ ۵۰ طلبہ تھے جو اس زمانہ کے حالات سے بہت سمجھے جانے چاہئیں[لہ]۔ ناامیدی کی جگہ امید کی لہر حالی کے دل و دماغ میں موجزن ہو گئی تھی۔ اسی لئے انھوں نے اس حصے کو امید کے ان الفاظ سے شروع کیا ہے:-

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو　　جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو　　فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں!

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے　　عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے　　تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا![سلہ]

اس حصے میں وہ ان عادتوں اور خصلتوں کا جائزہ لیتے ہیں جنھیں اختیار کرنے سے قومیں بگڑ کر بن سکتی ہیں۔ یہ عادتیں محنت پسندی، غمخواری بنی نوع انسان، علوم و فنون سے رغبت، جدید علوم کا اکتساب، علم والوں کی قدر افزائی، یہ سب مولانا حالی کے نزدیک ایسی خصلتیں ہیں جن سے گری ہوئی قومیں ابھر سکتی ہیں۔

مسدس میں زیادہ تر ہندی مسلمان مخاطب ہیں مگر جو خصلتیں کسی قوم کو بناتی ہیں اور جو عادتیں انھیں بگاڑتی ہیں وہ کچھ اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ ان کا اطلاق کسی قوم پر بھی ہو سکتا ہے۔ حالی نے نہ صرف اپنی مسدس میں تعصب کو جہنم سے تعبیر کیا ہے[سلہ] بلکہ اس بدخصلت پر ۱۸۹۲ء میں ایک مستقل نظم بھی لکھی ہے، جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ انسان سمجھے کہ وہ خود کمالات کا پتلا ہے اور اسے اپنی خامیاں دوسروں کی اچھائیوں سے بہتر نظر آئیں وہ کہتے ہیں کہ تعصب ایک دھوکا ہی دھوکا ہے اور اگر کوئی قوم اپنی بری چیز کو بھی اچھی چیز سمجھتی ہے تو جان لینا چاہیئے کہ اس کے برے دن قریب ہیں۔

دیکھا جب عالم انصاف کا رنگ　　ہم کو خود آنے لگا آپ پہ ننگ
خوبیاں اپنی جو تھیں ذہن نشین　　ان پہ ہم کرنے لگے خود نفریں
عیب سب اپنے نظر آنے لگے　　آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے
جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا　　اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا
قصر و ایواں کا گماں تھا جن پر　　نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر
جب ہر اک قوم کا ساماں دیکھا　　ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا

لہ انتظام رعالم تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ صفحہ ۱۳۵ مکمل جدول کو راقم الحروف نے اپنے مضمون " سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد" میں نقل کیا ہے جو کتاب "علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز" صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۲۱۵ پر چھپا ہے۔

سلہ مد و جزر اسلام، ضمیمہ، ۱۳۰۳ ہجری

سلہ " تعصب کو ایک جزو دیں سمجھے ہیں ہم ؛ جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم "

نکلے سب ہیچ خیالات اپنے ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے [1]

تعصب کی برائی سے ایک قدم آگے بڑھیئے تو حالی کو حب وطن کے گن گاتے پائیں گے اس موضوع پر ان کی ایک مستقل مثنوی ہے جو ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی تھی اس کے آغاز میں حالی کائنات کی خوبصورتی پر جھومتے ہیں اور ناز کرتے ہیں مگر کہتے ہیں [2]

اے وطن اے مرے بہشت بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری کی ہے مورد آلام تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

....

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
ہے نباتات کا نمو تجھ سے روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

....

وہ کہتے ہیں کہ حب وطن ہر دوسرے جذبے سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ وہ پوچھتے ہیں :-

نام ہے کیا اسی کا حب وطن جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

وہ اب بیان کرتے ہیں کہ اصلی حب وطن کو نسا جذبہ ہے :-

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

مثنوی کے آخری بندوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی سماجی مساوات کے کس حد تک قائل تھے۔ فرماتے ہیں :-

جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کا یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
مقبلوں مدبروں کو یاد کرو خوش دلو! اغم زدوں کو یاد کرو
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ

اس کے بعد وہ سچی وطن دوستی کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی وسیع مشربی کا پورا ثبوت دیتے ہیں :-

---

[1] حالی تعصب و انصاف، مجموعہ نظم حالی، صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۶۱ -

[2] حالی: حب وطن مجموعہ نظم حالی صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۳۱

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو اس میں یا برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہووے یا کہ ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

اب ملاحظہ کیجیے:-

ملک میں اتفاق سے آزاد — شہر میں اتفاق سے آباد
ہند میں ہوتا اتفاق اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بد خواہ — لگی غیروں کی تم پہ پڑنی نگاہ

حالی بھی سرسید کی طرح دل سے وطن دوست تھے۔ نکبت و نحوست اور افلاس کی حالت میں وطن عزیز کی آبادی کا ایک حصے نے اپنی قابل رشک اور اعلیٰ مرتبہ کھو دیا تھا۔ اس پر وہ سر دھنتے ہیں اور اس نکبت و افلاس کا تجزیہ کرنے کے ساتھ وہ بعض عالمگیر حقیقتوں اور اصولوں تک پہنچ جاتے ہیں جو قوموں کے عروج و زوال کا باعث ہوتے ہیں۔ سرسید کی طرح انھیں بھی اس کا یقین ہے کہ جب تک گاڑی کا ہر پہیہ اپنا اپنا کام کرنے کا اہل نہ بن جائے گا اس وقت تک گاڑی کا چلنا محال ہے۔

یہاں ایک دلچسپ بات یہ کہنی ہے کہ جس طرح سرسید کا حالی پر اثر تھا اسی طرح سرسید بھی حالی سے متاثر تھے اور مسدس حالی کا تو ان پر خاص اثر پڑا تھا۔ ۱۰ رجون ۱۸۷۹ء کو وہ شملے سے مولانا حالی کو لکھتے ہیں:-

"جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ وہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے .... اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جس میں میری طرف اشارہ ہے۔ بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں .... مسجد کے اماموں کو چاہیے کہ خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں ...... لڑکے ڈنڈوں پر باندھے پھریں ...... قوال درگاہوں میں گائیں حال لانے والے اس سچے حال پر حال لا دیں ......"[1]

....

جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف حالی میں حب وطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا تو دوسری جانب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ بحیثیت ایک مسلمان کے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے سامنے ان رازوں کو آشکارا کریں جن کی وجہ سے جاہل وحشی اور خونخوار عرب ایک عظیم الشان اور لاثانی مسلک پر عمل کر کے تہذیب، شائستگی، دیانت اور انسان دوستی میں دنیا بھر کے معلم بن گئے۔ جب تک وہ سرسید سے نہ ملے تھے اس وقت تک انھیں دنیوی نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تھا۔ لیکن سرسید سے ملنے کے بعد یکایک ان میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا اور ان کے دماغ نے ایک نئی روشنی محسوس کی انھیں اس کا اندازہ ہونے لگا کہ ہندی مسلمانوں کے مرض کا ایک اور صرف ایک نسخہ ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے اخلاق اور اپنے کردار کو درست کریں، اپنے وطن سے محبت کریں، اسلاف نے جو نمونے چھوڑے ہیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور جدید علوم سے استفادہ کریں انھیں یقین ہو چلا تھا کہ اگر ان کے ہم وطن مسلمانوں نے یہ نہیں کیا تو وہ قعر مذلت سے نہ نکل سکیں گے اور پہلے سے بھی زیادہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

---

[1] خطوط سرسید، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء، صفحہ ۱۶۶

باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں

محمد عبدالسلام خاں

کائنات کی علت

کائنات کی علت، وہ مادّہ ہو یا اس کی کوئی بدلی ہوئی صورت یا کوئی زیادہ ابتدائی نامعلوم حقیقت ـــــ عقل کی درماندگی، قیاس کی نارسائی اور جستجو کی ناکامی سے بخت، اتفاق یا حادثہ کہہ کر گزر جاؤ ـــــ ہے بہرحال ایسی بنیادی حقیقت جس کو مانے بغیر نہ انسانی عقل ایک قدم آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ کائنات میں کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

انسانی شعور کی پوری معلوم تاریخ ـــــ چٹانوں پر ہو یا ستونوں اور گپھاؤں میں، زمین دوز مقبروں میں ہو یا مندروں اور محلوں کے کھنڈروں میں، زبانی کہانیوں، گیتوں میں ہو یا پتوں، چھالوں، تختیوں اور کاغذوں میں ـــــ بتسلسل و تواتر گواہ ہے کہ بالادست اور ماوراء قوت کی ہستی کا احساس انسان کی فطرت ہے۔ اگر ہستی خارجی واقعہ ہے تو انسانی شعور کے لئے ایک بالادست طاقت بھی حقیقت اور خارجی واقعہ ہے۔

اس بالادست قوت سے تغافل برت لیا جائے، مبالغہ آمیز دلائل اور نارسا مشاہدات کے بوجھ سے اس فطری احساس کو دبا دیا جائے لیکن اس کو بالکل مٹا دینا بس کی بات نہیں۔ کائنات ہو یا انسانی شعور ایک ماورائی حقیقت دونوں میں رچی بسی ہے۔ نہ کائنات اس سے آزاد ہو کر رہ سکتی ہے اور نہ انسانی شعور اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ کائنات کی یہ فطرت ہے، انسانی شعور کی یہ ساخت ہے۔

کائنات کی علت کے اوصاف اوّلیہ

انفس ہوں یا آفاق اس ماورائی مقتدر اور بالادست طاقت کے کھلے اور واضح علامات سب میں نمایاں ہیں جو پکار رہے ہیں کہ وہ حق ہے "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ" اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو خود کائنات کی ہستی تاریک ہو جائے گی۔ عالم کی روشنی اور اس کا نور یہی حقیقت ہے۔ ہستی کی عقلی گواہی اور عملی شہادت یہی ہے" أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○ موجودات میں یہی سب سے عظیم و کبیر سب سے برتر اور علی و متعال ماورائی حقیقت ہے جو ہستی کے سلسلے کو تھامے ہوئے اور قائم رکھے ہوئے قیّوم ہے۔ خود وجود کی نگراں اور رقیب، حفیظ، مقیت اور مهیمن ہے۔ قرآن نے اس ظاہر اور کھلی ہوئی حقیقت کو مسلم اور ناقابلِ انکار واقعہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کو خود کسی ثبوت اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ چیزیں اس کی شہادت کی محتاج ہیں۔ وہ خود بے نیاز اور صمد ہے۔ عالم اس کا ضرورتمند ہے وہ عالم سے بے پرواہ اور غنی ہے یہ حقیقت قوت، علت ـــــ جو بھی نام رکھو ـــــ پوری کائنات کو محیط ہے اتنی واسع ہے کہ اس کی وسعت اور سمائی سے کوئی شے باہر نہیں۔ روزمرہ کے مسلسل اور متواتر تغیرات، تطورات اور شئون کی درپردہ اور باطن علت کے طور پر خود غیر متغیر اور متین ہے۔ یہی سب سے پہلی اور اوّل ہے، یہی سب سے پچھلی اور آخر ہے یہی وہ یکتا اور احد ہے جو کائنات سے قریں اور قریب ہے۔ لاریب کہ وہ اتنی لطیف ہے کہ اس کو اس کی حقیقی حیثیت میں نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔ سب پر قوی اور سب سے غالب ہے۔ عزیز اور سب میں گراں اور گرامی ہے۔ سلسلہ کی کی سب سے قوی کڑی اور تمام کڑیوں کی ہستی کی آخری کفیل ہے۔

حیات و ارادہ اور ان کے متعلقات، شعور وغیرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے جہاں تک مذکورہ قرآنی اوصاف کا تعلق ہے اس حقیقت کبریٰ کے تعقل کے لئے لازم ہیں بلکہ اس حقیقت کا انسانی تصور و تعقل کم و بیش یہی اوصاف ہیں۔ انسانی عقل نے جہاں دھوکے کھائے ہیں اور دشواریوں میں الجھی ہے وہ اس حقیقت کی حیاتی خصوصیات، شعور، ارادہ اور اختیار یا کائنات سے اس کے تعلق کی نوعیت اور اس تعلق کی بنیاد پر اس کی

تقدیسات اور تعینات ہیں۔ مذاہب و ادیان کا اختلاف بھی اصلاً نتیجہ ہے اس تعلق کی نوعیت اور اس کے تعینات و تقدیسات میں اختلاف کا فلسفہ اور حکمت کی تردید یا تائید کا موضوع حقیقتہً یہی خاص صفات ہیں نہ کہ خود اصل ماورائی حقیقت۔

قرآن کا اندازِ نظر

قرآن نے انسانی ذہن کے اسی الجھاؤ کو تنبیہوں، توضیحوں اور امثال و واقعات سے سلجھایا ہے اور کائنات اور اس اقتدارِ اعلیٰ کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کی ہے۔ اس نے سامنے کے طبیعیاتی مظاہر سے، ان کی ساخت اور ان کے طبیعی تغیرات سے ان کے جنچے تُلے ٹھیک اندازوں اور تقدیروں سے، ان کی وضعوں سے، ان سے وابستہ فوائد اور مقاصد سے پھر انسانی خلق، اس کے شعور اور آلاتِ حس سے اور اس سے متعلقہ اغراض سے، ان اغراض کے ساتھ فطرت کے لگاؤ اور اس کی موافقت سے واضح کیا ہے کہ کائنات کی آخری علت کو کیسا اور کس طرح کے اسماء و صفات سے متصف ہونا چاہیئے۔ ان موقعوں پر قرآن نے جذبات و میلانات کے بجائے انسان کی عقل و خرد اور اس کے تدبر اور تفکر کو مخاطب کیا ہے اور اس کی علمی حس کو انگیز کیا ہے۔

کائنات اور اس کی عام خصوصیات

انسانی ذہن اپنی تمام موشگافیوں کے باوجود کائنات کی واقعیت سے صرف نظر نہیں کر سکتا فلسفیانہ انتقادات اور علمی مشاہدے کائنات کی خارجیت کے متعلق اس کے رویے میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے۔ خود انسان اور شعور بھی اسی خارجیت کی ایک کڑی ہے جو پوری کائنات پر حاوی ہے عالم النفس اور عالم آفاق ایک ہی حقیقت کے مربوط مظاہر ہیں۔ النفس کی ساخت میں آفاق کا شعور شامل ہے اور آفاق کی معنویت انفس کے ساتھ قائم ہے۔ یہ کوئی لمحاتی وجدان یا آنی دقوت نہیں ہے بلکہ ٹھوس اور دیرپا حقیقت ہے "کیا انھوں نے اپنے نفسوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک حقیقت کی حیثیت سے اور ایک مقررہ مدت تک کے لیے" (پارہ ۲۱ سورہ ۳۰ رکوع ۱)

مظاہر کونیہ کا تشخص اور تعدد، ان کا استمرار اور تغیر، ان میں تعامل اور توالد، ان میں نظم و ضبط کیا اسی لیے نہیں ہے کہ "اس کے یہاں ہر چیز ایک (معین) اندازہ (اور مناسب قدر) کے ساتھ ہے" (۱۳۔۱۳۔۲) پھر چیزیں نہ خود بخود ہو گئی ہیں اور نہ انھوں نے یہ خاص نسبت اور یہ خاص اندازہ خود بخود حاصل کر لیا ہے بلکہ "ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک اندازہ (اور خاص تناسب) عطا کیا ہے" (۱۸۔۲۴۔۱)

کائنات کا سادہ سے سادہ عنصر ہو یا نہایت پیچیدہ اور ترقی یافتہ ترکیب، اس کی فطری ساخت نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ ممکن حد تک تام ہے بلکہ اپنی پوری مدت بقا اور تمام اطوار وجود میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو اعمال اور استعداد ہیں لابد ہیں، ان میں بھی مکمل ہے، گرد و پیش سے ساز کرنے کے لیے صلاحیتیں درکار ہیں ان میں پوری اور حسن آفرینش کا نمونہ ہے۔ تو کیا مظاہر کا کمال کی طرف یہ رخ خود بخود ہو گیا ہے۔ یہ نظام تعاون و تعامل از خود وجود میں آگیا ہے۔ ہم آہنگی اور توافق کی طرف چیزیں اپنے آپ ہی اپنے آپ بڑھ رہی ہیں۔ کیا اس کے لئے اندرونی ساختوں، ان کی الگ الگ خصوصیتوں پھر بیرونی صورتوں اور ان کے جدا جدا اعمال و وظائف اور قریب و بعید گرد و پیش، باہم تعامل اور گزشتہ و آئندہ اثرات کا گہرا اور وسیع علم ضروری نہیں ہے؟ اسباب و علل پر کامل اقتدار درکار نہیں؟ موافقانہ رویہ یا رحمت لابد نہیں؟ قرآن کہتا ہے:۔ "وہ جاننے والا ہے چھپی (اور پس پردہ حوادث اور اندرونی حقائق) اور کھلی کا۔ غالب (اور با اقتدار) ہے۔ رحمت (اور شفقت) والا ہے جس نے ہر اس چیز کو جس کو پیدا کیا ہے۔ اچھا ہی بنایا ہے" (۲۱۔۳۲۔۱) اس اندازِ صنعت اور اس طرزِ آفرینش اور اس نظامِ تعاون کے سطحی علم اور اٹکلی دانائی کافی نہیں۔ معمولی زور اور قوت مفید نہیں معروضی اور غیر جانبدارانہ رویہ بس نہیں۔

طبیعی مظاہر کا تجزیہ کرتے چلے جاؤ، اجزاء کی خصوصیتوں پر نظر رکھو، ان کے فاصلوں کا جائزہ لو پھر تعامل پر غور کرو۔ محدود عناصر اور ان گنت نوعوں کو دیکھو، سالموں کے اختلاف اور ان کے جواہر کی یکسانی پھر کاتعنی فرقوں کو، برقیوں کی تعداد اور ان کے عددی اختلاف کے اثرات سب پر نظر ڈالو، ان کی تالیفوں اور ان تالیفوں کی بندش کے فرقوں کا لحاظ کرو پھر ان فرقوں پر مبنی خصوصیات کا مشاہدہ کرو اور پھر ترکیبی استحکام اور بندش کی چستی کی توجیہ کرو۔ کیا عقل سلیم باور کرتی ہے کہ نا پیوستہ سالمات میں اپنی اپنی جگہ رہنے کی خواہش ذاتی ہے۔ برقیے اپنے آپ ہی آپ اپنی تعداد مقرر کر لیتے ہیں اور محکم اور سخت بندش وجود میں آجاتی ہے اور اس طرح یہ مختلف النوع طبیعی اصناف نمودار ہو جاتے ہیں یا اس سب میں کسی علم و حکمت والی بااقتدار ذات کی

صنعت گری جلوہ فرما ہے۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ نظامِ ہستی کی یہ حسین مظاہر میں یہ حسن انتظام اور موجودات میں یہ متین فعال کی کارفرمائی ہے۔" اس ذات کی جس نے ہر شے کو متانت (اور حسین) عطا کی ہے۔" (۲۰-۲۷-۷)

اب اگر کائنات محض دھوکا اور فریب نہیں ہے تو پھر اس کا حقیقی ہونا، اس کے طبیعی مظاہر میں خاص اندازوں اور قدروں کا کارفرما ہونا، ان کا کمالِ ہم آمیزش اور حسنِ حال، ان کی متانت اور استحکام، نظم و ضبط عقلِ سلیم کے لئے دعوتِ فکر ہے کہ وہ فلسفیانہ دوراز کار احتمالات اور عقلِ نظری کے کھوکھلے امکانات کے پرفریب جال میں پھنسے بغیر واقعاتی بصیرت سے کام لے اور عملی فیصلہ کرے کہ اس کارزارِ ہستی اور کارزارِ حیات میں بے بصیرت اسباب و علل اور اندھے طبیعی عوامل آپ ہی آپ فعال اور موثر ہیں یا ان کا انتخاب و اختیار پھر ان کی باگ ڈور علیم و حکیم اور مصلحت شناس مقتدر کے ہاتھ میں ہے۔

اجرام ارضی وسماوی کی خلق اور ان کی نوعیت

کائنات کے سب سے بڑے طبیعی مظاہر ارضی وسماوی اجرام جن کی عظمت و ہیبت نے دنیا کی بڑی بڑی قوموں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور جن کے فرضی کارناموں کی دیومالائیں بن چکی ہیں، ان کی ابتداء یہ ہے کہ سماء (یا اجرام سماوی) تو "دھواں (یا گرم گیس) تھا۔ چنانچہ اس سے اور زمین سے کہا کہ بخوشی یا بجبر وجود میں آ جاؤ انھوں نے کہا ہم بخوشی آگئے تو ان کو سات سماوات کر دیا" (۲-۴۱-۲۴) یہ عظیم ترین گیسی مخلوق جس کی شان یہ تھی کہ ارض و سمٰوات خلط ملط (اور ملی جلی وحدت) تھے (۲۱-۲۱-۱۷) ان کو خاص قدروں اور صحیح ترین اندازوں سے "اب الگ الگ کیا" (۲۱-۱۷-۳۰) اور خاص خاص حجموں کے اجرام میں اس طرح تشکیل کیا کہ ایسا نظام گرفت بروئے کار آگیا کہ "ارض وسماء (محض) اس کے حکم سے قایم ہیں" (۲۱-۳۰-۳۰) اور دیکھنے والوں نے سمجھ لیا کہ "اللہ وہ ہے جس نے سماوات کو ایسے ستون کے بغیر اٹھائے رکھا ہے جس کو دیکھ سکو" (۱۳-۱۳-۱) چنانچہ یہ اجرام اپنی ساخت طریقِ ساخت بلکہ اپنے مادّے میں بھی یکساں ہیں۔ "اللہ وہ ہے جس نے سمٰوات سبعہ کو مطابق (اور یکساں)[1] بنایا" (۲۹-۶۷-۱)

اس معلوم نظامِ ہستی کی سب سے بڑی عظیم الشان مخلوق اجرام سماویہ کی ابتدائی شکل پر غور کرو۔ ابھی نہ سورج ہے نہ چاند، نہ زمین ہے اور بالائی فضا دھند ہے جو لامحدود خلا کے کسی گوشے یا حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ گرم گیس ہے جو کسی خاص وسعت میں بھری ہوئی ہے۔ کیا لاشئے محض نے آپ ہی آپ شئے کا روپ دھارن کر لیا یا کوئی نامعلوم شئے از خود دھوئیں یا گرم گیس میں تبدیل ہو گئی؟ پھر اس گیس میں منضبط تغیرات کیوں کر پیدا ہونے شروع ہو گئے؟ ٹھیک نظم کے ساتھ صحیح اندازوں کے ساتھ یہ خود بخود تقسیم ہو گئی۔ اور پھر الگ خصوصیتوں والے اجرام وجود میں آگئے اور ایک نہایت دقیق، کامل اور ہم آہنگ نظام وجود بروئے کار آگیا؟ زمین کو اجرام سماویہ کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اور ان کی گوناگوں ہلاکت بار فعلیتوں کو منضبط کرنے کے لیے بالائی فضا تیار ہو گئی اور اس نے زمین کو لپیٹ لیا۔ قرآن کہتا ہے "ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنا دیا ہے" (۱۷-۲۱-۳۲) دوسری جگہ ارشاد ہے "کیا انھوں نے دیکھا نہیں اپنے اوپر آسمان کی طرف ہم نے اسے کیسا بنا دیا ہے" (۲۶-۵۰-۱) کیسا بنا دیا ہے؟ "اللہ تو وہ ہے جس نے زمین کو مستقر اور آسمان کو گول گھر بنا دیا ہے" (۲۴-۴۰-۷) اس گول گھر میں تحفظ کا جو سامان ہے وہ تو ہے ہی، ساتھ ساتھ جمالیاتی نقطۂ نظر سے ستاروں کے

---

[1] عام اور مشہور معنی تو یہی ہیں جس کو لسان میں بیان کیا گیا ہے والسمٰوات الطباق سمیت بذلك لمطابقة بعضها بعضا ای بعضها فوق بعض وقیل لان بعضها مطبق علی بعض، لیکن اوپر نیچے میں یا ایک دوسرے پر ڈھکے ہوئے اور چھائے ہوئے ہیں سب کی رویت یا ممکن نہیں ہے یا بہت مستبعد ہے۔ حالانکہ "ما تری فی خلق الرحمٰن من تفاوت" ای الاختلاف من الفوت فان کلا من المتفاوتین فات عنہ بعض ما فی الآخر۔ اور "ھل تری من فطور"، "والفطور الشقوق" میں رویت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یکسانی سے تفاوت زیادہ مناسب ہے۔ مطابقۃ اصلاً اگرچہ مقدار اور پھیلاؤ کی مساوات ہے لیکن دوسری طرح کی برابریوں میں بھی اس کا استعمال متعارف ہے لسان میں ہے:۔

المطابقۃ الموافقۃ، والتطابق الاتفاق، وطابقہ علی الامر جامعہ واطبقوا علی الشیء اجمعوا علیہ ویقال طابق فلان فلانا اذا وافقہ وعاونہ وطابقت المرأۃ زوجھا اذا واتتہ

زینت اور آرائش کا سامان ہونے میں بھی نچلی فضا کو کتنا دخل ہے جاننے والے جانتے ہیں: "ہم نے سب سے نچلے آسمان کو چراغوں سے مزین کر دیا ہے اور ساتھ ساتھ) حفاظت کے لئے" (بھی) (۱۴-۴۱-۲۰) تو یہ کیا یہ سب کچھ محض طبیعی حادثہ ہے۔ بے شعور مادے کے از خود تغیرات ہیں۔ صرف طبیعیاتی فعلیت ہے یا اس میں کوئی گہرا علم، وسیع دانائی اور غیر معمولی اقتدار پنہاں ہے جس کو قرآن کہتا ہے: " ذالک تقدیر العزیز العلیم ٥ " چنانچہ کتنی ہی گہری کیسی ہی دقیق علمی نظر ڈالو اس خلق میں فرق نہیں پاؤ گے۔ بار بار تجربے کرو۔ نازک سے نازک آلات کی مدد لو لیکن اختلال اور نقصان کا سراغ نہیں لگا سکو گے اور آخر میں تمہاری خوردہ گیر نظر کو ناکام ہونا پڑے گا اور عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا ہوگا۔

زمین چاند اور سورج

یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کائنات کی آخری علت کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ اور کیا علم و حکمت سے تہی مایہ، اقتدار و اختیار سے بے بہرہ ہستی اس کارگاہ وجود کا نقشہ مکمل کر سکتی ہے؟ زمین، چاند اور سورج پر، جو حیات پر براہ راست موثر ہیں، نظر ڈالو۔ دیکھو اللہ "وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا۔ اور اس میں گڑھے (پہاڑ) بنائے اور دریا بہائے" اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے جوڑ (نر و مادہ) پیدا کیے" (۱۳-۱۳-۱) پھر اس میں ہر طرح کے چوپائے پھیلا دیئے" (۳۱-۳۱-۳) اب زمین کا یہ انداز کہ وہ ذی حیات کا مسکن ہے، نباتات کا لہلہاتا چمن اور فلک بوس پہاڑوں کی بیٹھک ہے، دریاؤں کا رستہ اور سمندروں کا فرش ہے نظر میں رکھ کر سورج اور چاند کی حیات آفرینی پر غور کرو اور سوچو کہ ان کی منظم اور منضبط حرکات کی کیا اہمیت ہے خصوصاً جبکہ خود "سورج اپنے ایک مستقر (اور مقام) کی طرف رواں ہے (۲۳-۳۶-۳) قرآن واضح کرتا ہے کہ" چاند کی منزلوں کا ہم نے اندازہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ پرانے خوشے کی صورت (باریک اور خمیدہ شکل میں) پلٹ آتا ہے۔ نہ سورج کو سزاوار ہے کہ وہ چاند کو آ لے اور نہ رات دن پر چھا سکے اور سب (اپنے اپنے) فلک (اور مدار) میں رواں رہتے ہیں" (۲۳-۳۶-۳) ان حرکات یا ان اجرام کے فاصلوں میں فرق پڑ جاتا تو کیا یہ ارضی مسکن باقی رہ سکتا تھا۔ اس کی حیات آفرینی، اس کی یہ سرسبزی اور یہ رونق باقی رہ سکتی تھی قرآن نے بار بار زور دیا ہے کہ "سورج اور چاند حسابی انداز سے کے ساتھ ہیں" (۲۷-۵۵-۱) زمین کی حیات آفرینی اس کی روئیدگی اور اس کی رونق میں سورج اور چاند کی حرکتوں، روشنیوں اور شعاعوں کو کتنا دخل ہے۔ زندگی سے عام ہم آہنگی میں ان اجرام کی خصوصیتوں اور ان کے مقررہ اعمال و افعال کو جو تعلق ہے اس کو محض طبیعیاتی اتفاق کہہ کر گذر جانے سے مسئلے کی اطمینان بخش توجیہ ہو جاتی ہے۔ یا سچ مچ یہ سب کسی جانے بوجھے منصوبے کی مقررہ کڑیاں ہیں اگر ہیں تو پھر اللہ "وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور کیا ہے اور اس کی منزلیں مقرر کی ہیں" (۱۱-۱-۱) یوں بھی تو ہو سکتا تھا کہ بالائی فضا روشنی کی روک بن جاتی، زمین کا فقط کوئی ایک ہی رخ سورج کے سامنے رہتا، وہ زیادہ حرارت جذب کرتی، سمندر تعدیل نہ کرتے، چاند مد و جزر نہ لاتا۔ چنانچہ یہ شب و روز کا تعاقب اور سورج اور چاند کی یہ خاص فعلیت غور کرنے کی چیزیں ہیں۔ کیا دیکھا نہیں کہ اللہ رات کا دن میں دخل کر دیتا ہے۔ اور دن کا رات میں دخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو اس نے مسخر کر دیا ہے" (۲۱-۳۱-۳) دوسری جگہ ارشاد ہے "اور وہ وہی ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب اپنے (اپنے) فلک (مدار) میں تیرتے رہتے ہیں" (۱۷-۲۱-۳) ایک جگہ کہا گیا ہے: "روز و شب کے اختلاف (اور تعاقب) اور آسمانوں اور زمین میں جو پیدا کیا ہے، ایسی قوم کے لیے جو ڈرتی ہے، نشانیاں ہیں" (۱۱-۱۰-۴)

انسانی حیات اور اس کی نشو و نما کے وسائل

زمین و آسمان کو ایک دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھو کہ یہ، ان کی مختلف فعلیتیں اور ان سے وابستہ دوسرے گوناگوں مظاہر اتفاقی حادثے اور بے مقصد طبیعی آثار ہیں یا کسی اہم اور برتر مخلوق کی زندگی اور اس کی نشو و نما کی صلاحیت کا بھی کسی نہ کسی درجے میں لحاظ ہے۔ "اور ہم نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اس میں ہے کھیل بنا کر (اور بے مقصد) نہیں پیدا کیا ہے" (۱۷-۲۱-۲) کا بھی عملی ثبوت ہے۔ زمین کو ایسی وضع دی گئی کہ وہ خاص قسم کے ذی حیات خصوصاً انسان کا مسکن ہونے کی بھرپور استعداد رکھتی ہے: "وہ تو وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش کی حیثیت دی" (۱-۲-۴) پھر اس میں زندوں اور مردوں سب کی گنجائش رکھی: "کیا ہم نے زمین کو زندہ اور مردہ سب کے لئے جامع نہیں بنایا ہے" (۲۹-۷۷-۱) اس کے کوئی سلسلوں کو در بند نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ آمد و رفت کو جاری رکھنے اور باہم تعلقات کو قائم کرنے اور آپس کے میل جول کو جاری رکھنے اور

باہم تعلقات کو قائم کرنے اور آپس کے میل جول کو جاری رکھنے کے لئے ان میں درّے اور رستے کھلے رکھے۔" اور ہم نے ان میں درّے بنا دیئے ہیں رستے کے انداز پر کہ وہ راہ پا سکیں" (۱۷-۲۲-۳) اس کے سمندروں کو قابل عبور بنایا اور جہاز رانی اور کشتی بانی کی سہولتوں سے انسانوں کو نوازا "کیا دیکھا نہیں کہ سمندر میں کشتیاں اللہ کی نعمت (و کرم) سے چلتی ہیں" (۲۱-۳۱-۴) پھر بری اور بحری سفروں کو سہل بنانے کے لیے ستاروں کے طلوع و غروب اور ان کی حرکتوں کو ایسا انداز دیا کہ لق و دق بیابانوں میں حدود نظر سے زیادہ وسیع سمندروں اور سمتوں کی دریافت کا ذریعہ بن گئے "اور وہ تو وہ ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا کہ تم بر و بحر کی تاریکیوں میں رستہ پا سکو" (۷-۶-۱۲) ساتھ ساتھ "آسمان کو محفوظ چھت بنا دیا ہے" (۱۷-۲۱-۳) تاکہ بالائی اجرام کی ہلاکت باریوں سے یہ کرۂ ارض محفوظ ہے اور جہاں تک مفید اثرات کا تعلق ہے وہ برابر پہنچتے رہیں۔ موسموں کے ایر پھیر سے حیات آفرینی اور اس کی مناسب نشو و نما کا انتظام ہو۔ حیات ارضی کی بقا کے لیے اس کی ضرورتوں کے پورا ہوتے رہنے کا سامان کیا۔ غذاؤں کا بندوبست کیا، وسائل معیشت مہیا کیے اور ایسی کروڑوں مخلوق کی بقا کے سامان فراہم کیے جو انسانی حیات کے لئے ضروری ہونے کے باوجود ان کا تغذیہ انسانی دسترس سے باہر ہے" اور ہم نے اس میں اگائیں ہر طرح کی موزونات (غلوں کی قسم سے) اور ہم نے اس میں تمہارے معیشتوں (کے وسائل) کو پیدا کیا اور ان کے لیے (بھی) جن کو تم رزق نہیں دیا کرتے۔ اور کوئی ایسی شے نہیں مگر ہمارے پاس تو اس کے خزانے ہیں اور ہم انہیں اتارتے نہیں ہیں مگر ایک معین (اور مناسب) انداز سے" (۱۴-۱۵-۲) خشک اور ایک طرح سے مردہ دانوں اور تخموں میں تولید مثل کی قابلیت پیدا کر کے زرعی اور باغبانی نظام کی طرح ڈالی "یہی تو ہے کہ اللہ چیرنے والا ہے دانے اور گٹھلی کا کہ زندہ کو مردے سے نکالنے والا اور مردے کو زندہ سے" (۷-۶-۱۲) زمین کے تمام قطعوں کو یکساں نہیں بنایا بلکہ سب میں کچھ کچھ فرق رکھے گئے اس طرح ان کی صلاحیتیں الگ الگ ہو گئیں۔ کچھ زراعت اور اس کی مختلف اصناف کے لئے مخصوص ہیں تو کچھ میں باغوں کو نشو و نما دینے کی استعداد ہے کچھ سبزہ زار بننے کی اچھی قابلیت رکھتے ہیں اور اس طرح انسانی حیات اور اس کے لوازم و مناسبات کے لئے زیادہ بہتر وسیلے کا کام دیتی ہے "اور زمین میں ملے جلے قطعے ہیں انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں اور نخلستان ہیں" (۱۳-۱۳-۱) پھر درختوں، پودوں اور کھیتوں کی سیرابی کے لیے بارش کا انتظام "کیا دیکھا نہیں کہ اللہ چلاتا ہے ابر کو پھر اس کو جوڑتا ہے پھر تہ بہ تہ کر دیتا ہے تو تو دیکھتا ہے کہ بارش اس سے نکلنے لگتی ہے" (۱۸-۲۴-۶) پھر اس وقتی آب رسانی کے ساتھ ساتھ سیرابی کے لئے مستقل انتظام کیا۔ پانی کو محفوظ کر کے چشموں اور دریاؤں کی صورت میں اس کا ذخیرہ رکھنا اور تقسیم کرنا ایک جانے بوجھے نظام کا پتہ نہیں دیتے "کیا دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان (اوراوپر) سے پانی اتارا پھر زمین میں چشموں کی صورت اس کو رواں کیا اب اس سے اقسام کی کھیتیاں ابھر آتی ہیں" (۲۳-۹-۳۹-۲) نقل و حمل کو سہل بنانے میں، غذائی ضرورتوں میں کام آنے میں، پیداوار کو بڑھانے میں ڈھور ڈنگروں کا اہم حصہ ہے (۲۳-۶-۳-۵) چنانچہ اس زاویہ نظر سے ان کی خلق انسانی نظام حیات کا ہی ایک جزء ہے اور قرآنی تصریح کے مطابق سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے نشانی ہے (۲-۲-۲۰)

غرض یہ کہ کرۂ ارض کا اپنی صلابیت، اپنے تحفظ، اپنے موسموں اور آب و ہوا اور دوسرے مظاہر کے اعتبار سے پھر اپنی پیداوار اور ذخائر کے اعتبار سے زندگی سے خصوصاً انسانی زندگی سے موافق ہونا لاریب طبیعی اسباب کا مرہون ہے لیکن ان کثیر طبیعی اسباب کا اور گوناگوں علتوں کا یکجا اور ایک وقت فراہم ہو جانا اور وہ بھی پوری ہم آہنگی کے ساتھ محض اتفاقی حادثے سے جس کے پیچھے کوئی شعور اور ارادہ نہیں ایک کھوکھلا عقلی امکان ہے اور بس۔

انسان کی پیدائش اور اس کے آلاتِ حس

کرۂ ارض کی سب سے برتر، بہتر اور سلسلۂ ارتقا کی سب سے پیچیدہ اور آخری کڑی انسان ہے اس کا غیر معمولی تعادل اور توازن، اس کے آلات حس و ادراک کی بے مثال پیچیدگی اور نزاکت اور مخالف ظروف سے ساز کر لینے کی اہلیت غرض یہ کہ اپنی مجموعی حیثیت میں یہ حیاتیاتی ارتقا کا شاہکار دعوت فکر ہے ان سب کے لیے جو کائنات کو محض اتفاقی حادثہ سمجھتے اور تنہا طبیعی قوتوں کا وقتی تعامل تسلیم کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ پہلے صرف ایک طبیعی مظہر کی حیثیت میں قدرت کی اس نادرہ کاری پر نظر ڈالیں ابتدا سے آخر تک اس کے شئون اور تطورات

کو دیکھیں، اس کے مدارجِ خلق اور مراحلِ حیات پر غور کریں" اور (خود) تمہاری آفرینش میں .... نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین (کی دولت) رکھتے ہیں"۔ (۲۵-۴۵-۱) اس باحیات اور حیات آفریں، اس باشعور اور شعور زا" انسان کی آفرینش کی ابتدا (بے جان اور بے شعور مادّے یا) گارے سے کی ہے۔ پھر اس کی نسل کو حقیر پانی (یا مردانہ رطوبت) میں کے خلاصے[1] (یا تخم) سے بنایا پھر اس کو برابر (اور درست) کیا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا"۔ (۲۱-۳۳-۱) یہ انسانی ہمواری اور نشو یہ یک بارگی اور دفعتاً نہیں ہوا بلکہ متعدد مستقل صورتوں کے درجہ بدرجہ ارتقائے انسان نے یہ مناسب اور متوازن صورت اختیار کی ہے پھر یہ ارتقا کھلی اور روشن فضا میں نہیں ہوا ہے بلکہ شکم مادر کی اندھیری کوٹھری میں رحم مادر کی بند تھیلی کے اندر، پہلے بیضہ مادری کی جھلی میں اور پھر دیوار رحم کے بند سوراخ میں اور آخر میں مشیمے اور جر ثومی جھلی کی اندھیاری[2] میں۔ ساتھ ساتھ نشو و نما کے ہر مرحلے اور ہر ظرف و مقام کے مناسب خلق کے انداز بدلے"۔ "تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے تین تاریکیوں میں، یکے بعد دیگرے (انداز) آفرینش سے"۔ (۲۳-۲۹-۱) چنانچہ نطفے[3] (یا باردار بیضۂ مادری) کے اندر کے ضروری تغیروں کی تکمیل کے اثنا میں یہ جنینی مادّہ بہتا ہوا اور آخر میں اس بیضوی جھلی کو توڑتا ہوا دیوار رحم کی جھلی کو کاٹ کر تدریجاً اس سے متعلق اور اس میں جم جاتا ہے اب علقے[4] یا جنین (Embryo) کی صورت میں مناسب نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ارتقا کے ایک خاص اور اہم مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور پہلے غیر متمیز اور انسانی مضغے یا جسد اور پیکر (Foetus) کی شکل لے لیتا ہے۔ اول اول خاص خاص اعضا کی علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوتی ہیں یہاں تک کہ درجہ بدرجہ تمام اعضا صورت پذیر ہو جاتے ہیں[5]۔ اور یہ انسانی پیکر بچہ اور طفل ہو کر سات قمری مہینوں میں ہی یا پھر مزید قوت و کمال حاصل کر کے کم و بیش دس قمری مہینوں میں انسانی برادری کے اضافے کا باعث ہو جاتا ہے۔" ہم نے تو تمہیں مٹی (اور بے جان مادّے) سے پیدا کیا تھا۔ پھر نطفے سے پھر علقے سے پھر تام اور ناتمام لوتھڑے سے تاکہ (ان عجیب و غریب مراحل آفرینش سے) تمہارے لیے (اپنے آپ کو) واضح کر دیں اور ہم تمہیں ارحام (مادر) میں جب تک چاہتے ہیں (تاہم) معین مدت کے لیے رکھتے ہیں۔ پھر بچے کی حیثیت میں تمہیں نکالتے ہیں پھر بچے کی حیثیت میں تمہیں نکالتے ہیں پھر (یہ نشو و نما جاری رہتی ہے) کہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ[6] (۲۲-۱۷-۱) اب کی موجودہ شکل و صورت پر

---

[1] لسان العرب میں ہے:- السل انتزاع الشیٔ و اخراجه فی رفق ...... سلالة الشیٔ ما استل منه" من سلالة من ماءٍ میں دوسری "منْ" غالباً ابتدا کے لیے ہے۔ واللہ اعلم

[2] تقریباً دس گیارہ دن میں مادّہ تولید یا نطفہ بیضہ مادری کی جھلی میں بند بہتا ہوا دیوار رحم تک پہنچ جاتا ہے اور جھلی توڑ کر دیوار رحم میں تدریجاً سرایت کر کے علقہ کی صورت میں استقرار پا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مشیمے (Chorion) کے اندر جر ثومی جھلی (Amnion) پھیل کر جنین کو لپیٹ لیتی ہے۔ اس طرح شکم مادر کے اندر رحم، مشیمہ اور جر ثومی جھلی کی تین تاریکیوں میں جنین جسدی انداز (پہلے غیر مخلقہ یا ناتمام مضغے اور پھر تمام اور مخلقہ مضغے کی شکل میں) اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

[3] لسان العرب میں ہے:- النطف الصب ...... ونطفان الماء سیلانه۔ گویا باردار بیضے پر نطفے کا اطلاق اس کی اس بہاؤ اور سیلان کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔

[4] علق بالشیٔ علقا و علقة: نشب فیه و علق الشیٔ علقا و علق به علاقة و علوقا لزمه

لسان العرب کی اس تصریح کے بموجب علقے میں تعلق، سرایت کرنے اور استقرار پا جانے کا مفہوم شامل ہے۔

[5] اذا صارت العلقة التی خلق منها الانسان لحمة فهی مضغة (لسان العرب)

[6] یوں پہلے مضغۂ غیر مخلقہ اور پھر مخلقہ ناتمام اور تام لوتھڑے کی شکلیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ مخلقہ کو مقدم کرنے میں اس کی مثبت حیثیت کا لحاظ کیا گیا ہے تاکہ منفی غیر مخلقہ کا مفہوم واضح ہو جائے۔ ترتیب کو سامع کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

[7] ایک دوسرے موقعے پر مضغے یا جسد اور پیکر (Foetus) کے دوسرے اندرونی تغیرات کو بیان کیا ہے کہ مضغے میں پہلے (اگلے صفحہ پر)

نظر ڈالو۔ دوسری ذی حیات مخلوق سے مقابلہ کرو تو تم اس کو قدرت کی صناعی کا آخری نمونہ پاؤ گے اور اس واضح سچائی کو ماننے پر مجبور ہو جاؤ گے "تمہیں صورت عطا کی تو بہتر صورتیں بنائیں۔" (۴۲-۴۰-۷) اس کے تعادل اور توازن کو دیکھو، اس کے عواطف و میلانات کا جائزہ لو، اس کے ادراکات وحسیات پر نظر ڈالو تو اس کو اس کی ساخت اور ترکیب کے اعتبار سے کرۂ ارضی کی سب سے برتر مخلوق پاؤ گے اور باور کر لو گے کہ "یہی تو ہے کہ ہم نے انسان کو (ساخت اور) تقویم کے اعتبار سے بہترین بنایا ہے۔" (۳۰-۹۵-۱)

انسان یوں تو اپنی مجموعی حیثیت میں ارتقا کا آخری نشان ہے ہی تاہم جن لوگوں نے جدید انکشافات کو سامنے رکھ کر انسانی سماعت بصارت اور دماغی قوتوں پر غور کیا ہے، ان کی پیچیدہ، نازک صنعت اور ان کے عجیب و غریب اعمال اور خارجی آثار کے وصول، امتیاز اور پھر ان کی تقسیم اور درجہ بندی پھر ان کے ایصال اور تاثیر پر غور کیا ہے، ان کو فطرت کا غیر معمولی کمال اور قدرت کا نادر عمل قرار دیا ہے قرآن نے بھی خاص طور سے ان آلات کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا ہے "اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور افئدہ (دیا دل، دماغ) بنائے۔" (۲۱-۱۰-۴) عام مشینی آلات یا خالص طبیعیاتی آثار کی طرح یہ آلات ابتدا سے ہی مکمل نہ تھے بلکہ ایک متواتر تدریج ہے خامی سے پختگی کی طرف، ایک مسلسل ارتقا ہے ضعف سے قوت کی طرف "اور اللہ نے تمہیں شکم مادر سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل (یا دماغ) بنائے (۱۴-۶-۱۱)

انسان کے اس کمال کی بلندی پر پہنچنے میں اس کے معلومات، محسوسات، جذبات اور عواطف کے نہایت صحیح طور پر منتقل ہونے کو بہت بڑا دخل ہے جس کا سب سے کامل اور بڑا ذریعہ قوت بیانیہ ہے۔ اگر آدمی اپنے معلومات دوسروں تک ٹھیک ٹھیک نہ پہنچا سکتا ہوتا۔ اپنے محسوسات سے دوسروں کو باخبر نہ کر سکتا ہوتا، اپنی خواہشیں دوسروں پر نہ پیش کر سکتا ہوتا تو کیا انسانی معاشرہ ایسا ہی ہوتا جیسا اب ہے، اظہار مافی الضمیر کی یہ انسانی قوت اس کی عجیب و غریب ساخت کا قابل لحاظ حصہ ہے چنانچہ قرآن نے اس کی اس قوت کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے "اس نے پیدا کیا انسان کو اور اس کو (اپنے مافی الضمیر کو) واضح کر دینا سکھایا" (۲۷-۵۵-۱) چنانچہ بحیثیت مجموعی انسان کے اس عجیب و غریب ظہور کو، اس کے ان غیر معمولی تطورات کو، اس کے ان پیچیدہ آلات حس و ادراک و اظہار کو اس پیکر حسن و جمال کے تعادل اور توازن کو، اس کی نادرہ کار صلاحیتوں، اس کی بے مثال فعلیتوں کو محض بے شعور طبیعی عوامل کی تاثیر کا اتفاقی کارنامہ کہنا آسان ہے یا ایک باشعور، بااقتدار اور بامقصد خلق کا ساختہ کار قرار دینا۔

انسانی ارتقا اور معاشرتی ارتفاع کے وسائل

انسانی حسن و صورت اور حسن ساخت پر ہی اکتفا نہیں کر لیا بلکہ اس میں جو عقلی اور عملی قوتیں ودیعت ہیں ان سے کام لینے کے لیے ایک میدان بھی مہیا کیا گیا ہے اور اس طرح نیابت الٰہی کا مستحق ثابت کرنے کے لئے اس کو ایک کھلی فضا فراہم کر دی گئی اس کو عمل اور تجربے کی کامل آزادی ہے۔ ان گھڑ اور خام مواد کی بھرپور فراوانی ہے۔ ساری کائنات اس کا معمل اور تجربہ گاہ ہے۔ "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے وہ سب مسخر کر دیا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتوں کی تم پر تکمیل کر دی ہے۔" (۳۱-۲۱-۳) زمین کی ہر شے اس کے عمل اور تجربے کے لئے آلہ اور وسیلہ ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس سے کام لے اور کائنات کی رہی سہی ناآہنگیوں میں آہنگ پیدا کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کی شہادت بہم پہنچائے۔ "اور وہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے ان سب کو پیدا کر دیا ہے جو زمین میں ہے۔" (۱-۲-۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) استخوانی ڈھانچہ متمیز اور ظاہر ہونے لگتا ہے اور اس تمیز اور ظہور کے بالکل عقب ہی اس ڈھانچ پر گوشت کا چڑھاؤ اور لپیٹ نمایاں ہونی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہڈیاں ڈھک جاتی ہیں" اور ہم نے تو انسان کو پیدا کیا ہے (مادے یا) گارے کے جوہر سے، تو پھر اس کو قائم اور جمے ہوئے) ٹھکانے میں نطفہ بنا دیا پھر نطفے کو علقہ بنایا اب علقے کو مضغہ دیا پیکر بنایا اب مضغے کو ہڈیاں کیا اب ہڈیوں پر گوشت پہنایا پھر اسکو دبا کل، دوسرا (اور نئی انداز) پیدائش دیدی تو برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر خالق (۱۸-۲۳-۱)

انسان کی اس فطری ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے جس مضبوط اجتماع اور محکم تعاون کی ضرورت ہے اس کو بروئے کار لانے کے لیے جو جذباتی کشش لابد ہے انسان کو اس کا بھی وافر حصہ دیا گیا ہے " اور تمہارے آپس میں محبت اور شفقت پیدا کی " (۲۱-۳۰-۳) ساتھ ساتھ اس کی انفرادی راحت وآرام اور گھریلو سکون و دلجمعیت کے جو سامان تھے ان کو بھی پوری فراخی سے مہیا کیا۔" اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی میں سے جوڑ پیدا کیے کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو" (۲۱-۳۰-۳) " اور ہم نے تمہیں جوڑے پیدا کیا، تمہاری نیند کو راحت بنایا اور رات کو ستر بنایا اور دن کو گذر بسر کے لیے بنایا؟ (۳۰-۸-۱) " کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی میں سے ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے۔ اب وہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے ان کو ان کا مطیع کر دیا ہے۔ ان سے ان کی سواریاں ہیں اور ان سے کھانے (بھی) ہیں اور ان کے لیے ان میں منفعتیں ہیں اور (دودھ) پینے کے موقعے ہیں " (۳۶-۲۳-۵) غرض یہ کہ ہر طرح سے انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے جو قدرتی ذرائع اور مادی وسائل مناسب اور ضروری تھے وہ سب موجود ہیں۔

چنانچہ یہ انسانی صلاحیتیں اور تعلیلیں پھر ماحول کی ان کے ساتھ یہ قدرتی سازگاری کیا مقصدیت کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں؟ کیا محض بخت و اتفاق انسانی تکوین کی مکمل توجیہ ہے؟ کیا حادثے مقصدیت کی تعلیل کے لیے کافی ثابت ہو سکتے ہیں؟ پھر ان توجیہوں سے عقل سلیم بھی طمانیت اور تسکین حاصل کر لیتی ہے؟

کائنات کی علت کا حیات و شعور اور انکے لوازم و مناسبات سے موصوف ہونا

کائنات کے حقیقی ہونے، کامل اور منظم و منضبط کے اعتبار سے محکم ہونے سے، اس کے مظاہر کی طبیعیاتی تاریخ اور ان کے مواد، ان کی اوضاع اور ان کی حرکات کی ٹھیک ٹھیک مقررہ تقدیروں، اندازوں اور ان کے آہنگ سے اور ان سب کے ایک خاص رخ کی طرف جھکاؤ سے پھر خصوصیت سے انسان کی طبیعی تاریخ اور اس کے ترقی یافتہ آلات حس و ادراک سے، اس کے لئے وسائل حیات کی حیات کی فراہمی سے، اس کی صلاحیتوں اور ان صلاحیتوں کے لیے میدان عمل کی بہم رسانی سے اور دوسری قدرتی سہولتوں سے قرآن نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ کائنات کے سبب اور علت کا نہ صرف یہ کہ خالق، باری، مصور ہونا کافی ہے بلکہ اس کو حی اور زندہ حقیقت کے تمام اعلیٰ اوصاف مرید، علیم، خبیر، سمیع، بصیر، حکیم اور مدبر سے موصوف ہونا چاہیے۔ کائنات کا ایک خاص رخ کی طرف جھکاؤ اس کے بغیر قابل فہم نہیں کہ اس کا خالق اس کا رخ متعین کرنے والا اور ہادی ہے۔ انسان کے ساتھ کائنات کا یہ تدریجی آہنگ اور ساز کیسے ہو سکتا ہے اگر قوی نظریہ یہ قاہر اور قہار ذات کا رویہ رحیم، رؤف بلکہ ودود کا سا نہ ہو۔

کیا انسانی شرف و مجد، اس کے میدان عمل کی وسعت، اس کے اقتدار کے پھیلاؤ کا یہ تقاضا نہیں کہ کائنات کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر شے کی طرف اس کا زاویہ نظر بجائے انفعالی ہونے کے فعلی ہو، اور حیرت سے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بدلے ان سے کام لینے کی کوشش کرے طبیعی قوتوں کو اپنا خادم سمجھے اور تنہا اسی ذات کو جو قدیر اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے، اپنا مولیٰ، رب، ولی، نصیر اور رزاق محسوس کرے۔ اس کی نیابتی صلاحیتوں کو ابھارنے اور خلافتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جس استغنا، بے باکی، آزادی، اعتماد نفس، تحمل، تنافس اور مساوات وغیرہ اوصاف کی ضرورت ہے اُن کو پیدا کرنے میں اس کا یہ احساس ممد و معاون ثابت ہوگا۔

اس مسبب الاسباب اور علۃ العلل کا قدوس ہونا، سلام ہونا، کریم ہونا، حسیب اور مالک یوم الدین ہونا غفور و تواب ہونا پھر ان صفات کمالیہ کے اتصاف کے لوازم مثلاً حمید و مجید ہونا، رشید ہونا نفسیاتی طور پر خود بندے کو جس کا کام اپنے آقا کے اسمار حسنیٰ سے متاثر ہونا اور آپ میں ان کو منعکس کرنے کی کوشش کرنا ہے کتنا بلند اور برتر بنا دیتا ہے۔

اگر قرآن مجید کی ان واضح تنبیہوں کو، عقل سلیم کے کھلے تقاضوں کو، فطرت انسانی کے مسلسل اور متواتر باطنی احساسات کو پھر انسان کی اخلاقی معاشرتی اور سیاسی ارتقار میں اللہ کے برتر اور معیاری تصور کی افادیت کو نظر انداز کر دیا جائے اور عقل نظری کے بے سر و پا احتمالات اور مابعد الطبیعیاتی کھوکھلے امکانات کو اہمیت دی جائے تو پھر باور کرنا پڑے گا کہ بے شعوری نے شعور کا روپ دھارن کیا ہے، بے مقصدی نے مقصد کو جنم دیا ہے
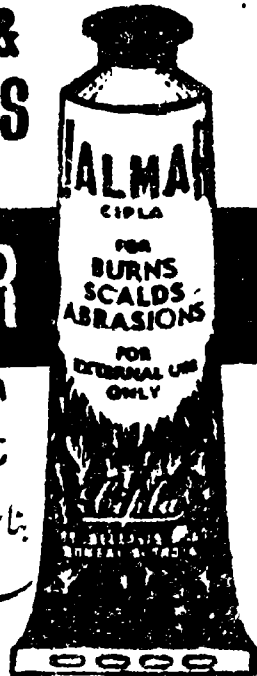
بے ترتیبی نے نظم پیدا کیا ہے، حادثہ منصوبہ بندی ہوتا جا رہا ہے سادگی
پیچیدگی بنتی جا رہی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ بے کراں کائنات کے ان گنت
ظاہر کے طبیعیاتی اور کیمیائی خصوصیات حادثہ ہیں بے سبب اتفاقات
یا بے علت۔ کیونکہ ان نامشاہد استنباطات اور غیر تجربی قیاسات کے
پیچھے اگر مشاہدہ ہے تو صرف مادے کے تصور کا، اگر تجربہ ہے تو
محض اس کی تبدیلیوں کا اور علم ہے تو بس اس کی خصوصیات کا، اس
کے مقابلے میں اگر ازلی ابدی باشعور اقتدار اعلیٰ کا قیاس زیادہ غیر
عقلی ہے تو پھر کسی بندر کو ٹائپ کی مشین پر انگلی مارتے دیکھ کر یہ باور
کر لیتا کہ اس مشین پر ٹائپ کیا ہوا (غالب کا) قصیدہ اسی بندر کی
انگلیوں کی اتفاقی تصنیف دکتابت ہے، زیادہ قرین قیاس ہے
بہ نسبت یقین کے کہ کوئی شخص اس قصیدہ کو ٹائپ کر کے مشین پر چھوڑ گیا ہے۔

بقیہ حسرت موہانی

یاد آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا کنستر لیا اور کانگریس کے نقارخانے میں جا کر
بجانا شروع کر دیا۔ چندے یہ حالت رہی کہ گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کی منبد
ماسٹری سے انحراف کا وہم و گمان بھی نہ گزرتا تھا۔ مگر آخر کار یہ معلوم ہوا کہ
یہ لوگ بھی اپنی آوازوں میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

اتنا معلوم ہوتا تھا کہ فیروز شاہ اور گوکھلے بھی دشمنان ملک نظر
آنے لگے۔ پال اور تلک " نیتان آزادی کے شیروں " کی چنگھاڑنے
دل اور دماغ پر کشش کی یہانتک کر گنگا جمنا سے گزر کر وادی نیل بھی
حکومت برطانیہ کو برا کہہ اٹھی۔ تعزیرات ہند نے ان کو بھی نہیں پہنچا دیا
جہاں نیتان آزادی کے شیر کو؟

کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس ذہین اور طباع۔ نیک دل
اور وطن پرست شخص کی موجودہ مصیبت پر افسوس نہ کرتے ہوں
جب تک آزاد تھا پورے طور سے آزاد تھا۔ اب قید میں ہے مگر اس کا
دل اور دماغ اور روح ویسی ہی آزاد ہے ڈھائی برس کی قید شدید
سے ڈیڑھ برس کی قید سخت رہ گئی ہے۔ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن
خدا چاہے تو یہ مصیبت بھی اس پر آسان کر سکتا ہے۔

زمانہ دسمبر ۱۹۰۸ء

بے نظمی نے نظم پیدا کیا ہے، حادثہ منصوبہ بندی ہوتا جا رہا ہے، سادگی پیچیدگی بنتی جا رہی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ بے کراں کائنات کے ان گنت مظاہر کے طبیعیاتی اور کیمیائی خصوصیات حادثہ ہیں بے سبب اتفاقات ہیں بے علت۔ کیونکہ ان تامشاہد استنباطات اور غیر تجربی قیاسات کے پیچھے اگر مشاہدہ ہے تو صرف مادے کے تصور کا، اگر تجربہ ہے تو محض اس کی تبدیلیوں کا اور علم ہے تو بس اس کی خصوصیات کا، اس کے مقابلے میں اگر ازلی ابدی باشعور اقتدار اعلیٰ کا قیاس زیادہ غیر عقلی ہے تو پھر کسی بندر کو ٹائپ کی مشین پر انگلی مارتے دیکھ کر یہ باور کر لیتا کہ اس مشین پر ٹائپ کیا ہوا (غالب کا) قصیدہ اسی بندر کی انگلیوں کی اتفاقی تصنیف و کتابت ہے، زیادہ قرین قیاس ہے اس یقین سے کہ کوئی شخص اس قصیدہ کو ٹائپ کر کے مشین پر چھوڑ گیا ہے۔

بقیہ حسرت موہانی

یاد آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا کنستر لیا اور کانگریس کے نقارخانے میں جا کر بجانا شروع کر دیا۔ چندے یہ حالت رہی کہ گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کی منبہ ماسٹری سے انحرافات کا وہم و گمان بھی نہ گزرتا تھا۔ مگر آخرکار یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اپنی آوازوں میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

اتنا معلوم ہوتا تھا کہ فیروز شاہ اور گوکھلے بھی دشمنان ملک نظر آنے لگے۔ پال اور تلک "نیتان آزادی کے شیروں" کی چنگھاڑ نے دل اور دماغ پر کشش کی یہانتک کہ گنگا جمنا سے گزر کر وادی نیل بھی، حکومت برطانیہ کو برا کہہ اٹھی۔ تعزیرات ہند نے ان کو بھی وہیں پہنچا دیا جہاں نیتان آزادی کے شیر کو؟

کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس ذہن اور طباع۔ نیک دل اور وطن پرست شخص کی موجودہ مصیبت پر افسوس نہ کرتے ہوں جب تک آزاد تھا پورے طور سے آزاد تھا۔ اب قید میں ہے مگر اس کا دل اور دماغ اور روح ویسی ہی آزاد ہے ڈھائی برس کی قید شدید سے ڈیڑھ برس کی قید سخت رہ گئی ہے۔ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن خدا چاہے تو یہ مصیبت بھی اس پر آسان کر سکتا ہے۔

زمانہ دسمبر ۱۹۰۸ء

حسرت موہانی

ایک قدردان کی نظر سے

خانی خاں

انیسویں صدی کے آخری برس اور اس سے ایک سال پیشتر جو لوگ علیگڑھ میں تھے اُن کو یاد ہوگا کہ ان ایام کے نوواردوں میں سے کوئی شخص بلحاظ شکل وشباہت وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دلچسپ نہ تھا جس قدر نواح لکھنؤ کا ایک طالب علم جسے محبت اور مذاق نے "خالہ اماں" نام دیا تھا۔

چھوٹا قد، لاغر بدن۔ گندمی رنگ چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا خیال کرتے ہوئے ڈاڑھی کسی قدر نیچی فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ دنیا نہ کو ناگوار نہ ہونے دیتی تھی۔ اس پر کلابتونی ٹوپی۔ پرانی وضع کے چار رخانے کا انگرکھا، مشرو کا تنگ پاجامہ جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے۔ عینک اور پٹی کا اضافہ کیجئے تو خالہ اماں یا دوسرے لفظوں میں۔ فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت چشم تصور کے سامنے پھرنے لگے گی۔ عموماً تیز چلتے تھے مگر جس طرح صاحب بصر حدیہ کے والد مرحوم آہستہ خرام تھے مگر ضرورت کے وقت تیز بھی چل سکتے تھے۔ اسی طرح فضل الحسن آہستہ بھی چل سکتے تھے اور نوع حیوانات کی اس عام صفت سے محروم نہ تھے۔

علی گڑھ کالج میں اپنی ہستی کا منشا پورا کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ہمیشہ چند تیز فہم حقیقت شناس ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کسی کیریکٹر کو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو ایک لفظ یا ایک نام سے ظاہر کرسکتے ہیں اس طرح کہ وہ نام موت تک اس صیدِ بے گناہ کے گلے کا پھندہ ہوجائے۔ بہت سے شہور اور معزز لوگ ہیں کہ بدون 'بوم' یا 'خنزیر' ان کے ناموں پر اضافہ کیے ہوئے ان کے عزیز ترین دوست کبھی صاحب نام کو پہچان نہیں سکتے۔ غرض اس قسم کے ناموں میں کہ جن کی نسبت ا لاسمائے منزل من السماء، صادق آتا ہے ایک نام خالہ اماں بھی تھا۔ ہمارے دوست کی ہیئت ظاہر تو اس نام کی مستحق تھی ہی مگر جس چیز نے اس نام کو برخلاف دوسرے ناموں کے محض ظرافت و مذاق ہی کا ذریعہ نہیں بنا دیا تھا بلکہ اس سے ایک لطیف ہمدردی اور بے تکلفی کا اظہار بھی متصور ہوتا تھا، وہ فضل الحسن کی مرنجان مرنج طبیعت۔ خندہ روی۔ عالم دوستی اور حسن پرستی تھی۔

ان اوصاف کے ساتھ ہی فضل الحسن ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ ایسا کہ پُرانی وضع کے مسلمان اس کے کسی قول و فعل پر گرفت نہ کرسکتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی اس کی زندگی کا جزو ضروری تھا مگر برخلاف عوام کے اس لیے اس کی شیرینیٔ طبع میں فتور نہیں آنے پایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم ہے اور نماز کا وقت بن بلائے مہمان کی طرح آپہنچا، فضل الحسن مسکراتے ہوئے اٹھے۔ معذرت بھی کرتے جاتے ہیں اور وضو بھی۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہوکر پھر آبیٹھے۔ مگر ایسی حالتوں میں نماز بہت جلد جلد پڑھتے تھے، بلکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کلام مجید کی سورتوں کے بجائے ان کے اعداد بحساب ابجد پڑھ لیا کرتے تھے۔ بزرگان دین کے مزاروں کی ان کو ایسی ہی جستجو رہتی تھی جیسی ازیادرفتہ اساتذۂ قدیم کے دیوانوں کی۔ دہلی اور آگرہ میں کم مزار ہوں گے جن کی جالیوں میں فضل الحسن نے چلّے نہ باندھے ہوں۔

... نتیجہ سمجھو یا ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ خالہ اماں نے عدم کی راہ لی اور اس کے بجائے "...
... پہ ستمبر ... جاری ہوا۔ کہ ... تاریخ انتساب ... میں یہ السا واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں۔

مگر یہ سب اوصاف ایسے تھے کہ فضل الحسن کے لیے حصول عزت و محبت کا باعث ہوسکتے تھے، مگر حصول شہرت؟ اس کے لئے فطرت نے کو بہت کچھ عطا ہوا تھا۔ وہ مالک کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالف

انگریزی میں اور ان میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ قطعاً انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے۔ یہ کسی صحیفۂ فرنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا یا لکھنا نہ آیا۔ حقیقت میں ان کا میلان طبع اردو اور فارسی کی طرف تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو بیگانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہو کر انھوں نے بی اے میں ریاضی پڑھی مگر یہ واقعہ ہے، گو اس کا سننا نفاست پسند طبیعتوں کو ناگوار گذرے کہ اس مولوی اور مسلمان کش مضمون کو انھوں نے صحت زمانے سے باہر کبھی برضا و رغبت نہیں پڑھا۔ اس پر بھی وہ امتحان میں ناکام نہیں رہے۔

غرض اردو فارسی اور خاص کر ادب اردو سے اس شخص کو عشق تھا۔ جس زمانے میں عام طالب علم دار الاقامت اور بیت الطعام کے مناسب پارٹی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں رہتے ہیں اس زمانے میں شغل اساتذہ قدیم کے دیوان جمع کرتے اور ان کی خشک ہڈیوں پر "قم باذنی" پڑھنے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ کئی مشہور اور بہت سے بھولے ہوئے شعرائے اردو کے کلام کا اتنا بڑا مجموعہ اس قدامت پرست نے جمع کر لیا کہ شاید پرانے کتب خانوں کے سوا کہیں نہ ہو۔

اسی زمانے میں سید سجاد حیدر کی جدت پسند طبیعت نے انجمن اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی انسانی زندگی میں فقط یہ ایک مجلس تھی جس میں علم دوست طبیعتیں عام ہوا و ہوس کی خراب اوقات کشاکش سے پناہ لیتی تھیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ۔ شاید اتوار کی شب کو۔ ایک مقام مقررہ فرش فروش سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اراکین مجلس اور دوسرے مشتاقان سخن خوش وضع انگرکھے۔ اچکنیں اور شیروانیاں۔ دو پلی ٹوپیاں سروں پر دیئے ہوئے قرینے سے بیٹھ جاتے۔ شمع ایک ایک کے سامنے آتی اور وہ نظم و نثر تازہ کے پھول نذر کرتا۔ داد تحسین اور آداب و تسلیمات کا انداز فنون لطیفہ کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ ایسی انجمن کی ترقی کے لئے مولانا سے بہتر رکن کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اردوئے معلیٰ اور مولانا ایسے لازم ملزوم ہو گئے کہ ایک کا خیال دوسرے کے بغیر ممکن ہی نہ معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کی غزلیں مشاعرے کی جان اور ان کے مضامین مناظرے کی روح و رواں خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ متروک الفاظ پر ایک سلسلہ مضامین جو عرصہ تک مخزن میں چھپا کیا اپنی جدت اور انداز تحریر کی دلنشینی کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا۔

انھیں ایام میں چودھری خوشی محمد نے علیگڈھ منتھلی میں قدیم اردو شاعری پر ایک قبیح حملہ کیا۔ اس مضمون کا انداز تحریر اور پیرایہ استدلال اس قسم کا تھا کہ حسرت سے جس کا دل اور دماغ میر و سودا اور مصحفی اور انشا کے کلام سے سرشار تھا ضبط نہ ہو سکا۔ چنانچہ

اس رنگ سے اٹھائی کچھ اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

اردو شاعری کی خوبیوں کی داد دینے کے بعد حریف کے ڈرامے کے جواب میں تصوف کو پیش کیا اور نئی شاعری جس کو چودھری صاحب نیچرل شاعری بتاتے تھے اس کی اور مولانا حالی کی جھوٹی تقلید کی ایسی خبر لی کہ جنگ ادبی کا پورا لطف آ گیا۔

جب حسرت کا زمانہ تعلیم ختم ہونے کو آیا تو سید سجاد حیدر۔ بحیرہ زلاج یعنی (کنوار الانزم) میں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ گویا اردوئے معلیٰ کے چراغ حیات کے لئے سحر قریب تھی مگر فینکس کی طرح اردوئے معلیٰ نے بھی مرتے مرتے ایک ایسی راگنی گائی جس کی آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ ایک عالیشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی۔ تمام ہندوستان کے شعرائے اردو کی خدمت میں شرکت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ اکثر اساتذہ عالی قدر نے دعوت قبول فرمائی اور اسٹریچی ہال میں جو ایک ربع صدی سے نثر سنتے سنتے تھک گیا تھا ایسا شاندار مشاعرہ ہوا کہ اب تک اس کی یاد دلوں میں گدگدی پیدا کرتی ہے۔ سپہر نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی حضرات مجروح و تسلیم کے علاوہ بہت سے چھوٹے بڑے ستاروں نے اپنا کمال دکھایا مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب۔ یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر بھی ہو گئے۔

اگلی صبح خاتمۂ سبق پر تھیوڈر ماریسن تھے اور فضل کا دامن۔ عقاب جیسے کسی کمزور چڑیا کو پکڑ کر آن واحد میں آسمان کی بلندی میں جا چھپتا ہے، اسی طرح ماریسن صاحب چہرے پر غصے کی (جو صاف بناوٹی معلوم ہوتا تھا) کیفیت پیدا کیے ہوئے غریب فضل الحسن کو پکڑے ہوئے دواں دواں دفتر کی طرف لے گئے یہاں سب لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھا کیے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔

حسرت موہانی

ایک قدردان کی نظر سے

خانی خاں

انیسویں صدی کے آخری برس اور اس سے ایک سال پیشتر جو لوگ علیگڈھ میں تھے اُن کو یاد ہوگا کہ ان ایام کے نو واردوں میں سے کوئی شخص بلحاظ شکل وشباہت وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دل چسپ نہ تھا جس قدر نواح لکھنؤ کا ایک طالب علم جسے محبت اور مذاق نے "خالہ اماں" نام دیا تھا۔

چھوٹا قد، لاغر بدن، گندمی رنگ، چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا خیال کرتے ہوئے ڈاڑھی کسی قدر نیچی، فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ قیافہ کو ناگوار نہ ہونے دیتی تھی۔ اس پر کلابتونی ٹوپی، پرانی وضع کے چار رخانے کا انگرکھا، مشروع کا تنگ پاجامہ جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے۔ عینک اور چھڑی کا اضافہ کیجئے تو خالہ اماں، یا دوسرے لفظوں میں، فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت چشم تصور کے سامنے پھرنے لگے گی۔ عموماً تیز چلتے تھے۔ مگر جس طرح صاحب عصر جدید کے والد مرحوم آہستہ خرام تھے مگر ضرورت کے وقت تیز بھی چل سکتے تھے، اسی طرح فضل الحسن آہستہ بھی چل سکتے تھے اور نوع حیوانات کی اس عام صفت سے محروم نہ تھے۔

علی گڑھ کالج میں ان کی ہستی کا منشا پورا کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ہمیشہ چند تیز فہم حقیقت شناس ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کسی کیرکٹر کو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو ایک لفظ یا ایک نام سے ظاہر کر سکتے ہیں اس طرح کہ یہ نام موت تک اس صید بے گناہ کے گلے کا پھندا ہو جائے۔ بہت سے مشہور اور معزز لوگ ہیں کہ بدون 'بوم' یا 'خدیا' ان کے ناموں پر اضافہ کیے ہوئے ان کے عزیز ترین دوست بھی صاحب نام کو پہچان نہیں سکتے۔ غرض اس قسم کے ناموں میں کہ جن کی نسبت الاسمائے منزل من السماء، صادق آتا ہے ایک نام 'خالہ اماں' بھی تھا۔ ہمارے دوست کی ہیئت ظاہری تو اس نام کی مستحق تھی ہی مگر جس چیز نے اس نام کو برخلاف دوسرے ناموں کے محض ظرافت و مذاق ہی کا ذریعہ نہیں بنا دیا تھا بلکہ اس سے ایک لطیف ہمدردی اور بے تکلفی کا اظہار بھی متصور ہوتا تھا، وہ فضل کی مرنجان مرنج طبیعت، خندہ روی، عالم دوستی اور حسن پرستی تھی۔

ان اوصاف کے ساتھ ہی فضل ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ ایسا کہ پرانی وضع کے مسلمان اس کے کسی قول و فعل پر گرفت نہ کر سکتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی اس کی زندگی کا جزو ضروری تھا مگر برخلاف عوام کے اس سے اس کی شیرینئ طبع میں فتور نہیں آنے پایا۔ یہ بارہا دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم ہے اور نماز کا وقت بن بلائے مہمان کی طرح آ پہنچا، فضل مسکراتے ہوئے اُٹھے۔ معذرت بھی کرتے جاتے ہیں اور وضو بھی۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کر پھر آ بیٹھے۔ مگر ایسی حالتوں میں نماز بہت جلد جلد پڑھتے تھے، بلکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کلام مجید کی سورتوں کے بجائے ان کے اعداد بحساب ابجد پڑھ لیا کرتے تھے۔ بزرگان دین کے مزاروں کی ان کو ایسی ہی جستجو رہتی تھی جیسی از یاد رفتہ اساتذۂ قدیم کے دیوانوں کی۔ دہلی اور آگرہ میں کم مزار ایسے ہوں گے جن کی جالیوں میں فضل نے چلّے نہ باندھے ہوں۔

زہد و [illegible] کا نتیجہ تھا یا ان کی خوش نصیبی کہ کر پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ خالہ اماں نے عدم کی راہ لی اور اس کے بجائے "مولانا" [illegible] چپت [illegible] پر جاری ہو گیا۔ کالج کی [illegible] تاریخ انتخاب [illegible] میں یہ ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں۔

مگر یہ سب اوصاف ایسے تھے کہ فضل کے لیے حصول عزت و محبت کا باعث ہو سکتے تھے، مگر حصول شہرت؟ اس کے لیے فطرت نے مولانا کو بہت کچھ عطا ہوا تھا۔ وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالفین تعلیم

انگریزی میں اور ان میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ قطعاً انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے۔ یہ کسی صحیفۂ فرنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا یا لکھنا نہ آیا۔ حقیقت میں ان کا میلان طبع اردو اور فارسی کی طرف تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو بیگانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہو کر انھوں نے بی اے میں ریاضی پڑھی مگر یہ واقعہ ہے، گو اس کا سننا نفاست پسند طبیعتوں کو ناگوار گذرے کہ اس موذی اور مسلمان کش مضمون کو انھوں نے صحت نصاب سے باہر کبھی برضا و رغبت نہیں پڑھا۔ اس پر بھی وہ امتحان میں ناکام نہیں رہے۔

غرض اردو فارسی اور خاص کر ادب اردو سے اس شخص کو عشق تھا۔ جس زمانے میں عام طالب علم دارالاقامت اور بیت الطعام کے مناسب بانڈی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں رہتے ہیں اُس زمانے میں حضرت اساتذۂ قدیم کے دیوان جمع کرتے اور اُن کی خشک ہڈیوں پر "قم باذنی" پڑھنے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ کئی مشہور اور بہت سے بھولے ہوئے شعرائے اردو کے کلام کا اتنا بڑا مجموعہ اس قدامت پرست نے جمع کر لیا کہ شاید پرانے کتب خانوں کے سوا کہیں نہ ہو۔

اسی زمانے میں سید سجاد حیدر کی جدت پسند طبیعت نے انجمن اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی انسانی زندگی میں نقطہ یہ ایک مجلس تھی جس میں علم دوست طبیعتیں عام ہوا و ہوس کی خراب اوقات کشاکش سے پناہ لیتی تھیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ۔ شاید اتوار کی شب کو۔ ایک مقام مقررہ فرش فروش سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اراکین مجلس اور دوسرے مشتاقان سخن خوش وضع انگرکھے۔ اچکنیں اور شیروانیاں۔ دوپلی ٹوپیاں سروں پر دیئے ہوئے قرینے سے بیٹھ جاتے۔ شمع ایک ایک کے سامنے آتی اور وہ نظم و نثر تازہ کے پھول نذر کرتا۔ داد تحسین اور آداب و تسلیمات کا انداز فنونِ لطیفہ کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ ایسی انجمن کی ترقی کے لئے مولانا سے بہتر رکن کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اردوئے معلیٰ اور مولانا ایسے لازم ملزوم ہو گئے کہ ایک کا خیال دوسرے کے بغیر ممکن ہی نہ معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کی غزلیں شاعرے کی جان اور ان کے مضامین مناظرے کی رُوح رواں خیال کیے جاتے لگے۔ چنانچہ متروک الفاظ پر ایک سلسلہ مضامین جو عرصہ تک مخزن میں چھپا کیا اپنی جدت اور انداز تحریر کی دلنشینی کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا۔

انھیں ایام میں چودھری خوشی محمد نے علیگڈھ منتھلی میں قدیم اردو شاعری پر ایک فصیح حملہ کیا اس مضمون کا اندازِ تحریر اور پیرایہ استدلال اس قسم کا تھا کہ حسرت سے جس کا دل اور دماغ میر و سودا اور مصحفی اور انشا کے کلام سے سرشار تھا ضبط نہ ہو سکا۔ چنانچہ

اس رنگ سے اٹھائی کچھ اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

اردو شاعری کی خوبیوں کی داد دینے کے بعد حریف کے ڈرامے کے جواب میں تصوف کو پیش کیا اور نئی شاعری جس کو چودھری صاحب نیچرل شاعری بتاتے تھے اس کی اور مولانا حالی کی جھوٹی تقلید کی ایسی خبر لی کہ جنگ ادبی کا پورا لطف آ گیا۔

جب حسرت کا زمانہ تعلیم ختم ہونے کو آیا تو سید سجاد حیدر۔ جیلر زلاج یعنی (کنوار الانزم) میں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ گویا اردوئے معلیٰ کے چراغ حیات کے لئے سحر قریب تھی مگر فنیکس کی طرح اردوئے معلیٰ نے بھی مرتے مرتے ایک ایسی راگنی گائی جس کی آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ ایک عالیشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی، تمام ہندوستان کے شعرائے اردو کی خدمت میں شرکت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ اکثر اساتذہ عالی قدر نے دعوت قبول فرمائی اور اسٹریچی ہال میں جو ایک ربع صدی سے نثر سنتے سنتے تھک گیا تھا ایسا شاندار مشاعرہ ہوا کہ اب تک اس کی یاد دلوں میں گدگدی پیدا کرتی ہے۔ سپہر نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی حضرات نجروح و تسلیم کے علاوہ بہت سے چھوٹے بڑے ستاروں نے اپنا کمال دکھایا مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب۔ یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر بھی ہو گئے۔

اگلی صبح خاتمۂ سبق پر تھیوڈر ماریسن تھے اور فضل الحسن کا دامن۔ عقاب جیسے کسی کمزور چڑیا کو پکڑ کر آن واحد میں آسمان کی بلندی میں جا چھپتا ہے اسی طرح ماریسن صاحب چہرے پر غصے کی (جو صاف بناوٹ معلوم ہوتا تھا) کیفیت پیدا کیے ہوئے غریب فضل الحسن کو پکڑے ہوئے دوال دوال دفتر کی طرف لے گئے یاں سب لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھا کیے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔

اتنے میں شیر غرایا "تو کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟"
سہمی ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب ملا "جی ہاں۔ ہم لوگوں کا معیار آپ سے نخ مخ مختلف ہے!"
مسٹر ماریسن جھنجھلا کر بولے یہ سراسر بکواس ہے۔ کئی پرانے طالب علم خلاف تہذیب اشعار پڑھے جانے کی مجھ سے ابھی شکایت کر چکے ہیں۔
تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اردوئے معلیٰ نے بار دگر ترک وطن کیا۔ مولانا کو اب تک یقین ہے کہ پرانے طالب علموں سے ماریسن صاحب کی مراد "نیچرل شاعر" تھے۔

مگر اس علمی زندگی کے ساتھ ساتھ حسرت کے عادات میں ایک ایسا وصف نشو ونما پا رہا تھا کہ جس کا آخری نتیجہ علی گڑھ کے سیشن جج کی عدالت میں نظر آیا۔ اور جس سے یہ معلوم ہو گا کہ وہ شخص کہ جو مذہب اور ادب میں ایسا قدامت پرست تھا پالٹیکس میں کانگریس کے مقدمۃ الجیش میں کیونکر شریک ہو گیا۔ یہ وصف وہ تھا جسے انگریزی محاورے کے مطابق صدائے بلند ترین کا ہم آہنگ ہو جانا کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ وصف فتنہ انگیز ظاہر ہوا اور ہر مرتبہ مولانا کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا۔ شملے میں علیگڑھ کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڑھ کالج کے بنی اسرائیل اس پر اپنے سے باہر ہو گئے۔ ایک گروہ کثیر تمام آلات موسیقی جو کالج میں دستیاب ہو سکتے تھے یعنی تھالیاں، لوٹے، گلاس، کھانے کی سینیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شور محشر برپا کرتا تھا۔ بفضلہ جنھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی بیٹ چھوا تھا نہ گیند پھینکا تھا۔ یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیل کو حوالہ خاک کر کے سب سے آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے پر وقیبہ بن حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد سیاہ میں جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے ان کا نام لکھ لیا گیا۔

برسات کا پہلا پانی جیسا معنی خیز ہے وہ کچھ علی گڑھ ہی کے لڑکے خوب جانتے ہیں۔ اس روز پاس عقل عین حماقت ہے۔ مگر جماعت سے باہر ایک دن حسب دستور قدیم جا بجا لڑکے ہولی کھیل رہے تھے۔ پکڑو پکڑو جانے نہ پائیں، نکالو۔ نکالو۔ دروازے توڑ کر نکالو"۔ پھر کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گھڑوں کے ہوتے پھسل پھسل کر دھم سے گرنے کی آوازوں قہقہوں کے شور وغل سے آسمان پر بجلی اور زمین پر مینڈکوں کے زہرے پانی ہوئے جاتے تھے۔ مگر ہنوز بعض جماعتیں کالج ہی میں تھیں۔ مولانا میں تاب ضبط کہاں۔ دونوں ہاتھوں میں کیچڑ لے لوندے لیے ہوئے وہیں پہونچے اور اگر عربی کے پروفیسر بہ لطائف الحیل نہ ٹال دیتے تو عبا اور عمامے پر بھی دو چار چھینٹے پڑ ہی جاتے۔ فرد سیاہ گھات میں لگی ہی تھی نکلی اور مولانا کا نام درج ہو گیا۔

جون کی دوپہر تھی۔ اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ مولانا شاید استراحت پر تھے کہ ظہور وارڈ[1] کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا۔ گھبرا کر ننگے پاؤں ننگے سر کمرے سے نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ اسکول کے کسی لڑکے کو ایک مالی نے آم چرانے کے شبہ میں مارا ہے اور کچھ لڑکے اس شقی کی تنبیہ کو نکلے ہیں۔ مولانا اس ہیئت سے "پکڑو بدمعاش کو۔ مارو بدمعاش کو۔" کا شور کرتے ہوئے اس یورش میں شریک ہو گئے۔ مالی تو خیر پٹا یا نہ پٹا مگر ادھر اس مہم کا واپس آنا تھا کہ ادھر اس میاں رزمال نے بیسوں درخت لنگڑے اور بمبئی کے تاراج کر دیئے اور کئی سو روپیہ کا بطور تلافی نقصان کالج سے طالب ہوا۔ اس یلغار سپہ سالار بے چارے مولانا کو قرار دیا محض اس لئے کہ ان کا پہچاننا اوروں کی نسبت آسان تر تھا۔ فرد سیاہ ایک مرتبہ پھر نکلی اور مولانا کچھ عرصے کے لئے حکماً کالج سے رخصت کر دیئے گئے۔ سر آرضلع گو یان جناب میر عباس حسین صاحب پروفیسر نے کہ مہتمم باغات بھی تھے باغ لوٹنے پر فضل الحسن کو باغی قرار دیا اور فرمایا کہ "میاں مالی کی بد اعمالی پر اس کی گوشمالی بیشک ضروری تھی مگر مالی نقصان تو بیچارہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

اردو تقریر کا ملکہ مولانا میں بہت اچھا تھا۔ یونین کلب کے بے اصول جتھے ان کی نگاہ میں بے وقعت تھے اور آزادہ روی مسلک تھا۔ ایک مرتبہ انتخاب کے موقع پر بطور امیدوار آزاد، کوشاں ہوئے مگر کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دوسری مرتبہ دونوں فریق ان سے طالب امداد ہوئے اور وہ صدائے بلند ترین کے اصول پر کاربند ہو کر ایک فریق کی شرکت سے سکریٹری منتخب ہو گئے۔ مگر یہ جوڑ نبھ نہ سکا۔ جس فریق سے مولانا نے شرکت کی تھی اس کے اور م

---

[1] بورڈنگ ہاؤس کا نام ہے۔ (اب اس عمارت میں ادارۂ علوم اسلامیہ ہے۔ نگار)

کے خیالات اور عادات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شکر رنجی پیدا ہوائی۔ اس سے نفاق اور نفاق سے منافرت۔ اسی حالت میں سکریٹری صاحب سے ایک نامبارک غلطی سرزد ہوگئی۔ حریف تو تاک میں لگے ہی تھے۔ مجلس معتمدہ کا پورا اجلاس جس میں مسٹر تھیوڈر ماریسن مسٹر ٹمنگ اور مسٹر برون وغیرہ شریک تھے منعقد کرا کر مولانا کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

غرضکہ یہ وصف جسے ایک قسم کی فطری کمزوری کہنا چاہیئے گاہے بگاہے مولانا کے زمانہ تعلیم میں ظاہر ہوا کیا۔ زمانہ تعلیم ختم ہوا تو وظیفۂ قانونی کے لئے مولانا نے درخواست کی جسے مسٹر ماریسن نے نہ دیا۔ بورڈنگ ہوس میں بدستور رہنے کی اجازت چاہی۔ اجازت نہیں ملی۔

مایوسی اور افسردگی کا اس کے سوا کیا علاج تھا کہ شہر میں سکونت اختیار کر کے برسوں کی آرزو یعنی زبان اردو کی خدمت میں زندگی وقف کر دی جائے اور برائے نام قانون کے سبقوں میں بھی حاضر ہو جایا کریں۔

رسالہ اردوئے معلیٰ جاری ہوا اور آب و تاب سے جاری ہوا۔ دنیائے ادب نے حیرت اور استعجاب سے دیکھا کہ ایک کم عمر نوجوان نے جو ابھی کل مکتب سے نکلا تھا صحائف اُردو کے لیے کیسے نئے نئے راستے کھول دیئے ہیں۔ اپنے ذاتی رسالے کے ذریعہ سے جدید شاعری اور اس کے قدردانوں کو بے ڈالنا کون مشکل تھا۔ اکثر لحاظ سے پنجاب اس مفروضہ نیچرل شاعری کا مرکز تھا۔ مولانا حالی مدظلہٗ العالی کا وطن ایک حیثیت سے پنجاب ہی تھا۔ چودھری خوشی محمد ناظر میں کے پہاڑوں سے قدیم شاعری پر پتھر برسایا کرتے تھے، چٹائی، جھاڑو، لوٹی اور لنگوٹی پر وہیں کے اخباروں میں طبع آزمائیاں ہوتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نیا ستارہ "اقبال" کی صورت میں طلوع ہوا تھا جس کی روشنی میں تسخیر کا عمل تھا۔ علیگڈھ منتھلی میں ایک مضمون اردو زبان پنجاب میں کا چھپنا مولانا کے لئے بہانہ ہوگیا۔ مہینوں تک کوئی پرچہ نہ نکلتا تھا جس میں فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح حسرت اور ان کے تابعین کی سرد ہی اور کٹار مولانا حالی اور اقبال پر نہ چلاکی۔ ان شیران میدان سخن پر تو خیر یہ کیا اثر کر سکتی تھی تاہم چھوٹے مقلدوں کے سراسیمہ اور حواس باختہ کرنے کو یہی کافی بلکہ اس سے بڑھ کر تھے مگر میرا مقصد اس بیان سے کیریکٹر کے غلبے کی ایک خوبصورت مثال پیش کرنا ہے

کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت دو دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلیٰ کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔ حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور اردوئے معلیٰ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور "واہ۔ خوب لکھا" کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں۔ ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے "ارے مولانا یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے" اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہنا شروع کیے "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا۔ اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا اچھا ہے" فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ "نکتہ چینی اصلاح زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں"۔

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے مگر ابھی "ہم آہنگی صدائے ترین" کے لئے ایک ایسا وسیع میدان باقی تھا جس کے لیے حسرت کے پاس 'دل' اور زبان کے سوا کوئی قابلیت نہ تھی۔ یہ میدان میدان پالٹیکس تھا۔

حسرت نے نگاہِ غور سے دیکھا تو ایک طرف ۸ کروڑ مسلمانوں کو آیہ "اطیعوا اللہ و اطیع الرسول و اولی الامر منکم" کے اثر سے صُمٌّ بُکمٌ پایا۔ وفاداری کا گوسالہ جو علیگڈھ کے سامری کے ہاتھوں نے تیار کیا تھا ان کی توجہ کو کسی دوسری طرف ہٹنے بھی نہ دیا۔ ادھر ۲۱ کروڑ ہندوؤں کو دیکھا کہ مجر مواج کی تلاطم میں ہیں اور کانگریس کے شور کے سامنے صورِ اسرافیل کا شور طوطی کی صدا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ ہی مخالفین فردِ سیاہ کا سلوک

غلام ربّانی تاباں:

بس دشمنِ تمکیں کا اشارا بھی بہت ہے — خرمن کے لئے ایک شرارا بھی بہت ہے
ہر موجِ ہوس سر سے گزر جاتی ہے ورنہ — جینے کو غمِ دل کا سہارا بھی بہت ہے
پھولوں سے تہی شوق کا دامن ہے تو کیا غم — ہم اہلِ تمنا کو نظارا بھی بہت ہے
آجاتا ہے رہ رہ کے خیالِ مہ و خورشید — ہر چند شبِ غم کوئی تارا بھی بہت ہے
لائی ہے تری یاد بہت دل پہ تباہی — گو دل کو خرابی نے سنوارا بھی بہت ہے
ڈرتا ہوں نہ حرف آئے ترے ذوقِ جفا پر — ہونے کو تو یہ درد گوارا بھی بہت ہے

ہم آبلہ پایانِ رہِ شوق کو تاباں
یہ دوریِ منزل کا سہارا بھی بہت ہے

وقار خلیل:

یہ شب و روز یہ نشیب و فراز — زندگی ہے کہ دُور کی آواز
دیکھنا ہر فریبِ خندۂ گل — کتنی محرومیوں کا ہے غماز
ایک مدت سے کن اندھیروں میں — زندگانی ہے گوش بر آواز
وقت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں — آج بھی وقت کے نشیب و فراز
تیری راہوں میں اے غمِ دوراں — ہو چلا ہے یقینِ عمرِ دراز
ہم نے سمجھا خوشی جہاں غم نے — اپنا لہجہ بدل کے دی آواز

شعر ہیں اصل میں وقار خلیل
اپنے وجدان کا سبک انداز

بُت شکنی

(چینی جارحیت سے متاثر ہوکر)

کیفی اعظمی:

پوجا تھا تمہیں بت کی طرح ہم نے کسی دن — گو جاں پہ عقیدت میں کئی بار بنی بھی
ماتھے سے کئی بار لہو سجدے میں ٹپکا — آنکھوں سے مئے درد کئی بار چھنی بھی
تم سازِ وفا کو کبھی خاطر میں نہ لائے — گردن کبھی جھکانا جسے اکڑی بھی تنی بھی
گھبرا گئی سازش بھی اگر تم رہے خاموش — کی بات تو شرما گئی ناوک فگنی بھی
اک بات سمجھ لو گے تو کھل جائیں گی آنکھیں — پوجا ہے تو آتی ہے ہمیں بت شکنی بھی

جاں دی ہے سدا دیں گے سدا اپنے وطن پر
گو آج بہت سستی ہے حب الوطنی بھی

غالبیہ

یعنی

غالب نامِ آور انیسویں صدی کے آئینے میں

ترتیب و تحشیہ

اکبر علی خاں

اسسٹنٹ لائبریرین

رامپور رضا لائبریری

تعارف

غالب ہمارا محبوب موضوع ہے۔ اس پر تنقیدی اور تحقیقی دونوں انداز سے بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ہماری دلچسپی اس موضوع کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے نئے نئے گوشے بھی سامنے آتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی غالب کے بارے میں بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اس معنی میں اردو کی سب سے زیادہ خوش نصیب شخصیت ہے کہ اُس سے متعلق جتنی بھی تفصیلی معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کسی بھی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں۔ اُس کے معاصرین میں سے ذوق اور مومن ہی کو لیجیے ہم ان دونوں کے بارے میں مقابلتہً کتنا کم جانتے ہیں حد یہ ہے کہ غالب کے معاصرین میں سے کسی کی بھی عکسی تصویر نہیں ملتی بہرحال غالب ایک استثنا ہے۔

اب کہ غالب اتنا محبوب ہو چکا ہے اور اُس پر بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اُسے اُس کے عہد کے آئینے میں بھی دیکھیں اور یہ جانیں کہ اُس کے معاصرین اُسے باعتبار ایک انسان اور باعتبار ایک فنکار کے کیسا جانتے تھے۔ یقیناً یہ مطالعہ ہماری معلومات میں دلچسپ اضافہ کرے گا اور اس کے نتائج ہمارے سامنے غالب کو سمجھنے کی بہت سی راہیں کھول دیں گے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے ایسی سب تحریریں جمع کر دی ہیں جو انیسویں صدی کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس صدی میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں نے غالب کو دیکھا تھا برتا تھا یا اس کے بارے میں معتبر روایات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ایک ایک سطر جو غالب کو اس کے عہد میں جاننے کے لیے ضروری ہے ایک رشتے میں منسلک کر دوں چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان تحریروں میں غالب کے متعلق جو بیش قیمت مواد ہے وہ یکجا کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔ مطالعہ میں سہولت پیدا کرنے کے خیال سے میں نے اس کام کو چند ابواب پر تقسیم کر دیا ہے۔

ان عبارتوں پر ضروری اور مفید حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جن کے ذریعہ ہر تحریر اور صاحب تحریر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ماخذ پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ سارا کام بالاقساط قارئین نگار کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے اصل عبارتیں اور اس کے بعد حواشی۔

اس بار پہلا باب جس میں تذکروں کے اقتباسات ہیں۔ شایع کیا جا رہا ہے۔ عیار الشعرا اور عمدۂ منتخبہ کے علاوہ تمام تذکروں سے انتخاب اشعار کا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ استثنا اس لیے ضروری تھا کہ ان دونوں میں غالب کے کچھ قلم زد اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس کی بالکل ابتدائی مشق کا نمونہ ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس تفریق کو روا رکھا جائے۔

یہاں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ آب حیات کی عبارت کو صرف نگار کے صفحات کی حد تک اس کی طوالت اور کتاب کے سہل الحصول ہونے کے باعث ترک کر دیا گیا ہے۔ اور چند ابتدائی سطور ہی نقل کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا نام **غالبیہ** رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مختصر نام جو اس کتاب کی بہتر نمائندگی کرتا ہے پسند کیا جائے گا۔ جلد ہی برصغیر کا ایک نامور دار الاشاعت اسے خوبصورت ٹائپ میں بڑے اہتمام سے شائع کر رہا ہے لیکن میرا جی نہیں مانا کہ نگار دوستوں کو یہ تحفہ دیر سے پہنچے اس لیے ان اوراق پر یہ مکمل کتاب کم سے کم قسطوں میں منتقل کر دی جائے گی۔

توقع ہے کہ اس سلسلے میں غالب پسندوں کی جانب سے مجھے مفید مشورے بھی ملیں گے تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ مکمل شکل دی جا سکے۔

اکبر علیخاں

معیار الشعرا —— خوب چند ذکا

مرزا اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، المتخلص بہ غالب، ولد مرزا عبد اللہ خان، عرف مرزا دولہ، نبیرۂ مرزا غلام حسین خان کمیدان، ساکن بلدۂ اکبرآباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعر فارسی و ہندی است۔ از دست:

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ ایسا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

ص ۵۴۱ — ۵۴۲

عمدۂ منتخبہ —— نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور

اسد تخلص، اسد اللہ خان، عرف میرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبرآباد۔ جوان قابل و یارباش، دردمند، ہمیشہ بہ خوش حالی بسر بردہ۔ ذوق ریختہ گوئی در خاطر تمکن۔ ... ... غم ہای عشق مجاز، تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز۔ در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا عبد القادر بیدل علیہ الرحمۃ در ریختہ در محاورات فارسی موزون می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یکجہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامین نازک موزوں گشتہ۔ زاویۂ خیال بندی بیشتر از بیش پیش نہاد خاطر دارد از نتائج طبع اوست۔

شیشۂ صافی یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک
لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

آنسو کہوں کہ آہ سوار ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھو وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

مجلس شمع عذراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے یک رو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبشِ لب مثل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوز اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبطِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

کہتا تغافل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سنتے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب　　بے قراری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

(ورق ۴۶ الف — ۴۸ الف)

گلشن بیخار —— نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

غالب تخلص، اسم شریفش اسد اللہ خان، المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندان فخیم است و از روساى قدیم. سابقاً مستقر الخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر ونازبود اکنون دار الخلافہ شاہجہاں آباد بدین نسبت غیرت افزای صفاہان و شیراز. طوطی بلند پرواز چمن معانی است وبلبلِ نغمہ پرواز گلشن شیوا بیانی. پیشِ بلندیٔ خیالش اوج فلک پستیٔ زمین است و در جنب تہ نشینی غورش، سرفرازی قارون، کرسی نشین شاہین فکرش. جز بشکارِ عنقا نہ پردازد، واشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد. اگر ام وز بتلاش متاعِ نفیس شتابی، جز بدکانش در نیابی. سالہا است کہ پا بدائرہ شاعری نہادہ، در اوائل حال بتقاضای طبعِ دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن میگفت و وقت آفرینی ہا میکرد آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازی مطبوع ابداع نمودہ، دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دگر نگریست فراواں ابیات ازاں عزلت وساقط کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ. مدتہا است کہ بنظم ریختہ سری ندارد. در زبانِ فارسی نیز دستگاہ بلند پایۂ وافر بہم رسانیدہ. پایہ اش از فحول استادان کم نیست. غزلش چوں غزل نظیری بی نظیر و قصیدہ اش چو قصیدۂ عرفی دلپذیر. مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطایف پی می برد، و این فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہل سخن است. اگر طبع سخن شناس واری باین نکتہ میرسی. چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر. خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شربی یافتہ وحظی ربودہ. بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ. دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد، اما پیوندمعنی مستحکم است دیوانش بنظر رسید وایں ابیات ازاں منتخب گردید. (ص ۱۸۵ — ۱۸۷)

گلدستۂ نازنیناں —— منشی کریم الدین

اسد تخلص، اسم شریف اُن کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معروف بمرزا نوشہ خاندان فخیم اور روساى قدیم اکبر آباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ بنیاد کے ہیں. ادیب لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی اُن کی کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور، سخن فہم و سخن داں اس پایہ پر کہ متنبی و کعب باوجود تنہا او ربلند پائگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے اُن کے حضور. اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری، مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری. خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا، خاقانی بجا رعب کشی مستعد اسیر دیا. فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اُس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا. صاحب دیوان و تصانیف ہیں، مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصنیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا، اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے. مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے اس لئے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے.

ص ۲۱۵ — ۲۱۶

طبقات الشعرا ——— منشی کریم الدین

غالب تخلص، اسداللہ خاں، مشہور مرزا نوشہ، خاندان فخیم اور روسای قدیم سے۔ ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے اب شاہجہاں آباد میں ۱۲۵۰ ہجری کے قبل سے رہتے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں ان کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہوتا ہے ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف سے منشی نورالدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے بہت بڑا دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے وہ بھی مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۲۵۰ھ کے چھپا تھا۔ حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار اشعار کا فراہم کیا تھا۔ اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جز کا بنا لیا۔ وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے۔ میں نے ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا۔ دروغ برگردن راوی۔ لیکن اس مقولہ کا مؤید صاحب تذکرہ گلشن بے خار کا بھی ہے وہ بھی یہ لکھتے ہیں کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان انتخاب کر لیا ہے۔ قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں۔ اردو میں صرف غزلیں ہیں۔ اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان ایام میں یعنی درمیان مئی ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانب سرکار سے بڑا آ پڑا۔ حبس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر اُن کی اس سال قریب ساٹھ برس کی ہوگی۔ یہ اشعار اُس کے ہیں۔

ص ۳۹۵ - ۳۹۶

...... جس سال کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی طامسین صاحب جو کہ عالم کامل، اور قدر شناس اہل علم کے ہیں، شاہ جہاں آباد میں واسطے بندوبست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کا مع طلبہ کے امتحان لیکر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسہ کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیے۔ شاہ جہاں آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں: ایک مرزا نوشہ صاحب، دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے حکیم محمد مومن خاں۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے بسبب اس کے کہ ان کو نوکری کرنے سے استغنا تھی انکار کیا۔ حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی۔ مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے، حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی۔ چالیس روپیہ ماہواری انکے واسطے مقرر ہوا۔ مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے، ۱۸۴۰ء میں درس و تدریس کرنے لگے ان کے روزگار کے باب میں اور لوگوں نے بھی بہت سعی کی تھی، کیونکہ وہ شخص اس عہدہ کے قابل تھا۔ بعد ایک عرصہ کے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگئی، ہنوز وہی تنخواہ پاتے ہیں۔ شاہ جہاں آباد کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں...

ص ۴۲۸ — ۴۲۹

"......... غالب، مرزا نوشہ غالب اردو شعر بھی جو کہتے ہیں موتی پروتے ہیں۔ جیسا کہ وہ شخص فارسی میں استاد کامل ہے ایسا ہی اردو میں بھی جلیل القدر استاد ہے۔" ص ۱۴۵

آثار الصنادید ——— سرسیّد احمد خاں

ہمای اوج مفاخر و معالی، جاگزین سدرۃ المنتہیٰ مراتب بلند و مدارج عالی، مؤسس اساس شیوا بیانی، بانی بنای الفاظ و معانی، عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمائے برتری و والا تباری، مہر سپہر بلند اختری و گردون اقتداری، شاگرد رحمٰن، استاد سحبان، المعی زمان، لوذعی بیان، فرزند دلبند دہر ولبید ادان، سمی وصی رسول اللہ، جناب مستطاب مرزا اسد اللہ، غالب تخلص دیوان حافظ ان کا لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش۔ زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش۔ چراغ انوری انفس کے شعلۂ فکر

روشن اور سینۂ آذری انفیں کی آتش حسرت سے گلشن۔ عنصری ان کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکون ہوا تھا اور سحبانی اِن کی حسرت کمال سے ایسا رویا کہ مگر اُس کی بینائی چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی۔ زلالی ان کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحٰق اطعمہ ان کے خوان استعداد سے نعمت طلب۔ خاقانی اس خسرو معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت۔ ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبان حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ دار۔ رنگینی معنی سے صفحے کو گلرنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو رشک ارژنگ کرنا، خاصہ اسی حسن طراز سخن وری اور نقاش صحیفۂ ہنر پروری کا ہے! اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ، کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض، سدِ سکندر سے جگہ سے نہ ہلے۔ قلم ان کا معنی روشن کی سنا وش سے فوارہ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور۔ اس سخن طراز کے کمال استعداد کو جو ظرف حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ صد زبان بیان کرے، اوّل چاہیے کہ ملکہ، عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدیس جوہر اور امداد مبدأ فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنان بارگاہِ ازل سے کمیٔ استعداد کا طعنہ سُنا اور شوخیٔ ادب کی سرزنش حاصل کی، تو باایں ہمہ نقصان عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر تنگ لنگاں اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیا تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی۔ اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابانِ انصاف طینت کے آگے حصولِ صلۂ آفرین تو کیا خجلت نارسائی اور طعنۂ نا عاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے:

"کسی کہ از عہدہ ثنای کسی۔ بیرون نیاید جزادل بعجز اعتراف نہ نماید"

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے۔ بیت:

بامی است بعد بلند و پستی ہان پای نہ لغزدت ز مستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے بعض ہم گوہر تھے فرماں روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دور تمام ہوا ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جد امجد اپنے پدر مشفق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج ہو پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے۔ اور اُس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لاکر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باشِ اکبر آباد اختیار کی۔ اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنات نعیم کی گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبر آباد کے صوبیدار تھے۔ آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصر اللہ بیگ خاں، لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے امدادی بادشاہ کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کارنمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافات اکبر آباد سے اُن کی حین حیات تک جاگیر میں عطا کیے۔ پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا وہ جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی۔ پھر وہاں سے بسبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہجہان آباد میں تشریف لائے اور اُس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ دہن شکر اور ہر مد حرف، زبان سپاس ہے، ان کی نعمت تربیت کا۔ راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اُس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چونکہ "دلہا را بدلہا راہ باشد" ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں اِن کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور اِن کے ایک گل کو

طبقات الشعرا ـــــ منشی کریم الدین

غالب تخلص، اسد اللہ خاں، مشہور مرزا نوشہ، خاندان فخیم اور روسای قدیم سے۔ ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے اب شاہجہان آباد میں ۱۲۰۵ ہجری کے قبل سے رہتے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں ان کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہوتا ہے ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف سے منشی نورالدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے بہت بڑا دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے وہ بھی مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۲۵۷ھ کے چھپا تھا۔ حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار اشعار کا فراہم کیا تھا۔ اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جز کا بنا لیا۔ وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے۔ میں نے ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا۔ دروغ برگردن راوی۔ لیکن اس مقولہ کا موید صاحب تذکرہ گلشن بے خار کا بھی ہے وہ بھی یہ لکھتے ہیں کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان انتخاب کر لیا ہے۔ قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں۔ اردو میں صرف غزلیں ہیں۔ اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان ایام میں یعنی درمیان مئی ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانب سرکار سے بڑا آ پڑا۔ حبس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر اُن کی اس سال تریب ساٹھ برس کی ہوگی۔ یہ اشعار اُس کے ہیں۔

ص ٣٩٥ - ٣٩٦

.... جس سال کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی طامسین صاحب جو کہ عالم کامل اور قدرشناس اہل علم کے ہیں، شاہ جہاں آباد میں واسطے بندوبست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کا مع طلبہ کے امتحان لیکر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسہ کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیے۔ شاہ جہاں آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدرالدین خاں بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں: ایک مرزا نوشہ صاحب، دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے حکیم محمد مومن خاں لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے بسبب اس کے کہ ان کو نوکری کرنے سے استغنا تھی انکار کیا۔ حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی، مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے، حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی۔ چالیس روپیہ ماہواری اُنکے واسطے مقرر ہوا۔ مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے، ۱۸۴۰ء میں درس و تدریس کرنے لگے ان کے روزگار کے باب میں اور لوگوں نے بھی بہت سعی کی تھی کیونکہ وہ شخص اس عہدہ کے قابل تھا۔ بعد ایک عرصہ کے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگئی، ہنوز وہی تنخواہ پاتے ہیں، شاہ جہاں آباد کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں...

ص ٤٣٨ ـــ ٤٣٩

"........ غالب، مرزا نوشہ غالب اردو شعر بھی جو کہتے ہیں موتی پروتے ہیں۔ جیسا کہ وہ شخص فارسی میں استاد کامل ہے ایسا ہی اردو میں بھی جلیل القدر استاد ہے۔"

ص ٥٤١

آثار الصنادید ـــــ سرسیّد احمد خاں

ہمای اوج مفاخر و معالی، جاگزین سدرۃ المنتہیٰ مراتب بلند و مدارج عالی، موسس اساس شیوا بیانی، بانی بنای الفاظ و معانی، عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمای برتری و والا تباری، مہر سپہر بلند اختری و گردون اقتداری، شاگرد رحمٰن، استاد سحبان، المعی زمان، لوذعی بیان، فرزدق دہر و لبید اوان، سمی وصی رسول اللہ، جناب مستطاب مرزا اسد اللہ، غالب تخلص دیوان حافظ ان کا لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجادی کے زمانے میں خاموش۔ چراغ انوری الفکر کے شعلہ فکر سے

روشن اور سینۂ آذری انھیں کی آتش حسرت سے گلخن ۔ عنصری ان کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصر آتش سے متکون ہوا تھا اور سحبانی ان کی حسرت کمال سے ایسا ہوا کہ مگر اُس کی بینائی چشم فقط عنصر آب سے بنی تھی ۔ زلالی ان کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحٰق اطعمہ ان کے خوان استعداد سے نعمت طلب ۔ خاقانی اس خسرو معنی کی اکثر رعیت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت ۔ ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبان حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ وار ۔ رنگینی معنی سے صفحے کو گلرنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو رشک ارژنگ کرنا ، خاصہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفۂ ہنر پروری کا ہے ! اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ ، کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورقِ بیاض ، صدمۂ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے ۔ قلم ان کا معنی روشن کی ستاوش سے فوارہ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور ۔ اس سخن طراز کے کمال استعداد کو جو طرف حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ ندنہ باں بیان کرے ، اوّل چاہیے کہ ملکہ ، عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے ۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدیس جوہر اور امداد مبدا رتیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا ، کارکنانِ بارگاہِ اجل سے کمیِ استعداد کا طعنہ سُنا اور شوخیِ ادب کی سرزنش حاصل کی ، تو بایں ہمہ نقصانِ عقل و ہوش کس شمار میں ہے ۔ فی الحقیقت اگر تنگ لنگاں اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیا تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی ۔ اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابانِ انصاف طینت کے آگے حصولِ صلۂ آفرین تو کیا خجلت نارسائی اور طعنۂ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی ۔ ظہوری نے سچ کہا ہے :

"کسی کہ از عہدہ ثنای کسی بیرون نیاید جہاد اول بعجز اعتراف نماید"

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے ۔ بیت :

بامی است بعید بلند و پستی ہان پای نلغزدت زمستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا ۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے ہم جنس و ہم گوہر تھے فرماں روائی کرتے تھے ۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دورہ تمام ہوا ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا ۔ اس حضرت کے جد امجد اپنے پدر مشفق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہندوستان میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے ۔ اور اُس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا ۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی پھر کسی سبب سے بود و باشِ اکبر آباد اختیار کی ۔ اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنات نعیم کی گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے ۔ آپ کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبر آباد کے صوبیدار تھے ۔ آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصر اللہ بیگ خاں ، لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی بادشاہ کے ساتھ سرگرم جنگ رہے ۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کارنمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافات اکبر آباد سے اُن کی حین حیات تک جاگیر میں عطا کیے ۔ پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا وہ جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی ۔ پھر وہاں سے بسبب الس طبیعت اور میل خاطر کے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے اور اُس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے ۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں ۔ ہر دائرۂ الفاظ دہن شکر اور ہر مد حرف ، زبان سپاس ہے ، ان کی نعمت تربیت کا ۔ راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اُس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے ۔ اور چونکہ "دلہا را بدلہا راہ باشد" ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا ۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو

سرگراں مجھ سے سبک روح کے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سنتے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب — بے قراری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر عاقل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

(ورق ۴۷ الف — ۴۸ الف)

گلشن بیخار ——— نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

غالب تخلص، اسم شریفش اسد اللہ خان، المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندان فخیم است و از رؤسای قدیم۔ سابقاً مستقر الخلافت اکبرآباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود اکنون دارالخلافہ شاہجہاں آباد بدین نسبت غیرت افزای صفاہان و شیراز۔ طوطی بلند پرواز چمن معانی است وبلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی۔ پیش بلندیٔ خیالش اوج فلک پستیٔ زمین است و در جنب تہ نشینی غورش، سرفرازی قارون، کرسی نشین شاہین فکرش۔ جز بشکار عنقا نہ پردازد، و اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد۔ اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی، جز بدکانش در نیابی۔ سالہا است کہ پا بدائرہ شاعری نہادہ، در اوائل حال بتقاضای طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن میگفت و دقت آفرینی ہا میکرد آخر الامر از آں طریقہ اعراض کردہ اندازی مطبوع ابداع نمودہ، دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب و گزین گریست فراوان ابیات از آں حذف وساقط کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ۔ مدتہا است کہ بنظم ریختہ سری ندارد۔ در زبان فارسی نیز دستگاہ بلند دپایۂ والا فراہم ساختہ۔ پایہ اش از فحول استادان کم نیست۔ غزلش چوں غزل نظیری بی نظیر، قصیدہ اش چو قصیدۂ عرفی دلپذیر۔ مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پی می برد، و ایں فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ میرسی۔ چہ خوش فکر اگر چہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شربی یافتہ و حظی ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ۔ دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد، اما پیوند معنی مستحکم است دیوانش بنظر رسید وایں ابیات ازاں منتخب گردید۔ (ص ۱۸۵ — ۱۸۷)

گلدستۂ نازنیناں ——— منشی کریم الدین

اسد تخلص، اسم شریف اُن کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معروف بمرزا نوشہ خاندان فخیم اور رؤسای قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں۔ ادیب لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی اُن کی کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور، سخن فہم و سخن داں اس پایہ پر کہ متنبی و کعب باوجود تنہا اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے اُن کے حضور۔ اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری۔ مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری۔ خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا، خاقانی بجا رعب کشی مستعد بسر رویا۔ فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اُس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں، مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصنیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے اس لئے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے۔

ص ۲۱۵ — ۲۱۶

طبقات الشعرا ـــــــ منشی کریم الدین

غالب تخلص، اسد اللہ خاں، مشہور مرزا نوشہ، خاندان فخیم اور روساے قدیم سے۔ ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے اب شاہجہان آباد میں ۱۲۵۰ ہجری کے قبل سے رہتے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں ان کے شاگرد ہیں فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہوتا ہے ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف سے منشی نور الدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے بہت بڑا دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے وہ بھی مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۲۵۰ھ کے چھپا تھا۔ حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار اشعار کا فراہم کیا تھا۔ اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جز کا بنا لیا۔ وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے۔ میں نے ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا۔ در دروغ بر گردن راوی۔ لیکن اس مقولہ کا مؤید صاحب تذکرہ گلشن بے خار کا بھی ہے وہ بھی یہ لکھتے ہیں کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان انتخاب کر لیا ہے۔ قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں۔ اردو میں صرف غزلیں ہیں۔ اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان ایام میں یعنی درمیان مئی ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانب سرکار سے بڑا اُبر ا پڑا۔ حبس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر اُن کی اس سال تریب ساٹھ برس کی ہوگی۔ یہ اشعار اُس کے ہیں۔

ص ۳۹۵ - ۳۹۶

.... جس سال کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی طامسین صاحب جو کہ عالم کامل اور قدر شناس اہل علم کے ہیں، شاہ جہاں آباد میں واسطے بندوبست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کا مع طلبہ کے امتحان لیکر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسہ کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیے۔ شاہ جہاں آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں: ایک مرزا نوشہ صاحب دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے حکیم محمد مومن خاں لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلایا، مرزا نوشہ صاحب نے بسبب اس کے کہ ان کو نوکری کرنے سے استغنا تھی انکار کیا۔ حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی، مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے، حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی۔ چالیس روپیہ ماہواری اُنکے واسطے مقرر ہوا۔ مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے، ۱۸۴۰ء میں درس و تدریس کرنے لگے ان کے روزگار کے باب میں اور لوگوں نے بھی بہت سعی کی تھی کیونکہ وہ شخص اس عہدہ کے قابل تھا۔ بعد ایک عرصہ کے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگئی، ہنوز وہی تنخواہ پاتے ہیں، شاہ جہاں آباد کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں....

ص ۴۲۸ — ۴۲۹

"........ غالب، مرزا نوشہ غالب اردو شعر بھی جو کہتے ہیں موتی پروتے ہیں۔ جیسا کہ وہ شخص فارسی میں استاد کامل ہے ایسا ہی اردو میں بھی جلیل القدر استاد ہے۔"

ص ۵۴۱

آثار الصنادید ـــــــ سر سیّد احمد خاں

ہمای اوج مفاخرہ معالی، جاگزین سدرۃ المنتہی مراتب بلند و مدارج عالی، موسس اساس شیوا بیانی، بانی بنای الفاظ و معانی، عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمائے برتری و والا تباری، مہر سپہر بلند اختری و گردون اقتداری، شاگرد رحمن، استاد سحبان، المعی زمان، لوذعی بیان، فرزند دہر دلپیذادان، سمی وصی رسول اللہ، جناب مستطاب مرزا اسد اللہ، غالب تخلص دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجادہ کے زمانے میں خاموش۔ چراغ انوری انفیس کے شعلہ فکر سے

روشن اور سینۂ آذری اغیں کی آتشِ حسرت سے گلشن. عنصری ان کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکون ہوا، اور سحبانی ان کی حسرتِ کمال سے ایسا رویا کہ مگر اُس کی بینائی چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی. زلالی ان کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحٰق اطعمہ ان کے خوانِ استعداد سے نعمت طلب. خاقانی اس خسروِ معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہِ سخن کے آگے سرگرمِ خدمت. ملاحتِ کلامِ سعدی ان کے خوانِ فیض کی نمک خوار اور شیرینیِ زبانِ حافظ ان کی نعمتِ مقال سے روزینہ دار. رنگینیِ معنی سے صفحے کو گلرنگ اور طراحیِ فکر سے کاغذ کو رشکِ ارژنگ کرنا، خاصہ اسی چمن طرازِ سخن وری اور نقاشِ صحیفۂ ہنر پروری کا ہے! اگر الفاظِ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ، کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورقِ بیاض، صدمۂ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے. قلم ان کا معنیِ روشن کی تراوش سے فوارہ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطفِ کیفیت سے شرابِ انگور. اس سخن طراز کے کمالِ استعداد کو جو طرزِ حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ ندزباں بیان کرے، اول جامۂ کرملکہ، عقلِ فعال سے عاریت مانگے اور زبانِ قلم تقدیر سے مستعار لے. میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصافِ حمیدہ اور محامدِ پسندیدہ دفترِ کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدیس جوہرا در امداد مبدارِ فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنانِ بارگاہِ ازل سے کمیِ استعداد کا طعنہ سُنا اور شحنۂ ادب کی سرزنش حاصل کی، تو باایں ہمہ نقصانِ عقل و ہوش کس شمار میں ہے. فی الحقیقت اگر تنگ لنگاں اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیا تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی. اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندانِ بلند فکر بلکہ دقیقہ یابانِ انصاف طینت کے آگے حصولِ صلۂ آفریں تو کیا خجلتِ نارسائی اور طعنۂ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی. ظہوری نے کیا کہا ہے:

"کسی کہ از عہدہ ثنای کسی بیرون نیاید جہاادل بعجز اعتراف نہ نماید"

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے. بیت:

باھی است بعد بلند و پستی ہان پای نہ لغزدت ز مستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا. آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے. آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے ہم جنس بہم کہ رہتے فرماں روائی کرتے تھے. جب سلجوقیوں کے عہدِ سلطنت کا دور تمام ہوا ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا. اس حضرت کے جدِ امجد اپنے پدرِ مشفق سے ایک امرِ سہل پر قدرے شکر رنج ہو پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے. اور اُس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطانِ عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لاکر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا. حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی. پھر کسی سبب سے بود و باشِ اکبرآباد اختیار کی. اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنارِ شفقت اور آغوشِ عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جناتِ نعیم کی گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے. آپ کے حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبیدار تھے. آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے. جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصراللہ بیگ خاں، لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی بادیہ کے ساتھ سرگرمِ جنگ رہے. جرنیل لیک صاحب نے اس کارِ نمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافاتِ اکبرآباد سے اُن کی عینِ حیات تک جاگیر میں عطا کیے. پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا وہ جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی. پھر وہاں سے بسبب اُنسِ طبیعت اور میلِ خاطر کے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور اُس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالمِ تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے. حق یہ ہے کہ جانِ سخن پر منت اور سرِ معنی پر بارِ احسان رکھتے ہیں. ہر دائرۂ الفاظ دہنِ شکر اور ہر مدِ حرف زبانِ سپاس ہے، ان کی نعمتِ تربیت کا. راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اُس کا بیان نہ قدرتِ تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے. اور چونکہ "دلہا را بدلہا راہ باشد" ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا. میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گر

بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔ اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپکی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں، اور جواہر گراں مایہ کو آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر یہی جزدان حافظہ میں محفوظ اور یہی صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین عطائی ہر مستفید کے پاس خردار خروار فراہم آگئے ہیں اور چونکہ مثل مبدا رفیاض کے آپ کی طبیعت موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے آپ کو اُن جواہر بے بہا کے اعطا میں کچھ دریغ نہیں آرہے۔

نطقش کہ بدوست جان توانا چون بادہ خرد فزای دانا

آپ کا جواہر خانۂ نفائس سخن حد شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیرون ہے۔ ایک دیوان قصاید وغزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور مطبوع ہولیے اور اسی طرح سے نثر۔ اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فواید جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتایج فکر سے ہے کہ منتہیان معنی رس کیواسطے مغتنمات عظمیٰ سے ہے اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی۔ راقم تیمناً و تبرکاً کچھ نظم اور کچھ نثر اس کتاب میں لکھ کر ہدیۂ نظار ارباب شوق کرتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ نظم کس رتبہ کا ہے اور نثر کس عنان کے ساتھ:

ص ۱۳۵ — ۱۳۹

گلستان بے خزاں ——— قطب الدین باطن

غالب جو اسد تخلص، اسد اللہ خاں نام، ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں، کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از نبائر غلام حسین خاں کمیدان، قبل اس سے عہد دہلی میں ان کی سکونت کا مکان۔ استادان باشعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور بادی شعراء جو بے نظیر روزگار رکھتے جن سے تعلیم پائی۔ ایام صبا سے ببرکت انفاس متبرکہ ان استادوں کے مرتبۂ علم پہنچے تب اُن کی فکر رسا نے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوش گو ہوں، جن کے ایسے استاد دو ہوں۔ متانت فحوائے کلام میں لاکلام، کلام سے بنیاد سخن کو استحکام۔ چونکہ وہ استاد مرگئے یہ عہد دہلی سے ادھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔ ہاں خود استاد ہیں، مرغان مضامین کے صیاد ہیں۔ ہاں اُن کا فراخ حوصلہ ہے پھر نسخہ کا کیا گلہ ہے۔ گو فارسی میں متین ہیں پر اردو میں تو ذوق ہی نکتہ چین ہیں۔ اب بعد وفات ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو، کلام ان کا سحر حلال ہو مگر زمانہ خالی نہیں، کیا اور کی طبیعت عالی نہیں۔ غالباً جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمان محکمۂ شعر کے روبرو معاملہ ہو۔ بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی، اور از حد اتحاد کی بات تھی۔ انتخاب زبان میں یکتہ دوران ہیں جس طرف طبیعت آئی اسی کی خاک اڑائی۔ چنانچہ دختر رز سے جو ناک لگائی تو وہ ظرافت پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شراب شفق، قاضی آفتاب بادب پیشکش لایا اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر بساط اور بگھڑے واؤں کھانے لگے، ایسا کمال پایا شعر کم قدر اُن کا کبھی کسی کی زبان سے نہ سنا، نہ اپنی آنکھ سے دیکھا۔ لفاظی اور جودت زبان فیض ترجمان سے عیاں ہے۔ کلام شیریں وصف سرمۂ چشم فرہاد ہیں جس نے سنا حلاوت سخن اور گلوگیری سرمہ سے یارائے صفت شعر نہ رہا گویا کہ دقت امتحاں ہے۔ کثرت عذوبت سے ہونٹ چپک گئے سرمے کی خاصیت سے زبان سیہ گولال ہوئی، عدو ٹھٹک گئے۔ جو شخص اُن کے کلام سے بہرہ ور ہوا بیساختہ آفریں اور سبحان اللہ اُس کی زبان پر ہوا چونکہ ہمارے کام دہاں نہیں کہ منزل وصف میں قدم سر کرے لہذا راقم توسن سبک تگ کلک سوے بادیہ مطلب پر کرے۔ اب یہ دہلی والے ہیں اور بڑے ارادے والے ہیں شاید قدیم کی نظم و نثر کو خفیف جانتے ہیں، غرور کی راہ چاہیں سو زبانیں بردل میں، تو ان کا لوہا مانتے ہیں۔ دہلی والے صاحب کسی کو اپنے روبرو خاطر میں نہیں لاتے، مارے خودی و تمکنت کے جی میں پھولے نہیں سماتے۔ پر جب کسی سے مقابلہ ہو تو دم بھر میں فیصلہ ہو۔

ان کو شراب و کباب چاہیے، خلاف شرع کا بے حساب چاہیے روزے کے نام سے انھیں کیا کام نماز کو ان کا ہر دم سلام۔ اصحاب تذکرہ کی تحریر دیکھی اور ان کی تقریر دیکھی کیا غرور ہیں، اپنے نزدیک کتنے دور ہیں۔ یاران ہم صحبت اُن سے زیادہ غرور میں چور ہیں، گویا ان کے یار خوشامد کے مزدور ہیں۔ دہلی والے صاحبوں کے تذکرے جو عبارت رکھتے ہیں متاع حیرت شعرائے ماضی و حال ہ مصنف کو غارت

رکھتے ہیں۔ ہیں! ہیں! باطن کدھر گیا جوش میں بھر گیا، خبردار باہوشیار! ان کے اسدِ فکر کا نخچیر مضمون پر غلبہ ہے، غمسہ ان کا شیر کا پنجہ ہے۔ دیوان فارسی ضخیم ہے مگر اردو کا دیوان مانند آہنامہ قلیل و قدیم ہے۔ اسدِ فکر، نیستان کا غذ میں ڈکارتا ہے زبادہ مضامین کو ناحق جان سے مارتا ہے۔ ص ۱۷۱ ــ ۱۷۳

سراپا سخن ــــ میر محسن علی محسن

مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالب، ولد عبداللہ بیگ خاں، قوم ترک، اولاد میں گستاسپ کی، مولد اکبرآباد، مسکن دہلی۔ دیوان فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی ہیں۔ مولف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ فدا حسین فدائی قصبۂ دیبائی سے بھیجی تھی۔ (ص ۴۷،۴۸)

یادگار شعرا ــــ اشپرنگر

اسد، اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ۔ انکے بزرگ سمرقند کے تھے اور یہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے (تذکرہ سرور) ان کا تذکرہ غالب کے تخلص کے ذیل میں کیا جاوے گا۔ اخر سنہ ۱۸۵۲ میں یہ تقریباً ۶۰ سال کے ہیں۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس وقت یہ صرف فارسی میں اشعار لکھتے ہیں۔ انھوں نے انشا فارسی اور حضرت علی کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ ص ۲۲

غالب، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ بڑے عالی خاندان ہیں۔ پہلے آگرے میں رہتے تھے۔ اب دہلی میں ہیں۔ یہ ایک پرانے شاعر ہیں۔ پہلے بیدل کا تتبع کرتے تھے، لیکن اب ایک طرز پیدا کیا ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔ (گلشن بے خار) ص ۱۴۵

گلشن ہمیشہ بہار ــــ مولوی عبدالعلیم محمد نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی

غالب تخلص، مرزا نوشہ کہ نام سامیش اسد اللہ خان است، تازہ در دار الخلافہ شاہجہان آباد نکتہ سنجی مزاج اوست وموزونیت کلام از جوہر طبع وہاج او۔ شاعری است کہ مانندش درین عہد زمان معدوم و عالی طبعی است کہ ندش تا قطع دور دوران غیر معلوم۔ نظیری در تغزل پیش او بعلو نظرش از شعرای عامی است و عرفی در تشبیب بعرفان مضامین عالیہ و وحید الکلامی غیر نامی در فکر سخن نام برآوردہ و درین عرصہ گوی سبقت از ہمسران بردہ صاحب دیوان منیف است و این اشعار از ان استاد شریف است بیت: ص ۸۰ - ۸۲

گلستان سخن ــــ مرزا قادر بخش صابر

غالب تخلص، شبیر نیستان سخنوری، ببر بیشۂ معنی پروری، یکہ تاز عرصۂ کمال، یگانۂ کشور افضال، سیاح زمین سخن، دانای نوادہ فن، زبدۂ کملای جہان، مرزا اسد اللہ خان، معروف بمرزا نوشہ سلمہ الرحمن، سخن سنج بے مثل و نظیر، اور صاحب طرز دلپذیر ہے۔ خامۂ گوہر بار سے اقلیم سخن میں لوای جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا ستان مصر سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے۔ فضائل اگر اس قدوۂ افاضل کی ذات پر تکیہ نہ کرتے، فضیلت نہ رکھتے۔ اور کمالات اگر اس زبدہ کملا سے مدد نہ لیتے عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔ سیاہی رقوم اس کی رنگینیِ معنی سے ہم شکل طاؤس، صفحۂ قرطاس، اس کے فروغ مضامین سے، ہمرنگِ فانوس۔ برق طور اگر اس کی تجلی معنی کے مقابل ہوتی سرمہ ہو جاتی۔ شمع ایمن اگر اس کے شعلہ فکر کے سامنے آتی فروغ نہ پاتی۔ ایوان سخن اس کی فکر کی معماری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت، بنای کلام اس طبیعت کی مدد سے قاف کے ساتھ ہم متانت۔ وصف بزم میں رفتارِ قلم رقصِ ناہید کے برابر، بیان رزم میں صریر خامہ نعرۂ شیر سے ہمسر۔ فکر اگر حوصلۂ ہمت کے لائق جہد کرے فضای لامکان مرحلۂ مقصود کے روبرو دیدۂ مور سے تنگ نظر آوے۔ خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جاوے خزانۂ تحت العرش کو اس جایگاہِ رفیع سے گنج قارون سے پست تر پاوے۔ سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور شوخی اشارات اور حسنِ عبارات، گاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دینا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا،

ی کو فصل اور ملاقات کو وصل کی قبیل سے ٹھیرا کر مباحث سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حشو و زوایدسے بزم کلام میں شل صحبت زہاد اجتناب
اور اسی طرح اور باتیں جو لوازم سخن اور مقتضیات فن سے ہیں جیسی اس ناظم کشور کمال میں مشاہدہ ہوتی ہیں کم کسی میں دیکھی گئیں۔ ابیات ریختہ
ت ریختہ۔ دقایق فارسی جواہر قدس کا بیختہ۔ ہرچند اشعار ریختہ حد حصر سے خارج اور اندازۂ شمار سے افزوں تھے لیکن از بسکہ کمر یار اور دہان
ر کا مضمون زیب اشعار ہوتا ہے انھیں مضامین کی رعایت سے اختصار کو پسند کیا اور چند بیتیں دلبروں کے لب کے مانند نقطۂ انتخاب کے
سے مزین کر کے ایک دیوان مختصر مرتب کیا۔ اور مجموعہ فارسی کا تو دیوان محشر سے بھی زیادہ اشعار پُر غوغا اور ابیات بلند صدا سے مملو اور مشحون
ریختہ میں گاہ گاہ اسد تخلص بھی کیا ہے لیکن غالب غالب اور ہر طالب اسی نام سے ہند و فارس میں اس کے نشان کا طالب ہے۔
یہ چند شعر لکھ کر چشم بند غفلت کا چارہ اور جلوہ شاہد مدعا کو آشکارا کرتا ہے۔ (ص ۳۸۲ — ۳۸۳)

فت آسمان ——— مولوی آغا احمد علی احمد

.... و برین وزنست مثنوی درد و داغ غالب۔ نام او اسد اللہ خان، تخلص غالب۔ او خودش گفتہ بیت :

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

ت میرزا نوشہ، اکبرآبادی المولد و دہلوی المسکن، شاگرد میرزا عبد الصمد اصفہانی کہ پیشتر ہرمزد نام داشتند۔ قوت طبع و قدرت سخن گزاری نظام
امر او را مسلمست ملکہ بیشتر نثر او دلرباتر۔ لیکن حال سخندانی او سیما کیفیت قاطع برہان او کہ بیشتر در فش کامیابی خطابش کردہ و ہمچنین جوہر تیغ تیز او
مطالعہ جوابہای آن خصوصاً مؤید برہان و شمشیر تیز تر بر تماشائیان سخن حالیست۔
در لارنس گزٹ میرٹھ مطبوعہ ۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۹ء نوشتہ عمر او تخمیناً ہشتاد و دو سال بودہ است۔ مولوی عبد الحکیم جوش تخلص
ن اسکول میرٹھ تاریخ وفات او کہ در سنہ ع یکہزار و ہشتصد و ہشتاد و پنج واقع شدہ چنین یا فتہ ع مرد ہیہات میرزا نوشہ "آہ شمس الملک
مرالدین حیدر خان بہادر مظفر جنگ فرماید: شعر

سال میلاد اوست لفظ غریب   سال فوتش بمرد غالب آہ

پس عمرش ہفتاد و سہ باشد۔
آغاز این مثنوی (کہ ہیچ ہرتی مثلش نیست و در کلیات او بطبع آمدہ) این کہ بیت :

بے تکلف برزگری پیشہ داشت   در دل صحرای جنون ریشہ داشت

آنچہ از اعتراض و اصلاح برین شعر خوک شدہ آہ واقع شدہ در مؤید برہان صفحہ (۲۴۲) مرقوم گشتہ فلا نکررہ
و ہم برین وزنست مثنوی رنگ و بوی او کہ ہمین چار ورقست۔ اولش اینکہ بیت :

بود جوان دولتی از خسروان   غازہ کش عارض ہندوستان

و ہم برین وزنست مثنوی یک ورقہ او کہ در تہنیت عید الفطر بابو ظفر بہادر شاہ نوشتہ ابتدایش اینکہ بیت :

باز برآنم کہ بہ دیبای راز   از اثر ناطقہ ہندم طراز

و ہم برین وزنست دیگر مثنوی یک ورقہ او کہ در تہنیت عید بولیعہد فتح ملک رقم کردہ، سر آغاز اینست بیت :

منکہ درین دایرۂ لاجورد   کردہ ام از حکم ازل آنچہ رود

قافیہ بلہجۂ قدما۔ الفاظ و تراکیب متقدمان در کلامش بسیار یافت می شود و ہرچہ دلش خوش می کند می نویسد، قلیل بود یا فصیح۔ در پایان
این مثنوی گفتہ بیت :

گرچہ بہ از نظم نظامیست این   مدح مخوان خط غلامیست این   (ص ۱۶۶ - ۱۶۷)

سخن شعرا ــــــ عبدالغفور نساخ

غالب تخلص، مخدوم اعظم، نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ، معروف بہ میرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ خاں، اولاد میں افراسیاب کی ہیں۔ مولد ان کا اکبر آباد، مسکن دہلی، طبیعت ان کی بہت دشوار پسند ہے۔ اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوری ترشیزی و میرزا عبدالقادر بیدل کے ہم پہلو ہوتے ہیں۔ اشعار اردو میں بھی وہی انداز ہے۔ اوائل میں اردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے۔ بڑا عرصہ گزرا کہ کلکتے میں بھی آئے تھے۔ راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ کلیات ان کا نظر سے گزرا۔ ۱۲۸۵ بارہ سو پچاسی ہجری میں انتقال کیا۔

(ص ۳۴۲)

تذکرہ فرح بخش ــــــ نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی

فردوسی رزم، خسرو بزم، کلیم کلام، نظامی نظام، جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بغالب دہلوی علیہ الرحمہ مشاہیر بلغائے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے اور دیوان اردو اور کلیات فارسی جناب ممدوح مشہور آفاق ہیں، اس لیے صرف ایک شعر تبرکاً لکھتا ہوں۔

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آخر ۱۲۸۵ ہجری شہر شاہ جہاں آباد میں جناب ممدوح کا انتقال ہوا۔ تواریخ انتقال اکثر شعرائے نازک خیال نے لکھی ہیں۔ ازاں جملہ یہ تاریخ جناب مولانا محمد عباس رفعت کی مجکو یاد ہے، قابل تحسین و داد ہے،

جانِ اربابِ سخن غالب عالی ہمت ناظم سحر بیان ناثر والا فطرت
رشک فردوسی و خاقانی و عالی در کمال ثانی خسرو و سعدی و حزین و شوکت
ابر مدرارِ کمالات و فرات دانش ماہر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوی ریاضِ رضواں گفت عباس کہ شایان سریر جنت

۱۲۸۵ (ص ۶۶ - ۶۹)

فرہنگ مجموعہ سخن

غالب تخلص، نام ان کا اسد اللہ خاں اور شاہ دہلی کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطاب ہے۔ ۱۷۹۵ عیسوی میں خاص شہر دہلی میں متولد ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں، قوم اتراک سے ہیں۔ مرزا غالب کے دادا کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہوکر ہند میں آئے اور لاہور میں معین الملک کے نوکر ہوئے۔ بعدہ دہلی میں آکر بادشاہی ملازمت اختیار کی۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے اور دہلی سے اجڑ کر اکبر آباد میں جا رہے مرزا غالب کا سن پانچ برس کا تھا جب اُن کے باپ نے قضا کی تب نصر اللہ بیگ خاں اُن کے چچا نے ان کو پرورش کیا۔ وہ از جانب مرہٹا اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ بعدہ ایک صاحب بہادر گورنر جنرل کی طرف سے چار سو سوار کے رسالہ دار ہوکر دو پرگنوں کے جاگیردار ہوئے۔ آخر کو وہ جاگیر ۱۸۰۶ عیسوی میں ضبط ہوگئی اور اُس کے عوض تنخواہ ملنے لگی جب تو مرزا غالب شاہ جہاں آباد میں آکر آباد ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے اور زبان اردو میں فقط میر کے معتقد تھے۔ ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۱۸۶۶ عیسوی کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور دیوان قصائد فارسی و غزلیات فارسی اور نثر فارسی میں تاریخ مہر نیمروز اور انشائے پنج آہنگ و قاطع برہان و تاریخ دستنبو اور اردو میں ایک دیوان غزلیات مختصر موجود ہے۔

(ص ۱۱۱ ــــ ۱۱۲)

...ارے نورچشم ——— نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی

نجم الدولہ، دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ دہلوی المتخلص بغالب مصنف: ۱۔ مہر نیمروز ۲۔ ماہ نیم ماہ ۳۔ پنج آہنگ ۴۔ دستنبو ۵۔ دیوان فارسی ۶۔ دیوان اردو ۷۔ قاطع برہان ۸۔ تیغ تیز ۹۔ عود ہندی ۱۰۔ درفش کاویاں ۱۱۔ گوہر افشاں ۱۲۔ قادرنامہ ۱۳۔ پسا چین ۱۴۔ روان ...رین ۱۵۔ اردوی معلا۔

...ثانی ظہیر و ظہوری تھے۔ دوم ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہی ملک بقا ہوے۔ جناب ممدوح کے صدہا شاگرد رشید میں سب سے کمتر یہ راقم ...م ہے۔ جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر مرحوم رئیس ٹونک کی ...ح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا۔ نواب موصوف نے ارسال صلہ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیر کی میرزا صاحب نے ایک خط منظوم لکھ بھیجا۔ ...ب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کیے۔

چند سال وفات سے پہلے مرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے میرزا صاحب کو لکھا کہ میں ...رسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں جناب مرحوم نے اُن کو خط فارسی تحریر فرمایا جو کہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیات دیوان و انشای جناب موصوف ...میری نظر سے نہیں گزرے اور وہ میرے پاس موجود تھے۔ بمراد اشاعت کلام استاد و استفادہ ادبای نقاد، احقر العباد نے تبرکاً اس اپنی ...شا میں رقم کیے۔

منظوم

گفتم بخرد بخلوت انس   کی شمع و چراغ ہفت ایوان

آیا ز چہ رو بود کہ نواب   ننوشت جواب نامہ امسال

آنگونہ عریضہ کہ دانی   درویش نوشتہ سوی سلطان

آنگونہ قصیدہ کہ گوئی   از صفحہ دمید سنبلستان

این ہر دو رسید و نیست پیدا   زانسو اثری بہیچ عنوان

رنجیدہ مگو ز مدح نواب   ای کاش نگشتی ثنا خوان

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم   از گفتۂ خویشتن پشیمان

عقلم بجواب گفت غالب   زنہار مخور فریب شیطان

نواب بفکر ارمغان است   تا نامہ فرستدت بسامان

وانہا کہ بخاطرش گذشت است   زود آنہمہ جمع کرد نتوان

زود ست کہ جمع نیز گردد   دیر ست کہ دادہ است فرمان

تا راہروان بجو و بر گرد   آرند بکوشش فراوان

دیبا ز دمشق و مخمل از روم   الماس ز معدن و زر از کان

فیل از دکن و زمرد از کوہ   توسن ز عراق و دُر ز عمان

فیروزہ نغز از نشاپور   یاقوت گزیدہ از بدخشان

خمیازہ تیز رو ز بغداد   شمشیر برندہ از صفاہان

پشمینۂ قیمتی ز کشمیر   زربفت گران بہا ز ایران

بالجملہ درنگ چون ازین روست   بر رنج و ملال نیست برہان

چون پیر خرد بدل فریبی   گفت این ہمہ رازہای پنہان

گشتم بدم امید داری — مرہم نہ زخم یاس و حرمان
گفتم کہ چو با من این کرم کرد — آن قبلہ و قبلہ گاہ اعیان
ناچار ز راہ حق گزاری — تا کردہ شود تلافی آن
من نیز طلب کنم برایش — این مشکل اگرچہ نیست آسان
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیمان
از عالم غیب جام جمشید — از چشمۂ خضر آب حیوان
عمر ابد و نشاط دائم — نیرزی دل و ثبات ایمان
توفیق جواب نامۂ خویش — تعجیل عطا و بذل و احسان

منثور

والا یزدان ہست و بود آفرین را کہ گماشتن وخشور و فرستادن منثور از آلای اوست بے مرنیایش و آوردندۂ گرامی منثور ہما ناہمایون وخشور را کہ پس از وی ازان دہ نہ دو پیرہ وخشور کہ با زپسین آن جمع با خداوند درنام انبازی دارد۔ ہر یکی بہر ہنگام بجای اوست۔ بی اندازہ ستایش غالب سخن گزار ہیچ منگار۔ اگر درین مرحلہ دلی سوی کلک و کاغذ گرایش دارد نامہ نگار را بسا دو ستانند کہ سواد مردم چشم گزرگاہ آنان نشدہ و در سیہ خیمۂ سویدائی دل می مانند۔ نیرنگ روزگار در تنگ نگرستنی ست پست پایگی بدان پایہ کہ از فرد ماندگی خاک نشین مکیشہرم و بلند نامی بدان اندازہ کہ بمیانجی گری خامہ و نامہ رو شناس اعیان دہر م حاشا کہ این چنین پست پایۂ بلند نام جز من در دہر توان یافت۔

از دیر باز بہ نظم و نثر نمی گرایم۔ نظم خواہی پارسی و خواہی اردو خوابی ست فراموش۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین نماندہ ہرچہ نوشتہ می شود بگید دراردو ست۔ اینک خواجہ حق پرست حق شناس بلند پایہ مولانا عباس کہ ہم ازان گروہ پرشکوہ ست کہ با من بزبان قلم راہ سخن کشودہ اند از عیال فرمان فرستاد کہ غالب فرسودہ روان بنام آن ہمہ دان نامہ در پارسی زبان نویسد۔ یارب فرمان چون بجا آورم و در نامہ چہ نویسم۔ باری از توانائی بنان بلکہ از اثر روائی آن فرمان جنبش خامہ لفظی چند کہ نخواندن نیرزد برروی ورق فرو ریخت تا آن ورق بہم پیچیدہ سوی کارفرما روان داشتہ آمد۔ چشمداشت آنکہ برگ سبز از درویش بہ تحفگی پذیرفتہ آید۔

نگاشتہ سہ شنبہ و چہارم ربیع الاول سال رستاخیز (ص ۴۶ — ۵۲)۔

انتخاب یادگار ——— منشی امیر احمد امیر مینائیؒ

غالب، اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، خلف مرزا عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا، قوم ان کی ایبک ہے اقوام ترک سے۔ جد اعلیٰ ان کے ماوراء النہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے۔ جب ریاست مغلیہ برہم ہوئی ملازم مہاراجہ جے پور ہوئے اور بود و باش شہر آگرہ میں اختیار کی۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں اِن کے والد ماجد خواجہ غلام حسین خاں کمیدان متوطن شہر آگرہ کے یہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے۔ ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی۔ پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے جس کا نام آتش پرستی میں ہُرمُزد اور بعد قبول اسلام عبد الصمد تھا تلمذ ہوا۔ دو برس وہ ان کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی جب سن تمیز کو پہنچے مرزا الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کے یہاں منسوب ہوئے اور شہر دہلی میں توطن اختیار کیا۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعۃ النہار آشکارا ہے، نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار رہے۔ تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔

فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں۔

قادر نامہ، جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے۔

مہر نیمروز اور ماہ نیم ماہ یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عہد جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے۔

دستنبو، جس میں غدر کے واقعات ہیں۔

قاطع برہان، جس میں برہان قاطع کے بعض لغات پر خدشات ہیں۔

پنج آہنگ، اس میں فارسی زبان کے منشآت ہیں۔

اردو میں ایک دیوان

اور اردوی معلی

اور عود ہندی

ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں۔

الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت اُن کے نتائج فکر سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے اس سرکار فیض آثار (ریاست رامپور) کے نمک خوار قدیم ہیں۔ جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں طاب ثراہ کو ان سے تلمذ ہے۔ اُس عہد میں بھی وظیفہ خوار رہے۔ بندگان ولی نعمت ابد اللہ ظلال اجلالہم (نواب کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں جانشین فردوس مکان) کے عہد دولت میں بھی جب تک زندہ رہے مورد پرورش بے شمار رہے۔ چوہتر برس کی عمر پائی۔ بارہ سو پچاسی ہجری میں ذیقعدہ کی دوسری تاریخ وفات پائی۔ سلطان نظام الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے جس کا ہر حرف لاجواب ہے۔ (ص ۲۴۰ — ۲۴۱)

شمع انجمن ——— نواب سید محمد صدیق حسن خاں

غالب، میرزا اسد اللہ خان دہلوی مخاطب بنجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ بہادر، از سخنوران نامی شاہ جہان آباد و صاحب قوت فکر خدا داد است۔ موجد مبانی خوش و مخترع معانی دلکش، شیر بیشہ سخن پروری، شہریار مصر معنی گستری، در نثر و نظم طرز خاص دارد و تراکیب دلنشین ابداع می نماید۔ بسیاری از معاصرانش قائل بکمال او در نثاری و نظامی اند، وجمعی از اقران بر طرز ادای کلام او اعتراضات کردہ اند چنانچہ از ملاحظہ قاطع برہان وساطع برہان چون صبح، روشن می شود۔ اما شک نیست کہ قدرت او بر اصناف سخن از نثر و نظم بیش از دیگران است قصاید و مثنویات وغزلیات ورباعیات دارد اما مخالص قصاید خوب واقع نشدہ و قصیدہ بہتر از غزل می سراید۔ غالب قصاید او در مدح حکام فرنگ و رؤسا و اکابر ہندوستان ست۔ از وظیفہ خواران بہادر شاہ پادشاہ دہلی ست۔ مذہب شیعی داشت، چنانکہ خود ہم میگوید

غالب نام آورم نام ونشانم مپرس　　ہم اسد اللّٰہم وہم اسد اللّٰہیم

وہیچ وقت خود را از شرب مدام وگردش جام معاف نمی گذاشت۔ زبان فارسی نیک تر می داند واز ایراد الفاظ عربی حتی الامکان گریز می نماید۔ مہر نیمروز و دستنبو و منشآت وجز آن از کتب فارسیہ یادگار او ست۔

محرر سطور در ایام اقامت شاہجہان آباد مکرر او را دیدہ و تقریر جادو تاثیرش گوش کردہ وغزلہا از زبان او شنیدہ۔ قصیدہ وغزل بسرعت تمام می گفت وطرز خود را در سخن سنجی از دست نمی داد۔ احیاناً شعر ریختہ اردو ہم می گفت۔ دیوان مختصری در ریختہ دارد۔ دیوان فارسی او بوجہ طبع دائر وسائر ست۔ مجموعۂ ابیاتش دہ ہزار وچہار صد وبست وچہار بیت است وہر یک از روی شوخی تاثیر وخوبی تقریر، پیرایۂ گلوی لبل وآویزۂ گوش دل ست۔

لفظ غریب تاریخ ولادت اوست ۔ وفاتش در ۱۲۸۵ھ بودہ ۔ تتبع کلام ظہوری و عرفی شیوہ مرضیہ اوست و استفادہ از سخن طالب و حزین راہ و رسم دیرینۂ او ۔ بنا بر التزام چند گوہر شاہوار از صدف طبع او درین جا بسلک بیان کشیدہ می آید .... (ص ۳۴۷ ــ ۳۴۸)

آب حیات ــــــ محمد حسین آزاد دہلوی

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا ۔ اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے ۔ لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرائے ہندوزادہ سارے اکبرآباد میں علو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح اردوئے معلّٰی کے مالک ہیں ۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جاوے .... الخ

طور کلیم ــــــ سید نور الحسن خاں

غالب فخر عرفی و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر افراسیابی دودمان اکبرآبادی مولد دہلوی مسکن، لفظ غریب تاریخ ولادت اوست ۔ وفاتش در ۱۲۸۵ھ واقع شدہ از تالیفات اوست پنج آہنگ، دستنبوی و مہر نیم روز و قاطع برہان در پارسی زبان دیوانی دارد مجموع ابیاتش دو ہزار و چار صد و بست و چہار است ۔ در اوائل بروش میرزا بیدل حرف می زد آخر الامر انداز دیگر مطبوع ابداع نمودہ و دیوانی کہ در ریختہ است فراواں ابیات ازان ساقط کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ است ۔ اولاً اسد تخلص می کرد چنانچہ در بعضی مقاطع غزلیات ہنوز موجود است ۔ مدت مشق وی پنجاہ سال است ۔ در پارسی پایہ اش از فحول اساتذہ کم نیست و در ریختہ ہم تبہ اش بیارا گر کسی ست ۔ اگر حدیقۂ نظم را نوبہار ست در عرصۂ نثر تیز مرد کار ست ۔ قدرتی کہ بر جمیع اصناف سخن او راست نتواں گفت ۔ نمی بینی کہ تو چہ بعضی سخنوران ہمہ بغزل معطوف ست و جز غزل نغمۂ دیگر نمی تواستند سرودن، و راس المال برخی ہمہ قصیدہ است و جز قصیدہ ترانۂ دیگر از ایشان نتوان شنودن و علی ہذا القیاس ۔ غالب سخنوریست کہ اگر زمین غزل است بآسمان بردۂ اوست و اگر عرصۂ مثنوی ست پامال کردہ او، و چگامہ اش بقصیدۂ عرفی ہمپایہ است و چامہ اش چون غزل نظیری گرانمایہ و شگرف تر آنکہ وی بہر وادی کہ قدم می کشود سبر غست تمام می پیموز و با اینہمہ فروغ معنامین و حسن تراکیب و شوکت الفاظ و رنگینی معانی و متانت بیان و شستگی زبان کہ از شعر اکثر کسی را بالقوۃ میسر بود بالفعل نصیب او بود ۔ آنچہ بہ نسبت دیگراں مبالغہ اش تا مندوریجا نفس الامرش خوانند ۔ انصاف بالای طاعتست اگر بہ پیشینیان ہمسرش نگوئیم کہ افضل المتقدمین دیوانیم کہ بیشترش از ایشان پنداریم و باکمال سخنوری کمال سخن فہمی داشت و چنانکہ می شاید لطف شعری بر داشت حضرت شیفتہ می نگارد و بی مضامین شعری را کماحقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پی می برد و این فضیلتی ست کہ مخصوص اہل سخن ست ۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ برسی چہ خوش فکر اگر چہ کمیابست اما خوش فہم کمیاب تر ۔ خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شرب یافتہ و حظی ربودہ انتہی

بنا بر ضابطۂ شعری چند ثبت می شود ورنہ دیوانش ہمہ نقطۂ انتخاب است ۔ (۴۲ ــ ۴۳)

بزم سخن ــــــ سید علی حسن خاں

غالب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک خلف الرشید عبد اللہ بیگ خاں اکبرآبادی مولد و دہلوی منشا ۔ حق انیست کہ زبان ریختہ از دکار بالا گرفت و گفتار پارسی پایۂ والا اگر او را مجدد سخن گویم بجا است و اگر مجتہد فن خوانم روا فروزندگر دودمان فصاحت است و شمع شبستان بلاغت ۔ ستایش او محتاج بیان نیست ۔ ہر کہ بہرۂ از ادراک داشتہ باشد داند کہ او کیست و گفتارش چیست ۔ در پارسی تصانیف متعددہ دارد ۔ در ریختہ دیوانی گزاشتہ ۔ در ۱۲۸۵ھ درگزشت ۔ او راست .... (ص ۸۸)

جامع الاشعار ——— رِوَرِنڈا یڈورڈسیل

مرزا غالب ۱۷۹۵ء میں خاص شہر دہلی میں متولد ہوئے۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے اور دہلی سے اجڑ کر اکبر آباد میں جا رہے۔ مرزا غالب کا سن پانچ برس کا تھا جب ان کے باپ نے قضا کی...... وہ جاگیر ۱۸۰۶ء میں ضبط ہو گئی اور اس کے عوض تنخواہ ملنے لگی۔ ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۷۶ھ میں مطابق ۱۸۶۲ء کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ (ص ۳۰)

محبوب الالباب فی تعریف الکتب و الکتاب ——— مولوی خدا بخش خاں

کلیات غالب چھاپہ دہلی، محتوی است بر قصائد و غزلیات۔

مرزا اسد المعروف بہ مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ابن عبد اللہ بیگ خان۔ اصل وی اتراک است۔ بعد ازین کہ زمانۂ سلجوقیان سپری شد اجداد مرزا مزبور بہ سمرقند اقامت گزیدند۔ جد امجد حضرت ایشان از پدر بزرگوار خود رنجیدہ رخت بجانب ہندستان کشیدہ و در لاہور با معین الملک ملاقی شدہ در سلک رفقای وی منسلک گردید۔ بعد ازین کہ کار معین الملک خراب گشتہ وی بملازمت شاہی در آمد۔ والد مرزا نوشہ در دہلی متولد شد و ہمانجا نشو و نما یافت، باعث بعضے وجوہات توطن اکبر آباد گزید۔ مولد مرزا نوشہ اکبر آباد است۔ چون بعمر پنج سالگی رسید پدر میرزا جہان فانی را پدرود کرد۔ نصر اللہ بیگ خان عم مرزا دران زمان من قبل مرہٹہ صوبہ دار اکبر آباد بود، مرزا را بہ آغوش شفقت خود گرفتہ بتربیت وے پرداخت۔ چونکہ میرزا نصر اللہ بیگ بموافقت جنرل لیک کارہای نمایان کردہ بود بجلدوی خدمت مرزا مشار الیہ را دو پرگنہ در مضافات اکبر آباد از دولت انگلشیہ جاگیر تاحیات شد۔ در سنہ ۱۸۰۶ء مرزا نصر اللہ بیگ مغفور فوت شد۔ موافق قرار داد جاگیر عطیہ ضبط گردید وظیفۂ نقدی برای صاحب ترجمہ معین شد۔ عرصہ برین نگزشتہ بود کہ مرزا از اکبر آباد بدہلی شتافت ہمان جا منزوی شدہ بر وظیفۂ معینہ قناعت کرد۔ یکبار بغرض سیاحت رخت بجانب بنگالہ کشید و چندی در کلکتہ ہم قیام داشت۔ روزی در یک مشاعرہ عزیزی اعتراضی بار در بر شعر مرزا مزبور وارد کرد۔ مثنوی باد مخالف در جواب ہمان اعتراض است۔ باین کہ بجدامی کارہای دنیا تعلق نداشت مگر با غایت عزت و مکنت می زیست در شعر فارسی در عصر وی دیگری مثل وی نبودہ۔ دیوان بزبان اردو ہم دارد در شعرا اردو ہم روش نارسی نگذاشتہ۔ بہر حال ہر چہ از مرزا ست خیلی خوب است۔ در ایام غدر دہلی در آنجا بود و باعث بعضی ارباب ریاست کہ با فوج انگلشیہ داخل شاہجہان آباد بودند مرزا ازمہلکہ آن رستاخیز قیامت نجات یافت و حالات خود را خود در رسالہ حوالہ قلم نمودہ آن را دستنبو نام کردہ۔ این رسالہ را محض بزبان فارسی بلا آمیزش کدامی الفاظ عربی نوشتہ باین قید این رسالہ ہم خوب نوشتہ۔ مرزا محض بروش شعرای زیست و اقدام با قدح راح می کرد و در آخر عمر ثقل سماعت ہم داشت۔ مجموعۂ نثر و نظم وی ہم فارسی و ہم اردو مجلد ضخیم می شود۔ عمر طویل کرد۔ در سنہ ۱۲۸۵ در دہلی وفات یافت۔

مطلع قصیدۂ اول سے　　اے زدہم غیر غوغا در جہان انداختہ　　گفتہ خود حرفی و خود را در گمان انداختہ

مطلع دیوان!　　اے تحیلا و ملا غوی تو ہنگامہ زا　　با ہمہ در گفتگو بے ہمہ با ما جرا　　۶۲۹ — ۶۳۱

...... الحق کلام میر عجب مذاقی دارد کہ کمتر در کلام دیگر شعرا بہم می رسد۔ اسد اللہ خان غالب کہ در عصر خود در شاعری نظیر خود نداشت فرمودہ،

قطعہ

میر کے شعر کا کیا حال کہوں میں غالب　　جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

ریختہ کا وہ ظہوری ہے بقول ناسخ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

...... شیخ امام بخش ناسخ کہ بقول غالب "طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار راہوں کے ناسخ تھے" معروف دی بود دا درا در شعر اردو مسلم شمردہ ...... (ص ۶۳۱ — ۶۳۲)

یادگار دہلی ——— مولوی سید احمد ولی اللہی

حضرت محبوب الہٰی کے روضۂ مبارک کے قریب ...... شروع بازار کے متصل
چونسٹھ کھمبہ سنگ مرمر کی ایک عمارت ہے نہایت عجیب سنہ ۱۰۳۴ ہجری کے بعد بنی ہے اس میں سنگ مرمر کے چونسٹھ ستون لگے ہیں۔
اس سبب سے اس کو چونسٹھ کھمبہ کہتے ہیں۔ اس میں مرزا عزیزالدین کوکلتاش خاں کی قبر ہے جو شمس الدین اتکہ خاں کے بیٹے ہیں۔ سنہ ۱۰۲۴ ہجری مطابق سنہ ۹ جلوس جہانگیری موافق ۱۱۲۴ء احمد آباد گجرات میں انتقال کیا اور یہاں لاکر دفن کیے گئے۔ ان کو جہانگیر کے دربار سے خان اعظم کا خطاب حاصل تھا یہ نہایت خوش تقریر بزرگ اور نستعلیق کے استاد تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اس عمارت کے شمال کی جانب ایک احاطہ میں

مرزا نوشہ غالب دہلوی

کا مزار ہے عجیب پایہ کا شاعر گزرا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دہلی میں شاعری کو ختم کر دیا۔ خدا تعالیٰ نے عجیب وغریب دل و دماغ ان کا بنایا تھا۔ جس طرح فردوسی فارسی نظم میں عربی الفاظ استعمال نہیں کرتا تھا اسی طرح مرزا نوشہ بھی اپنی نظم و نثر میں عربی الفاظ بہت کم استعمال کرتے تھے۔ فارسی تحریر میں تو مسلم الثبوت مانے ہوئے استاد ہیں مگر اردو میں بھی جو انھوں نے ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ بھی بالکل ایک نیا رنگ ہے۔ اگر ان کے دیوان کے اُن اشعار کو چھوڑ کر صرف صاف ستھری اردو کے اشعار پڑھے جائیں تو آدمی کو متحیر کر دیتے ہیں مثلاً دو ایک شعر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

~~~~~~~~

رفو ئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی یہ مت سمجھو کہ پاس دردسے دیوانہ غافل ہے

~~~~~~~~

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

جس دماغ سے یہ اشعار نکلے ہیں اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

مرزا نوشہ غالب، ابراہیم ذوق، مومن خاں یہ تینوں اپنے وقت میں فرد تھے۔ آپس میں بہت بڑی محبت اور اتحاد رکھتے تھے مگر ہر ایک کی، طرز تحریر و وضع جدا جدا تھی۔

مومن خاں (ان کا مزار درگاہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے احاطے کے باہر جانب غرب واقع ہے) ذوق اور غالب سے بڑے اور عجیب وضع قطع سے رہتے تھے۔ لمبی لمبی زلفیں ہاتھ پیروں میں مہندی لگی ہوئی، پور پور چھلّے انگوٹھیاں، پیروں میں گھیتلی جوتیاں، سر پر زری ٹوپی غرض ان کی یہی آن بان تھی، مگر ابراہیم ذوق کی مولویانہ بالکل وضع تھی۔ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے عالم تھے۔ اکثر ان کے ہاں عربی کتب کا درس رہا کرتا تھا۔ اول ہی دن سے نہایت متقی پرہیزگار، رندوں اور آزادوں کی صحبت سے متنفر تھے۔ اسی سبب سے آپ کے اشعار بالکل سادے سودے اور رنگ آمیزی سے خالی ہیں اگرچہ کہیں کہیں اشعار میں شراب نوشی اور ہجر اور مصیبت کا ذکر آگیا ہے لیکن اس ذکر میں نہ شراب نوشی کی رنگینی پائی جاتی ہے اور نہ فراق یار میں درد ٹپکتا ہے۔ آپ کی تمام عمر نہایت عیش کے ساتھ گزری۔ بہادر شاہ بادشاہ کے استاد تھے (ان کا مرقد کلّو کے تکیے میں متصل قدم شریف ہے)

مرزا غالب نرالی وضع رکھتے تھے۔ سر پر چوگوشیا اونچی بانکی ٹوپی اور ایک لمبی قبا اور اس پر ایک جامہ دار ڈھیلا جبّہ پہنتے تھے ضعیفی میں آپ کی کمر بھی جھک گئی تھی۔

آپ کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔ لوح مزار پر یہ تاریخ کندہ ہے

یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ

رشک عرفی وفخر طالب مُرد ۔۔۔ اسد اللہ خان غالب مُرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں ۔۔۔ تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح ۔۔۔ ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

(ص ۲۰۶ ـــ ۲۰۷)

ناظم برقی پریس میں چھپوا کر دفتر نگار گھیر سنی رام پور یو۔پی سے شایع کیا۔

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نادراتِ شاہی: شاہ عالم ثانی کا اردو اور ہندی کلام جو تاریخ زبان کے مرتبین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے مغل بادشاہوں کی خدمت زبان کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا عرشی کے تفصیلی مقدمے نے اس کتاب کی اہمیت اور اُس دور کی تاریخ کو جس عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ قیمت ———— ۸ روپے

وقائع عالم شاہی: کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ جس میں شاہ عالم کے عہد کی نوادر معلومات درج ہیں۔ افراتفری کے دور کی ایک اہم تاریخ ہے مولانا عرشی کے مقدمے اور حواشی نے مزید سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ تاریخ ہندوستان کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ———— ۸ روپے مجلد

سلکِ گوہر: انشا کی بے نقط کہانی جو خود انشا کی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو نثر کے کلاسکی نمونوں میں اس کتاب کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کا تعارف بھی مولانا عرشی ہی کے قلم سے ہے اور اسے بھی اُن کی دوسری کتابوں کی طرح ظاہر و باطن کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ قیمت ———— ۳ روپے مجلد

متفرقاتِ غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ اس کتاب میں ادیب صاحب نے غالب کی بہت سی نظم و نثر کی ایسی تحریریں جمع کردی ہیں جو اس سے پہلے کبھی اور شایع نہیں ہوئیں۔ غالب سے متعلق لٹریچر اس کتاب کے بغیر نامکمل رہے گا (طباعت ٹائپ) قیمت ـ ۵ روپے مجلد

اوراقِ گل: مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، ریاست رام پور کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں کا انتخاب جو بہترین آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ شاعر کی تصویر عکس تحریر اور حالات زندگی نے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جوشؔ، جگرؔ، دانشؔ، اخترؔ شیرانی جیسے دو درجن سے زیادہ شعرا اس میں شریک ہیں۔ یہ تذکرۂ شعرا اپنے اہتمام طباعت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مثالی ہے۔ قیمت ــ ۱۵ روپے مجلد

رامپور انتھالوجی: یہ کتاب مشرقی شعرا کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے جسے انگریزی کے مشہور شاعر جے اے جیپ مین نے ترتیب دیا ہے۔ حافظؔ، سعدیؔ، غالبؔ، خیامؔ اور عرشیؔ کے کلام کو جس خوبی سے انگریزی نظم میں منتقل کیا گیا ہے وہ لائق داد ہے اس لیے کہ کہیں بھی نزاکت بیان مجروح نہیں ہونے پائی۔ قیمت ———— دس روپے مجلد

نگار، بک ایجنسی رامپور، یو۔پی

قیمت | فی پرچہ: ۷۵ نئے پیسے
| سالانہ: دس روپے

زبانِ خلق

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد)

مضامین اچھے ترتیب بھی قابلِ تعریف، خدا مبارک کرے اور رسالے کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)

کل نگار نظر نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ایک طرف آپ نے نگار کی روایات کا لحاظ رکھا ہے اور دوسری طرف اس میں کئی خوشگوار اضافے کیے ہیں۔ مستقبل کے لیے پروگرام بھی شاندار ہے۔

یوں تو اور مضامین بھی قابلِ قدر ہیں لیکن غالبیہ کا عنوان مجھے بہت پسند آیا۔ یہ بہت مفید سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی ۔۔۔۔

آپ نے یہ بڑی ذمہ داری اٹھالی ہے لیکن آپ کی صلاحیت اور انہماک سے توقع ہوتی ہے کہ اس کا حق ادا کریں گے۔

ڈاکٹر عبد العلیم (علی گڑھ)

غالبیہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ یوں تو میرا خیال ہے کہ اگر ہم لوگ ایک عرصے کے لیے غالب کو اپنی قبر میں آرام کرنے دیں تو غالبیات کے لیے بہتر ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ میری رائے کوئی ماننے کا نہیں اور جیسا کہ صفحہ ۲۵ کے اشتہار میں کہا گیا ہے غالب سے چھیڑ چلتی رہے گی۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی)

نئے سال ۔۔۔ نگار کی شکل میں جلوہ نما ہوا ایسے وقت تو خوشی کی دوہری خوشی کر دی اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو اکبری رکھے۔

میکش اکبر آبادی (آگرہ)

خوشی کی بات ہے کہ آپ نے نگار کا معیار قائم رکھا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ "غالبیہ" کے اضافے سے اس کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی۔ تاباں کی غزل بہت ہی بہتر ہے۔ ابھی میں جستہ جستہ ہی مطالعہ کر سکا ہوں۔ مگر اپنے ذہن میں ایک شعر کی حرکت محسوس کر رہا ہوں اس لیے امید ہے کہ انشاء اللہ کبھی کوئی خدمت ضرور کر سکوں گا۔

غلام ربانی تاباں (دہلی)

آپ نے بہت محنت سے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ داستی بہت پسند آیا۔

مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ)

نگار ملا۔ شکریہ۔ پاکستانی ایڈیشن بھی آج دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل ہے اور وہ نقل۔ معلوم ہوتا ہے آپ نگار کے دفتر سے وہی کاغذ اٹھا لائے اور وہی کاتب۔ طباعت اور کتابت بہت اچھی ہے۔ اس کی داد اس لیے دے رہا ہوں کہ اچھی طباعت کی رامپور میں امید نہ تھی۔

مضامین سب اچھے ہیں آپ نے ۔۔۔ باری تعالیٰ پر سنجیدہ اور جاری بحث کو مضمون کے فوراً بعد سرت نوابی پر ایک مقالہ چھاپ کر شائع کر دیا تاکہ رسالہ متوازن ہو۔

محمد عتیق صدیقی (علی گڑھ)

یہ دیکھ کر خوشی ہوا کہ آپ نے نگار کی سابقہ روایات کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ شکل و صورت کتابت اور مواد نگار کے ماضی کا آئینہ دار ہے۔ خدا آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ اس کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

غالبیہ دیکھا بہت اچھا ہے

آپ نے آئندہ کا جو پروگرام پیش کیا ہے وہ بھی خاصا شاندار ہے اور آپ کی اہلیتوں سے توقع ہے کہ آپ کامیابی کے ساتھ اس کو پورا بھی کر سکیں گے۔

مرتضیٰ حسین فاضل (لاہور)

نگار ملا ۔۔۔ اتنا دل کش کہ کرشمہ دامن دل کھینچنے لگا۔ جو صفحہ الٹا وہ عنوان نظر دوز و ذوق افزا سے آراستہ تھا۔ خدا اس نگار لبیار شیوہ کو آپ کے ہاتھوں تابندہ و پائندہ رکھے۔

ظفر قریشی (مدیر ماہ نو کراچی)

غالبیہ والی تجویز اور اس کی ابتدا بہت اچھی ہے آپ لوگ یہ کام خوب کر سکتے ہیں غالب کو اپنے زمانے میں اتنے اور ایسے قدر دان نہیں ملے جتنے اب ملے ہیں اور رامپور والوں نے تو کبھی اس کی ہر طرح عزت افزائی کی اور سرپرستی بھی۔

فاضل زیدی (رچپ ضلع سکھر)

بخدا آپ نے خوب رسالہ نکالا ۔۔۔ اور غالبیہ تو بہت ہی خوب مرتب کیا ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس موضوع میں دلکشی باقی نہیں رہ گئی۔ لیکن آپ نے اس میں بھی جدت و ندرت پیدا کر دی۔ میرے خیال میں غالب کے متعلق اتنا مواد اور کہیں نہیں مل سکتا ــــ اسے آپ کا کارنامہ کہنا چاہیے۔

کھیل کھیل میں چوٹ لگ گئی

کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ درد بہت دن آپ کو پریشان کرے۔

— آپ تفریح سے محروم الگ رہیں اور کام کاج میں علیحدہ نقصان ہو۔

لیکن پریشان کیوں ہوتے ہیں

نورانی تیل

چوٹ زخم اور درد کی لاثانی دوا ہے۔

اس پر بھروسہ کیجئے۔

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئو ناتھ بھنجن - یو۔پی

ضروری اعلان :۔ پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں رسالہ جاری کر دیا جائیگا۔ نمائندہ نگار ۱۷/۶۱ این سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین فروری ۱۹۶۳ء | شمارہ ۲

ملاحظات

انّا للہ راز یزدانی صاحب کا ۱۲ جنوری کو اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ میرے لیے متوقع ہوتے ہوئے بھی سخت تھا۔ متوقع اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دل کے مریض تھے اور اس بیاپنی بیماری کی طرف سے بے پروا بھی۔ ویسے بھی دل کی بیماری سے کون جانبر ہوا ہے۔

جب میں نے نگار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ان کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ دراصل میں نے یہ کام اسی لیے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کہ مجھے اُن سے بہت کچھ توقعات تھیں اور وہ بے جا بھی نہیں تھیں، میں نے اُن سے مضمون کے لیے کہا اور وہ انھوں نے تیار کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو مضمون اُن سے جنوری کے شمارے کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور جس کی کتابت تک ہو چکی تھی وہ اس بار بھی نہیں آ سکا۔ فروری کے شمارے کے لیے انھوں نے غالب کے ان سہل ممتنع کا موضوع انتخاب کیا تھا۔ اور یہی ان کا آخری مضمون تھا جو نامکمل رہ گیا۔

راز صاحب میں کام کرنے کی جیسی لگن تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس پر طرہ ان کی گرفت تھی۔ وہ بہت جلد اپنے موضوع کا احاطہ کر لیا کرتے تھے۔ اور اُس سے بھی کم وقت انھیں مواد کو ترتیب دینے میں لگتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خان آرزو پر اپنا مضمون دو چار روز میں مکمل کر لیا تھا (یہ مضمون نقوش کے تازہ خاص نمبر میں شائع ہو چکا ہے) اس لیے میں مطمئن تھا کہ اگر فوری ضرورت پیش آئی تو یہ دو لوسی کام دے جائے گی۔ لیکن آج یہ سہارا ٹوٹ چکا ہے۔ اور میں ان کی یاد میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

راز صاحب نے ساری عمر شاعری اور صحافت میں گزاری ۵۶ء میں وہ عرشی صاحب کے ترغیب دلانے پر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے اور دو اہم موضوعات پر دل لگا کر کام کیا ان میں سے ایک تھا رام پور کا ماحول شعر و سخن اور دوسرا اُردو کی داستانیں۔ ان میں سے آخری کو انھوں نے میرے اصرار پر کتابی شکل میں مرتب کر کے میرے ہی حوالے کر دیا تھا۔ یہ کتاب انشاءاللہ جلد شائع ہو جائے گی۔

آج کل وہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے جو مولانا عرشی پریزنٹیشن والیوم کے نام سے موسوم تھا۔ جب اُن کے ذہن میں یہ اسکیم آئی تو شاید انھوں نے سب سے پہلے مجھ ہی سے اس کا ذکر کیا میں نے انھیں بتایا کہ یہی کام مالک رام صاحب بھی کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھے لکھ بھی چکے ہیں

اس لیے آپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔ مرحوم نے کہا "میں انھیں بھی لکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس کام میں اپنے ساتھ شریک کرلیں"۔ یہ جملہ اس لیے بڑا اہم ہے کہ اس سے اُن کی منکسر المزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے۔

وہ خود بھی بڑے جذباتی آدمی تھے۔ مظفر علی سید نے اردو تحقیق پر نقوش میں ایک مضمون لکھا اُس میں عرشی صاحب کا بھی ذکر کیا۔ راز صاحب سید صاحب کی رائے سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے یہ کہا وہ انھیں بھی کتاب کے مرتبین میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کہنے لگے تم انھیں لکھو۔ میں نے جواب دیا کہ میرا لکھنا موزوں نہیں آپ ایک کام کر رہے ہیں تو آپ ہی لکھیے بولے آغاز تم کردو میں بعد کو لے بڑھالوں گا۔ چنانچہ یہی ہوا میں نے سید صاحب کو خط لکھا انھوں نے تائیدی جواب دیا اور پھر راز صاحب کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ انھوں نے کتاب کے سلسلے میں بہت سے لوگوں کو لکھا۔ مجھ سے اکثر مشورہ ہوتا رہا۔ مگر یہ سخت تاکید ہوتی تھی کہ عرشی صاحب کو نہ معلوم ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ بات زیادہ نہیں چھپ سکتی تھی۔ عرشی صاحب کو معلوم ہوگئی اور انھوں نے مرحوم کو روکنا چاہا۔ اس پر میرے پاس بہت افسردہ آئے اور کہنے لگے کہ میں مالک رام صاحب کو اور عندلیب شادانی صاحب کو (عرشی نامہ کے ایک مرتب شادانی صاحب بھی ہیں) لکھتا ہوں کہ اب آپ ہی عرشی صاحب کو لکھ کر اجازت لیں۔ ابھی اُدھر سے جواب نہ آنے پائے تھے کہ خود ہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ یہ کام اس حد تک ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک روز پہلے شام کو اپنے ایک شاگرد پر شدید تقاضا کیا کہ وہ پریس سے طباعت کا تخمینہ بنوا لائیں جو مالک رام صاحب نے ان سے طلب کیا تھا۔

اس سلسلے میں جب کسی کا خط آتا تھا بے حد مسرور ہوتے تھے۔ سارے ہی اہم لوگوں کو دعوت دی تھی، ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، ڈاکٹر علیم صاحب، علامہ نیاز فتحپوری صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، ڈاکٹر باقر صاحب، شیخ محمد اکرام صاحب، پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، پرنسپل عبدالسلام خاں صاحب ——— ان میں سے کچھ کے مقالے انھیں مل گئے تھے۔ باقی سب کے وعدے تھے۔

کئی بار ذکر آیا کہ "اگر میں یہ مکمل نہ کرسکوں تو مواد ضایع نہ ہو" میں بات کو ٹال دیتا تھا۔ اس لیے کہ اقرار کے معنی یہ تھے کہ میں خود بھی ان کی زندگی سے مایوس ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان پر برا اثر ہی مرتب کرتی۔ اب اُن کا جمع کیا ہوا یہ مسالہ ان کی وصیت کے مطابق مالک رام صاحب کو بھیج دیا جائے گا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ جو اس کام کا مجوز ہے وہی تنہا اسے انجام بھی دے۔

راز صاحب کا ایک مجموعہ کلام حرب و ضرب کے نام سے کبھی شایع ہوا تھا اب وہ بھی ناپید ہے اس کے بعد بھی بیس بائیس سال انھوں نے جو کہا وہ مدون نہ ہو سکا۔ نگار کے ایک نمبر میں اس کلام کا نمائندہ انتخاب اور راز صاحب کے اہم متفرق مضامین شایع کرنے کا ارادہ ہے جو یقیناً اردو ادب کو رام پور کا ایک یادگار تحفہ ہوگا۔

موجودہ شمارہ زیر نظر شمارے میں غالب اور اُس سے متعلق عنوانات پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ارادہ ہے کہ یہ بدعت برابر جاری رہے یعنی ہر سال فروری کے شمارے میں غالب پر مضامین شایع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہاں ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں میری رائے میں غالب پر لکھنے والوں کو یہ التزام کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مضامین ماہِ نو، آجکل اور اب ایک اور اضافہ ——— نگار ان ہی میں اشاعت کے لیے بھیجیں۔ اس طرح آیندہ کام کرنے والوں کو در بدر مارا مارا پھرنا نہیں پڑے گا۔ آیندہ بھی میں یہ کوشش کروں گا کہ غالب پر سال کے مختلف حصوں میں ادھر ادھر شایع ہونے والے مضامین میں سے اہم نگار میں نقل کرتا رہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت ہو سکے۔

اس بار وعدے کے باوجود مسلسل شایع ہونے والے کتاب غالبیہ کا دوسرا باب صفحات کی کمی کی بنا پر نہیں دیا جا سکا۔ اگرچہ اُسی کتاب کے ایک اور باب سے غالب سے متعلق دو خط شایع کیے جا رہے ہیں تاکہ قطعاً وعدہ خلافی کا جرم بھی سرزد نہ ہو۔ ان خطوں سے متعلق اختلافی حواشی نظر انداز کردیے گئے ہیں۔ ابتدا میں صرف تعارفی سطریں درج کی گئی ہیں۔
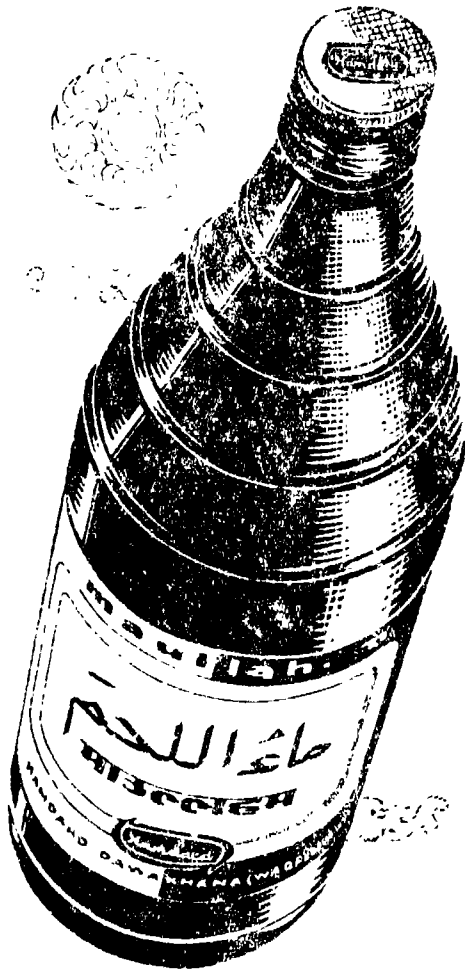
مجھے مسرت ہے کہ متفقہ طور پر غالبیہ کی اشاعت کو قارئین نے سراہا۔ مجھے اس کتاب کی ترتیب کا خیال دستور الفصاحت کی ترتیب کو دیکھ کر آیا تھا جس کے حواشی میں عرشی صاحب نے دوسرے تذکروں سے احوال شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ تذکروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا جائے جس میں اردو کے اہم شاعروں کے بارے میں تمام تذکروں کے بیانات یکجا کیے جائیں۔ اور اس کا آغاز اپنے محبوب شاعر غالب سے کیا تھا۔ مگر اب اس کی وسعت کا اندازہ ہوا ہے تو سوچتا ہوں سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ میرے اکیلے کرنے کا یہ کام نہیں۔ اس کے لیے بے اندازہ وقت مکمل توجہ اور وافر روپے کی ضرورت ہے جو اس دور میں کہاں میسر ہیں۔ اس لیے میری رائے میں اب علیحدہ علیحدہ شاعروں پر اپنی اپنی دلچسپی کے ماتحت دوسرے لوگ بھی کام کریں تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اس میں یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ ہماری توجہ کے لائق کون ہے اول و دوم درجے کے شعرا کو چھوڑ کر اگر ہم چوتھے اور پانچویں درجے پر آ جائیں تو نہ صرف اس کا فائدہ بڑا محدود رہ جائے گا بلکہ تضیع اوقات بھی ہوگی۔

یہ کام یونی ورسٹیوں کے اردو شعبے بھی ایم اے اور پی ایچ ڈی کے طلبا سے کرا سکتے ہیں بشرطیکہ رہنمائی کرنے والوں میں صلاحیت ہو اور وہ اسے اپنے سے فروتر بھی نہ جانیں۔

شاداں کا دیوان میں شائع کرنا چاہتا تھا۔ نگار کی اشاعت کا کام سنبھالا تو سوچا کہ کیوں نہ اسے غالب کے لیے وقف شمارے میں چھاپ دیا جائے۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ رام پور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ خمخانہ جاوید میں کچھ اور اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس کے لیے شوکت حسین خاں صاحب سے ایک مختصر تعارف بھی لکھوا لیا اور اس طرح کامل کے متفرق کلام کے ساتھ یہ دیوان بھی چھاپا جا رہا ہے۔ یہ اس سلسلہ نوادر کا آغاز ہے جو رام پور رضا لائبریری کے ذخیرے سے حاصل کر کے چھاپے جائیں گے۔

شاداں کا ذکر مکاتیب غالب (عرشی) تلامذہ غالب (مالک رام) کے علاوہ نغان دہلی، فریاد دہلی، سخن شعرا، خمخانۂ جاوید، انتخاب یادگار، تذکرۂ کاملان رام پور، تذکرۂ طور کلیم اور ذکر غالب میں بھی ہے۔

غالب اور صہبائی

مالک رام

غالب کی خود بینی اور خود ستائی اب اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ اس پر کسی تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ وہ ہندوستان کے کسی فارسی گو شاعر اور ادیب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خطوں میں تقریباً تمام ہندوستانی شاعروں اور نثر نگاروں کے نام آئے ہیں اور انھوں نے ان میں سے ایک حضرت امیر خسروؒ کے سوائے کسی کو نہیں بخشا۔

اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہمعصروں سے متعلق ایک قطعے میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے فرماتے ہیں:-

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم — چہ بما منتِ بسیار نہی از کم شان

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوتِ شان مشک فشاں از دم شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار

ہست در بزمِ سخن، ہم نفس و ہمدم شان

یہاں انھوں نے اپنے چھ معاصروں کا نام لیا ہے اور اپنے آپ کو انکسار سے ان کا محض ہم نفس اور ہمدم کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں سے ایک صہبائی ہیں۔

صہبائی، جن کا اصلی نام امام بخش تھا، نجیب الطرفین تھے۔ سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی پر اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے۔ ان کا خاندان تھانیسر کا رہنے والا تھا، لیکن یہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ یہ عبداللہ خاں علوی کے شاگرد تھے، جن کا نام غالب کے مندرجہ صدر قطعے میں بھی آیا ہے۔ ان کا کلیات فارسی ان کے ایک ہندو شاگرد دین دیال میر منشی اجنٹی بھوپال نے جمع کر کے چھپوایا تھا۔ اردو میں بھی ان کی بعض نثری چیزیں ملتی ہیں۔ قدیم دلّی کالج کے پرنسپل فیلکس بوترو کی فرمایش پر انھوں نے ۱۸۴۴ء میں شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن اس میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی کی ہے۔ بعض عبارت میں اتنا ردو بدل اور حذف و اضافہ کیا ہے کہ یہ کتاب ان کی مستقل تالیف ہو گئی ہے۔ اصلی کتاب میں مثالیں فارسی میں تھیں، ان کی جگہ انھوں نے اردو کی مثالیں مہیا کی ہیں۔ بعض جگہ مثالوں میں اپنے چند اردو شعر بھی درج کیے ہیں، ورنہ یوں وہ اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ اسی کالج کی ترجمہ سوسائٹی کے لیے انھوں نے اردو شاعروں کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔ ہر ایک انتخاب سے پہلے انھوں نے شاعر کے مختصر حالات اردو نثر میں لکھے ہیں۔ یہ انتخاب بھی اسی سوسائٹی کی طرف سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ سرسیّد کی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی وہ برابر کے شریک رہے تھے، بلکہ ایک پورے کا پورا باب انہی کا لکھا ہوا تھا۔ جب ۱۸۴۰ء میں دلّی کالج میں عربی کی طرح فارسی کے لیے بھی ایک اچھا مستعد مدرس رکھنے کی تجویز ہوئی، تو اس جگہ پر صہبائی ہی کا تقرر ہوا تھا۔ ان بیچاروں کا انجام بہت حسرت ناک ہوا۔ اپنے دو جوان بیٹوں کے ساتھ، ۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غالب کے اس قطعے سے خیال ہوگا کہ وہ صہبائی کی شاعری کے قائل اور معترف ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ خدا معلوم، وہ کس تاثر کے تحت یہ لکھ گئے، ورنہ انھوں نے اور جہاں کہیں بھی صہبائی کا ذکر کیا ہے، حقارت اور مذمت کے لہجے میں۔ برہانِ قاطع کے مباحثے میں صہبائی کے

شاگرد میرزا رحیم بیگ میرٹھی نے بھی غالب کے جواب میں ایک کتاب ساطع برہان لکھی تھی۔ میاں داد خاں سیاح، غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے کسی خط میں اس کتاب کا ذکر کیا، تو انھیں لکھتے ہیں[1]:-

"وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملا ے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا، مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔"

اگرچہ یہاں انھوں نے سیاح کو لکھا تھا کہ ساطع برہان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، لیکن بعد کو انھوں نے خود ایک طویل خط میرزا رحیم بیگ کے نام لکھ کر اسے نامۂ غالب کے عنوان سے شائع کیا۔ میرزا رحیم بیگ نے ساطع برہان میں اپنے استاد کے نام (امام بخش) کی رعایت سے ایک مقام پر ان کے اسم گرامی سے پہلے "امام المحققین" لکھا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرزا نامۂ غالب میں ایک جگہ میرزا رحیم بیگ سے پوچھتے ہیں[2]:-

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو 'امام المحقّقین' خطاب دیا ہے، کتنے مُحقّقین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک نہ اجماع مُحقّقین کا ہوگا، یہ خطاب بہ اجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ وہ فرماں روائے عہد شہنشاہ کہلائے گا، کہ کئی بادشاہ جس کے فرمان پذیر ہو جائیں گے۔ ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا، یہ میر شہنشاہ صاحب کیونکر شاہجہاں و جہانگیر ہو جائیں گے! اگر حضرت بفتحۂ قاف بصیغۂ تثنیہ امام المحقَّقین کہتے، تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نہ اتن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

میرزا نے نامۂ غالب اپنے خرچ پر طبع کروایا تھا اور دور نزدیک اس کے نسخے دوست احباب میں تقسیم کر دیے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایک صاحب مولوی عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری تھے۔ معلوم ہوتا ہے میرزا نے انھیں بھی اس کا نسخہ بھیجا تھا۔ اس پر شاکر نے مکتوب الیہ (میرزا رحیم بیگ) سے متعلق پوچھا اور چاہا کہ اگر ہو سکے تو ساطع برہان کا نسخہ بھی مہیا کیا جائے۔ اس پر انھیں لکھتے ہیں[3]:-

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واہ رے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ رسالہ اس کا ساطع برہان دلی پہنچ کر[4] ڈھونڈوں گا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔"

معلوم نہیں اہلِ دلی نے کیا کہا اور کیوں کہا۔ بے شک، انھوں نے اپنے کلام پر تو صہبائی سے اصلاح نہیں لی تھی، لیکن گلستانِ سخن (ص ۲۴۱) میں صاف لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے چند رسائل نثر اصلاح کے لیے صہبائی کو بھیجے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے سے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیا تلمذ کے لیے یہ کافی تصور نہیں کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں گلستانِ سخن سے زیادہ اور کوئی بیان قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔

لیکن غالب نے رحیم اور شاکر کے نام صہبائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی رائے ان سے متعلق کیا تھی۔ دونوں جگہ ایک ایک لفظ سے ان کی توہین اور علمی بے وقری کا اظہار مقصود ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ برہانِ قاطع کی بحث میں میرزا اپنا توازن کھو بیٹھے تھے اور اس معرکے میں جو بھی ان کے مدمقابل ہوا، انھوں نے اسے نیچا دکھانے کے لیے جائز اور ناجائز تمام حربے استعمال کیے۔ علمی دلائل سے گزر کر

---

[1] اردوئے معلیٰ، ص ۲۳ (مطبع کریمی، لاہور) [2] عودِ ہندی، ص ۱۳۸، ۱۳۹ (مطبع کریمی، لاہور) [3] عودِ ہندی، ص ۱۵۱، ۱۵۲
[4] یہ خط رامپور سے لکھا گیا تھا۔

طنز و طعن اور تمسخر و تشنیع سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں اتفاق سے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اصلی ہدف تو میرزا رحیم بیگ تھے، صہبائی بیچارے اُن کے استاد بھی لپیٹ میں آ گئے۔ اگر اور کوئی شہادت موجود نہ ہوتی، تو یہ توجیہہ کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

میرے اپنے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ ہے، اس میں چند قصیدے، قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر اخباروں وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے ولی عہد ظفر، میرزا فتح الملک بہادر کی مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۴۸ پر ہے اس کا مطلع ہے:-

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زخمہ رواں، زمزمہ از تار بر آمد

اس کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفے ز لبِ کافر و دیندار بر آمد
آں از نعم آوازۂ انکار در افگند
ایں راز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:-

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدانِ خویش کہ خر کرۂ چند بودند، گفت: افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از نعم معنیِ انکار افادہ می کند! حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آلِ نبی یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرحِ مُلّا کہ رفعِ ایں وسوسہ می کرد، بوے نمود و گفت: غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدہ۔ سوال از جانبِ حق اینست: اَلَستُ بِرَبِّکُم؟ — آیا نیستم پروردگارِ شما؟ و ایں کلمہ استفہامیہ است۔ کفّار گفتند: ہاں، نیستی خدائے ما؛ مومناں گفتند: ہاں، ہستی خدائے ما۔ آں تسلیم انکار است و ایں تسلیم اقرار۔ مولوی چوں خرِ در وحل فرو ماند۔"

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

بقیہ۔ غالب کا ایک گمنام شاگرد

آنکھ جس دن سے کھلی محورخِ دوست ہوں میں
میری آنکھیں نہیں واقف، کسے کہتے ہیں خواب

ہے یہاں موسم برسات ہمیشہ طالب
دیدۂ تر میں مرے رو کشِ باراں سیماب

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہر صورت
واں زلف پریشاں ہے یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اس کی۔ نصیب اس کا۔ زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوفِ عدو دن رات ہم پہلوئے دوست

طالب خلد بریں طالب ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

کس آتشیں نگار کے سوزِ فراق میں
سرگرم نالہ ہوں شرر افشانیوں کے ساتھ

طالب کیا ہے آہ نے اپنی اثر ضرور
وہ ہیں جو عذر خواہ پشیمانیوں کے ساتھ

یہ سرسری انتخاب ان شکستہ اور کرم خوردہ اوراق کا ہے جس کی ترتیب و تدوین کے لیے اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے! طالب کے نام غالب کا کوئی خط مجھے ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ طالب کے اکلوتے فرزند مفتی سید احمد شریف گھر لا ولد مرے۔ ان کی وفات کے بعد اس خاندان کا نسلی چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ خاندانی جائداد کے تنازعے شروع ہوئے اور جس کے ہاتھ جو کاغذات لگے اس نے اپنے قبضے میں کر لیے بظاہر ان کے ملنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں پھر بھی سعی و کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔

غالب سے متعلق دو خط

صاحب آب حیات کے نام

(زیر طبع کتاب غالبیہ سے)

اکبر علی خاں

تذکرۂ آب حیات کا نام جہاں ہمارے ذہنوں میں ایک باغ و بہار، دلکش اور ساحرانہ اسلوب کی تازگی کا اثر بیدار کرتا ہے وہیں تاریخی اعتبار سے اس تصنیف کی اہمیت کو کم اور اس کے مصنف کو پایہ اعتبار سے ساقط بھی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ شاید ہی موجودہ دور کا کوئی نقاد اور محقق ایسا ہو جس سے محمد حسین آزاد کے بارے میں رائے دریافت کی جائے — اور وہ بھی آب حیات کی روشنی میں تو وہ انھیں جانب دار، متعصب اور واقعات کو حسب ضرورت استعمال کرنے والا نہ کہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب تک جن حالات کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا وہ بیشتر آزاد کے خلاف نکلے۔ اس لیے ہمارے نقاد اور محقق آزاد کو مجرم سمجھنے میں بڑی حد تک حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد کی دیانت داری کو مشکوک بنانے میں جہاں اور بہت سی باتیں کام کرتی ہیں وہاں خصوصیت سے تدوین کلام ذوق کے وقت اصلاح اشعار کا کام بھی ہے۔ بے چارے آزاد نے یہ کب سوچا ہوگا کہ اپنے استاد کے لیے خلوص محبت اور عقیدت میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں عالم آشکار ہو کر رہے گا۔ مگر وقت کی رو بڑی بے درد ہوتی ہے اور آج ہم سب جانتے ہیں کہ ذوق کی تصویر میں کتنے نقوش اصل اور کتنے مصور کا اپنا اضافہ ہیں۔

اسی طرح آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں کا تذکرہ شامل نہ کرکے بھی انھوں نے اپنے آپ کو اعتراضات کا نشانہ بنالیا۔ کہنے والوں نے کہا کہ مذہبی تعصب کے جنون میں آزاد نے مومن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ لاکھ صفائی پیش کرتے رہے کہ مجھے مومن کے بارے میں سعی و جستجو کے باوجود معلومات نہیں مل سکیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں جب مومن کا ذکر آگیا تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ پہلی بات عذر لنگ کے سوا کچھ نہ تھی اور یہ شمولیت مطالبہ جمہور کے ڈر سے ہے۔

یہ اور اس جیسے بہت سے اعتراضات صاحب آب حیات کے سلسلے میں عام ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آب حیات کو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی افسانہ و افسوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا لب و لہجہ، تاریخ اور تذکرے کے مروجہ انداز سے میل نہیں کھاتا اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ زیب داستاں کے لیے صاحب کتاب نے اپنی ذہنی اڑان کو بے دریغ استعمال کیا ہے۔ لیکن کلی طور پر یہ خیال درست نہیں ہے۔ آزاد نے خام مواد کے مہیا کرنے میں مختلف ذرایع استعمال کیے تھے۔ اور غالب و مومن وغیرہ کے سلسلے میں ایسے اصحاب کو خطوط لکھے تھے جو انھیں ان شخصیتوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے تھے۔

اس مسالے کو ڈاکٹر محمد صادق نے دریافت کیا ہے۔ اس میں علاء الدین احمد خاں علائی اور شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی کے دو خط بھی ہیں۔ یہ خط غالب سے متعلق ہیں۔ پہلا خط علائی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے سوالات قایم کرکے بھیجے تھے جن کے جوابات بالترتیب علائی نے لکھے ہیں۔ دوسرے خط میں جو ذکاء اللہ کا ہے باقاعدہ سوال و جواب کا ڈھنگ تو نہیں لیکن ہے وہ بھی آزاد کے استفسار ہی کے جواب میں۔

ان خطوں کے سامنے آجانے سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ آزاد نے حتی الامکان کسی کے بارے میں لکھنے سے پہلے ایسے ذرایع تلاش کیے جن کی طرف انھیں رجوع کرنا چاہیے تھا، اور جن سے صحیح واقعات و احوال کا علم ہو سکتا تھا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں خط موافق و مخالف انداز فکر کی آخری حدوں کو چھوتے ہیں۔ علائی نے غالب کے سلسلے میں جس عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے ذکاء اللہ کے یہاں اس کے برعکس جذبہ نظر آتا ہے اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔

ان خطوں کے ساتھ آب حیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ آزاد نے منفی کے مقابلے میں مثبت اطلاعات کو ترجیح دی ہے اور غالب کے بارے میں ان تاثرات اور واقعات کا اندراج پسند کیا ہے جو علائی نے لکھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ذکاء اللہ کے بیانات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

دراصل یہ طرز عمل آزاد کے مرنجاں مرنج مزاج کا تقاضہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گل کبھی نہ کھلا سکتے جو انھوں نے کاغذ پر بکھیر دیئے ہیں اور جو کاغذ کے ہوتے ہوئے بھی بے رنگ و بو نہیں۔ وہ اگر چاہتے تو جانب داری سے کام لیتے ہوئے مخالف مواد کو بآسانی پیش کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ہمیں سارے مشکوک مواقع پر جہاں ہم آزاد کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتے ایک بار پھر سوچنا چاہیے کہ ہم مصنف کو کتنی چھوٹ دے سکتے ہیں

یہ خطوط اگر ایک طرف آزاد کو سنگین الزام سے بری کرتے ہیں تو دوسری طرف غالب کے بارے میں دلچسپ معلومات کے حامل بھی ہیں اور دو قطعاً مخالف سمتوں کی وجہ سے بے حد لائق توجہ بھی۔ ڈاکٹر محمد صادق کے شکریہ کے ساتھ انھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوب نواب علاء الدین احمد خاں علائی

ادیب شفیق، حبیب لوذعی والمعی مولوی محمد حسین صاحب عربی پروفیسر کالج لاہور

السلام علیکم! آپ کا مہربانی نامہ ۲۲ جون کا اس دور افتادہ کو ملا۔ اس کا ورود میرے لیے فتح الباب مسرت ہوا۔ آپ کا ارادہ نسبت تالیف تذکرہ مشاہیر شعراء اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس تذکرے میں ہر شاعر کے تاریخی حالات اور اس کی سوانح عمری کے واقعات لطائف اور تلامذہ رمانی کا آپ نے التزام فرمایا ہے اور عنایت الٰہی اس کا تکمیل پر پہنچنا دریافت ہو کر نہایت درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ اگرچہ میں سرمایہ علمی بہت کم رکھتا ہوں الا ایسے امور کا نہایت شائق ہوں اور افسوس ہے کہ وقت لکھنے اس تذکرے کے میں آپ سے دُور تھا۔ ورنہ آپ کو تاریخی حالات شعرا کی نسبت سوائے حالات مرزا اسد اللہ خاں غالب کے زیادہ تر امداد دی جاتی، کیونکہ میں نے اپنے والد ماجد سے بہت کچھ سنا ہے۔ میں ایک خاکستر ہوں اُس خرمن کا جسے آتش غدر، نے جلا دیا۔ اب آپ نے مخدومی مکرمی مرزا غالب کا حال دریافت کیا ہے۔ اگرچہ اس کا منصب عمومی مکرمی جناب ضیاء الدین خاں صاحب کو حاصل ہے وہ بالاستیعاب ان کے حال سے آپ کو اطلاع دیتے۔ بدیں وجہ کہ وہ مجھ سے زیادہ کہن سال بھی ہیں اور ان کی معلومات افہام و اوہام کے نزدیک معتمد علیہ اور معتبر تر ہے مگر جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ حوالہ قلم ہے۔

آپ کو واضح ہو کہ جناب مرحوم سے مجھے تلمذ بھی تھا۔ اور رعایت درجہ مہر و شفقت اُن کی میری نسبت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم میرے والد کے اور ان کے زیادہ محبت اور مودت تھی۔ اور چونکہ وہ صاحب اولاد نہ تھے مثل فرزند مجھے تربیت کیا۔ میرے علم میں جو کچھ ہے اسے بے تکلف لکھے دیتا ہوں۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اور راویان صادق کی تحقیق کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

آپ کا سوال نسبت تبدیلی تخلص ؟

جواب ـــــ مجھ کو یاد ہے فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ میں ۲۹ کے قریب انھوں نے تخلص تبدیل کیا۔ اور واقعی اسد اللہ خاں کے نام کے واسطے غالب ہی تخلص زیبا تھا۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ لقب قرار پا لیا تھا دوسری وجہ یہ بھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ نو تنگا کوڈھیا جھجھر کا شعر کہتا تھا اس کے ایک مقطع میں لفظ اسد ان کی نظر سے گزرا۔ وہ مقطع یہ تھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب — ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

ہم تکلس ہونا جناب مرحوم کو ایسے لوگوں سے جو تہمت آدم ہیں نہایت مکروہ معلوم ہوا اس وجہ سے اسد اللہ خاں کے ساتھ غالب کو موضوع کر دیا۔

دوسرا سوال بابت مذہب مرزا صاحب و آبائے مرزا صاحب؟

جواب ــــ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولاد سلم اور تور سے ہیں اور ترکمان کہلاتے ہیں۔ اجداد ان کے شیعہ مذہب نہ تھے۔ مگر اس ملک کا آدمی اور ترکمان لوگ اکثر تفضیلی ہیں۔ اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر تھی۔ ان کے نزدیک حقیقت خلافت امامت کی ثابت ہوئی۔ ماسوا اس کے کثرت صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین معروف کے ساتھ اور بخشی محمود رضا خاں کے ساتھ اسی امر کی باعث ہوئی کہ وہ علی پرست ہو گئے۔ اور غلو ان کا ہنگام مباحثہ تھا نہ یہ کہ وہ تبرائی ہوں۔ بزرگوں میں مرزا صاحب کے کسی کو ہم کیش مرزا نہ سنا۔

تیسرا سوال کہ کس سنہ میں شعر کہنے شروع کیے؟

جواب ــــ سنہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر عنفوان جوانی سے طبیعت نے راہ دی اور یہی مشغلہ رہا۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔

چوتھا سوال ہرمزد عبدالصمد کا معاملہ؟

جواب ــــ آپ کی زبان سے میں نے اکثر سنا تھا کہ وہ ان کا استاد تھا۔ وہ تاجر تھا۔ ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے ہنگامہ بنایا تھا۔ پس اگر مرزا صاحب جھوٹے تصور کیے جائیں تو یہ روایت بھی بے اصل محض ہے۔ اور جب یہ روایت بے اصل ہے تو پھر القا اور الہام کو ماننا پڑے گا۔ ایسا متعلم سوائے سروش غیبی کے کیسے فیض پذیر ہو سکتا ہے۔

پانچواں سوال کتب مصنفہ کی تدوین؟

جواب ــــ دیوان فارسی ۱۸۳۳ء، ۱۸۳۵ء میں ترتیب ہو گیا۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں وہ الواح طبع سے مل سکتا ہے دیوان اردو ۱۸۴۹ء کے بعد ترتیب پذیر ہوا۔ مہر نیمروز شاید ۱۸۵۱ء میں شروع ہوئی۔ اور اسی ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں شرف باریابی ارک پایا اور حکیم احسن اللہ خاں کے تقاضے سے تاریخ نگاری شروع کی ورنہ بادشاہ ایسے اشتیاق و اشتغال سے مبرا تھے۔

چھٹے سوال کا جواب بھی اسی پانچویں میں آ گیا۔

ساتواں سوال۔ کلکتے میں طرح یاد مخالفت اور اس کی وجہ؟

جواب ــــ اہل پورب اور بنگالہ بوجہ بے مذاقی کے قتیل پرست اور مادھو رام ستائی ہیں اور مرزا صاحب کو اہل ہند کی نسبت کلام رہا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اس شعر سے مستفاد ہے۔ شعر:

نیک ناید ز من کہ در گفتار　　　مدحت لالہ سوبر داس کنم

اور باعث اس تفضیح کے چند بے تمیزان کلکتہ ہوئے، کہ وہ لوگ آداب مہمان نوازی اور مہر شناسی سے عاطل ہیں۔ بجائے تکریم ضیف تسویم تضحیم ضیف کی گئی۔ اس تقریب کے باعث مولوی عبدالقادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگ کلکتہ کے تھے اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے۔ ترتر مکان صاحب نے شاہنامے کی تصحیح کہ گویا جس کو تفضیح کہنا چاہیے ان دونوں صاحبوں کے واسطے سے کی تھی۔ بجملہ اس بنا پر باد مخالف لکھی گئی۔

آٹھواں سوال۔ نواب مصطفیٰ خاں کو ہدایت غیبی؟

جواب: حالت غیبی رفیق حال ہوئی مگر حالت شیبی سے پہلے رنگ جما ہوا تھا۔ اگر رم جو منہیات میں داخل نہیں ہے تو بنت العنب سے مضائقہ کیجیے۔ شعر:

ہو گئی چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　　پیتے تھے روز ابر و شب ماہتاب میں

مگر ہاں میاں انصاف کہ میاں عبدالغنی صاحب سے خانقاہ میں جب تجدید بیعت کی اور خود بھی کسی قابل نہ رہے تو توبہ کامل حاصل ہوئی

در شاید پاس داشت حدیث خوانی بلحوظ خاطر اسلام شکوہ رہا ہو۔

نواں سوال۔ مولوی الطاف حسین حالی کی روایت؟

جواب —— واقعی مرزا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ دقتِ اشارات و معنی و غرابتِ ترکیب ہم اردو میں نہ کرتے اگر طباع افہام کو ایسا ناقص جانتے۔

محبا! میں احباب کی خدمت گذاری کو عمداً حاضر ہوں۔ اور آپ کی اس مہجور پرستی کا شاکر۔ جب کام ہو تو آپ انصرام فرمائیں اس کا سر انجام میرے لیے سرمایہ مسرت ہے۔ مگر اس معاملہ خاص میں باہمہ بے بضاعتی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ امر بے ممکن نہیں۔ اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیف شریف کے یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید آپ کو اس میں جائے انکار۔ ریواڑی سے لوہارو تک میرے ہاں کی سواریاں حاضر ہو سکتی ہیں۔ اور لاہور سے ریواڑی تک ریل کی سبیل ہے زائد والسلام والاکرام میں ناتندرست ہوں۔ ورنہ اپنے ہاتھ سے لکھتا۔

المعذور معاف علاؤ الدین

مکتوب شمس العلما منشی ذکاء اللہ دہلوی

جناب من!

جب مجھے آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شایع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو بندے سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں وہ ہتک عزت کی نالش کرنے کو تیار ہوں گے اس لیے ایک عذاب جان بن جائیں گے۔

اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ رنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مرگیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرگیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ "صہبائی شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں نہ جیل خانے میں پڑا۔" طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس جگہ بیچتا تھا۔ اس لیے قصاید میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے۔ بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں سینزدہم۔ دہم۔ نہم۔

میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں۔ وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں ہیں۔ غالب کا خود قول تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا دو شاعر ہوئے ایک غالب اور دوسرا خسرو۔

ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا۔ اس نے ایک دفعہ دیکھ کر واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ "دریں خرافات اوقات ضایع نکنیم، مانمی دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی جو عیسائی ہو گیا تھا۔ جان مور نام رکھتا تھا۔ وہ ذوق مرحوم کے پاس جاتا تھا وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے پوچھتے تھے۔ وہ فوراً معنی بتا دیتا اور محاورہ کی ایک نہ غلطی۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم و نثر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یا فتوں کو سوجھا ہے اور منشی اور دبیر جو پہلے زمانے کے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غالب کی مثنوی بے نام کا نام

سید مرتضیٰ حسین فاضل

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کا تذکرہ کرتے ہوئے نو کتابوں کے نام لکھے، گل رعنا میں وہی نام نقل کر دیئے گئے مولانا حالی نے سب سے پہلے غالب کی تصنیفات، و تالیفات کا ضمنی و سرسری جائزہ لیا، مگر ان کا موضوع نہ سوانح تھا نہ تاریخ، اس لیے تالیفات کی تحقیق اور ان کے بارے میں تفصیلات بھی بنیادی طور پر پیش نظر نہ رہے لیکن ان معلومات کے ماخذ اولین میں جہاں اور بہت سی کام کی باتیں ہیں وہاں ان ایسی کتابوں کے بارے میں اشارے بھی ہیں جن کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو مولانا کا یہ کہنا:

"چند اجزا ایک نا تمام قصے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا"

(ص ۱۵۷، یادگار غالب)

دوسرے یہ تحریر کہ:

"بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا، اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی، بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا" (یادگار غالب ص ۷۰)

ابھی تک "ناتمام قصے" کے تفصیلات تو معلوم نہیں ہو سکے، مگر مذکورہ بالا مثنوی پر کنجکاوی منزل تحقیق تک پہنچ گئی۔ حالی کے بعد جناب مہر صاحب نے سوانح و سیرت غالب کی طرف پوری توجہ کی، لیکن "غالب" طبع اول (نیز بعد) میں "مثنوی دعائے صباح" کی طرح اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا، جناب اکرام صاحب نے غالب نامہ طبع دوم ص ۶۰ حاشیے میں اس مثنوی کے دو شعر لکھے مگر نام نہ لکھا، پھر ص ۶۲ پر لکھا:

"اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ، مرزا سے دفع الباطل (کذا) کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا"

پھر چوتھے ایڈیشن میں غلطی طباعت، کی اصلاح فرمائی گئی اور ص ۲۱۱ پر "دمغ الباطل" لکھا، مالک رام صاحب اس سلسلے میں خاموش ہیں اور کوئی نام نہیں بتاتے، مسعود حسن رضوی صاحب نے "متفرقات غالب" میں یہ مثنوی شایع کی تو ان کے سامنے رسالۂ علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری" تھا، اور نام کی تحقیق، حالی کی غلط فہمی پر بحث بھی فرمائی لیکن اسے "بے نام مثنوی" ہی قرار دیا۔

میں نے ۱۹۴۷ء میں "رسالہ علم حیدری اور مثنوی شوکت حیدری" صفی دار المطالعہ لکھنؤ میں دیکھی اور مثنوی تو پوری نقل کی لیکن نثر کے رسالے کو نقل کرنے اور نوٹس لینے کی باری نہ آ سکی، مگر زیر بحث مثنوی کا نام لکھ لیا۔ پاکستان آنے کے بعد بارہا ارادہ کیا کہ اس سلسلے میں کچھ لکھوں مگر ماخذ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہمت نہ پڑی، بعض احباب کو ضد رہتا رہا تھا۔ حبیب محترم جناب خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی نے چند دقیع کتابیں عاریت دیں جن میں، رسالہ علم حیدری، مثنوی شوکت حیدری، مثنوی شیعیان علی۔ بھی ہیں۔ اس درمیان جناب اکبر علی خاں صاحب نے فرمائش مضمون فرمائی۔ ہم نے اس مضمون میں ان تینوں کتابوں کے پہلے مطبوعہ لکھنوی نسخوں ۱۲۷۰ھ کو سامنے رکھا ہے۔

جناب مسعود حسن صاحب نے مثنوی کے بارے میں بڑی کارآمد بحث فرما کر اس سلسلے کی اکثر مثنویوں کے نام اور صحیح تفصیلات لکھی

ہیں. لیکن جناب امداد صابری نے "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا" میں، ایک اور ہی قصہ لکھا، "غیر ملک سے انگریزوں کے خلاف مدد لینے کی سعی" کے عنوان سے فرماتے ہیں:

> "۱۸۵۱ء میں مرزا حیدر شکوہ .... اور واجد علی کے قابل اعتماد مانے جاتے تھے، جن کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا، اور واجد علی شاہ کے ہم مذہب یعنی شیعہ بھی تھے۔ ان سے بہادر شاہ کی گفتگو ہوئی، اور جو حرکتیں بہادر شاہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے مرزا حیدر نے بادشاہ کو مشورہ دیا، کہ ہندستان میں اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لیے واجد علی شاہ سے یک جہتی اور رابطہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں متحد ہو کر اور طاقت ور بن کر شاہ ایران کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور بقول حکیم احسن اللہ خاں ان سے مل کر اپنا ملک فتح کر لیں۔
>
> بہادر شاہ کو یہ طریقہ پسند آیا، اس پر غور کیا گیا کہ اتحاد کا طریقہ کیا اختیار کیا جائے، مرزا حیدر کی رائے ہوئی کہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جائے گا تو واجد علی شاہ اور شاہ ایران پر بھی اثر پڑے گا اور آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جائیگا"
>
> انگریزوں کی مخالفت کے لیے شیعہ بننے کا اعلان
>
> بہادر شاہ ظفر، انگریزوں سے انتہائی برگشتہ اور نالاں تھے۔ انھوں نے بعض معاویہ کے جذبہ میں آکر اعلان لکھ کر مرزا حیدر کو دے دیا، کہ میں نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے، مرزا حیدر نے اس کو لکھنؤ میں جا کر مجتہد العصر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ خبر لکھنؤ کے ہر محلے اور ہر بازار میں پھیل گئی۔ لکھنؤ والے بہت خوش ہوئے لیکن دلی والوں میں کھلبلی مچ گئی کہ انھوں نے اس مصلحت وقت کو مذہب کے مقابلے میں کیوں اہمیت دی بالآخر بادشاہ نے اپنے انکار کی تصدیق میں ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت" مرتب کی اس پر مرزا غالب نے بادشاہ کو اس الزام سے بچانے کے لیے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا۔"
>
> (کتاب مذکور طبع دہلی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۷ بعد)

مجھے اس عبارت سے بحث نہیں، اگرچہ امداد صابری نے "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" اور مولانا حالی کی یادگار غالب کا حوالہ دے کر یہ سب کچھ لکھا ہے مگر یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ واقعہ یوں نہیں، بلکہ یہ ہنگامہ عید ۱۸۵۲ء سے جنوری ۱۸۵۴ء کے درمیان میں شروع ہوا، اور حالی سے آفاق تک سب نے اس کی صحیح وجہ بادشاہ کی بیماری و صحت یابی ہی بتایا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت آنے والے معاصر بیانات و دستاویزات کی بنا پر مشتبہ، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غلط ہو جائے گی تو شاید بے جا نہ ہو۔

مثنوی "دمغ الباطل" نہیں "کلمات طیبات" ہے جس کی تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ بادشاہ ۸ جولائی ۱۸۵۳ء (عید ۹ ۱۲۶ھ غالباً) میں بیمار ہوئے، دوران علالت میں مرزا ملازمت دربار کی وجہ سے قلعے جاتے اور مزاج پرسی کے لیے بھی حاضر ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کو علالت کے تفصیلات سے براہ راست علم تھا، مگر انھوں نے زیادہ تاثر کا اظہار نہیں کیا ہے، منشی نبی بخش حقیر کے نام جو خطوط ہیں، ان میں ذرا مفصل حال ملتا ہے، اور وہ بھی کسی گہرے تاثر کی نشان دہی نہیں کرتا، مثلاً ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہیں:

> "بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو، اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں دست موقوف ہو گئے، مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں، تپ جاتی رہی، مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے، ہچکی اس شدت کی نہیں رہی، گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں، اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں، اس ہیئت سے برآمد بھی ہوتے ہیں، قلعے ہی قلعے میں پھر کر پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجیے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے، بہر حال جب تک سلامت رہیں غنیمت ہے۔" (۱۶ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ، روز یکشنبہ)

۲۹ ذی الحجہ، ۲ اکتوبر کو لکھتے ہیں:

> "اب سنتا ہوں کہ حضور، بعد محرم جشن غسل صحت کریں گے۔"

۲ محرم، ۶ اکتوبر کو لکھا:

"بعد محرم سناجاتا ہے کہ جشن غسل صحت ہوگا۔ بادشاہ اچھے ہیں رہا ضعف، وہ لازمۂ عمر ہے۔"

مرزا کے ان خطوط سے بادشاہ کی بیماری کا ایک ہلکا سا خاکہ، اور تھوڑے تفصیلات معلوم ہوئے۔ رسالہ علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری" کے مؤلف محمد حیدر شکوہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ ان دنوں بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جسے خود بادشاہ کی لفظوں میں سنیئے:

"نور چشم راحت جان، مرزا حیدر شکوہ بہادر مورد تفضلات بودہ بدانند کہ ہر دو علم، صرف از اعتقاد غلامان غلام جناب حضرت علمدار گذرانیدہ ام، اگر قبول افتد زہی عز و شرف۔ از طمع دنیاد ران نہ بیداد (کذا) وئی نہم، صرف برائے آسودگی دین، کسی نمی داند کہ عنایت چہ قدر بریں احقر شدہ، چند بار بزیارت شدہ (کذا) قابل اظہار نیست، الّا بر وقت ملاقات خود ما خواہیم فرمود۔ ہر شخصے کہ از اہل بیت حسد می داشت بہ لعن مدام باد مبتلا باد، ایں ایمان است فقط۔"

اس خط کے بعد حیدر شکوہ کلکتے سے دہلی آئے اور دربار میں حاضر ہوئے، تو بادشاہ نے اپنے خواب کا بیان اور بہ تقسیم عزم بنائے تعزیہ خانہ" (علم حیدری ص ۳) کا تذکرہ کیا اور جناب سلطان العلماء کے نام ایک خط مرحمت فرمایا، علم مرزا محمد نور الدین حیدر بہادر کے ہاتھ لکھنؤ بھیج چکے تھے حیدر شکوہ لکھنؤ آئے اور ۶ ربیع الاول کو وہ علم شاہی اہتمام سے "درگاہ" میں نذر کیا گیا۔

مثنوی شوکت حیدری میں "آغاز ماجرا" یوں ہے:

ره دین چو دریافت آن بادشاه　　طلب کرد ما را بصد عز و جاه
مرا بسکه با خویش همراز دید　　ز حضار بہ کیش خلوت گزید
چو محفل تہی شد، ز اغیار من　　بفرمود از من دران انجمن
که یک روز در خواب نوشین ما　　ہدایت کن دین و آئین ما
در آمد، علمدار سبط نبیؐ　　مسمّیٰ بہ عباسؓ ابن علیؓ
بہ تلقین زبان ہدایت کشود　　مرا در غلامان حیدرؓ نمود
بہ تعبیہ آن گشت چون اہتمام　　ہمان وقت با اعتقاد تمام
بہ آل محمدؐ تولّا نمود　　ز اعدای آنہا تبرّا نمود
بہ شکرانہ آن علم ساختہ　　زبانی چو افسر بہ سر داشتہ
فرستاد، در لکھنؤ بادشاہ　　پی نذر درگاہ عرش اشتباہ
دگر شقۂ خاص خیر اکتساب　　بنام جناب ہدایت مآب
بہ علم و عمل مقتدای انام　　مسمّیٰ محمد علیہ السلام
بہ مرحمت گشت واز دست ما　　رسیدہ بہ درگاہ آن مقتدا
چو در لکھنؤ آمدم از حضور　　فریبی نمودند اصحاب زور
چنان طبع را منحرف ساختند　　کہ بر کردۂ خود نہ پرداختند
چو آن قوم بدکیش ناچار کرد　　زار سال و اصرار انکار کرد
بہ توقیع شاہی غلط ساختند　　بنام من این شرعہ انداختند

مثنوی شوکت حیدری ص ۵ ببعد

یہ علم ۶ ربیع الاول ۱۲۰۰ھ کو شاہی جلوس کے ہمراہ سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب کے ہاتھوں درگاہ حضرت عباس واقع کشمیری محلہ لکھنؤ میں نصب کیا گیا اور وہیں مجلس میں مرزا نور الدین نے بادشاہ کے نام سے مرثیہ پڑھا۔

شاید اس سلسلے میں اشتہارات و اعلانات کے علاوہ افواہیں بھی پھیلی پھیلائی گئیں۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ اکابر علمائے دہلی نے بادشاہ سے ان کے عقاید اور تبدیلی مذہب کے بارے میں بازپرس کی تو بادشاہ نے اپنے سنی ہونے کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا کہ "علم" اور مرثیہ کا قصہ میرے اوپر بہتان ہے۔ یہ سب کچھ مرزا نورالدین اور محمد حیدر شکوہ نے کیا اور میرے سر تھوپ دیا۔

بظاہر اس سلسلہ میں تین اقدامات کیے گئے، ایک تو یہ کہ بادشاہ نے "امین الدولہ سمین فریزر بہادر، دلیر جنگ، صاحب ایجنٹ شاہجہاں آباد کو ایک خط لکھا:

"امارت و ایالت مرتبت، عمدۂ امرای نامدار، زبدۂ عقلای باوقار خیر اندیش، دولتخواہ بلا اشتباہ، فدوی خاص بعقیدت اختصاص، لایق العنایت والاحسان!

بتفضلات بادشاہی مباہی بودہ بداند! دریں ایام بملاحظۂ قطعات سوالات علما و مشائخ این شہر بوضوح پیوستہ کہ از روی اخبار و خطوط لکھنؤ بدریافت این مردم رسیدہ کہ بتاریخ ششم ربیع الاول مرزا حیدر شکوہ بہادر، و مرزا نورالدین بہادر شیعی مذہب، نبیرگان مرزا سلیمان شکوہ بہادر، در لکھنؤ علمی بکمال تجمل بہمراہی عمائد آن شہر برداشتہ بدرگاہ حضرت عباس بردند۔ و فضیلت پناہ سیادت دستگاہ سید محمد، مجتہد مذہب شیعہ، بدست خود علم مذکور را در درگاہ نصب نمودہ۔ و مرزایان مسطور بہ نسبت ابلاغ آن علم بہ بندگان والا کردند۔ و نیز مرزا نورالدین بہادر بر منبر برآمدہ مرثیہ بزبان اردو کہ متضمن بی ادبی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بودہ در مجمع کثیر بآواز بلند برخواندہ۔ در مقطع آن مرثیہ تخلص حضور پرنور درج کردہ و قطعۂ شقۂ مہری خاص مشعر ترک کردن مذہب اہل سنت و جماعت و اختیار نمودن مذہب اہل تشیع و وثوق ارادۂ تعمیر امام باڑہ و اختیار تعزیہ داری بردوام موسومہ مجتہد مذکور ظاہر ساختہ، بندگان والا را باہتمام مذہب روافض متہم و بدنام ساختند

و چون این ہمہ غلط و بی اصل و محض افترا و بہتان است، زیرا کہ بعنایت الٰہی در عقیدۂ راسخۂ حضور کہ آن بطریق اہل سنت و جماعت است، ہرگز فتور و فساد راہ نیافتہ۔ و کدام مرثیہ محتوی مضمون سب و طعن نسبت بخلفائے راشدین، کہ اساطین دین و مقتدایان اہل یقین اند، بر زبان الہام بیان نہ رفتہ، و شقۂ خاص باشعار امور خلاف شرع بنام مجتہد مذکور ہرگز ریختۂ کلک گوہر سلک نگردیدہ این ہمہ تصنع و دروغ آرائی مرزایان مذکور است کہ بحضور پرنور منسوب کردہ اند۔

و لیکن بیاد می آید، کہ ایشان ہنگام حضوری خود دریں جا، این معنی بطریق حکایت و تذکرہ معروض داشتہ بودند کہ موافق مذہب خود برائے حصول صحت بندگان والا، نذر قرار دادہ ایم کہ بر وقت غسل صحت حضور از طرف خود علمی طیار ساختہ، در شکریۂ صحت حضرت اقدس بدرگاہِ حضرت عباس خواہیم داشت، سوای این ہیچ مذکور نہ کردہ بودند، و نیز اکثر شقہ جات در مقدمۂ ذاتی خود مسجل کنانیدہ بودند و لیکن بنام فضیلت پناہ مذکور کدام تحریر کہ بہ مہر خاص مزین باشد ہرگز بوقوع نیامدہ شاید مرزایان مسطور بنام کدام مصلحت و منفعت خود این افترا بحضور کردہ باشند و تحریری بی اصل و باطل مرتب کردہ دادہ باشند و مجتہد مذکور بمقتضای نیک نہادی خود آن را در پایۂ صدق دانستہ شہرت دادہ باشند دریں صورت ملاحظۂ آن شقہ کہ نزد آن سیادت دستگاہ رسانیدہ اند ضرور در افتادہ، تا معلوم شود کہ مضمونش چیست، و نگارندہ اش کیست۔ و بعد دریافت این حال تدارک انسداد رخنۂ این فساد بطرز مناسب بعمل آید کہ بار دیگر کسی جرأت این افترا پردازی بہانہ گردد۔

لہذا، زیب ارقام می باید کہ آن امارت و ایالت مرتبت بمقتضای دولت خواہی و خیر اندیشی بہ جہت رفع این اتہام و بدنامی بندگان اقدس خط انگریزی خود بنام ایجنٹ بہادر لکھنؤ بمزید تاکید بہ نگارد کہ شقۂ جعلی مہری خاص، از مجتہد مذکور بہر نوع کہ تواند طلبیدہ نزد و ترا ارسال دارد۔

ہر آئینہ این معنی موجب استرضای خاطر عاطر خواہد شد ـــــ زیادہ تفصیلات شناسد۔ فقط"

سلطان العلماء نے اس کے جواب میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو ایک خط بہادر شاہ کو لکھا جس کا متن علم حیدری ص ۷ پر درج ہے خلاصہ یہ ہے:

"آپ کے آباؤ اجداد شیعہ تھے[1]۔ آپ کے سابقہ خط نے اس کی تائید مزید کی تھی، لیکن جس طرح بادشاہ غفران پناہ، بہادر شاہ، طاب ثراہ کو اعلان تشیع کے جرم میں شہید کیا گیا[2]۔ اسی طرح جناب والا کے اس اقدام کے بعد ہنگامے کھڑے ہو گئے اور دشمنوں نے یہ چاہا کہ آپ کا نام بھی خطبے سے نکال دیں۔ عین اسی عالم میں آپ کے خط کی نقل اجنسٹ کے نام آئی مجھے پڑھ کر حیرت ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سابقہ خط میں فریب کا امکان ہے۔ اسی طرح اس خط کو تقیہ پر محمول کیا جا سکتا ہے۔
رہی یہ بات کہ وہ خط جعلی ہے؟ اس کا جواب مرزا محمد شکوہ بہادر اور مرزا نور الدین صاحبان سے ہے۔ ان کے خطوط آرہے ہیں اور چونکہ اس سلسلے میں تحقیق ہو رہی ہے، اس لیے اصل تحریر تو ابھی واپس نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بعد تحقیق جس طرح میں جناب والا کا خط واپس کروں گا، یقین ہے جناب والا بھی میرا جواب واپس کر دیں گے۔

اس کے ساتھ ہی سلطان العلماء نے رزیڈنٹ کو اسی قسم کا جواب لکھا، مرزا حیدر شکوہ نے بھی رزیڈنٹ کو اپنے آباء اجداد کے شیعہ اور حالت تقیہ میں ہونے کا ذکر کرتے ہوئے حقیقت واقعہ لکھی، جس کے بعد فیصلہ انہی کے حق میں ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک رسالہ "بطور اعلام از طرف بادشاہ جم جاہ و چند اشعار، بطور مثنوی بزبان فارسی باندراج تخلص بادشاہی کہ متخلص بہ ظفر اند ـــــ کلمات طیبات ـــــ مخاطب ساختہ طبع کنانیدہ، جابجا مشتہر "کی گئی"۔ (علم حیدری ص ۱۲ سطر ۴ بعد)

(۲) رسالہ کے آخر میں ص ۲۰ پر ہے "مثنوی شوکت حیدری در جواب کلمات خبیثات خوارج دہلوی" پھر علی بخش کے مطبع کی چھپی ہوئی اٹھارہ صفحات اور ۱۶۲ شعروں کی مثنوی ہے، اسی مثنوی کے ص ۱۸ پر مصنف کا قطعہ تاریخ ہے۔

ازین نظم حق، مفتری شد ذلیل		براوج مراتب شدہ مثنوی
ز دہلی چو نظم دروغ آمدہ		کہ آن پر معایب شدہ مثنوی
چو حق بود سویم، نوشتم جواب		بر این عجایب شدہ مثنوی
شدہ غالب کل غالب معین		بر ان نظم غالب شدہ مثنوی

ان طویل اور مفید اقتباسات سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ چونسٹھ شعروں کی وہ مثنوی جسے متفرقات غالب میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کا نام "کلمات طیبات" تھا، اور غالب نے بادشاہ کے نام سے کہی تھی:

بوظفر، ملک و دین خدا داداست		داد خواہیم و کار با داد است

اور وہ "اعلام نامہ" جس کا ذکر حقیر کے نام مرسلہ خط میں ہے:

"وہ مثنوی اور اعلام نامہ میں نے تمہارے پاس بھجوا دیا ہے"۔ (نادرات ص ۵۰ حصہ مکتوبات)

مثنوی سے جداگانہ چیز ہے۔

اس پوری بحث کے بعد پنج آہنگ طبع دوم دہلی ص ۲۲۴ اور طبع اول کشور طبع سوم ص ۲۲۸ کا وہ بے تاریخ خط بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور یقینی طور سے اس کی تاریخ بھی معین کی جا سکتی ہے جس میں مرزا نے انتہائی عاجزی و شرمندگی کے ساتھ "مجتہد العصر، سلطان العلماء، مولوی سید محمد صاحب" کو اس مثنوی کی معذرت میں جواب دیا ہے:۔

---

[1] یہ بات درست نہیں ہے اس خاندان میں بہادر شاہ اول کے علاوہ کوئی بھی بادشاہ شیعہ نہیں ہوا۔ (نگار)

[2] یہ بھی خلاف واقعہ ہے۔ بہادر شاہ طبعی موت مرے ہیں اور طویل عمر پائی تھی۔ (نگار)
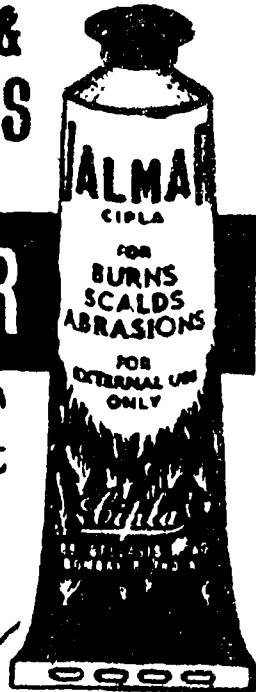
" واد آنست کہ اگر ازیں پرسش باندازِ بازپرس بودی ہم راہ سخن برمن فروبستی، و لرزہ پیکر مرا خُرد درہم شکستی، چون از روی مہر و آزرم است، چرا نہ گویم، و اگر گویم ہم از من برمن ستم رود، و در چہ انجمن گفتہ نشود، کہ — تلانی در گناہ دلیر است و در پوزش نا بروا — زبان سخن سرای آلۂ گہر سفتن است، نہ ساز آہنگ ناسزا گفتن. نمی گویم کہ بد گفتن گناہ نیست و ہمی گویم کہ گناہ من جز بزیر فتن فرمان شاہ نیست. تا دریں ناخوش ہنگام دنا روا ہنگامہ دیگر چہ فرمان رود

راست می گویم و یزداں نہ پسند. وجز راست حرف نا راست سرودن روش اہرمن است در نگارش مثنوی، مضمون از خسرو است و لفظ از من' چنانکہ در رامش زخمہ از مغنی و صدا از تار۔ و نشگفت' کہ بایں ہمہ ہمہ از زبان من نبود دو دیگراں مصرعی چند افزودہ باشند"

قطع نظر اس سے کہ خط کس قدر دل کش عبارت اور کیسے پیارے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ یہاں مرزا کے نفسیات، بادشاہ سے مرزا کا قلبی تعلق، سلطان العلماء کی تحقیق و تفتیش کے علاوہ ایک بالکل نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ "کلمات طیبات" میں کوئی اور شخص بھی سلجھے دار رہے[1]

---

[1] نگار کو فاضل صاحب سے اختلاف ہے اس لیے کہ غالب نے "مصرعے چند افزودہ باشند" کہا ہے جس میں احتمال پایا جاتا ہے یقینی طور پر کہنے کی جرأت انھیں بھی نہ ہوئی ممکن ہے مختلف مصالح سے انھوں نے یہ جملہ لکھا ہو اور حقیقت حال اس کے قطعاً خلاف ہو جو غالب کے مزاج کے پیش نظر قرین قیاس ہے

مزاح:

غالب انڈ گوئٹے

حاجی لق لق

مجھ سے روایت کیا کامریڈ باری علیگ نے اور انھوں نے سُنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سُنائی آپ بیتی اور اب آپ مجھ سے سنیے "مرزا بیتی" میرے الفاظ میں اور اس کا ثواب پہنچائیے غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجیے میرے حق میں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے ان ایّام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانے میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردارجی نے مرزا صاحب سے کہا کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کچھ روپیہ مجھے بطور قرض دے دیں یا کسی دوست سے دلا دیں تو میں اٹلی پہنچ کر تھوڑے ہی عرصے میں یہ قرض چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا "قرض؟ سردار صاحب! یہاں پردیس میں کون ایسا ہندوستانی فارغ البال ہو سکتا ہے جو اپنے اللّے تللّوں کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے؟"

سردارجی: "مجھے کوئی زیادہ روپیہ نہیں چاہیے، صرف ...."

مرزا صاحب: (بات کاٹ کر) "اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔"

سردارجی: (مایوسی کے لہجہ میں) "تو پھر کیا کیا جائے؟"

مرزا صاحب: "کیا کیا جائے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

سردارجی: (پُر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) "وہ کیا، وہ کیا؟"

مرزا صاحب: "وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ جو بہت آسان کام ہے۔"

سردارجی: "وہ کیسے؟"

مرزا صاحب: "میں کل بتاؤں گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے۔"

سردارجی کی آنکھیں ان الفاظ کو سن کر چمک اٹھیں اور آپ مرزا صاحب کا "پیشگی" شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردارجی کو نیند نہ آئی۔ اور دوسرے دن وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہوہ خانے میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے اور قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے:-

مرزا صاحب: "دیکھیے سردارجی! مرزا غالب ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے؟"

سردارجی: "جی نا۔ جنہیں انڈین شکسپیئر کہتے ہیں؟"

مرزا صاحب: (مسکراتے ہوئے) "نہیں نہیں۔ انڈین شکسپیئر تو آغا حشر کاشمیری مرحوم تھے جو مشہور ڈراما نویس تھے۔ غالب ان سے بہت پہلے عہدِ مغلیہ میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسداللہ خاں تھا اور وطن دہلی۔ آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگ دستی میں گزری، آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اس لیے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔"

سردارجی: "بالکل میرے چچا سرنام سنگھ کی طرح، ذیلدار تھا۔ دو سو گھمیہ زمین تھی، ضلع بھر میں عزت تھی۔ لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اُدھار نہیں دیتا۔"

مرزا صاحب: "ہاں ہاں بس غالب کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن تھا بڑا خوددار، مرتا مر گیا لیکن اُمراء کے سامنے نہ جھکا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ...."

سردارجی سر تو ہلاتے جاتے تھے لیکن دل میں سوچتے تھے کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غالب کا قصّہ کیوں چھیڑ بیٹھے؟ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے سنتے جائیے۔

مرزا صاحب: "غالب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انھوں نے وہی زمانہ

پایا جو جرمنی کے فلاسفر شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی......"

مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی: "لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے"

مرزا صاحب: "بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ ذرا سنتے جائیے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مورخ، شاعر اور ادیب ہیں۔"

سردار جی: "میں اور شاعر؟"

مرزا صاحب: "بس آپ چپ رہیئے، اور میری بات سنیئے، آپ اتوار کے دن "ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ فرمائیں گے۔"

سردار جی: "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔ اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔"

مرزا صاحب: "آپ اُردو زبان میں، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جائیے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں تو ان کا نام تو چنداں مشکل نہیں۔ ذرا کہیے تو۔"

سردار جی: "غالب گوئٹے ــــ غالب گوئٹے ــ"

مرزا صاحب: "بالکل ٹھیک! آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ "غالب انڈ گوئٹے" کہیے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں، جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے۔"

سردار جی: "غالب انڈ گوئٹے ــــ غالب انڈ گوئٹے۔"

مرزا صاحب: "واہ وا، خوب! اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہوگا کہ ہندوستان کے مشہور اسکالر سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن بوقت شام ہومبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہوگا وغیرہ۔"

سردار جی: "لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟"

مرزا صاحب: "جی میں آئے کہتے جائیے۔ بس بولتے جائیے اور ہر تین چار جملوں کے بعد "غالب انڈ گوئٹے" کہتے رہیے۔"

اتوار کی شام آپہنچی۔ ہومبرگ ہال جرمن "اہل ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہر ادبیات جلوہ افروز تھے۔ ان کے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آ گیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے صاحب صدر نے اٹھ کر حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی:

"صاحبان! مرزا اسد اللہ خاں غالب دلی کے رہنے والے تھے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اس لیے ان کی عمر تنگدستی میں گذری۔ دلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے، وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے۔ چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں ــ ــــ غالب انڈ گوئٹے!"

مجمع نے پُر زور تالیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی، تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں۔ اس لیے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گورو مہاراج کی کرپا ہے۔ نہر میں بھی پانی خوب رہا اور بارشیں بھی اچھی ہو گئیں، امید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ، چڑیا گھر، عجائب گھر ــ غالب انڈ گوئٹے!"

پھر تالیوں سے فضا گونج اٹھی اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار مار کر مقرر کی "جادو بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی تو ذرا زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا:

"غالب انڈ گوئٹے کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے شری دربار صاحب امرت سر کے درشن نہ کیے تھے کہ وہ ضلع گورداسپور بھی نہ جا سکے، ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انھیں نانی سپنے میں یاد آجاتی۔ ضلع امرت سر میں ایک گاؤں چمیاری ہے۔ وہاں کے خربوزے بہت مشہور رہے۔ قصور کی میتھی بہت خوشبودار ہوتی ہے اور پھر غالب انڈ گوئٹے کے کیا کہنے ہیں گویا انڈیا انڈ جرمنی!"

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب اینڈ گوئٹے" پر " انڈیا اینڈ جرمنی " کا اضافہ کر کے کمال کر دکھایا۔ اور ان الفاظ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا: تالیوں سے ہال گونج اُٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی اور دو تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا کہ :۔

"صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنیے"۔

اس مقام پر مرزا کاظم نے اٹھ کر حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنے مخصوص قومی انداز میں یہ گانا شروع کر دیا:

اساں نت دے

فی اساں نت دے شرابی رہنائی ہر نام کولے نال دے

اوہ وچ کتدہ کرئے

مرزا کاظم کرسی سے اچھل پڑے۔ جس پر حاضرین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب نے ان اشعار کو بے حد پسند کیا ہے۔ سردار صاحب پھر بولے :

اسیں مر گئے

فی اسیں مر گئے، کمایاں کر دے نی ہر نام کور نال دے

لے تیرے ہند نینے ـــــ ہائے نی اسیں مر گئے

اس دفعہ بھی حسب معمول، کافی داد ملی۔ لیکن داد کی حد تو اس وقت ہوئی جب سردار صاحب نے "غالب" کی وہ "مثلث" سنائی جس کی ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا:۔

" موڑیں بابا ڈانگ والیا چھٹی "

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور سردار پریتم سنگھ مورخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی، اس کے بعد مرزا کاظم اُٹھے اور انھوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا کہ پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے۔ شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو۔ کم از کم برلن میں تو آج تک ایسی تقریر نہ ہوئی ہوگی اور مجھے فخر ہے کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کیے ہیں۔ میں اس پوری تقریر کا ترجمہ کر کے برلن کے اخبارات میں شایع کراؤں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے مایہ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیسا کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی ـــــ اس کے بعد صاحب صدر اُٹھے اور انھوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ حاضرین کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا، بڑے بڑے ادیب، شاعر، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو لپکے اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازے تک لے جایا گیا ـــ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے اسٹیشن تک لے گئے۔ اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پُر تھیں۔

بقیہ "غالب سے متعلق دو خط"

نکات غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو اور کسی مضمون سے خبر ہی نہیں۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر ایک نظر سرسری ڈالے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گنے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں ......

یہاں مجھے ایک پہیلی کہہ لینے دو۔ میں جغرافیہ طبعی میں اسے لکھ دوں گا کہ آزاد جو اول ہندوستان میں نیچرل پوئٹ ہے اس نے اس کے مضمون کو یوں ادا کیا ہے وہ مضمون یہ ہے کہ خشکی و تری میں ایک رشتہ زن و شوہر کا ہے جب تک پانی مٹی سے نہیں ملتا کوئی نبات پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا رشتہ ان میں دختر و مادر کا ہے یعنی خشکی تری کے پیٹ ہی سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی گود میں پلی۔ پہیلی یعنی چیستاں ہوتی جائیں کہ وہ دو چیزیں کیا ہیں کہ جو جورو خصم بھی ہیں اور ماں بیٹیاں بھی ہیں۔

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر عبادت بریلوی

انگلستان کے کتب خانوں میں راقم کو غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط درج ذیل ہے۔ یہ خط مولوی نعمان احمد صاحب تعلقہ دار مہیوا پرگنہ مہولی سیتاپور کے نام لکھا گیا ہے، اور اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اس میں ان کا مخصوص انداز بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

"مولانا و بالفضل اولانا! فقیر میں جہاں اور عیب ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حکام سے بہ سبب ریاست خاندانی کے علاقے کے اکثر ملاقات رہتی ہے ــــ کبھی خوشامد کسی کی نہیں کی بھلا حضرت سے جھوٹ کیوں بولتا، اور آپ کی خوشامد کیوں کرتا۔ ایسا عاصی بھی نہیں واللہ باللہ کو تکیہ کلام جانتا ہوں۔ موحدہ کو اور واؤ کو تسمیہ جان کر از روئے قسم لکھا تھا، اور اب بھی از روئے قسم کہتا ہوں کہ نثر کے اس شیوۂ خاص میں اور مدعیوں سے آپ بہتر ہیں۔ آپ کو اپنا ہم فن اور ہم زبان سمجھ کر اپنا دردِ دل آپ کے سامنے کہا تھا۔ آپ نے غمخواری نہ کی۔ بلکہ اور الٹا آپ مجھ سے ملول ہوئے۔ خیر یہ بھی میرے بخت کی برگشتگی تھی کہ حضرت کے ذہن نے میرے خلافِ مقصود سے جہت انتقال کیا۔ برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنے چھوڑ دیے۔ اب شہزادہ بشیر الدین بہادر نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی میں خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع ــ بہتر برس کی عمر، حواس مسلوب، قویٰ مضمحل، بصارت میں ضعف، ہاتھ میں رعشہ، نسیان مستولی ــ آپ کا خط آیا، پڑھا، جواب اور وقت پر حوالہ کیے خط مع سرنامہ رکھ چھوڑا ــــ آج جو جواب لکھنے بیٹھا، خط نہیں ملتا۔ نہ بکس میں نہ کتابوں میں نہ طاق میں۔ حیران کہ اب کیا کروں۔ جو کچھ یاد آگیا اس کا جواب لکھا ــــ قِران کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زہرہ مشتری کا ایک برج اور درجہ و دقیقہ میں برابر ہونا قِران السعدین ہے۔ اور یہ قرانات جزئیہ میں سے ہے۔ اور اکثر واقع ہوتا ہے۔ اور یہ خبر ــــ؟ حسب سلطنت موعود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قِران پڑا ہوگا۔ بشرط آں کہ برج طالع میں یا اوتاد ثلثہ یا مائل اوتاد میں واقع ہو کہ نظر اس کے طالع موعودہ پر ہو۔ تو وہ افادہ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس ــــ وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقال سلطنت ہوتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک قِران تھا کہ زحل و مریخ میں فراہم ہوئے تھے۔ سراسر ہندوستان کی خاک اڑا دی ــــ قصہ مختصر جو بادشاہ صاحبِ قِران کہلاتا ہے بہ اعتبار افراط جاہ و جلال و قوت حال کہلاتا ہے۔ طالع ولادت میں قران السعدین واقع ہونا ضرور نہیں ــــ صاحبِ قِران مرادف شاہنشاہ ہے۔ سو بھی صرف سلاطین تمریہ میں دو شخص صاحب قِران کہلائے ہیں۔ امیر تمر اور شاہجہاں۔ تتبع کلام اساتذہ سے معلوم ہوگا کہ خاقانی نے اپنے آپ کو صاحب قران لکھا ہے۔ اس طرح فقیر نے بھی لکھا ہے۔ ع

سنز دگر تو لیسند صاحب قرانم

ادمیاں مومن تو قیع نویسی علت نہیں ہے۔ صاحب قراں کہلانے کی فقط

اسد اللہ [مہر]

شنبہ ششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

از روئے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔"

مہیوا پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور ۶۔ اکتوبر سنہ ۶۶ء۔ بیرنگ ضروری
جواب طلب۔ بخدمت مخدوم و مکرم مولوی نعمان احمد صاحب ادام مجدہٗ
مقبول باد　　از اسد

(افکار کراچی)

غالب کا ایک گمنام شاگرد

نادم سیتاپوری

غالب کے فن اور آرٹ کی پرکھ کے ساتھ "غالبیات" کے جن پہلوؤں سے ارباب ادب کی دلبستگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں "تلامذۂ غالب" ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ غالب کی اس معنوی نسل میں کہیں کہیں غالب کے فن اور آرٹ کی اچھی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ جس طرح غالب وسیع الاحباب تھے اسی طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا جو کم و بیش ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے جناب مالک رام نے شیرازہ بندی کر کے "تلامذہ غالب" میں بہت کچھ یکجا کر دیا ہے پھر بھی اس تصویر میں کچھ ایسے رنگ باقی رہ گئے ہیں جو ابھی تک ابھر نہیں سکے۔

حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری بھی غالب کے ایسے ہی گمنام اور غیر معروف شاگردوں میں ایک ہیں جن کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں اور شاید ارباب نظر انھیں جدید تحقیق کی اس کسوٹی پر ابھی تک پرکھ نہ سکے جسمیں روایات و درایات کے اصولوں کی دیکھ ریکھ کچھ ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ فکر و تحقیق کی اس "محصور و مقید" فضا میں ظاہر ہے طالب جیسے گمنام عاشق غالب کے بارے میں مستند تحریری ثبوت کو فراہم کرنا صرف دشوار نہیں بلکہ بہت کچھ محال ہی ہے اور تحقیق کی تنگی داماں کا مداوا سوائے ان مقامی روایات کے دوسرا ممکن ہی نہیں ہے جنھیں میں بہرحال قابل اعتماد و مستند سمجھتا ہوں۔

طالب میرے شعور سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کچھ دور کی قرابت بھی تھی مجھسے! ان کا مکان بھی میرے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا مجھے ان تمام بزرگوں کی خدمت میں بھی حاضری کے مواقع حاصل رہے جنھوں نے طالب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں زیادہ تر نگاہوں سے اوجھل ہو چکے پھر بھی سیتاپور ان کے دیکھنے والوں سے خالی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی نجی اور ذاتی یادداشتوں میں بھی طالب کا ذکر کیا ہے اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ! مثلاً قاضی الیاس حسین جعفری سیتاپوری اپنے خود نوشت حالات "اپنی کہانی اپنی زبانی"[1] (غیر مطبوعہ) میں طالب کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "یوم پنجشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حکیم سید محمد شریف صاحب طالب ساکن سیتاپور محلہ بنگلہ دفعتاً ملک عدم کو روانہ ہو گئے —— یہ طبابت میں اپنے باپ حکیم مفتی سید اولاد علی صاحب (جبریح) کے شاگرد تھے اور شاعری میں غالب دہلوی سے تلمذ تھا ان کی طبیعت نہایت تیز و حاضر تھی اور دواؤں کے افعال و خواص انھیں از بر تھے اور تشخیص بھی اچھی تھی —— اردو کی نظم اچھی لکھتے تھے اور جلد —— یہ بھی اپنا یہ کمال اپنے ساتھ لے گئے۔"

قاضی الیاس حسین (اکتوبر ۱۸۸۴ء —— مئی ۱۹۵۰ء) نہ محض سیتاپور کی زندہ تاریخ تھے بلکہ طالب کے ہم جدی اور بنی اعمام میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب چند پشتوں کے بعد ہی طالب سے ملتا تھا قاضی صاحب نے اپنے خود نوشت حالات (اپنی کہانی اپنی زبانی) پورے تین سو چھ صفحات پر تحریر فرمائے ہیں جس میں اپنے خاندانی اور ذاتی حالات ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ تقریباً پچاس سال کے مقامی، موسمی، ملکی اور ادبی کوائف کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے اور شعر و سخن سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ کاتب تخلص فرماتے تھے۔ لیکن شعری شعور کچھ زیادہ جاندار نہ تھا۔ صحیح معنوں میں مورخ و محقق بھی نہیں تھے لیکن ثقہ اور دیانت دار اتنے تھے کہ ان کی تحریرات پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا! طالب سے جو قرابت قریبہ تھی

---

[1] اصل مخطوطہ قاضی الیاس حسین کے بھائی ماسٹر ابو حسین جعفری (قصبیارہ۔ سیتاپور) کے پاس محفوظ ہے۔ (نادم)

اس اعتبار سے ان کی معلومات بہر قیمت قابل اعتماد ہیں۔ قاضی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں جس حسرت ناک سانحہ سے دوچار ہوئے وہ آج تک معمہ بنا ہوا ہے۔ ۲۴ رمئی ۱۹۵۸ء کو ایک عزیز کی تعزیت میں "باڑی" (ضلع سیتاپور گئے۔ لیکن واپسی کے بعد پھر ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ "باڑی" سے ریلوے اسٹیشن "سدھولی" کی طرف آتے ہوئے اس طرح غائب ہوئے کہ تلاش و تجسس انگشت بدنداں ہے! جانے زمین کھا گئی یا آسمان! ۔ غالب سے طالب کا سلسلہ تلمذ اور والہانہ وابستگی کی داستانیں ہمیشہ سیتاپور میں زبان زد خاص و عام رہیں —— اور ان مناظر کو دیکھنے والے تو اب بھی موجود ہیں۔ جب طالب اپنے استاد غالب کا کلام والہانہ طور پر پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ میرے محترم اور معمر بزرگ خان بہادر سید محمد ذکی صاحب رضوی (ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یو۔ پی) اپنے ایک نجی خط (مورخہ ۲۸ را پریل ۱۹۶۲ء) میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"تم نے جو کچھ سنا ہے وہ ٹھیک ہے! حکیم محمد شریف صاحب مرحوم یقیناً جناب غالب مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنا تخلص طالبؔ کس لحاظ سے رکھا؟ تو مرحوم (طالب) نے فرمایا کہ میرے استاد (غالب) کے تخلص کے ہموزن کوئی اور لفظ اس سے اچھا نہیں ملا۔ وہ ایک بار اپنے استاد مرحوم سے ملنے دہلی گئے تھے۔ اس زمانے میں سیتاپور سے دہلی جانا بہت دشوار تھا۔ دہلی سے واپسی پر جناب قاضی سید محمد صاحب اعلی اللہ مقامہ نے جو اس وقت رجسٹرار تھے ان کو لاہرپور ضلع سیتاپور میں سب رجسٹرار کی جگہ دے دی اور شاید اسی وجہ سے وہ دہلی نہ جا سکے! میں نے مرحوم کی وہ غزلیں دیکھی تھیں جن پر غالب مرحوم نے اپنے قلم سے اصلاح دی تھی! اور ان کے ساتھ غالب مرحوم کے خط بھی تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے صاحبزادے احمد شریف کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے غالباً محمد شریف صاحب مرحوم (طالب) کے تمام کاغذات تلف ہو گئے!

ایک بار میں اپنی ملازمت کے کام سے دورہ پر حکیم صاحب مرحوم (طالب) سے اُن کے موضع "کورکی" میں ملا تھا۔ آموں کی فصل تھی اور حکیم صاحب ایک آم کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں اس درخت سے ایک پختہ آم گرا۔ حکیم صاحب نے اسے پانی سے دھو کر مجھے مرحمت فرمایا۔ اور جناب غالب مرحوم کا وہ قطعہ پڑھا "بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے"

....

انگبیں کے بحکم رب الناس　　　بھر کے بھیجے ہیں سربہ مہر گلاس

جب اس شعر پر پہنچے تو فرمایا —— دیکھو "سربمہر" کی تشبیہہ کتنی مناسب ہے اور تم کھا کر دیکھو اس کا رس "انگبیں" ہے یا نہیں"

سیتاپور کے معمر ترین بزرگوں میں خان بہادر صاحب بڑی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسی سال سے کچھ زیادہ ہی عمر ہے۔ ہوش و حواس میں اب بھی کسی قسم کی کمی نہیں۔ آپ کے والد ماجد میر کاظم حسین وفا سیتاپوری طالب کے ہمسن معاصرین میں تھے —— اور خود خان بہادر صاحب نے طالب کی زندگی کے کھلے اوراق کا مطالعہ کیا ہے۔

ہندستان بھر میں "اودھ" غالباً وہ منفرد علاقہ تھا جہاں غالب اپنی زندگی میں بہت ہی کم مقبول ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ "اودھ" میں غالب کے شاگردوں کا حلقہ اتنا محدود تھا کہ جناب مالک رام "تلامذۂ غالب" میں صرف مندرجہ ذیل شاگردوں کا ذکر کر سکے۔

۱۔ شاہ ولایت علی خاں عزیزؔ صفی پوری
۲۔ سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی
۳۔ شیخ لطیف احمد عثمانی کیفؔ بلگرامی
۴۔ مولوی مقصود عالم مقصودؔ پھانوی
۵۔ سید ناصر الدین حیدر خاں ناصرؔ لکھنوی (عرف یوسف مرزا)
۶۔ حکیم محب علی نیرؔ کاکوروی۔

اس فہرست میں اگر حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی (نبیرۂ مولانا فضل حق خیرآبادی) اور حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری کے نام کا اضافہ کر لیا جائے تب بھی یہ تعداد ایک درجن تک نہیں پہنچتی۔ ممکن ہے تلاش و جستجو سے ایک آدھ نام اور بھی مل جائے لیکن اس کے باوجود اودھ میں غالب کی عدم مقبولیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اس وقت کا "اودھ" دراصل آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر۔ اور امیر مینائی وغیرہ سے کافی متاثر تھا۔ دلّی کے مقابلے میں "لکھنؤ اسکول" کی بنیاد پڑ چکی تھی چنانچہ لکھنؤ کی قربت سے سیتاپور کا متاثر ہونا بھی قدرتی بات تھی! یہاں آتش۔ انیس اور دبیر کے ماننے والوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ غالب اور سیتاپور کے مابین ہم آہنگی اور اخلاص کا جو رشتہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ذریعہ قائم ہوا تھا وہ (غدر سے پہلے) غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عباس بیگ (ابن مرزا اکبر بیگ بدخشی) کے سیتاپور منتقل سکونت کر لینے سے کچھ اور مضبوط ہو گیا۔ اور غدر کے بعد تو غالب کے تمام "باقیات الصالحات" بھی سیتاپور ہی چلے آئے۔ ان کے بھانجے مرزا سجاد بیگ عرف مرزا مغل اور بڑے بھانجے مرزا عاشور بیگ کی اولاد خداداد بیگ محمود بیگ اور رفیع الدین بیگ وحشی! اس خاندان کے سیتاپور پہنچتے ہی سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (سب جج) آغا عبدالغنی وکیل دہلوی نواب عبدالسلام خاں رام پوری (سب جج) مرزا اسد بیگ دہلوی۔ حکیم مومن خاں دہلوی کے داماد مولوی عبدالغنی وکیل اور اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی وغیرہ آگے پیچھے نہ جانے کتنے نامور اور باکمال سیتاپور آ گئے ——— غالب کے متعلقین میں کچھ تو حیدرآباد چلے گئے! کچھ یو۔پی کے دوسرے اضلاع میں پھیل گئے ——— لیکن اس خاندان کی مرکزی شاخ مستقلاً یہیں کی ہو رہی اور آج بھی موجود ہے! سید محمد احمد خاں تو "نیم سیتاپوری" ہو ہی چکے تھے۔ اپنے آخری ایام زندگی میں (مسٹر) سید محمود بھی یہیں آ گئے۔ سیتاپور سے کچھ ایسا عشق ہوا کہ تمام عمر یہیں رہے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کی لاش علی گڑھ لے جائی گئی!

لیکن ان تعلقات کے باوجود نہ تو غالب کبھی مولانا فضل حق خیرآبادی کے ساتھ آم کھانے خیرآباد[1] (ضلع سیتاپور) آئے اور نہ اپنے بھانجوں سے ملنے کے لیے کبھی یہاں پہنچے! یہی نہیں بلکہ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی "وجیہہ النساء بیگم" کے نکاح میں بھی شریک نہ ہو سکے جو سیتاپور ہی میں غالب کے نواسے مرزا محمود بیگ کے ساتھ ہوئی تھی۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب ——— تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خاں بہادر کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے تم کیوں شکر گذار ہوتے ہو۔ جو کچھ نیکی اور خوبی اس اقبال نشان نے تمہارے ساتھ کی ہے وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے۔ اس کا جوہر طبع از روئے فطرت شریف ہے۔ پروردگار اس کو سلامت رکھے اور مدارج اعلیٰ کو پہنچائے۔ یہ اپنے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی "ناں" کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور نوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری طرف بھی عاید ہوتا ہے!

وہ اپنے جی میں کہتا ہو گا کہ "ماموں" میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صرف زر سے جی چرایا ہے۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا ——— مگر کیا کروں! مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاش کہ جب ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے۔" (صفحہ ۳۱۳۔ ادبی خطوط غالب مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ)

یہ رابطہ و تعلق تو اپنی جگہ تھا۔ اس کے برعکس تصویر کے دوسرے رخ میں خیرآباد (ضلع سیتاپور) کی دو مشہور اور ذہین طوائفوں (زہرہ و مشتری) کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں جو غالب کے مشہور حریف آغا علی شمس لکھنوی کی شاگرد تھیں۔ ان دونوں نے بھی غالب کے خلاف بڑے بڑے ہنگامہ خیز مضامین لکھے جو "اودھ اخبار" وغیرہ میں چھپا کرتے تھے۔ ریاض خیرآبادی نے بھی اپنی ابتدائے مشق سخن میں غالب کے دیوان کا "جواب" کہنا شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی ایک غزل میری نظر سے گزری ہے۔ مقطع کا آخری مصرعہ تھا:۔

میں ہوں ریاض، کچھ اسد دہلوی نہیں

---

[1] اودھ کا قدیم قصبہ سیتاپور سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے یہاں آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے علماء اور مشائخ آسودہ خواب ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ قصبہ اودھ کا "مدینۃ الاولیا" سمجھا جاتا تھا۔ اب تقریباً ویران ہو چکا ہے۔ (ناظم)

پس منظر خواہ کچھ بھی ہو ! لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی کے پوتے مرزا قاسم علی قزلباش بسلسلہ ملازمت سیتا پور پہنچے تو آغا
العنی وکیل دہلوی کے اشتراک سے انھوں نے غالب ہی کی نسبت اسمی سے "غالب الاخبار" جاری کیا مگر اس کا پہلا شمارہ یکم مارچ ۱۸۶۹ء کو نکلا تو
ب کی وفات کو دس بارہ دن گذر چکے تھے !

طالب اسی سیتا پور (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ سن ولادت کا صحیح پتہ تو چل نہیں سکا البتہ قدیم خاندانی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان
ن غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے آخری عہد حکومت (۱۸۱۴ء — ۱۸۲۷ء) میں بمقام سیتا پور پیدا ہوئے اور ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء میں کم و بیش
سال کی عمر میں وفات پائی۔ "تکیہ مدار شاہ" محلہ قضیارہ (سیتا پور) میں سپرد خاک کیے گئے ! ان کے والد مفتی سید اولاد علی جریح اپنے دور کے ایک
ال شاعر گذرے ہیں۔ تمام عمر مداحی اہلبیت اطہار میں بسر کی۔ ان کے فارسی قصائد کا ایک نامکمل قلمی مجموعہ میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

نسبی حیثیت سے طالب سیتا پور کے ممتاز جعفری[1] نیشا پوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلہ نسب تیئیس[32] واسطوں سے صادق آل
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مورث اعلیٰ حضرت سید شاہ اسمٰعیل نیشا پور سے ترک سکونت کر کے ہندستان تشریف لائے
ے۔ اور قصبہ کہرام (مضافات انبالہ) میں سکونت گزین ہوئے تھے۔ ان کے پوتے سید عبدالملک کہرامی کہرام سے جونپور اور کمیر مخدوم سید عادل
لک بہ عہد سلطان ابراہیم شرقی جون پور کو خیر باد کہہ کر رائے بریلی چلے آئے۔ ابوالفتح سید فتح اللہ (عرف شیخ فتن) انھیں بزرگ کی انسل سے تھے۔
عہد شاہجہانی میں سیتا پور آبسے تھے جن کی یادگار سیتا پور میں ایک محلہ "فتن سرائے" آج بھی موجود ہے۔

نیشا پوری سادات میں بڑے بڑے صاحبان شریعت و طریقت بزرگ گذرے ہیں۔ مخدوم عادل الملک کا مزار آج بھی رائے بریلی میں مرجع خاص و
م ہے۔ مخدوم عادل الملک کی چھٹی پشت میں سید ظہیرالدین کہرامی مصنف "فتاوائے ظہیری" کا شمار ان ارباب علم و فضل میں ہے جن کے اذکار سے اسلامی
یخ کے صفحات معمور ہیں۔ میر گلزار حسین ارم، مولوی نیاز احمد نامی سیتا پوری اور ہند و پاک کے مشہور ادیب و صحافی سید رئیس احمد جعفری ندوی تو
صدی کے اہل کمال ہیں جنھیں شاید بہت دنوں تک دنیا نہ بھلا سکے گی۔

طالب کے والد مفتی سید اولاد علی جریح کا انتقال غدر ۱۸۵۷ء سے آٹھ نو سال قبل (تخمیناً ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء) میں سلطان عالم
جد علی شاہ بہادر کے ابتدائی عہد حکومت میں ہوا۔ ان کے قبضہ میں سیتا پور کے قریب ہی کئی مواضعات کے حقوق متاجری تھے۔ تمول۔ فراغ البالی
امارت کے چوچلوں نے جریح کے مرتے ہی اچانک حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ "بوہرے" مہاجن کا
ڈ دس ہزار قرض ہوا اور طالب حالات سے کچھ ایسے گھبرا گئے کہ بلا کہے سنے سیتا پور کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ پہنچے۔ طبابت اس خاندان کا موروثی پیشہ
ا۔ طالب نے فن طب کی تکمیل اپنے باپ سے کی تھی اور وہ بھی اس طلب و ذوق کے ساتھ کہ ابتدا ہی سے ان کا شمار حاذق اطبا میں ہونے
لگا تھا۔ خدا نے دست شفا ایسا دیا تھا کہ کوئی مریض ان کے مطب سے ناکام و مایوس نہیں جاتا تھا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی انھیں خوش قسمتی سے شاہی
ندان کے ایک بیمار کے علاج کا موقع مل گیا۔ مریض شفایاب ہوا اسی کے ساتھ ہی ان کی شہرت کی دھوم لکھنؤ بھر میں مچ گئی۔ نواب سلیمان قدر
ادر نے قدر افزائی فرمائی اور یہ ان کی سرکار میں بزمرۂ طبیب خاص ملازم ہو گئے۔

نواب سلیمان قدر بہادر آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے مختلف البطن بھائی تھے ان کی سرکار میں آئے دن مشاعرے
ا کرتے تھے۔ ناسخ کی اس غزل کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی جس کا مطلع ہے۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا　　طلوع صبح محشر۔ چاک ہے میرے گریباں کا

لکھنؤ بھر میں اسی طرح پر مشاعرے ہو رہے تھے۔ نواب سلیمان قدر بہادر کے یہاں بھی اسی طرح میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لکھنؤ کے تمام
اساتذہ فن موجود تھے۔ لیکن طالب نے جب اپنی غزل پڑھی تو ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ اس غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] صفحہ ۸۵۴ لغایتہ ۸۶۵ "شجرات طیبات" مطبوعہ امیر المطابع سیتا پور ۱۹۱۸ء

فروزاں ہے جو دل میں داغ عشق شعلہ رویاں کا — گماں ہوتا ہے دود آہ پر دود چراغاں کا
یہی ہے زور گردست جنون فتنہ ساماں کا — نگہباں ہے خدا ہی صبح محشر کے گریباں کا
فروغ شعلۂ حسن رخ پر نور کے آگے — تجلی اک چراغ مردہ ہے گور غریباں کا
دہن سے ہر نفس کے ساتھ اک شعلہ نکلتا ہے — قفائے سینہ جو لانگاہ ہے کس برق تاباں کا
لگی ہے جس کی لو تجھسے اسے کیا خوف صرصر ہو — چراغ لالہ کو فانوس ہے دامن بیاباں کا

اس غزل کے دوسرے مطلع نے لکھنؤ بھر میں دھوم مچا دی۔ بڑے بڑے اہل کمال اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ طالب کا مطلع ثانی ناسخ کے مشہور مطلع سے بہت آگے بڑھ گیا۔

اسی مشاعرے کا ایک دل چسپ لطیفہ اور بھی مشہور ہے کہ کسی مسخرے نے ناسخ کی پوری غزل کو الٹ پلٹ کر مشاعرے میں پڑھ دیا۔ مثلاً مطلع کے پہلے مصرعہ میں "مشرق" کے بجائے "مغرب" بدل کر اس طرح پڑھا:۔

مرا سینہ ہے "مغرب" آفتاب داغ ہجراں کا

لوگوں نے کہا یہ تو استاد ناسخ ہی کے مطلع کو آپ نے الٹ دیا۔ مسخرے شاعر نے جواب دیا۔

"حضور — گستاخی معاف! آپ کو مشرق و مغرب میں بھی فرق نظر نہیں آتا — استاد نے مشرق کی بات کہی ہے اور میں "مغرب" کا ذکر کر رہا ہوں۔"

طالب نے ابتدائے مشق سخن اپنے والد مفتی اولاد علی جرم سے کی۔ اور زیادہ تر فارسی ہی میں کہتے تھے۔ شریف تخلص فرماتے تھے چنانچہ ان کی بہت سی اردو غزلیں بھی ایسی ہیں جن میں انھوں نے "شریف" تخلص نظم کیا تھا۔ لیکن جب غالب کے شاگرد ہوئے اور استاد کا ہم قافیہ تخلص "طالب" اختیار کیا تو اپنے قلم سے شریف تخلص قلمزد کر کے "طالب" بدل دیا!

نواب سلیمان قدر بہادر کی سرکار سے طالب کب تک وابستہ رہے! اس مدت کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۰ء تک وہ "لاہرپور"[1] میں عہدۂ سب رجسٹراری پر ضرور فائز ہو چکے تھے۔ اس زمانے تک "محکمۂ رجسٹری" میں تمام ملازمین کی تقرری اور برخواستگی "قاضی ایکٹ" مطابق ڈسٹرکٹ رجسٹرار کے ہاتھ میں رہتی تھی اور سیتاپور میں ڈسٹرکٹ رجسٹرار طالب کے سمدھی "قاضی سید محمد" ہی تھے انھیں کے توسل سے یہ لاہرپور کے سب رجسٹرار مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اسی عہدے پر فائز رہے!

سب رجسٹراری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے لیے انھوں نے پنشن نہیں لی بلکہ اسی جگہ پر اپنے اکلوتے صاحبزادے مفتی سید احمد شریف گہر کو سب رجسٹرار مقرر کرا دیا جو مدت العمر سب رجسٹرار رہے اور یہیں سے پنشن پائی۔

طالب اپنے آخری ایام زندگی میں زیادہ تر اپنے گاؤں کرکی میں رہا کرتے تھے جو ان کی زمینداری میں سیتاپور سے قریب ہی چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اپنے ایک موروثی گاؤں سے انھیں بے حد محبت تھی جب بھی سیتاپور میں رہتے رہتے گھبرا جاتے پالکی پر سوار ہو کر وہیں چلے جاتے جہاں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ان کی مختصر سی دیہاتی قیام گاہ بنی ہوئی تھی جسے "اودھ" کی زمیندارانہ اصطلاح میں "کوٹھار" کہتے ہیں۔

غالب سے رشتۂ تلمذ قائم ہونے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں البتہ سیتاپور کے معمرترین بزرگ حکیم سید احمد[2]۔ احمد سیتاپوری (۱۸۵۰ء

---

[1] "لاہرپور" ضلع سیتاپور کا ایک پرانا قصبہ ہے جسے اکبر اعظم کے مشہور نورتن۔ عین السلطنت راجہ ٹوڈرمل کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے راجہ ٹوڈرمل کے بنوائے ہوئے "راجہ تال" کے کھنڈرات اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ سیتاپور سے بیس بائیس میل پر واقع ہے۔

[2] حکیم سید احمد۔ احمد سیتاپوری "معیار پارٹی" (لکھنؤ) کے ایک خاص رکن تھے مرحوم ماہنامہ معیار، لکھنؤ میں ان کا کلام برابر چھپتا تھا۔ میرے والد کے خاص ملنے والوں میں تھے اور میرے ساتھ ہمیشہ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کے والد مولوی نعمان احمد کا شمار عمائدین سیتاپور میں تھا فارسی کے ا

(باقی صفحہ آئندہ)

۷ر اکتوبر ۱۹۶۲ء) بیان فرماتے تھے کہ ــــ

"مفتی صاحب (طالب) میرے والد مرحوم مولوی نعمان احمد (تعلقدار مہیوہ ضلع سیتاپور) کے گہرے دوستوں میں تھے ہر مہینے ایک کا دوسرے سے ملنا اتنا ضروری تھا جیسے مشرق سے آفتاب کا نکلنا! مفتی صاحب چونکہ فارسی کے ایک مشّاق اور نکتہ سنج شاعر تھے۔ اس لیے انھیں غالب کے کلام سے والہانہ وابستگی پیدا ہوگئی۔ خود میرے والد (مولوی نعمان احمد) فارسی کے ایک باکمال انشا پرداز تھے اور کسی حد تک غالب کی فارسی نثر نگاری کے قائل بھی تھے لیکن غالب کے شعری فن سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی وہ لکھنؤ کے رنگ کو زیادہ پسند فرماتے تھے چنانچہ اسی بات پر ان دونوں دوستوں (طالب اور نعمان احمد) کے درمیان اکثر چوٹیں چلا کرتی تھیں ــــ اور والد مرحوم اکثر مفتی صاحب سے طنزاً کہا کرتے تھے کہ جب آپ کو غالب کا رنگ اتنا پسند ہے تو آپ ان کی شاگردی کیوں نہیں کر لیتے ــ! انھیں باتوں کا نتیجہ نکلا کہ مفتی صاحب بہ نفس نفیس دلّی تشریف لے گئے اور غالب کے دست فن پر بیعت کر لی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان سلسلۂ مراسلت بھی قائم تھا میں نے بھی دو ایک خطوط دیکھے ہیں"

طالب کو اپنے استاد (غالب) سے جو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ وہ غالب کا فارسی اور اردو کلام پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سیتاپور کی فضا غالب کے لیے سازگار نہیں تھی چنانچہ اس دور کے بعض شوخ و طرار نوجوان طالب کے اس جذبۂ عقیدت کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ کب وہ نماز شروع کریں ــــ اور یہ لوگ انھیں ستانے پہنچ جائیں ادھر وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے پہلی رکعت شروع کی کہ دو چار لڑکے پہنچ گئے ــــ ایک نے غالب کا شعر پڑھا۔

درد "منّت کش" دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دوسرے نے شعر کی تعریف شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ اس شعر کی شرح بھی ــ! "منت کش" ایران میں ایک بہت بڑا دواخانہ تھا...... اور ...... اور......"

طالب پہلے تو لڑکوں کو مخاطب کرنے کے لیے زور زور سے نماز پڑھنے لگتے اور جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوتی تو نماز توڑ کر ان کے پیچھے دوڑتے ــــ!

مگر یہ کہاں ماننے والے۔ دوبارہ نماز شروع کی! پھر شیطان بن کر موجود! اب غالب کے اس مقطع کی شرح بیان کی جا رہی تھی ــــ

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا کہ "سر یاد" آیا

ایک نے مقطع پڑھا ــــ دوسرے نے شرح بیان کرنا شروع کر دی:-

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انشا پرداز تھے۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کے اصرار پر انھوں نے غالب کو فارسی میں خط لکھا۔ لیکن غالب نے اس کا جواب اردو میں دیا کیونکہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد وہ عام طور سے اردو ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کو غالب کی یہ ادا پسند نہیں آئی چنانچہ یہ سلسلۂ مراسلت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی نے غالب کے یہ چار دن خطوط ماہنامہ آجکل دلی میں شایع کر دیئے ہیں جو انھوں نے مولوی نعمان احمد کو لکھے تھے۔ غالب کے آخری خط میں جواب نہ دینے کا شکوہ بھی ہے۔

حکیم سید احمد نے (نغشا، ۷ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بارہ برس کی تھی مگر ہوش و حواس اتنے اچھے تھے کہ انتقال سے چند ماہ بیشتر جب میں ملنے گیا تو تقریباً دو تین گھنٹے تک برابر باتیں کرتے رہے۔ قدیم سیتاپور کے ادبی اذکار، اپنے انگلستان کے سفر کی روداد اور خود اپنے خاندانی حالات! شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر کچھ نہ کچھ بات چیت نہ ہوئی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حالات مجھے لکھوا دیجئے۔ فرمایا جب جی چاہے دو چار دن ٹھہر کر قلم بند کر لو ــــ لیکن یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی ایک دن معلوم ہوا کہ ان کی لاش لکھنؤ سے سیتاپور آئی ہے اور عیدگاہ کے قبرستان میں قبر کھودی جا رہی ہے۔ (نادم)

"صاف سا مقطع ہے غالب نے اپنے لڑکپن میں کہا تھا اور خوب کہا تھا یعنی جب انھوں نے مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تو اچانک مجنوں کا باپ" سر پا "آ گیا ...."

غرض کہ اسی طرح طالب مرحوم کو بار بار نماز توڑنا پڑتی اور یہ ناشعور لڑکے انھیں ستایا کرتے۔

ہونے کو طالب کے دس بارہ اولادیں ہوئیں مگر سوائے ایک صاحبزادے مفتی سید احمد شریف اور ایک صاحبزادی کے تمام اولادیں کم عمری ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ صاحبزادی میرے رشتہ کے چچا سید حید رحسین حیدری سے منسوب تھیں جن کے بطن سے صرف ایک دختر "معظم النسا بیگم" ہوئیں جو بقید حیات ہیں۔

مفتی سید احمد شریف بڑے ہی محرور المزاج مگر متقی بزرگ تھے تخمیناً ۱۹۲۵ء تک یو،پی کے مختلف اضلاع میں سب رجسٹرار رہے۔ جون ۱۹۳۱ء میں بمقام سیتاپور وفات پائی۔ شعر و سخن سے بھی کچھ دلچسپی تھی "گہر" تخلص فرماتے تھے۔ کلام میں سلاست اور روانی تھی، روزمرہ اچھا کہتے تھے۔ ایک غزل سنائی تھی جس کے صرف دو شعر اس وقت یاد ہیں:۔

اب دلوں میں باہمی الفت نہ یاری رہ گئی　　تُو تُو۔ مَیں مَیں۔ آئے دن میری تمہاری رہ گئی

تم شب وعدہ نہ آئے۔ اپنا عالم کیا کہیں　　جس طرح گذری گذاری۔ ضد تمہاری رہ گئی

طالب کے نامکمل دیوان میں جو غزلیں ہیں انھیں دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو ابتدائی دور جب وہ شریف تخلص کرتے تھے۔ دوسرا دور غالب سے افتخار تلمذ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کا جو نامکمل قلمی دیوان ہے اس میں فارسی کا ایک قصیدہ اور ایک حمد بھی ہے۔ یہ وجد آفریں حمد اگرچہ نامکمل ہے لیکن اسے پڑھ کر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں فارسی کے ادب عالیہ پر اچھا خاصا عبور تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے انھیں غالب کے پرستاروں میں شامل کر دیا تھا۔ حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را　　کہ در کنہہ اُو حسرت ادراک را

دو رنگ آفرینندۂ روز و شب　　ثریا عطا ساز تاک عنب

فرازندۂ کاخ گرداں سپہر　　فروزندہ گوہر ماہ و مہر

دہد نطق و ہم فہم و سمع و بصر　　کنی تا کہ ادراک نفع و ضرر

سفید و سیاہ و بہ نقش و کبود　　بسے رنگ ہائے گزین وا نمود

عطا میکند انچہ می شایدت　　کہ ہر یک بہ ہر لحظہ کار آیدت

معین مددگار ہر مستمند　　رہانندہ عاجزاں از گزند

ادا کے شود شکر احسان اُو　　خوش آن کہ پوید بہ فرمان اُو

طالب کا جو اردو کلام اب تک میں فراہم کر سکا ہوں اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی شاعری میں جو موڑ پیدا ہوا وہ غالب کے فیض تلمذ کا رہین منت ہے البتہ ایک مقطع سے اس حقیقت پر ایک ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے۔

بہت جانکاہیوں سے گوشنشیں کیں طرز غالب میں　　ہوا ممکن نہ اے طالب وہ انداز بیاں پھر بھی

طالب اپنے استاد میں کتنا محو و مستغرق تھے اس کا اندازہ ان کی اسی غزل کے ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے؟

تمہاری دوستی ہی میری بربادی کو کافی ہے　　ضرورت کیا ہے جو دشمن بنے یہ آسماں پھر بھی

اسے نہ تو غالب کا سرقہ کہا جا سکتا ہے نہ توارد — میں تو اسے "استغراق عقیدت" ہی سمجھتا ہوں۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ غالب کا یہ شعر انھوں نے نہ پڑھا ہو —

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے !　　ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

نمونۂ کلام کے طور پر میں بلا کسی تبصرے کے طالب کی انھیں غزلوں کا سرسری انتخاب پیش کر رہا ہوں جو کسی حد تک غالب کے رنگ میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ اشعار بھی شامل ہوں جن پر غالب نے اصلاح دی تھی۔

ثابت قدمی کر دل شیدا ابھی کچھ اور واں ہیں ستم حوصلہ فرسا ابھی کچھ اور

کر دمیوں نے بند کیے آسماں کے در آہنگ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

بسمل بخون طپیدہ کہ رنگ پریدہ ہوں جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

موج صبا پہ بوئے گل نو دمیدہ ہوں اک آہ سرد و نالہ درد آرمیدہ ہوں

بے تابی اپنی طالب دل خستہ کیا کہوں نالے سے رعد آہ سے برق طپیدہ ہوں

تیرے دیوانے کو ہے صحرا کا یوں دامن عزیز جس طرح یعقوب کو یوسف کا پیراہن عزیز

پاکدامانی پہ گو معصوم کی شاہد ہوا لیکن اپنے دل میں یوسف سے رہا بدظن عزیز

یوں رقیب روسیہ سے اور ہم سے ربط ہے خار کو رکھتا ہے جیسے دامن گلشن عزیز

کبھی دل آپ کو رسوا نہ کرتا مگر مجبور مرتا کیا نہ کرتا؟

جو بھولے سے بھی ہوتی پرسش حال دل شوریدہ گھبرایا نہ کرتا

وفائے قیس میں ترک ادب تھا جو تعظیم سگ لیلا نہ کرتا

پہلے حیات خضر مہیا کرے کوئی پھر انتظار وعدۂ فردا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت شمع تجلی کا دے فروغ شوق دل کلیم تو پیدا کرے کوئی

طالب وہ جسکے عیب کو چاہے صفت کرے داغ سفید کو ید بیضا بنا دیا

جامہ کعبیا نہ رہا رشتۂ جاں بھی تن میں رہگیا دست جنوں سر بگریباں ہوکر

نابلد ہوں میں رہ دشت جنوں سے بالکل لے چل اے وحشت دل خضر بیاباں ہوکر

ظاہر ہے دل کا حال مرے۔ کچھ چھپا ہے کیا بسمل تری ادا نے کیا پوچھتا ہے کیا

واعظ سنا رہا ہے جو دوزخ کی گرمیاں کچھ اس میں خوئے یار سے گرمی سوا ہے کیا؟

بلبل بوقت خندۂ گل نالہ کش نہ ہو اتنا تو دیکھ لے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

عرض نیاز ہی سبب ناز ہو گیا میں اپنے حق میں آپ در انداز ہوگیا

ہر چند درد دل میں چھپاتا رہا مگر   رنگ پریدہ پردہ در راز ہو گیا

وہم داغ فراق اس بت سیمیں تن کے   نہیں قارون کے خزانے سے بدلنے والے
بار ور گر نہ ہوا نخل تمنا نہ سہی   کیا ثمر ہوتے ہیں سب پھولنے پھلنے والے
سخت ہو کیسی ہی منزل مگر آگے پیچھے   بیٹھتے اٹھتے پہنچ جاتے ہیں چلنے والے

جس بات کا نہ تھا کبھی وہم و گماں مجھے   قسمت دکھا رہی ہے وہ نیرنگیاں مجھے
سمجھا جو میری موت میں وقفہ ہے یاں مجھے   کچھ اور جھیلنی ہیں ابھی سختیاں مجھے
کھلتا نہیں کہ قافلے والے کدھر گئے   بھٹکا رہی ہے گرد رہ کارواں مجھے

نالہ ہے بانگ جرس جب کوئی تاثیر نہیں   خواب مہمل ہے وہ جس خواب کی تعبیر نہیں
تیر ادھر رُخ تو کریں دیدۂ دل حاضر ہے   ان کی دل کاریوں سے ہم کبھی دلگیر نہیں
دیکھنا جوشش سودا یہ ادب کا ہے مقام   حلقۂ زلف ہے دیوانے کی زنجیر نہیں

دل محو جمال دوست مدفون ہے جہاں واعظ   اندھیرے کا بھلا مذکور ہی کیا ان مزاروں میں
توقع ان کے آنے کی عبث رکھتا ہے اے طالب   وہ کیوں آنے لگے ویرانۂ بے اعتباروں میں

نازاں ید بیضا پہ نہ ہوتے کبھی موسیٰ   گر دیکھتے جلوہ وہ تری دزد حنا کا
کچھ کم نہیں شاہی سے ترے در کی گدائی   سایہ تری دیوار کا سایہ ہے ہما کا

ساقی کی بزم تک جو رسائی ہوئی کبھی   قسمت سے میری جام نگوسار ہی رہا
دیکھا ہمیشہ طالب شوریدہ حال کو   رسوا میان کوچہ و بازار ہی رہا

دل مرا د[1]) خوار جور حسیناں ہی رہا   عمر بھر مثل جرس سرگرم افغاں ہی رہا
التفات غیر سے ہے مدعا ایذا مری   ورنہ وہ نا آشنا سب سے گریزاں ہی رہا
وہ نظارہ سوز ہے یارب جمال روئے یار   دیدۂ حسرت کش دیدار حیراں ہی رہا
طالب آئے بھی گئے بھی لوگ ان کی بزم سے   اور تو وقف کشاکشہائے درباں ہی رہا

یہ فیض ہے کسی متلون مزاج کا   ورنہ ہمیشہ رنگ بدلتا زمانہ کیا؟
طالب جو درد دل کا مزا جانتے نہیں   سمجھیں وہ صنعت غزل عاشقانہ کیا؟

(باقی صفحہ ۷ پر)

---

[1] لفظ پڑھا نہ جا سکا

دیوان کامل وشاداں

رشید حسن خاں

نواب زین العابدین خاں عارف، غالب کی بیوی امراؤ بیگم، کے حقیقی بھانجے تھے۔ غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں، بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم۔ بنیادی بیگم بڑی تھیں، ان کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی تھی، جن سے دو صاحبزادے ہوئے، زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔ زین العابدین خاں عارف، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے، اُن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اُس وقت ان کی عمر ۳۶ برس کی تھی بقول مالک رام صاحب، عارف کی موت پر غالب نے وہ دردناک نوحہ لکھا تھا، جو اردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور　　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کیے۔ دوسری بیوی (بستی بیگم عرف نواب دلہن، دختر میرزا محمد علی بیگ بخارائی) سے دو لڑکے ہوئے، باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کے انتقال سے چند ماہ پہلے، اُن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ عارف کے انتقال کے وقت، باقر علی خاں ۵ سال کے تھے اور حسین علی خاں دو سال کے۔ غالب نے ان دونوں بچوں کو متبنّٰی کر لیا۔ عارف کی رحلت کے بعد حسین علی خاں کو غالب اپنے یہاں لے آئے۔ باقر علیخاں کچھ عرصے تک اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے، پھر وہ بھی غالب کے پاس چلے آئے۔

دونوں بھائی شاعر تھے اور دونوں اردو فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باقر علی خاں کا اردو میں کامل تخلص تھا فارسی میں باقر۔ یہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ (مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب)

مالک رام صاحب نے بھی ان کو شاگرد سالک لکھا ہے اور تلمذ غالب سے انکار کیا ہے۔ البتہ صاحب سخن شعرا نے ان کو تلمیذ غالب لکھا ہے۔ ۲۵ مئی ۱۸۷۶ء کو یکم جمادی الاول (۱۲۹۳ھ) انتیسویں برس میں انتقال کیا (مکاتیب) سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی، اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ چھوٹے بھائی حسین علیخاں شاداں کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ وفات، لوح مزار پر کندہ ہے۔

چو زین غم خانۂ دنیا سفر کرد　　　سوے باغ جنان باقر علی خاں
بسال رحلتش تحریر گردید　　　بودمینو مکان باقر علی خاں　　(ذکر غالب)
۱۲۹۳

سالک نے بھی قطعہ تاریخ کہا تھا۔ جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔

" قطعہ تاریخ وفات مرزا باقر علیخاں کامل خلف زین العابدین خاں عارف۔ فرزند نسبتی نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں۔

یادگار عارفِ مرحوم تھا　　　کس کو مارا تو نے دوراں حیف ہے!
کیوں دکھایا تو نے اس کو روز بد　　　جس سے روشن تھی شبستاں حیف ہے!
اُس کے وابستوں کے دل میں رہ گئے　　　دیکھو کیسے کیسے ارماں، حیف ہے!
حسن اُس کا، ماہِ کامل سے دو چند　　　چھپ گیا وہ مہر رخشاں حیف ہے!
یہ ہے نوحہ، ہے یہی تاریخ سن　　　نوجواں باقر علی خاں، حیف ہے!" (کلیات سالک ص ۲۹۳)
۱۲۹۳

ان کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ایک غزل اور ایک مسدس شہر آشوب، فغانِ دہلی، میں محفوظ ہے، اور دو شعر، سخن شعرا میں باقی کلام خدا جانے کیا ہوا!
عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خاں کا تخلص شاداں تھا۔ فارسی میں خیالی تخلص کرتے تھے۔ فغان دہلی، میں ان کا تخلص راقم لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے راقم تخلص تھا، بعد کو شاداں اختیار کیا۔ دربار رام پور سے متعلق تھے امراد بیگم کے ایک مکتوب بنام نواب کلب علی خاں مورخہ ۲ اگست ۱۸۶۹ء (مشمولۂ مکاتیب) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاداں اُس وقت دربار رام پور کے متوسلین میں شامل ہو چکے تھے۔ پچیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ تھا (مکاتیب) صاحب خمخانہ جاوید نے

لکھا ہے کہ "پہلے تیس روپے ماہوار ملتے تھے پھر ساٹھ روپے ملنے لگے"۔ مالک رام صاحب نے 'تلامذۂ غالب' میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا ہے۔ آخر میں دلی چلے آئے تھے۔ اس آخری زمانے میں دماغی توازن بگڑ گیا تھا جسکی وجہ بقول مالک رام صاحب، بڑے بھائی کی موت کا صدمہ تھا۔ صاحب خمخانۂ جاوید نے، اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"آخر زمانے میں ان کو مالیخولیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے یہ خیال اُن کے ذہن نشین تھا کہ شاعر کے لیے دبلا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مرزا ارشد گورگانی، جو اُن کے جگری دوست تھے، ان سے مرزا شاداں کہا کرتے تھے کہ داغ کو کبھی شعر کہنا نہ آئے گا، کیونکہ شاعری اور فربہی سے بہت بعد ہے۔ ہوتے ہوتے یہ جنون یہاں تک بڑھا کہ پانی پینا بھی بہت کم کر دیا۔ ایک چھوٹی سی سیب کی ڈبیا میں، احتیاط کی وجہ سے پانی پیا کرتے تھے۔ حکیم غلام رضا خاں مرحوم نے ان کو ایک خمیرے کا نسخہ لکھ دیا تھا۔ اب غذا بھی بالکل ترک ہو گئی۔ یہ معمول کر لیا کہ دس بارہ آنے کے پیسے جیب میں ڈال کر، بازار میں آ کر کھڑے ہو گئے، اور دو دو چار چار پیسوں کا خمیرہ لے کر کھانا شروع کیا۔ جب سب پیسے ختم ہو گئے، مکان پر آکر لیٹ رہے۔ اب نقاہت اس درجہ بڑھی جس نے جان لے کر ہی چھوڑا"۔

شاداں کا انتقال، پنجم شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۸۰ء) کو ہوا۔ انتقال کے وقت ۳۰ سال کی عمر تھی۔ نساخ نے تاریخ کہی:

"برفت آہ شاداں ز دنیائے دوں　　　خدایا مقامش بفردوس باد
برائے سنِ رحلتش خامہ ام　　　رقم کرد شادانِ فرخ نہاد"

خمخانۂ جاوید، میں لکھا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۷ برس کی تھی، یہ صحیح نہیں۔ نیز صاحب خمخانہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ "فغان دہلی کی تحریر کے وقت ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی ہوگی"۔ بقول مالک رام صاحب اس وقت ان کی عمر "۹ - ۱۰ برس سے زیادہ نہیں تھی" (تلامذہ غالب)

کتاب خانۂ رام پور میں کلام شاداں کا ایک مختصر سا قلمی نسخہ ہے، جو ۱۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں کل ۲۸۲ شعر ہیں۔ سفید باریک کاغذ ہے، کتابت واضح ہے۔ سرورق پر ناظم کتاب خانہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی یہ تحریر ہے۔

"این نسخہ را کمترین امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ، از ردی خانہ یافتہ است و گمان غالب میدارد کہ اصل نسخۂ شاداں مرحوم است۔ مرقومہ ۸ مئی ۱۹۳۸ء"۔

اس کے کاتب نے ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے جس غزل کو جہاں چاہا لکھ دیا ہے۔ خمخانۂ جاوید میں شاداں کا کافی کلام درج کیا گیا ہے۔ صاحب خمخانہ نے لکھا ہے: "مجموعہ کلام ان کے اعزہ احباب کی غفلت سے تلف ہو گیا۔ اکمل الاخبار، ان ایام میں جاری تھا، اس کے پرانے فائلوں اور بعض دہلی کے مشاعروں کی غزلیں بے حد کاوش و جستجو سے ملیں، وہ درج ذیل ہیں"۔ اس میں ۲۴۲ بطور انتخاب کلام ہیں، اور دو شعر حالات میں درج ہیں۔ اس طرح کل ۲۴۴ شعر ہیں۔ ان میں سے ۵۵ شعر دیوان میں موجود ہیں — اور ایک شعر فغان دہلی، میں ہے۔ تذکرۂ انتخاب یادگار، میں اردو کے ۵ شعر ہیں، یہ پانچوں مخطوطۂ دیوان میں موجود ہیں۔ سخن شعرا، میں تین شعر ہیں، یہ خمخانہ میں درج ہیں۔ تذکرۂ طور کلیم، میں سات شعر ہیں، ان میں سے تین مخطوطے میں ہیں اور چار خمخانہ میں، تلامذہ غالب، میں جو شعر ہیں وہ خمخانہ سے ماخوذ ہیں۔ غرض شاداں کا جو کچھ کلام ہے، وہ دو جگہ ملتا ہے۔ اس مذکورہ مخطوطے میں یا خمخانۂ جاوید میں۔

انتخاب یادگار میں، فارسی کے پانچ شعر درج ہیں۔ دو شعر ایک قصیدے کے، ایک دوسرے قصیدے کا، اور دو شعر دو مختلف غزلوں کے ہیں۔ ان کے سوا فارسی کلام اور کہیں نہیں ملتا ہے۔ تذکروں کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا مثلاً امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں لکھا ہے کہ: "وطن ان کا دہلی ہے۔ مگر اب یہیں رہتے ہیں۔ پچیس برس کا سن ہے، شاعری کا مشغلہ رات دن ہے۔ فارسی اور اردو دو زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ شوق کا حال یہ ہے کہ کسی وقت فکر سے خالی نہیں رہتے ہیں۔ طبیعت دقت پسند ہے، فکر بلند ہے"۔ احمد علی خاں شوق نے تذکرۂ کاملان رامپور، میں لکھا ہے کہ:

"رامپور میں بوجہ ملازمت قیام رہا۔ بہت سے شاگرد تھے۔ شاعری کا رات دن مشغلہ تھا"۔

جو شعر خمخانۂ جاوید سے ماخوذ ہیں اور مخطوطے میں نہیں ہیں، ان کے سامنے (خ) لکھ دیا ہے یا حاشیے پر نوٹ دے دیا ہے۔ یہ اسلیے ہے کہ مخطوطے کے اشعار اور مطبوعہ اشعار میں امتیاز ہو سکے۔ ایک شعر فغان دہلی سے ماخوذ ہے۔ اس کے آگے (ف) لکھ دیا ہے۔ فارسی کے پانچوں شعر، انتخاب یادگار سے ماخوذ ہیں۔

باقر علیخاں کامل کا کلام تو اتنا بھی نہیں ملتا۔ ناچار فغان دہلی کی ایک غزل، اور ایک مسدس شہر آشوب، اور سخن شعرا، میں درج، دو اشعار پر قناعت کرنی پڑی۔ ان کو بھی آخر میں شامل کر دیا ہے — کامل اور شاداں کے مفصل حالات کے لیے مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب، اور ذکر غالب، مرتبہ مالک رام صاحب دیکھیے، اس مختصر سی تحریر میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بیشتر انھیں سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان دونوں کتابوں میں خصوصاً مکاتیب غالب، میں ساری ضروری تفصیلات درج ہیں، اس لیے ان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جو لوگ کامل و شاداں کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنا چاہیں، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصیدہ در مدحِ جناب نوّاب محمد کلب علیخاں صاحب بہادر، دام اقبالہٗ

سبز و شاداب چمن میں ہیں امیدوں کے نہال
تجھ سے ہے کلب علی خاں چمنِ دہر نہال

سعدِ اکبر کو ملا تیری قلمرو میں شرف
نظر آتے نہیں شادی کے سوا رنج و ملال

تو وہ ہے جو کہ بس اک دم میں لٹا دے سب کو
تیری نظروں میں ہے قاروں کا خزانہ کیا مال

تیرے ہی لطف سے رہتی ہے رعایا خرسند
ورنہ چلتا ہے فلک تو وہی اک ظلم کی چال

فی المثل وہ ہے اگر ذرّہ تو، تو ہے خورشید
عدلِ کسریٰ کو ترے عدل سے کیا دیجے مثال

بس کہ مشہور ہوئی داد دہی تیری
اب کوئی ظلم کسی پر کرے، کیا پائے مجال

ظلمت و ظلم کہاں تیرے قلمرو میں رہیں
تجھ سا جب مسندِ اقبال پہ ہو مہر جمال

عندلیبانِ خوش الحان ہیں چمن میں خوش خوش
ڈر خزاں کا ہے، نہ صیاد کا کچھ دل میں خیال

گرگ تو کہتے ہیں چوپائے کہ جاتا ہے کہاں؟
شیر کو دیکھ کے، پاس اپنے بلاتے ہیں غزال

جلوہ گر شام میں ہے، صورتِ صبحِ امید
اس زمانے میں نہیں مہر کو آسیبِ زوال

تو وہ بزمی ہے کہ ہمسر نہیں پرویز ترا
تو وہ رزمی ہے کہ رستم کو نہیں تابِ قتال

بحرِ زخّار، ترے علم کی تشبیہ ہے تام
بارِ احساں ہے، ترے حلم کی گویا تمثال

جو تری رائے ہو، اُس میں غلطی کیوں کر ہو
تجھ پہ کھل جاتا ہے آغاز میں ہر شے کا مآل

فخر کیوں کر نہ ارسطو کو ہو یکتائی کا
تجھ کو دانش میں ارسطو سے اگر دیجے مثال

کیا بیاں اسپِ سبک بار کی تیرے رفتار
گرد کے ساتھ پہنچتا نہیں صرصر کا خیال

کیا لکھے فیل کے اوصاف ترے، مدح نگار
کہ بلندی میں ہے کیواں، تو وہ ہیکل میں [illegible]

عرض کرتا ہوں غزل شوقِ غزل سنجی میں
گو کہ مانع ہے مجھے، میری پریشانیٔ حال

غزل

فتنۂ حشر سے بڑھ کر ہے اگر یار کی چال
اپنے نالے بھی کچھ اچھا نہیں رکھتے ہیں مآل

غم تو کیا، شوق بھی بے تاب کیا کرتا ہے
اپنے نزدیک تو ہے ایک فراق اور وصال

کہتی ہے لذّتِ سوزِ غمِ پنہاں مجھ سے
ہاتھ آجائے تو فردوس کو دوزخ ہی مثال

وصل دلدار میسّر ہو، کہ موت آجائے
اے فلک کوئی تو ارمان ہمارا بھی نکال

نگہِ شرم کہے دیتی ہے سارے اسرار
آپ ہم بزمیِ دشمن کا نہ کیجے اقبال

جب اُسے دیکھتے ہی رہ گئے اہلِ محشر
جرمِ الفت کا کسی نے نہ کیا ہم سے سوال

خاک ہونا تھا ہمیں کوئے بتاں میں آ کے
قیس و فرہاد کو الفت نے دیے دشت و جبال

مدح سنجی میں اِن اشعار سے کیا مطلب تھا
لیکن اس پردے میں منظور ہے عرضِ احوال

تو کرے ذرّہ نوازی تو شرف حاصل ہو
ورنہ یاں کوکبِ امید کو حاصل ہے وبال

شرم آتی ہے بیاں کرتے ہوئے خستہ دلی — میری صورت سے ہویدا ہے مری صورتِ حال
[illegible] ہو میرا بندا، تو پھر اے داور — رمضاں کیوں نہ رہے غرّۂ ماہِ شوال
[illegible] ہے فیضِ کرم کے نہیں چارہ کوئی — کر دیا چرخ نے سب خرمنِ راحت پامال
ابرِ بخشش کو ذرا حکم، کہ برسے مجھ پر — تاکہ سرسبز ہو پھر میرا ریاضِ آمال
غور کر غور، کہ کیوں کر سخن آرا ہو زباں — دل ہی قابو میں نہیں ہو تو ہو کیا تابِ مقال
جی میں سب کچھ ہے، مگر ختم دعا پہ ہے سخن — کہ ہے شاداں کی زباں کثرتِ آلام سے لال
تا رہے بے ہنروں کو حسدِ اہلِ ہنر (ق) — نظرِ اہلِ جہاں میں رہے تا قدرِ کمال
تیرے حسّاد ہوں، پامالِ ہجومِ ادبار — تیرے احباب کے سر پر رہے ظلِّ اقبال

مجھ سے حیرت میں سوا کیوں نہ ہو قاتل میرا — دیکھتا کوئی تڑپنا دمِ بسمل میرا
آئنہ دیکھ کے کہتے ہیں یہ منہ پھیر کے وہ — کوئی کھینچے لیے جاتا ہے اُدھر دل میرا
بے خودی میں ہے تجسس مجھے اپنا، لیکن — اک قدم بھی نہیں پڑتا سوئے منزل میرا
کثرتِ غم سے نہیں کوئی جگہ سینے میں — پھر بھی دے، وہ ستم گار اگر دل میرا
حد سے ہر چیز کو ہے بڑھ کے زوال بعید — سہل ہے، کام جہاں تک کہ ہو مشکل میرا
جستجو اپنی حقیقت کی ازل سے ہے ولے — ہوں میں وہ بحر، کہ پیدا نہیں ساحل میرا
آئنہ توڑ کے کہتا ہے وہ مغرورِ جمال — اور بھی کوئی جہاں میں ہے مقابل میرا
ناز کرنا تو ذرا اس پہ سمجھ کر کرنا — آپ کی طبع سے نازک ہے سوا دل میرا

پہلے ہی مست مئے عشق سے ہے دل میرا — بے خودی کام نہ کر اور بھی مشکل میرا
خود بخود گم ہوئے جاتے ہیں فراموش حواس — پھر مجھے دیکھیے جائے کہاں دل میرا
میری آشفتگیِ طبع کہے دیتی ہے — حشر تک زلف کے پھندے میں رہے دل میرا
یہ بھی ہو جائے گا کاکل میں شکن کی صورت — کوئی نقصاں نہیں، رکھ لو گے اگر دل میرا

پردہ اٹھا ہوا ہے رخِ پُر جمال کا — اڑتا ہے آج رنگ ہمارے خیال کا
کس کی زباں پہ ذکر نہیں میرے حال کا — باعث ہوئی ہے میری خموشی مقال کا
میری نگاہِ شوق پھر آئی، مگر کہیں — نظّارہ سا نصیب ہے، اس کے جمال کا!
کیا اس پہ پڑ گئی کوئی اس کی نگاہِ شوخ؟ — بدلا[1] ہوا ہے طور جو تا سعد کی چال کا
ٹھوکر سے اُس کی، خاک پہ ملتا نہیں دماغ — ہے آسماں پہ پانو ہر اک پائمال کا
ہم بے خودوں سے دور ہے یہ بزمِ آگہی — دل بجھ گیا ہے سینے میں شمعِ خیال کا
تابش اگرچہ مہر میں ہے، لیکن اے فلک — دیکھا کہاں ہے سینہ کسی خستہ حال کا
اُڑنے سے رنگ کے، یہ شبِ وصل وہم ہے — بگڑے نہ رنگ اور بھی صبحِ وصال کا
ایسا نہ کیجو ضعف، کہ اس در کی راہ میں — دم ٹوٹ جائے غیر کے گھر پہ خیال کا

---

[1] نخ، بدلا ہوا جو طور ہے۔

ہیں اہلِ بزم ہاتھ جگر پر دھرے ہوئے
کچھ ذکر آگیا ہے وہاں میرے حال کا

کس ناتواں کا سایہ پڑا روزِ ہجر پر
سو حشر ہو کے وقت نہ پہنچا زوال کا

خاموشی اک بیاں ہے مرے رازِ عشق کو
رنگِ شکستہ آئنہ ہے میرے حال کا

صد خامشی نہ ایک مرا حرفِ مدعا (کذا)
قایل ہوں آپ اپنی میں طرزِ مقال کا

اب تک تو بے خودی سے نہیں مجھ پہ کچھ کھلا
مشتاق گو ازل سے ہوں میں اپنے مآل کا

اُٹھا میں سُن کے غلغلۂ حشر کو عبث
دھوکا ہوا اُٹھ کے اُس بُتِ کافر کی چال کا

پرتو فگن ہے حسن کسی کا جو سینے میں
کچھ رنگ اور ہی ہے ہمارے خیال کا

اے اہلِ بزم! خاک کو میری نہ پھینکنا
پروا نہ ہوں کسی کے فروغِ جمال کا

بیمارِ رنجِ ہجر ہے، بچنا محال ہے
یہ ماجرا ہے آپ کے شاداں کے حال کا

عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا
آئینہ بن گیا ہوں کسی کے جمال کا

کیا پوچھتے ہو حالِ دلِ پائمال کا
مشتاق پھر ہے ایک قیامت کی چال کا

ہم تو شبِ فراق ہی میں ہو گئے تمام
دینا پڑا حساب نہ کچھ ماہ و سال کا

سب انقلاب اُسی کی نگہ کے (ہیں) دہر میں
پابند ہے فلک تو وہی ایک حال کا

میں کہہ رہا ہوں اپنی سیہ بختیِ فراق
چہرہ سفید کیوں نہیں شامِ وصال کا

نورِ نظر تلاش میں یوسف کی کھو دیا
اللہ رے شوق دیدۂ عاشق جمال کا

واں خامشی نے قفل دہن پر لگا دیا
یاں شوق سے ہجوم ہے لب پر سوال کا

کثرت سے حسرتوں کی ملا اور تازہ غم
دل میں مرے گزر نہیں اس کے خیال کا

میں نالہ کرتے کرتے جہاں سے گزر گیا
واں ذکر بھی ہوا نہ کبھی میرے حال کا

ہاں زلفِ یار! تو نے رکھا دل کو میہماں
احساں ہے میرے سر پہ ترے بال بال کا

سنتے بھی جاؤ، آئے ہو مدت کے بعد تم
قصہ ہے مختصر سا مری عرضِ حال کا

بھڑکے اگر چراغ تو ہستی تمام ہو
ہر چیز کا کمال ہے باعث زوال کا

اس بے کسی سے جان نہ کیوں کر لبوں پہ آئے
رونا پڑا ہے آپ مجھے اپنے حال کا

شاداں کو کچھ گرا ہوا سمجھو نہ اہلِ بزم
یہ شخص بھی جہان میں ہے اب کمال کا

منظور حب سے یار کا وصفِ دہن ہوا
عنقا مثال گم مرے منہ میں سخن ہوا

مجھ کو ہی چارہ گر پہ نہ آئی فقط ہنسی
زخمِ جگر بھی دیکھ کے کچھ خندہ زن ہوا

تم اور شریکِ محفلِ اعدا! غلط غلط
میں اور یہ خیال! یہ کیا تم کو ظن ہوا؟

میرا ہی لاغری سے نہ پایا نشاں مگر
کیا کیا نہ تنگ میرے لیے پیرہن ہوا

ہوں وہ گرفتہ دل کہ کبھی میرے حال پر
زخمِ جگر بھی تو نہ مرا خندہ زن ہوا

جنبش زباں کو سامنے اُن کے نہ ہو سکی
سو داستانِ ہجر مجھے اک سخن ہوا

ہوتے وہ بات بات پہ دشمن سے ہم کلام
حکمت یہ ہوگئی کہ نہ ان کے دہن ہوا

چیں پڑ گئی جو اُس کی جبیں پر عتاب میں
بے چین نازکی سے وہ نازک بدن ہوا

ممکن نہیں اشارے سے اقرار وصل کا
کچھ خامشی سے آپ کا ثابت دہن ہوا

جب خامشی کے واسطے پیدا دہن ہوا
کس مُنہ سے یہ کہوں کہ وہ پیماں شکن ہوا

مضبوط ہو کے ٹوٹ گیا رشتۂ حیات
وہ شوخ وعدہ کر کے جو پیماں شکن ہوا

سو جائے ٹھہرتا ہے نقاہت سے تا بہ لب
اب تو ہمارا نالہ بھی اُن کا سخن ہوا

مُنہ دیکھتے ہیں بزم میں حیرت سے سب کے سب
عارض تمہارا آئینۂ انجمن ہوا

سمجھے تھے قتل ہو کے سبکدوش ہو گئے
تن پر ہمارے بوجھ، ہمارا کفن ہوا

اُس کو تو کاٹنا تھا زمانہ فراق کا
فرہاد بے سبب تو نہیں کوہ کن ہوا

میری زبان بھی کھنچنے لگی مجھ سے خود بخود
وہ بے وفا جو مجھ سے ذرا ہم سخن ہوا

میرے جلانے کو وہ سناتے ہیں بعدِ قتل
اغیار کی طرف سے تمہارا کفن ہوا

شاداں بھلا تم ایسے کہاں کے ہو خوش بیاں
لوگوں کو کیوں پسند تمہارا سخن ہوا

نہاں پاتا ہے نظروں سے جو وہ ظالم دہن اپنا
تو بس حکمِ قضا ہی جانتا ہے ہر سخن اپنا

میں کس صورت سے واں جاؤں، وہ کیونکر مجھ کو بلوائیں
مجھے رشکِ عدو مانع، انھیں پاسِ سخن اپنا

یہ شدت ناتوانی کی، یہ عادت ہے خموشی کی
کہ دم لیتا ہوا آتا ہے لب تک ہر سخن اپنا

وہ کہتے ہیں کہ ہاں اقرار کر کے ہم مکرتے ہیں!
کہ جو چاہا کہا ہم نے، زباں اپنی، دہن اپنا

نہاں رہتا ہے مطلب بھی دہن پوشیدہ ہونے سے
کہ کھوئے جاتے ہیں پہروں وہ خود کہہ کر سخن اپنا

یا وہ مجھ پر مہرباں، یا غیر پر برہم ہوا
آج دردِ دل مرے سینے میں کچھ کچھ کم ہوا

اتنے غم لکھے تھے قسمت میں مری روزِ ازل
مجھ پہ وہ گزرا ہوا ہے، جو کسی کو غم ہوا

سو چکے جب ہم تو کی تاثیر آہ و نالے نے
پوچھتا ہے وہ کہ اس کا شور غل کیوں کم ہوا

حالِ دل کس سے کہوں اب، وائے قسمت کیا کروں؟
باتیں سُن سُن کر مری، مجھ سا مرا ہمدم ہوا

بڑھ گئی میری سیہ بختی سے اُس کی تیرگی
میرے مرنے کا شبِ ہجراں کو بھی ماتم ہوا

درد و غم سارے جہاں کے ایک اس ہی جمع ہیں
سینۂ عاشق نہ ٹھہرا، خانۂ ماتم ہوا

سو جگہ رک رک کے آئی تا بہ لب میرے دعا
میرے سینے میں شبِ غم، یہ ہجومِ غم ہوا

جب ہوئی حد سے فزوں تکلیف، راحت ہو گئی
درد اتنا بڑھ گیا میرا کہ گویا کم ہوا

بھیج کر خط اُس کو، شاداں کیا خوشی حاصل ہوئی!
اور الٹا نامہ بر کا ہم کو رنج و غم ہوا

ہے رنگِ عشق رخ سے عیاں، دیکھ لیجیے
یہ دردِ دل نہیں کہ سنایا نہ جائے گا

مطلب یہ بے خودی سے ہے ہم کہ، کہ کوئی شخص　پوچھے اُسے، تو ہم سے بتایا نہ جائے گا
قاصد کے آتے آتے، ہم اتنے ہوئے ضعیف　اک حرف اُس کے خط کا اُٹھایا نہ جائے گا
ذوقِ نظارہ سے نہیں باقی ادب کا نام　رخ سر مجھ سے زیرِ تیغ جھکایا نہ جائے گا
شاداں نے دل لگا کے بتوں سے بُرا کیا　اُس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

جب تک نہ آیا سامنے، کھولی نہ اپنی آنکھ　یعقوب کو یہ شوق تھا یوسف کی دید کا
ہاں اضطرابِ شوق! ذرا تھم، کہ بے طرح　دامن چلا ہے ہاتھ سے صبر و امید کا
جو رُخ نقاب میں نظر سوزِ وہم ہو (کذا)　کیا حوصلہ نگاہ کو ہو اُس کی دید کا
کیا سارے ظلم ہو چکے اے چرخ؟ دیر سے　میں منتظر ہوں آج جفائے جدید کا
اے شیخ! دیر و کعبہ میں کیا امتیاز ہے؟　کچھ فرق ان میں ہے تو قریب و بعید کا
میں روزِ وعدہ کو بھی، شبِ غم گنا کیا　چھایا یہ دودِ آہِ دلِ ناامید کا
دیکھوں کبھی جو صورتِ شامِ وصالِ یار　پھر دیکھنا نصیب نہ ہو صبحِ عید کا
پوچھے ہزار داورِ روزِ جزا، مگر　میں اور شکوہ اُن کی جفائے شدید کا!
خط پرزے پرزے، اور ہوا قتل نامہ بر　عنوان یہ ہوا مرے خط کی رسید کا
تھا شرم سخت جانی سے ایسا عرق عرق　خنجر سے گر رہا ہے پسینہ شہید کا
وہ خفتہ بخت ہوں کہ شبِ ہجر کے سوا　دیکھا کبھی نہ خواب میں منہ صبحِ عید کا
پوچھا نہ بعدِ عشق کے کسی نے کلیم سے　باقی ہے حوصلہ ابھی کچھ اُس کی دید کا
کچھ بھی تو اُن کے قول کو دیکھا نہیں ثبات　اے دل ہو خاک ہم کو بھروسا امید کا
غیر اور ایک تازہ خوشی لحظہ لحظہ، ہائے!　میں اور ایک رنجِ زمانِ مدید کا!
آیا ہے آج میری طرح وہ بھی بد حواس　قاصد سے خاک لطف ہے گفت و شنید کا

ہے مژدۂ وصل اب مجھے پیغامِ قضا کا[1]　عادی ہوں غم و رنج کا، خوگر ہوں جفا کا
خلوت میں زلیخا نے چھڑا دامنِ یوسف　اچھا جو ذرا ہاتھ پڑا بختِ رسا کا
چھوٹے نہ غم و رنج سے ہم بعدِ فنا بھی　ہے تعزیتِ عشق، تو ماتم ہے وفا کا
نازک ہے وہ کتنا کہ تصور میں بھی میرے　آنکھوں سے اٹھایا نہ گیا پردہ حیا کا
یاں ضعف سے رنگ اڑ نہ سکا، اور وہ سمجھا　ہے رنگ کچھ اچھا ہدفِ تیرِ قضا کا
ہے فتح ہزیمت بھی بتوں کی، کہ جہاں کو　پھر ناصحِ مژگاں کا، ہے پیغام قضا کا
محشر کو سنے گا نہ کوئی صور کی آواز　ہے شور جو یہ ہی مرے نالوں کی صدا کا
پایا نہ فروغ آگے شبِ ہجر کے ہرگز　چمکا نہ ستارہ سحرِ روزِ جزا کا
اُس گل کا تصور تھا جو آنکھوں میں دمِ نزع　گویا دمِ آخر مرا، جھونکا تھا صبا کا

---

[1] یہاں سے، آخر ردیفِ الف تک، جملہ اشعار خمخانۂ جاوید سے ماخوذ ہیں۔

وہ معنیِ روشن کی تجلّی ہے کہ شاداںؔ   باطن ہے، ہر اک شعر مرا، اہلِ صفا کا

تری لاف، نازکی کا مجھے اعتبار رہتا   ترا تیر او ستمگر جو نہ دل کے پار ہوتا
تری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا   مجھے موت زندگی پر اگر اختیار ہوتا
اُنھیں بے حجابیاں تھیں مری بیخودی کے باعث   کبھی آپ میں نہ آتا، جو میں ہوشیار ہوتا
مری خاک ہو تسلّی ترے وعدۂ غلط پر   تجھے گر ہنسی نہ آتی، مجھے اعتبار ہوتا

مدد اے بخت! کہ سب کام ... نہیں   گریہ ہی کچھ اثرِ نالۂ وشرر یاد رہا
مژدہ اے یاس! کہ پھر آن مصیبت دل پر   حسرت اے دل! کہ انھیں وعدہ نہ پھر یاد رہا

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ   ہم پر یہ ستم ہے، کہ سوا ہو نہیں سکتا

دلِ مضطرب کا ہے اپنے قصور   نشانہ ہو اُن کا خطا ہو گیا

نہ جاگا روزِ جزا میں بھی خوابِ شیریں سے   ہنوز طالعِ خفتہ ہے نوجواں میرا

سر مرا جب کہ تہِ زانوئے قاتل آیا   اک مزہ وصل کا مجھ کو دمِ بسمل آیا
اُس کے کوچے سے نہ نکلا کوئی بچ کر ہرگز   کشتہ نکلا کوئی واں سے، کوئی گھائل آیا
ایک سکتے کا سا عالم ہوا سب کو شاداںؔ   آج محفل میں جو وہ حور شمائل آیا

ہے تصوّر میں ہمارے روئے دلبر کا جواب   بن گیا ہے دل بھی اپنا آئنہ گر کا جواب
پڑھ کے میری داستاں ... قاصد سے کہا   خامشی سے بڑھ کے کیا دوں اپنے دفتر کا جواب
بختِ خفتہ نے شبِ فرقت میں کروٹ بھی نہ لی   گرچہ نالہ بن گیا ہے صورِ محشر کا جواب
کچھ کہا ایسا کہ قاصد کہہ رہا ہے دیر سے   کیونکے نکلا ... ہے اُس ستمگر کا جواب
چھپ گئے ہم آنکھ سے ساقی کی دورِ بزم میں   ہو گئی ... گردش ... ساغر کا جواب
گم نگاہوں سے کیا یہ ناتوانی نے مجھے   سایۂ عنقا نہیں ہے جسمِ لاغر کا جواب
نامہ بر راہِ عدم ہے کوچۂ جاناں کی راہ   حشر میں سن لیں گے تجھ سے اُس ستمگر کا جواب
حشر تک ہوتا نہ دیدارِ رخِ جاناں نصیب   آئنہ ہوتا اگر میرے مقدّر کا جواب
جذبِ شوقِ قتل سے لب تک مگر آتا نہیں   دل ہی میں پھر رہا ہے اُس کے خنجر کا جواب
کوہکن نے عمر کاٹی اپنی اس امید پر   پر نہ نکلا اک درِ شیریں کے پتھر کا جواب
اضطرابِ شوق سے کرتا ہوں میں پیہم سوال   ایک بھی پورا نہیں ہے اُس ستمگر کا جواب

عکس سے اُس سنگدل کے صورتِ [illegible] ہے جائے — آئینہ بن جائے گر سنگِ سکندر کا جواب
جس کے نقشِ پا پہ شاداں ہوتے ہیں فتنے نثار — ہو کہاں سکتا ہے محشر اس کی ٹھوکر کا جواب
بھول جاؤ گے سب خوشی شاداں (رخ) — کسی غمگیں سے جب ملیں گے آپ

کس جائے ہوا میرے تصوّر کا گزر آج! — آتی نہیں جو اپنی حقیقت بھی نظر آج
بے کس کوئی دنیا سے ہے سرگرمِ سفر آج — اے بے خبری! تجھ کو کسی کی ہے خبر آج؟
ہیں شامِ شبِ وصل میں آثار سحر کے — ملتا ہے شبِ غم کی دعاؤں کا اثر آج
آتے ہیں وہ بے پردہ قیامت ہیں یہ خوف — بن جائے نہ موسیٰ کی نظر میری نظر آج
پیدا ہوا کیا اور کوئی روزِ مصیبت — آتی ہے نظر کیوں شبِ ہجراں کی سحر آج
اس موت پہ قربان کروں زندگیِ خضر — اس کوچے میں پہنچی مرے مرنے کی خبر آج
کل ہو کے دو چار اُس نگہِ شوخ سے یارب — آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج
وہ دیکھنے آتے ہیں مرے حالِ زبوں کو — اچھا ہے جو بڑھ جائے مرا دردِ جگر آج
رخصت ہوئے جاتے ہیں مرے ہوش خرد کیا — اے بے خودیِ شوق! ارادہ ہے کدھر آج!
برسوں میں نظر آئی ہے شامِ شبِ عشرت — یارب ہے کچھ دور گماں سے بھی سحر آج
روتا ہے مرے حال پہ کیوں چارہ گر اتنا — اشکوں سے نہ بھر جائے مرا زخمِ جگر آج
دیکھا ہے مری بے خودیِ شوق کو تو نے — قاصد نہ رہے گی تجھے اپنی بھی خبر آج
گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن — دوڑی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج
برسوں میں ہوا سامنا محشر میں جو مجھ سے — منہ دامنِ خجلت سے چھپاتی ہے سحر آج
یاں جنبشِ لب کی بھی نہیں ضعف سے طاقت (رخ) — مشتاق ہے گو میری دعاؤں کا اثر آج
پڑ جائے اگر سروِ قدِ یار کا سایہ (ر) — آجائے مرے نخلِ تمنا میں ثمر آج
وہ جو گرِ غم ہوں کہ بھر آئے وہیں آنسو (ر) — مجھ پہ متبسم جو ہوا زخمِ جگر آج
کل تک بھی مجھے تاب تھی کچھ کہنے کی شاداں (ر) — آتے نہیں وہ سننے کو مرا دردِ جگر آج

افعیِ کاکل کی تو تصویر کھینچ — گرد میرے حلقۂ زنجیر کھینچ
آرزو کوئی نکل جائے نہ ساتھ — میرے سینے سے نہ قاتل تیر کھینچ
ہم نشیں دیکھی مری دیوانگی — اور پاؤں سے مرے زنجیر کھینچ
بد دعا عشاق کی اچھی نہیں — دور اپنے کو نہ اے تاثیر کھینچ

مصرعِ اول مطابق خم خانہ ہے۔ مخطوطے میں یہ اس طرح ہے ع اس کے نقشِ پا پہ فتنے ہوتے ہیں شاداں نثار۔

نہ پہچانا اُس نے مجھے روزِ وعدہ[1]　　خوشی نے دیا رنج صورت بدل کر
ٹھکانا نہ ہو جب کسی دل میں اے دل　　کہاں جائے سینے سے ارماں نکل کر
گرا ہے ابھی نالہ ناطاقتی سے　　ذرا دل سے اے آہ اٹھنا سنبھل کر
تذبذب نارسائی کا مضموں ہے خط میں　　کہ تجھ کو بھی قاصد کچھ راہ چل کر
دلِ مضطرب بھی ہے پہلو میں قاتل　　ذرا پاؤں سینے پہ رکھنا سنبھل کر
پھر آنا نزاکت سے دشوار ہوگا　　نہ جاؤ مرے دل سے باہر نکل کر
رگِ جاں گلے مل رہی ہوگی شاید　　رُکی ہے جو تلوار قاتل کی چل کر
ٹھہرتی ہے سو جائے ناطاقتی سے　　نگہ بھی مری آنکھ سے اب نکل کر
چھپائے ہوئے دامنِ شب سے منہ کو　　شبِ غم گئی صبحِ محشر نکل کر

یہ بھری ہوئی تھی شوخی کہ تمہارے گھر سے یاں تک (رخ) کہیں نامہ بر کے منہ پر نہ رکا جواب ہرگز

ہوئے دوچار اپنے عکس سے وہ نہ پیش آئینہ کوئی صورت (رخ) کہ بن گئی تھی نگاہِ شوخ اُن کے حق میں، اُن کی نقابِ عارض

شبِ ہجراں میں یہ تڑپا میں سحر ہونے تک　　مل گیا خاک میں اُس بُت کو خبر ہونے تک
گر یہی جنبشِ مژگاں کے اشارے ہوں گے　　دل نکل جائے گا پہلو سے نظر ہونے تک
وہ یہ کہتے ہیں جو کرتے ہو دعا بھی کر لو　　ہم مزہ تم کو دکھا دیں گے اثر ہونے تک
تم تو کرتے ہی رہے بہرِ عبادت اور ہم　　مر گئے چارۂ آزارِ جگر ہونے تک
مژدۂ وصل ہی لاتا ہو اگرچہ قاصد　　کیا بچوں گا ترے آنے کی خبر ہونے تک
رفتہ رفتہ رخِ تاباں سے اٹھاؤ پردہ　　چاہیے عرصہ مجھے تابِ نظر ہونے تک
دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے اُن سے اچھی[2]　　رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہونے تک
شام تک گریہ وزاری میں بسر ہوتی ہے　　اور کبھی جان پہ بنتی ہے سحر ہونے تک
جلد شاداں کی خبر لے کہیں ظالم! ورنہ (رخ) گزرے گا جان سے وہ تیرا اگر رہنے تک

جس آرزو کا مقدر میں تھا نہ بر آنا (رخ) وہی ہوئی دلِ ناکامیاب میں داخل

کب میں ہر وقت خیالِ قدِ جاناں میں نہیں　　کب قیامت مرے سر پر شبِ ہجراں میں نہیں
جیسے دو نفیوں میں اثبات ہے ثابت اے مدعی!　　ہم نے اکثر یونہی دیکھی تری ہاں ہاں میں نہیں
نظر آتا ہی نہیں تجھ سا کوئی اور مجھے　　ورنہ کیا کچھ مرے اس دیدۂ حیراں میں نہیں

---

[1] خم خانہ میں یہ مصرع یوں ہے ع شبِ وعدہ اس نے نہ پہچانا مجھ کو۔ [2] مصرع مطابق خم خانہ درج کیا گیا ہے، مخطوطے میں "یا شمع ہے بہتر اُن سے" ہے۔

کیونکر مجھے لے جاؤں گناہوں کو قیامت میں خدا
اتنی وسعت نظر آئی مرے داماں میں نہیں
ہاتھ میرا جو گریباں پہ بڑھا جاتا ہے
غیر کا منہ تو کہیں اپنے گریباں میں نہیں

ہر لحظہ سدِّ راہ جو میری فغاں کے ہیں
سینے میں یہ بھرے ہوئے ارماں کہاں کے ہیں
بدنامی[1] اُس کی کھوئی مرے دودِ آہ نے
پردے میں اب تو مجھ پہ ستم آسماں کے ہیں
جاگا ہے پاسبانِ درِ یار رات بھر
الٹے اثر نصیب میں میری فغاں کے ہیں
رنج ایک دل میں میرے زمانے کے بھر گئے
دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں
میں ناتواں ہوں اور وہ نازک شبِ وصال
پردے کبھی نہ اٹھیں گے جو درمیاں کے ہیں
اے ضعف! دیکھ بھال کے مجھ کو گرائیو
نزدیک دشمنوں کے بھی گھر اس مکاں کے ہیں
کیا اُن سے اُٹھ سکیں گی نہ بانیں رقیب کی؟
میں بھی تو دیکھوں ایسے وہ نازک کہاں کے ہیں
میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا
وہ پوچھتے ہیں[2] مجھ سے یہ قصے کہاں کے ہیں
گھر سے گئے ہیں یا کہیں باہر سے آئے ہیں
کچھ ہوش آج بگڑے ہوئے پاسباں کے ہیں
کس نازکی سے آتے ہیں میری خبر کو وہ
گویا قدم یہ مجھ سے کسی ناتواں کے ہیں
روتے ہیں آکے قبر پہ غیروں کے ساتھ وہ
کیا کیا مٹانے والے ہمارے نشاں کے ہیں
کافی ہے نیند بھرنے کو میری شبِ فراق
گو خواب میرے بخت کو سارے جہاں کے ہیں

دیکھا ہے میں نے خوب مریدوں کو شیخ کے (رخ) اچھے وہی ہیں، یار جو پیرِ مغاں کے ہیں
پہلو میں میرے اور یہ پیدا ہوا رقیب (〃) آثارِ عشق، رخ پہ مرے راز داں کے ہیں
غم ایک میرے دل میں زمانے کے بھر گئے (〃) دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں
اے برق وہ جلائے گی کیا آہِ آتشیں (〃) تنکے بچے ہوئے جو مرے آشیاں کے ہیں
شاداں چھپائے لاکھ، پہ چھپتے بھی ہیں کہیں (〃) آثار اُس کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

آفت کا توڑ ہے ترے تیرِ نگاہ میں
پیدا اثر کہاں سے ہو عاشق کی آہ میں
آمد جفائے تازہ کی اتنی ہے چرخ سے
جاتا ہے میرا نالہ، تو رُکتا ہے راہ میں
یہ ناتواں ہوا ہوں کہ اب کوئے یار تک
میری نظر بھی جائے، تو رہ جائے راہ میں
شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار
کل کی سی بات ہی نہیں طرزِ نگاہ میں
دیکھی ہوئی ہے تیری درازی شبِ فراق!
کیوں لُٹ گئے روزِ حشر ہماری نگاہ میں
کیا بھید ہے کہ روز وہ آکر یہ کہتے ہیں
بتلا تو، کچھ اثر بھی ہوا تیری آہ میں؟
سایہ ہوا ہے غیر کی محفل کا دودِ آہ
لکھا ہوا تھا یہ مرے بختِ سیاہ میں
تعزیر اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں بار بار (رخ) ملتی ہیں راحتیں مجھے کیسی گناہ میں

---

[1] رخ، بدنامی اس کی کیوں کی مرے دردِ آہ نے ۔ [2] رخ، وہ پوچھتے ہیں مجھ سے وہ نازک کہاں کے ہیں۔

بچتے ہیں دور گرکے مری خاک کا گماں (رخ) اُڑتی ہوئی جو دیکھتے ہیں گرد راہ میں
میں اِن بتوں کے عشق میں یاں تک سبک ہوا (ر) اب خود نہیں سماتا ہوں اپنی نگاہ میں
یہ ناتواں ہوا ہوں کہ اب کوے یار تک (ر) نالہ بھی میرا جائے تو سو جائے راہ میں
ہے کس بھروسے پر تمہیں شاداں امیدِ وصل (ر) ہے نالے میں اثر، نہ ہے تاثیر آہ میں

رشک کی بھی ہمیں تو تاب نہیں — شکر ہے، غیر پر عتاب نہیں
لطفِ دیرینہ، خاک یاد رہے! — ستمِ تازہ کا حساب نہیں
ابھی لب پر ہے حالِ دل میرا — ہم نشینوں کو میرے تاب نہیں
کیا تغافل کا تھا کوئی مضموں — یاد قاصد کو کچھ جواب نہیں
ہے ترقیِ حسن ہی پردہ — کچھ اسے حاجتِ نقاب نہیں
اُس کی شوخی سے کم نہیں شبِ وصل — گرچہ پہلا سا اضطراب نہیں
بے خودی کام آ گئی آخر — کہ انھیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں
اُس نے پوچھا تو کیا بتاؤں گا؟ — حسرتوں کا مری حساب نہیں
چپ ہوں سُن کر یہ ایک بات اُس کی — کہ مجھے طاقتِ جواب نہیں
پھرتی ہے کوئی چیز آنکھوں میں (رخ) یہ مرے بخت کا تو خواب نہیں
خیر ہو آج بزم کی شاداں (ر) کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

ستم سہنے کی جب تاب و تواں ہو — یہی کیوں ہو، کوئی اور آسماں ہو
قدم رکھیں نہ ہم تو آسماں پر — جو سر رکھنے کو تیرا آستاں ہو
جو وہ پہلو میں میرے ہو تو کیونکر — نہ میری بے خودی سے بدگماں ہو
نہ دنیا میں نہ عقبیٰ میں ہو یا رب — شبِ عشرت سحر ایسی نہاں ہو
انھیں آئینے سے ہے بدگمانی — ہمارا حالِ دل کیوں کر عیاں ہو
شبِ غم کی مصیبت کا بیاں ہے — ہماری ختم کیوں کر داستاں ہو
نزاکت سے زیادہ ہے تجلی — وگرنہ تم تو نظروں سے نہاں ہو؟
ہماری ناتوانی دیکھنے کو — وہ آ کر پوچھتے ہیں تم کہاں ہو
الٰہی نازکی بڑھ جائے اتنی — کہ اُن کو ناز کرنا بھی گراں ہو
خیالِ آئینہ رہتا ہے ہر دم — کہیں ہو تم، مگر ہوتے کہاں ہو
نگاہِ شوق تم کو دیکھ لے گی — اگر تم لاکھ پردوں میں نہاں ہو
سہو جورِ سپہرِ پیر شاداں — ابھی فضلِ خدا سے تم جواں ہو

کہتے ہیں" عہد شکن سمجھے ہو کیا تم مجھ کو" — وعدے کے ساتھ جو آتا ہے تبسم مجھ کو
کوئی ہنگامہ ہے، یا گھر سے وہ نکلے ہیں کہیں — آج آتی ہے نظر کثرتِ مردم مجھ کو

ایک وہ ہیں کہ جو دل چاہے وہ کہتے ہیں مجھے　　ایک میں ہوں کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو
کوئی سنتا نہ ہو، اس کی بھی ذرا فکر رہے　　شکوۂ غیر سناتے ہو اگر تم مجھ کو
نالۂ دآہ سے ہے رنجشِ جاناں منظور　　مار ڈالے گی غلط فہمیِ مردم مجھ کو
بے قراری مری یہ، آپ کی شوخی وہ کچھ　　میں تمہیں دیکھ سکوں گا نہ کبھی تم مجھ کو
اس قدر کی دمنِ یار کی میں نے تعریف　　کہ بس آخر نہ رہی تابِ تکلّم مجھ کو
کہتے ہیں "دیکھتے ہیں آئینہ یوں ہی ہم بھی　　جس طرح دیکھتے ہو آٹھ پہر تم مجھ کو"
میں جو کہتا ہوں کوئی چارہ گر آئے یارب　　زخم بھی دیکھ کے کرتے ہیں تبسّم مجھ کو
اب تو حالت مری پہنچی ہے کچھ ایسی شاداںؔ　　خود وہ کہتے ہیں کہ آتا ہے ترحّم مجھ کو
ساقیا جام کے بدلے، دے کوئی خُم مجھ کو (خ) تاکہ اس بزم میں ہو تابِ تکلّم مجھ کو
اپنے کوچے میں بٹھا دو جو کہیں تم مجھ کو　　بسترِ خاک بھی ہو مسندِ قاقُم مجھ کو
وہ ادا ہے، نہ وہ غمزہ، نہ وہ شوخی، نہ وہ ناز　　آج کچھ اور ہی آتے ہو نظر تم مجھ کو
پوچھتے ہیں کہ "تمنا تو بتاؤ کیا ہے"　　جانتے ہیں کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو
جان و دل ہوش و خرد اس کے عوض میں لے لو　　صبر ایک چیز ہے بے کار، وہ دو تم مجھ کو
کہتے ہیں "جھوٹے ستم چھوٹ نہیں سکتی مجھ سے　　ورنہ آتا ہے بہت تجھ پہ ترحّم مجھ کو"
خندہ کیا ہے، نہیں معلوم، و لیکن گاہے　　اپنے ہی حال پہ آتا ہے تبسّم مجھ کو
بے قراری تو کہے دیتی ہے رازِ پنہاں　　یہ خموشی بھی ہے گویا کہ تکلّم مجھ کو
نیش سے چبھتے ہیں سینے میں مرے چارطرف　　دل کے بدلے میں ملا ہے کوئی کژدم مجھ کو
میری منت پہ شبِ وصل میں کچھ شرم کیا تھا　　دیکھنا اُن کا وہ ہنگامِ تبسّم مجھ کو
ناتوانی نے کیا ہے یہ سبک نظروں میں (خ) پُتلیاں پھیرتے ہیں دیکھ کے مردم مجھ کو
تم بھی آجاؤ یکایک تو خبردار نہ ہوں (〃) بے خودی نے شبِ عشرت یہ کیا گم مجھ کو
بے قراری مری یہ، اُن کی ہے شوخی وہ کچھ (〃) میں تمہیں دیکھ سکوں گا، نہ کبھی تم مجھ کو
حسرتِ گریہ گئی ہے، نہ کبھی جائے گی (〃) بخش دے رونے کو یارب کوئی قلزم مجھ کو
ساقیا اس ترے مے خانہ میں رکھا کیا ہے (〃) خُمِ گردوں کے برابر دے کوئی خُم مجھ کو

کام کیا ہم کو تری رہ میں کسی رہبر کے ساتھ (خ) جب تصور آ گئے آگے ہو دلِ مضطر کے ساتھ
لاگ اِس ظالم کو ہے ہر عاشقِ مضطر کے ساتھ (〃) گردشیں گردونِ دوں کی ہیں ہمارے سر کے ساتھ
اُن سے نازک کو نکلنے دے نہ تا بوسے مرے (〃) اے طبیعت! ہاں الجھ اچھی طرح دلبر کے ساتھ
اپنی مرگ و زیست پر ہوتا جو ہم کو اختیار (〃) ہر ادا پر اُن کی مرتے، جیتے ہر ٹھوکر کے ساتھ
نعشِ برہنہ ڈھانکنے کا ہے بہانہ، ورنہ ہیں (〃) رنجشیں در پردہ وہ ہی عاشقِ مضطر کے ساتھ
خدمت اُس بُت نے بلا گردانیوں کی دی مجھے (〃) گردشِ تقدیر سے نکلا مگر چکر کے ساتھ
ہے وہ نازک، خواب میں پہنچے نہ مجھ تک، گر نہ ہو (〃) جذبِ دل میرا خیالِ قامتِ دلبر کے ساتھ

ہو چکی شیشے میں مے، مجھ تک جو آیا دورِ جام (رخ) گردشِ قسمت تھی اپنی گردشِ ساغر کے ساتھ
بے ستوں پر آگئی صورت پرستوں کو نظر (〃) وہ جو اک نسبت دلِ شیریں کو تھی پتھر کے ساتھ
ظرف سے اپنے کہیں ساقی نکل جائے نہ مے (〃) گردنِ مینا جھکائے رکھ ذرا ساغر کے ساتھ
بے خودی نے ضعف میں مجبور ایسا کر دیا (〃) آپ میں آتا ہوں یادِ شوخیِ دلبر کے ساتھ
اضطرابِ دل نے اس رہ میں بڑھایا وہ قدم (〃) نقشِ پا تک بھی نہیں میرا مرے رہبر کے ساتھ

وہ نازکی سے تصور میں آ نہیں سکتے — جو آگئے، تو مرے دل سے جا نہیں سکتے
وہ پاسبانِ درِ یار تھا کہ جاگ اٹھا — ہمارے بخت کو نالے جگا نہیں سکتے
کسی کی سن کے کہیں کیا، یہ ناتوانی ہے — کہ بات کا بھی مزہ ہم اٹھا نہیں سکتے
وہ حال پوچھنے اُن کی طرف سے آئے ہیں — کہ ایک بات بھی جن کو سنا نہیں سکتے
ہمیں زمانے میں دل سوز مل نہیں سکتے — کسی کو داغِ جگر ہم دکھا نہیں سکتے
پہنچ نہ جائیں دلِ غیر میں کہیں یا رب — کہ میرے سینے میں ارماں سما نہیں سکتے
یہ دشمنوں کی نظر کا ہجوم ہے شاداںؔ — کہ آنکھ بزم میں اُن کی اٹھا نہیں سکتے

وہ نالے میرے کہ جو لب تک آ نہیں سکتے — تمہارا رنگ وہ کیوں کر اڑا نہیں سکتے
دیا ہوا ہے یہ کس کا، کہ فرطِ رشک سے داغ — کسی کو ہم پئے درماں دکھا نہیں سکتے
پڑی ہیں رخ پہ تمہارے جہان کی نظریں — یہ پردہ وہ ہے کہ جس کو اٹھا نہیں سکتے
ہمارا حال کچھ ایسا بیاں سے باہر ہے — کہ لوگ جس کی کہانی بنا نہیں سکتے
رہے ہیں سینے میں گویا کہ آرزو بن کر — کہ نالے ضعف سے لب تک بھی آ نہیں سکتے
یہ تیرگی شبِ ہجراں کہاں سے لائی ہے — کہ عقل و ہوش کو ہم ڈھونڈھ کے پا نہیں سکتے
یہ کھاتے کھاتے غمِ ہجر بھر گیا ہے جی — کہ اپنا غم ہے مگر آپ کھا نہیں سکتے
[1] وہ رحم خاک کریں، نازکی سے ہیں مجبور — کہ ہاتھ میرے ستم سے اٹھا نہیں سکتے
یہ اپنے ضعف نے کیسا غضب کیا شاداںؔ! — خیالِ یار میں بھی اب تو جا نہیں سکتے

اُٹھ کر درِ جاناں سے کہو، کوئی کدھر جائے، — جی سے نہ گزر جائے، تو دنیا سے گزر جائے
دیدار میں وہ لطف جسے دیکھ کے ہو زیست — رفتار میں وہ قہر، کہ جو دیکھے وہ مر جائے
ساغر کشِ میخانۂ توحید ہوں ناصح! — وہ نشہ نہیں مجھ کو، جو باتوں میں اتر جائے
رنجوریِ الفت کا مری پوچھ نہ انجام — آغاز میں وہ درد ہے جو حد سے گزر جائے
کیونکر نہ بڑھے لطف شبِ وصلِ عدو کا — عارض پہ تری زلفِ پریشاں جو بکھر جائے
ڈر ہے کہ وہ تکلیف کو اُس کی نہ چلے جائیں — یا رب نہ عدو، میری شبِ وصل میں مر جائے

---

[1] رخ، وہ خاک رحم کریں۔

آرایشِ ہر دم سے نہ ہووے جسے فرصت　　شاداں کی پریشانی پہ کیوں اُس کی نظر جائے

بے تابیِ عشّاق سے کب تجھ کو خبر ہے　　ہاں اپنے ہی کچھ حسن و نزاکت پہ نظر ہے
کیا روشنیِ بخت کا یا رب یہ اثر ہے؟　　شامِ شبِ فرقت مری، ہم شکلِ سحر ہے
پردے میں عبث بیٹھے ہو تم رخ کو چھپائے　　دیکھے کوئی تم کو، یہ کسے تابِ نظر ہے
ہر صبح مجھے شامِ غریبی سے ہے بدتر　　ہر شام مجھے ایک قیامت کی سحر ہے
کچھ دیکھے تو وہ ہی کمرِ یار کو دیکھے　　جس کو دکی) مرے شعر کے مضامیں پہ نظر ہے
کیوں آئینہ دیکھا کہ جبیں پر عرق آیا　　اپنا سا ستم گار مگر مدِّ نظر ہے
شاداں نہ سہو رنج و الم عشقِ بتاں کے　　اُس بات کو چھوڑو کہ تمہیں جس میں ضرر ہے

زلف کی بو ادھر نہیں آتی　　کیا صبا میرے گھر نہیں آتی؟
نیند اُس بت کے ہجر میں ہم کو　　شام سے تا سحر نہیں آتی
جب کہ وہ ہی نظر نہیں آتا　　زندگی بھی نظر نہیں آتی

غیر لپٹا رہے وہاں برسے　　اور یاں چشم سے لہو برسے
آئینے میں نظر پڑا ہے کیا　　نظر آتے ہو کچھ مکدّر سے
حشر کا حال پوچھتے کیا ہو　　دور کر دو نقاب رخ پر سے
چال اُن کی نہ دیکھیے شاداں　　خوف کیجیے ذرا تو محشر سے

اُس کے جلوے کے تحیّر نے، تڑپنے نہ دیا　　خاک ارمان ہمارے دمِ بسمل نکلے
آئنہ دیکھتے ہیں وہ تو بگڑ جاتے ہیں　　چاہتے ہیں کہ نہ کوئی بھی مقابل نکلے
کیا زیادہ پیے ہر روز سے دو چار سبو　　آج مے خانے سے شاداں جو بمشکل نکلے

چال ہی اُس کی نظر میں ہے، تو آفت کیا ہے　　اُس کے قامت ہی کو دیکھا تو قیامت کیا ہے
ہائے بے تابیِ شوق اپنی شبِ وصل ہیں، اور　　اُن کا اک ناز سے کہنا کہ مصیبت کیا ہے

یہ بار بار جو پیکاں کو دیکھتے ہو تم　　(خ)　　نکل گئی کوئی کیا آرزو مرے دل کی

مر جاؤں گا اک روز فغاں کرتے ہی کرتے　　(خ)　　حالِ دلِ بے تاب بیاں کرتے ہی کرتے
پورا نہ کہا جائے گا حالِ تبِ ہجراں　　(〃)　　گزرے گی شبِ وصل بیاں کرتے ہی کرتے

محبت نے مجھے کھینچا کہاں سے (خ) کہ میں آیا زمیں پر آسماں سے
سنو! پُر درد ہے حالِ دلِ زار (") مزہ پاؤ گے تم اس داستاں سے
بس اب خاموش! کیا کیا کہہ چکے ہو (") نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
تم اپنا رنگ آئینے میں دیکھو (") تمہیں کیا کام رنگِ عاشقاں سے
نشانہ دل ہے، بسم اللہ کیجے (") اگر کچھ شوق ہے تیر و کماں سے
بہت سی خاک چھانی تم نے شاداںؔ (") قدم باہر نہ رکھو اب مکاں سے

دل کسی شخص پہ آجائے، تو کچھ حال کُھلے (خ) آپ کیا جانیں کہ عاشق کی طبیعت کیا ہے

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی (ف) کس کی پا پوشش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

آغوشِ گور تنگ شد از بیقراریم ای دل! از پہلو کہ جدا گشتہ ایم ما؟

شرم می آید خیالی را بجنگِ آسماں کاین جوانی ہست و او یک پیرِ دیرین سالِ ماست

چہ احتیاجِ نگہباں بعہدِ دولتِ او کہ پاسبانِ جہاں است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم، ناوکش خطا نہ کند رہا کند سوی عنقا اگر بعزمِ شکار

غمِ تیز درخوشی است کہ فارغ شدہ زکار بر جای خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است

قطعۂ تاریخ باقر علیخاں کاملؔ

چو زیں عمخانۂ دنیا سفر کرد سوی باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر گردید بود مینو مکاں باقر علی خاں
۱۲۹۳ھ

کلامِ باقر علی خاں کاملؔ

اٹھانے پڑیں گے نہ ساقی کے ناز کہ پیرِ مغاں آشنا ہو گیا

یاد آنا کسی کے کاکُل کا تیرہ سازِ شبِ جدائی ہے

مٹ گیا اب نہ مٹا نام و نشانِ دہلی لب پہ دہلی ہے، تو نظروں میں ہے شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کہیں چرخ عوض لیتا ہے اب مصیبت میں پڑے ہیں جو کسانِ دہلی

منہ کو آتا ہوا آتا ہے کلیجہ، ہے ہے!! — ہم نشیں کیونکے بھلا کیجے بیانِ دہلی
جی بہارِ چمنِ دہر یہ کیوں کر دھرئیے — کہ نظر آتی ہے افسوس خزانِ دہلی
غم دیئے، رنج دیئے، اپنی گرہ سے ظالم — چرخ! کیا تو نے لیا، کرکے زیانِ دہلی
اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں — تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی؟
ضبطِ گریے کو یہ دل نے کیا ہے، گویا — نہیں پانی کٹی یہ نہرِ روانِ دہلی
سیل کے گولے پڑے، چرخ سے فتنے برسے — منہدم کیونکے نہ ہو جائیں مکانِ دہلی
خانۂ کعبہ کو اب حضرتِ کامل چلیے — رہنے کا اب نہ رہا لطف، میانِ دہلی

مسدس شہر آشوب

تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی — تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلعِ خورشیدِ نور تھی دہلی — تمام غیرتِ صد کوہِ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فرد بشر — بُرا بھی یاں کا، زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا فوق، خاصِ دُنیا پر — یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی زر ہو کر
یہ فوجِ باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا، غضب آیا، اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں — جو روز عیش میں گزرا، تو شب نشاط میں
پڑے ہوئے ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں — پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں! اور وہ بادشاہ کہاں!
رہا جو کوئی، تو وہ مرتبہ، وہ جاہ کہاں!

یہ قلعہ، رشکِ دہِ گلستانِ رضواں تھا — یہ قلعہ خلد تھا، اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا، کہ خدایا! کوئی پرستاں تھا! — یہ قلعہ پیکرِ دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی، تو ہاں! درد دل عیاں کیجے — صدائے طائرِ گم گشتہ آشیاں کیجے
حیات بخش کا، گر ماجرا بیاں کیجے — تو چاہیے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے
یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لعل پردہ، کہ تھا جس سے احتشام عیاں — خوشی سے خسرو پردینہ ہے جہاں درباں
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں — کہ خاص خاص بھی جاتے تھے گر تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جائے اک جہان کے سر
قدم بھی اب نہیں دھرتا ہے واں کوئی جا کر

یہ وہی چوک ہے! میلہ تھا جس جگہ ہر روز یہیں تو رہتے تھے مہ طلعتانِ دل افروز
نظر کو ہوتے تھی کیفیتِ سرور اندوز جدھر کو دیکھیے تھی اک بہارِ کلفت سوز

نشان بھی نہیں اب تو ہجومِ خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقامِ عبرت کا

یہ وہ ہے مسجدِ جامع، کہ جس میں اک جہاں نماز کے لیے آتا تھا دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہو ان کا بیاں ادب سے کرتے تھے اُن کی زیارت اہلِ زماں

وہ اس کی رونق بازار چار سو مت پوچھ
کہ مجھ سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دین دار ہے یہ فوج اور نہ دینداری سیاہ رؤں کو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بھی بجز ستم کاری حرام خوروں کو ہر دم تھا شغلِ مے خواری

تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ، سیکڑوں رہتے تھے جنکے ساتھ سوار کیا پیادہ انھیں، اے سپہرِ ناہنجار!
اُٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کے کس طرح سے بار اُٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دشوار

نہ زمین جگہ چاہیے اماں کے لیے
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیے

نہ چہچہے کوئی دم، اور نہ قہقہے کوئی آن فسردہ دل ہیں جو کرتے تھے عیش میں گزران
نہ ہوش ہی ہیں ٹھکانے، نہ باقی ہیں اوسان ذلیل و خوار ہیں، پھرتے ہیں جا بجا حیران

فلک نے پھینک دیا ہے کہاں کہاں اُن کو
بجائے زمزمہ ہے نالہ و فغاں اُن کو

الٰہی! بھاگ کے یاں سے کوئی کہاں جاوے کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں، جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں، جس جا پہ اماں جاوے اگر زمین پھٹے، تو سما وہاں جاوے

دکھائی دیتا ہے ہر اک عدوے جاں اپنا
بنا ہے دشمنِ جانی، یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خوں چکاں لکھے کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے

دعائے کاتبِ غمگیں ہو مستجاب، خدا!
بنی ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا!

ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار لکھیر سنجی رام پور یو، پی سے شایع کیا

نگار دوستوں سے :

اپنے شہر کے بڑے اخبار فروشوں

لائبریریوں، اسکولوں، کالجوں اور

صاحبِ ذوق دوستوں کے پتے ایک کارڈ پر لکھ کر بھیج دیں

شرط یہ ہے کہ

یہ سارے پتے وہ ہوں جن کی ایمان داری دلچسپی

اور

خوش ذوقی پر آپ کو بھرپور اعتماد ہو

نگار

کی خریداری کے لیے ان سے براہِ راست ہم بھی کہیں گے

اور آپ بھی کہیں

REGD. NO A 400
NIGAR. URDU MONTHLY. RAMPUR U.P.
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R N. NO. 2136 57

42 YEAR OF PUBLICATION
FEBRUARY 1963

زبانِ خلق

مولانا عبدالماجد دریابادی

نگار ہندوستان پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ یہ فروری نمبر آپ کا بھیجا ہوا ہے۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ نگار پاکستان کا مثنیٰ ہوگا مگر یہ تو بالکل

لیکن تو چیزے دیگری

نکلا۔ اس سے قبل کا کوئی نمبر میری نظر سے نہیں گزرا اس میں ذکر جا بجا غالبیہ کا ہے۔ مجھے تو غالبیہ مدخواہی نظر آیا۔ کیا غالبیہ اس کے سوا کچھ اور ہے۔

غالب میرے محبوب شاعروں میں ہے بلکہ غزلگوئی کی حد تک کہنا چاہیے کہ محبوب ترین۔ بشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں ان کمزوریوں کو زیادہ اچھالنے اور انھیں مزے لے لے بیان کرنے کی ذہنیت میری تو سمجھ سے باہر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ دہلی)

میں نے نگار کو بڑی دلچسپی سے پڑھا اس کے مضامین عام طور پر اور آپ کی تحریر خاص طور پر جو غالبیہ کے نام سے مسلسل شایع ہو رہی ہے بہت پسند آئی۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نوخیز نگار بوڑھے نگار سے زیادہ معقول اور مقبول ثابت ہو۔

پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد یونیورسٹی)

نگار (جنوری) نظر نواز ہوا۔ آپ نے جس حد تک اس کی روایتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے وہ لایق تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نئے دور میں نگار اس سے زیادہ علمی اور ادبی خدمات انجام دیگا جو پہلے دے چکا ہے کیوں کہ اس وقت علم و ادب دونوں نئی منزلوں اور نئے افق کی جستجو میں ہیں۔

اس نمبر میں یوں تو سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن غالبیہ کے سلسلے میں آپ نے جو جز شامل کیے ہیں وہ خاصہ کی چیز ہیں۔ میں بھی اس کی جو خدمت کرسکوں گا کروں گا۔

مالک رام (برسلز۔ بلجیم)

نگار کا جنوری کا شمارہ ملا تھا شکریہ ماشاء اللہ خوب نکلا ہے خدا کرے یہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔

آپ نے غالبیہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوب ہے اگرچہ بہتر ہوتا اگر آپ اسے مکمل غالب نمبر میں ایک ہی مرتبہ شایع کر دیتے۔ اس سے ایک تو کتاب ایک اشاعت میں پوری ہو جاتی دوسرے لوگوں کو انتظار کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑتی۔

عبدالمجید حیرت (پرانا سکھر)

غالب پر نقادان وقت لتے لے رہے ہیں کہ خدا کی پناہ مگر اب تو کرم فرمائیں ایک ہی مضمون سنتے سنتے کان پک گئے عزیزو۔

پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور)

میں نے نگار کے غالب نواز اوراق کو دلچسپی سے پڑھا اور آپ کے حسن ترتیب اور ذوق سلیم کی داد دی۔ ہندوستان میں تحقیق غالب کے لیے ابھی بے حساب مواد موجود ہے امید ہے آپ کی توجہ سے بتدریج اس سرمایہ کا انکشاف ہوتا رہے گا۔

اعجاز عسکری (علی گڑھ)

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سرورق کی پشت پر تعریفی رائیں چھاپنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ ایڈیٹر اپنی شان میں تو تعریفی خط چھاپتے ہی رہتے ہیں اور اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بہرحال افسوس ہوتا ہے جب کوئی تم سا شخص اس قسم کے Temptations کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی (گورکھپور یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو)

نگار ملا۔ این کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

آپ نے یقیناً معیار بلند کیا ہے .... میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا ....

آئندہ شمارے میں اقبال سے متعلق اہم مضامین شائع ہو رہے ہیں

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریداران نگار کا سالانہ چندہ
اس پتہ پر بھیجدیں رسالہ جاری کردیا جائیگا
نمائندہ نگار ۶/۱۷ این سمن آباد لاہور

جلد ۴۲ ‖ فہرست مضامین مارچ ۱۹۶۳ء ‖ شمارہ ۳

ملاحظات

ہندوستان میں اردو کے مستقبل کی طرف سے ہر اُردو دوست پریشان اور متفکر نظر آتا ہے۔ مایوسی اور دلگرفتگی کی یہ فضا سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر رہی ہے اور سب کے سب اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں۔ اس انداز فکر سے ہم اپنے راستے خود ہی مسدود کرتے چلے جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ سہل پسندی کے ساتھ طبیعت بہانہ جو بھی ہوتی جا رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نالہ و فریاد کے سوا اب کوئی نسخہ استعمال کرنے کے لیے باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اردو کی موجودہ کس مپرسی بیان کرتے وقت عموماً الزام تراشی سے کام لیا جاتا ہے اور یہ الزام ایک ہی فتنہ پرور کے سر جاتا ہے جسے حکومت کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

ہم سب کی سمجھ میں اردو کی ترویج و ترقی کا اور کوئی ذریعہ نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کو سرکاری مدارس میں منظور کرایا جائے اس بات سے شاید ہی کوئی ذی حواس انکار کرے کہ مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام ہماری بہت سی مشکلوں کو آسان کر دے گا۔ مگر اس سے زیادہ جو جذبہ اس مطالبے کی پشت پناہی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں خود کچھ کرنا نہیں پڑے گا سوائے چند نعروں اور وقتی ہنگاموں کے۔

اردو ہندوستان میں اپنے نام نہاد دعوے داروں کے ہاتھوں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی اب اُن لوگوں کے ذریعے ممکن ہے جو اس کی مقبولیت سے واقف ہیں اور جنھیں یہ احساس ہے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اردو کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے فراموش کر دینے سے ملک کے کتنے بڑے حصے سے بے تعلقی کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے۔

اردو کے چاہنے والے خالص تجارتی ذہن کے لوگوں میں بھی ملیں گے۔ چنانچہ پاکٹ بکس کی روز افزوں کثیر اشاعت اس کا ایک زندہ ثبوت ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ اردو میں نشر و اشاعت کا کام اب وہ ادارے اپنا رہے ہیں جنھوں نے کبھی اردو کو اپنی مادری زبان نہیں بتایا لیکن وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ زبان آزاد ہندوستان کی زبانوں میں بلند ترین مقام رکھتی ہے اور اس کے حلقۂ اثر کو اپنانے کے معنی اپنی تجارت کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ ہندی کے مشہور ماہنامے سریتا نے بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنا اردو ایڈیشن نکالا جو یقیناً اردو صحافت کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے اور ان کا یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا ہے۔

حال ہی میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے انگریزی ہفت روزہ اخبار بلٹز نے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنا اردو ایڈیشن شایع کرنے والے ہیں۔ ادارۂ نگار اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے نہیں کہ ہمیں اُن کی پالیسی اور طریق کار سے اتفاق ہے بلکہ اس لیے کہ جہاں اس ایڈیشن سے بلٹز اپنے سیاسی مقاصد کی ترویج و اشاعت کا کام لے گا وہیں اردو کو بھی مدتوں بعد ایک ایسا ہفت روزہ ملے گا جو بہرحال ہندوستان کی موجودہ صحافت کا نمایندہ ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ تجربہ سریتا سے بھی زیادہ کامیاب رہے گا۔

عراق میں ایک بار پھر انقلاب آگیا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عراقیوں کو قتل و غارت کا ڈرامہ کھیلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ موجودہ انقلاب کے رہنما عبدالسلام عارف نے سزائے موت دینے سے پہلے عبدالکریم قاسم سے جو سوالات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ پچھلا انقلاب لانے کا ذمہ دار کون تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب اتنی اہم بات نہیں تھی جتنی یہ بات کہ انقلاب لانے والا کون ہے۔ اس ایک جملے نے خود پسندی کے کتنے تہ در تہ جذبات کو عریاں کر دیا۔ بات کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاسم نے جو رحمدلانہ سلوک عارف کے ساتھ کیا تھا وہ سیاسی انقلاب کی دنیا میں دانشمندانہ نہیں تھا اور اسی کا خمیازہ انھیں اپنی زندگی سے بھگتنا پڑا ــــ ہماری تمنا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے پڑوسی ہندوستان کی امن پسند طبیعت سے کچھ سیکھیں اور اپنے مزاج میں استقلال و ثبات پیدا کر سکیں کیوں کہ ؎　بر سنگ گرداں نروید نبات

کچھ پیروڈی کے بارے میں

رشید احمد صدیقی

فن کی حیثیت سے پیروڈی مغرب کی دین ہے ۔ لیکن شغل کے اعتبار سے ہمارے شعر و ادب میں اجنبی نہیں ہے اردو میں اس کی ابتدائی مثال غالباً شاہنامے کی جہاں تہاں سے پیروڈی میں ملتی ہے ۔ جو رکیک و سخیف زیادہ ہے ۔ پیروڈی کم ہے، عربی فارسی، کلاسیکی اور مذہبی کتابوں کے تحت اللفظ اردو ترجمے کی بھی پیروڈی کی گئی ہے ۔ جس کے نمونے ملا رموزی کی "گلابی اردو" میں ملتے ہیں ۔ غالب ۔ حالی ۔ انیس اور اقبال کے کلام پر بھی یہ عمل کیا گیا ہے ۔ کسی شاعر یا مصنف کی پیروڈی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے کلام کا غیر معمولی طور پر چرچا ہے ۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کلام یا اس کا مصنف کس پائے کا ہے ۔

کچھ دنوں ترقی پسند شاعری بالخصوص بے قافیہ نظموں کی کثرت سے پیروڈی کی گئی ہے ۔ یہ در اصل کسی مشہور مصنف یا شاعر کے سنجیدہ اور معروف کلام یا نظم و نثر کو مضحک رنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے ۔ اس شرط کے ساتھ کہ مضحک مبتذل نہ ہونے پائے بالفاظ دیگر پیروڈی ادبی رنگ کی حامل ہو ۔ مشیخت مآبی یا حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو مزاح تفنن سے معتدل کرنے اور رکھنے کا کام پیروڈی سے لیا جاتا ہے ۔ علی گڑھ میں بور اور بوریت کچھ دنوں سے بڑی مقبول اصطلاحیں ہیں جن کو خود بور بڑی معصومیت سے کام میں لاتے ہیں پیروڈی ان معصوموں کے حضور میں ان کے ستم زدوں کی طرف سے نذر عقیدت ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ بور کو بور ہی کے حربے سے کیفر کردار کو پہنچانے کی مستحسن کوشش پیروڈی ہے ۔

پیروڈی میں جدت اور جودت کا ہونا ضروری ہے اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لیے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے پیروڈی کا ہنر ہے ۔ پیروڈی ظریفانہ پیوندکاری یا مزاحیہ تصرف ہی کو تو کہتے ہیں ۔ اعلیٰ پایے کی پیروڈی اتنی ہی قابل قدر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہو ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیروڈی کا فن کس ذہانت اور ذکاوت کا طلب گار ہوتا ہے ۔

پیروڈی نگاروں میں میرے نزدیک اکبر کا درجہ سب سے بلند ہے ۔ ایک زمانے میں سید محمد داؤد عباسی (علیگ) کی پیروڈی نگاری کی علیگڑھ میں بڑی شہرت تھی ۔ جو خوشی محمد خاں ناظر اور علامہ شبلی کے کلام پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے ۔ موجودہ دور میں سید محمد جعفری (پاکستان) کو بڑی شہرت ہے ۔

آپ نے سرکس میں مسخرے[1] کو دیکھا ہوگا جو اپنے ساتھی بازیگر نمبر ا کی نقل کرتا ہے ۔ وہ اپنے طور پر وہی سب کچھ دکھاتا ہے جو بازیگر دکھاتا ہے دونوں کے دکھانے میں صرف ٹیکنک کا فرق ہے ۔ ایک کے کرتب پر آپ محو حیرت رہ جاتے ہیں ۔ دوسرے کی نقل پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں ۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ مسخرا فن کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بازیگر کا ہمسر ہوتا ہے بلکہ بازیگر پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ کرتب جو بازیگر جان کو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے ۔ مسخرا محض چند قلابازیوں میں دکھا دیتا ہے ۔ لطف یہ ہے کہ ہم بازیگر کے کرتب کا حسن شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں

---

[1] رشید صاحب نے جسے مسخرا کہا ہے اس کو رام پور کی زبان میں بیلا (Beela) بروزن ٹیلہ کہتے ہیں ۔ یہ خاص رامپوری زبان کا لفظ ہے اور کہیں دوسری جگہ سننے میں نہیں آتا جوکر کے مفہوم کو اپنے تمام لوازمات اور فنکارانہ نزاکتوں کے ساتھ ادا کرنے والا کوئی اور لفظ نہیں ہے جوکر کو ہم مسخرہ نہیں کہہ سکتے ۔ اس لیے کہ جوکر میں فن کاری کا جتنا شدید احساس ہوتا ہے وہ مسخرے میں نہیں ہوتا جوکر اپنے مزاحیہ افعال کو ہنر بنا کر اور ہنر سمجھ کر پیش کرتا ہے بلکہ مسخرے کو بعض اوقات احساس بھی نہیں ہوتا ۔ اس لیے میری رائے میں سرکس والے مسخرے کو خصوصاً بیلا کہنا چاہیے کیونکہ یہ پوری طرح جوکر کا چربہ ہے (نگار)

اس سے کسی طرح کم شوق سے مسخرے کی قلابازیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ یہاں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس کرتب کو بازی گر اپنی جان خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے اسی کو مسخرہ اپنی آبرو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرے کی آبرو کسی غیر مسخرے کی آبرو سے کم نہیں ہوتی۔

قلابازی تو ہم آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ لیکن تماشائیوں کے ڈر سے شاید ایسا نہ کریں۔ دراصل قلابازی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا۔ سب کچھ مسخرے (فنکار) میں ہوتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ مسخرا بننے سے پہلے قلابازی لگانے میں احتیاط برتیں اور مسخرا بننے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں۔

پیروڈی اور کارٹون میں مماثلت ہے۔ کارٹون بھی کسی شخص یا شے یا واقعے کی سب سے نمایاں شناخت یا پہلو کو مضحکہ خیز حد تک نمایاں کر دیتا ہے۔ چسٹرٹن کے نزدیک طنز یا تضحیک کا تصور یہ ہے کہ سور کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ وہ سور سے بھی زیادہ سور نظر آنے لگے۔ یہ تعریف کارٹون پر بھی چسپاں ہوتی ہے اس طور پر پیروڈی کارٹون طنز و ظرافت بقول غالب ؎

"وہی ایک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے"!

نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے مشکل ہے۔ اس سے غالباً سب کو اتفاق ہوگا اس لیے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

آل احمد سرور

پیروڈی ظرافت کی ایک خاص صنف ہے۔ پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس کی پیروڈی کی جائے اس میں کچھ فکری یا فنی محور موجود ہوں۔ رشید صاحب کی اصطلاح میں انھیں کوبڑ کہہ لیجیے۔ مثلاً ایک صاف ستھرے صحیح اور ہموار شعر کی پیروڈی نہیں کی جا سکتی۔ جب تاؤ نہ ہوگا تو اسے تیز کیسے کیا جائے گا۔ اگر شاعر کے یہاں کچھ مضامین، اصطلاحات، تشبیہات، تراکیب اور علامات کی تکرار ہے اور یہ سب چیزیں ہی اس کی امتیازی صفت ہیں تو ان کی پیروڈی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر نثر نگار کے یہاں کچھ مخصوص خیالات کا اعادہ ہوتا ہے چند خاص خاص فقرے یا ترکیبیں بار بار ملتی ہیں واقعہ کچھ ہو تاثرات ایک ہی سے رکھتا ہے تو وہ پیروڈی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ پیروڈی انفرادیت کو آسیب بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس ستم ظریفی میں محض یہ دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھنے کا جذبہ ہی نہیں ذہنی صحت کے معیار قایم کرنے کا بھی احساس شامل ہے۔ ہر نشیب و فراز کو ہموار کرنے کا عزم ہی نئے نشیب و فراز کی داغ بیل ڈالنے کا بھی۔ یہ وہ آئینہ ہے جو محبوب کی جھرّیاں ہی دکھاتا ہے مگر جھرّیوں کے باوجود ادائے محبوبی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جس طرح ظرافت میں طنز کو گوارا اور اسلوب کو ادبی ہونا چاہیے اسی طرح پیروڈی میں بدنیتی کی گنجایش نہیں۔ اگر کسی کے نقطۂ نظر یا اسلوب بیان کی اس طرح پیروڈی کی گئی کہ پیروڈی کرنے والے کا ذاتی عناد نمایاں ہوگیا تو پیروڈی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ پیروڈی تو صرف آئینہ دکھاتی ہے قدروں کا پرچار نہیں کرتی۔ یہ چراغ رہ گزر ہے۔ پولس کی سرچ لائٹ نہیں۔

پیروڈی ایک شعوری کوشش ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر شعوری طور پر کوئی تصویر کارٹون اور کوئی تخلیق ایک ایسی بھدّی نقل بن جائے جس پر پیروڈی کا گمان ہو۔ اردو میں پیروڈی کی شعوری کوشش سب سے پہلے پطرس نے کی اور مولوی اسمٰعیل کی ریڈروں کے ملنے ہوئے حسن کو اپنے آئینے سے اور محبوب بنا دیا۔ ان کے مضمون کتے میں بھی مشاعروں کی ایک پیروڈی ملتی ہے۔ مگر مضمون نگار نے وہاں پیروڈی ضمناً کی ہے۔ اپنے بنیادی مقصد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جہاں کسی رومان یا انقلاب کی لے بہت تیز ہوگئی ہے۔ عورت یا نصاب' پیروڈی کے ذریعے سے صحت و اعتدال کی علمبرداری کی گئی ہے۔ جہاں فنکار نے پند کے نشے میں اپنے نغمے کی باگ کل آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ پیروڈی کرنے والوں کو اس کی بے لگامی واضح کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پیروڈی جہاد نہیں ہے ایک سنجیدہ تفریح ہے اور اس کا تہذیبی مقام مسلم ہے۔

سیّد احتشام حسین

انسان آلامِ حیات اور جان سوز سنجیدہ مصروفیات سے نجات کے لیے تفریح کے سیکڑوں ذریعے اور شغل پیدا کرتا ہے۔ ان کا ایک پہلو پیدا کر لیتا ہے

وہ ہنسنے کی بات پر تو خیر ہنستا ہی ہے (بشرطیکہ بعض لوگوں کی طرح ہنسنے سے اس کی صحت نہ خراب ہوتی ہو) سنجیدہ باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر ان میں مضحکہ کے پہلو نکال لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پیروڈی بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے۔ میں خود کو اس بات کے ماننے پر آمادہ نہیں کر سکا ہوں کہ پیروڈی کو ادبی محفلوں میں بھی جگہ دی جائے۔ ـــــــ ہو سکتا ہے کہ کوئی پیروڈی نگار میری اس بدذوقی پر مجھ سے بھی سمجھ لے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے وقتی تفریح تک محدود رکھنا چاہیے اور ایک ادبی صنف قرار دے کر اعلیٰ ظرافت اور مفکرانہ طنز کا مدمقابل نہیں بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

اردو ادب میں پیروڈی کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یا تو ہم لوگ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں اور یا انگریزی کے اس غیر مانوس سے لفظ کو کوئی نئی تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں پیروڈی کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔

پیروڈی بڑی پرانی چیز ہے۔ زمانہ قبل از مسیح میں بھی لوگ پیروڈی کیا کرتے تھے۔ یونان میں کسی ٹھوس نظم یا سنجیدہ ڈرامے کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا جاتا تو اس عمل کو پیروڈ یا (یا پیروڈو) کہتے تھے۔ ارسطو نے لکھا ہے کہ جب ایتھنز کی فوجیں سسلی میں تباہ ہو گئیں تو ایک یونانی نے اس جنگ پر اتنی اچھی پیروڈیا (یا پیروڈو) لکھی کہ اسے پڑھ کر ایتھنز والے اپنی شکست کو بھول گئے۔

اس زمانے سے اب تک دنیا کی ہر زبان میں ہر موضوع پر پیروڈیاں لکھی گئیں **Don Quixote** شایع ہوئی تو ساری دنیا یورپ کے بانکے سپاہیوں اور شولری پر ہنسی اور یہ کردار دنیا کے ادب میں ہمیشہ کے لیے شامل ہو گیا۔ جان فلپس نے ملٹن کی فردوس گمشدہ کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا تو لوگوں نے اسے ملٹن ثانی کا خطاب دیا جو آج تک اس کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پیروڈی نہ تو محض طنز ہوتی ہے اور نہ نری تضحیک، یہ ایسی خوشگوار سی تنقید ہوتی ہے جو بُری معلوم نہیں ہوتی۔ (خصوصاً اُسے جس پر پیروڈی کی گئی ہو) پچھلی صدی میں لندن کے تھیٹروں میں نامور شعراء کے کلام پر پیروڈی کی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ متعلقہ شعراء بطور تماشائی وہیں تھے لیکن انھوں نے برا نہیں مانا۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سنجیدہ اور سبق آموز چیزیں پڑھتے وقت قاری چوکنّا سا رہتا ہے اور بار بار سوچتا ہے کہ یہ باتیں تو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ ـــــــ اسے شک رہتا ہے کہ مصنف کہیں پروپیگنڈہ تو نہیں کر رہا ہے لیکن ایک کامیاب پیروڈی پڑھتے وقت اسے شبہ تک نہیں ہوتا کہ مصنف کسی اور کی آڑ لے کر طرز معاشرت، رسوم، اخلاقی قدروں اور دیگر اہم مسائل پر تنقید کر رہا ہے۔ چند جیت سے فقرے عبارت کے کچھ دلچسپ حصے اس کے ذہن میں رہ جاتے ہیں اور ساتھ ہی چند کارآمد نصیحتیں بھی یاد رہ جاتی ہیں۔ صحیح پیروڈی ادب کی نہایت دلکش صنف ہے جہاں تک لفظ پیروڈی کا تعلق ہے۔ سو جیسے تھیٹر کو تیاتر اور کلاسیکل کو کلاسیکی بنا کر اپنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر پیروڈی کو پیراوی یا پیرڈی بنا دیا جائے تو شاید ہم اس سے فوراً مانوس ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

پیروڈی سنجیدہ فن پاروں میں مضحک پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہ غلط پندار، گمراہ خودی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت میں تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے بہت سے گردہوں قوموں یا ادبی نسلوں کی مسیحائی طنز و مزاح کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اور پیروڈی بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ علی گڑھ نے اس میدان کے بڑے صاحب طرز شہسوار پیدا کیے ہیں۔ اور آج جب خود دستائی اپنی بات پر اڑنا اور دوسروں کی بات نہ سننا ہماری قومی کمزوری بنتا جا رہا ہے۔ طنز و مزاح کی شدید ضرورت ہے جو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا سکے۔

خوش مزاقی کا یہ معیار نہیں ہے کہ دوسروں پر ہنسا جائے۔ صحیح معیار یہ ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی اس آئینے میں دیکھا جائے اور ماتھے پر شکن نہ آنے پائے۔

شوکت تھانوی

ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ حالات ہی دراصل ان حالات کی پیروڈی ہیں جن سے کبھی ہم گذر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی جتنی بسر کرنا تھی وہ تو بسر کر چکے اب زندگی کی پیروڈی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں جب انسان خود اپنا کارٹون بن گیا ہو اور جب اس کا اسلوب زندگی بجائے خود پیروڈی ہو اس کے پیچھے اسلوب زندگی کی اس سے کسی پیروڈی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ پیروڈی کرنا وہ فن ہے جس کا فنکار اگر جیل اور موت دونوں سے بچ گیا۔ تو خود اپنے ہی فن کا شاہکار بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی کسی کاوش پر نہیں بلکہ خود اسی پر دنیا ہنسنے لگتی ہے۔

کنھیا لال کپور

میری دانست میں اردو ادب میں پیروڈی کی بہتات ہے قریب قریب ہر غزل، ہر مضمون، اچھی غزل، نظم، مضمون پر لکھی ہوئی پیروڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ پیروڈی مزاحیہ تنقید کی سب سے مشکل صنعت ہے۔ اچھی پیروڈی لکھنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے، نثر میں ڈاکٹر شفیق الرحمن شوکت تھانوی، کرشن چندر، منٹو اور فرقت نے چند اچھی پیروڈیاں لکھی ہیں نظم میں جعفری، مجید لاہوری نے پیروڈی کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب ہمارے ادبا پیروڈی کی اہمیت محسوس کریں گے اور سلیقے سے پیروڈی لکھا کریں گے۔

فکر تونسوی

میری تھیوری یہ ہے کہ اچھا طنز نگار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی شکل وصورت (بہ صورت پیروڈی) ۵ فیصدی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز ہو۔ جیسے برناڈشا، چارلی چیپلن، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی اور .... اور بالکل یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات سوسائٹی کی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز چیزوں پر کراری طنز کر لیتے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خدا نے کسی طنز نگار کو یوسفِ ثانی نہیں بنایا ورنہ یہ سوائے اپنی اپنی زلیخا کے اور کسی کام کے نہ رہتے آپ کا کیا خیال ہے[1]

ڈاکٹر قمر رئیس

ظرافت اور طنز کی ہیئت، ان کے محرکات اور تخلیقی عمل میں اتنے اوصاف مشترک ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز ہے جو دونوں کے مابین ہمیشہ وجہ امتیاز رہتی ہے۔ اور وہ ان کا مقصد۔ ایک کا مقصد تضحیک ہے اور دوسرے کا تنقید۔ ظرافت ہمیں ہنسی یا لطف اندوزی کی ایک عارضی کیفیت دے کر اپنی تخلیق کا مقصد کھو بیٹھتی ہے۔ طنز اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں میں اتار کر ہمیں زندگی کے کچھ حقائق کا ادراک بخشتا ہے پیروڈی کا سلسلۂ نسب طنز سے ملتا ہے۔ دونوں میں اگر کوئی بنیادی فرق ہے تو یہ کہ طنز اپنا موضوع اور مواد براہ راست (اور بالعموم) زندگی سے لیتا ہے۔ پیروڈی ادب اور فنونِ لطیفہ سے۔ ایک اہم وصف جو ظرافت، طنز اور پیروڈی تینوں میں بروئے کار رہتا ہے۔ مزاح کا مقصد۔ یعنی ایک ایسا فنی اظہار جو قاری کے دل میں ہنسی کی کیفیت پیدا کر دے۔ میں یہاں مزاح کی فلسفیانہ تاویلوں میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ارسطو نے اسے جس طرح دریافت کیا ہے وہ اپنی لفظیت کے باوجود آج بھی ناقابل تردید ہے۔ اس کا یہ قول کہ "وہی چیز ہنسی کی محرک ہو سکتی ہے۔ جو بدہیئتی کا ایک ایسا جزو ہو جس کی کجی یا ناہمواری کسی طرح کی اذیت یا جراحت کا شائبہ نہ رکھتی ہو" دراصل مزاح کی دو بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔

---

[1] شاید اس موقع پر ڈاکٹر شفیق الرحمن فکر تونسوی کی نظر میں نہیں رہے۔

۱۔ مزاح کا محرک کوئی ایسا بے تکا پن ہوتا ہے جس سے ہماری متانت اور جمالیات کو صدمہ پہنچتا ہے۔
۲۔ لیکن وہ بے تکا پن جس سے مزاح کی تخلیق اور ہنسی کی انبساطی کیفیت حرکت اور عمل میں آتی ہے ایسا ہرگز نہ ہو جو کسی انسان یا جاندار کے لیے جسمانی یا قلبی اذیت کا باعث ہو رہا ہے۔

اس طرح ارسطو نے مزاح کو بظاہر اپنے اخلاقی آدرش کا لیکن فی الاصل ایک وسیع تر معنی میں اس کو انسان دوستی یا انسانی ہمدردی کے تابع کر دیا۔ پیروڈی کا فن بھی اپنی مزاحیہ کیفیت میں اسی انسانی ہمدردی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور چونکہ طنز کی طرح اس کا مقصد بھی تنقید ہے اس لیے انسانی ہمدردی کا یہ عنصر اس کے تنقیدی عمل میں پوری آب و تاب لیکن ضبط و توازن کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ موضوع کے اعتبار سے پیروڈی کا میدان طنز سے محدود اور مختصر ہے صحیح نہ ہو گا۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے مزاح جو دونوں میں بنیادی اور مشترک حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری متانت کے احساس اور جمالیات کے تصور کی شکست و ریخت سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ شعر و ادب جمالیاتی قدروں کا بہترین مظہر ہیں اس لیے اس محدود دائرے میں بھی قدم قدم پر سینکڑوں موضوعات پیروڈی لکھنے والے کی نگاہ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کا تنقیدی عمل طنز کی بہ نسبت کچھ پیچیدہ اور دشوار ہوتا ہے۔

طنز نگار زندگی کے نو بہ نو مظاہر میں سے کچھ ایسی بے تکی صورتیں اخذ کر کے جو اس کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، اپنے مزاحیہ اسلوب میں ڈھالتا ہے اور اس طرح اس میں استرے کی سی تیزی پیدا کر دیتا ہے۔ پیروڈی کا موضوع شعر و ادب کا کوئی خاص اسلوب خاص میلان (فکری یا فنی) یا کوئی اہم ادبی شہپارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تنقید کا ہدف اس خاص اسلوب، میلان یا تخلیق کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے پیروڈی لکھنے والے کو طنز نگار کی ژرف نگاہی اور دیدہ وری کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا گہرا شعور اور فنی اسالیب کی واضح بصیرت بھی درکار ہوتی ہے وہ پیروڈی کی فنی تکمیل میں جن دشواریوں سے گزرتا ہے اور جس طرح کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے اس کا اجمالی تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے:

۱۔ سب سے پہلے ان نمایاں کمزوریوں کی دریافت ——— یا ان کمزوریوں کا واضح ادراک جو نمایاں نہیں ہیں۔ لیکن جن کو وہ نمایاں کر کے پیش کرنا چاہتا ہے۔
۲۔ اپنے تخیل کو اس خاص اسلوب کے دائرہ میں اسیر کر کے اس طرح مہمیز کرنا کہ اس کی تمام کمزوریاں اک مضحک ہیئت میں سامنے آ جائیں۔
۳۔ اور اس طرز عمل میں اس کا زاویہ نظر ہمدردانہ ہو۔ وہ تنقید کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہو۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد اس مروجہ اسلوب کی اصلاح ہو اور اس کے نقائص کو ادب کے قارئین سے روشناس کرانا کہ وہ اسلوب اسی مرتبہ کا مستحق سمجھا جائے جس کا وہ اہل ہے۔

اس تجزیے سے پیروڈی کے کئی اوصاف واضح ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ پیروڈی لکھنے والا کسی خاص اسلوب یا فن پارہ کی خارجی ہیئت (Form) کی تقلید کرتے ہوئے اس کے مواد کو حسب ضرورت ایسی مبالغہ آرائی اور ایسے ظریفانہ پینترے سے پیش کرے کہ اس کا اصل جوہر مسخ ہو کر بھی پہچانا جا سکے۔ ایک مغربی ناقد نے بہت پتے کی بات کہی ہے اس کا قول ہے "بہترین پیروڈی وہی ہے" اور یہ واقعہ ہے کہ بہترین پیروڈی شاذ و نادر ہی لکھی جاتی ہے) جو ہیئت کے ساتھ وفاداری لیکن مواد کے ساتھ عیاری کا مسلک اختیار کرتی ہے۔" مواد کے ساتھ یہی عیاری پیروڈی لکھنے والے کے تخیل کے ساتھ ساتھ اس کے فکر و شعور کو بھی کچھ آزادی دیتی ہے۔ اور اس بہانے اگر وہ چاہے تو اپنے عہد کی بدلتی ہوئی قدروں اور معاشرتی حالات کو بھی تنقید و طنز کا موضوع بنا سکتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے اس خاص اسلوب یا فن پارہ کی ہیئت (Form) اور اس کے موڈ کے ساتھ پوری پوری وفاداری برتنا ہو گی، جسے اس نے سامنے رکھا ہے اس لیے کامیاب پیروڈی کا معیار قرار دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری خود پتہ لگائے کہ اس کے آئینہ میں کس اسلوب یا کس فنکار کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ دوسرا فنی پہلو یہ ہے کہ پیروڈی کا تنقیدی عمل ہر اعتبار سے ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے ایک ناقد نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے وہ لکھتا ہے:

"پیروڈی لکھنے والے کی تنقید کو تخلیق کا ہم مرتبہ ہونا چاہیے اس کا تخلیقی عمل ایک طرح کی تخیلی بازآفرینی ہو۔"

گویا پیروڈی بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح فن، فکر اور جذبہ کی متوازن ہم آہنگی کا لطیفہ پیکر ہو۔

یہاں مناسب ہوگا کہ پیروڈی کی فنی ساخت پر غور کرتے ہوئے محل ورود پر بھی ایک نظر ڈالیں لغتاً پیروڈی دراصل ایک یونانی لفظ "پرودیا" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں Counter Song یا نغمۂ معکوس۔ پرودیا، قدیم یونان میں ایک ایسا گیت ہوتا تھا جو کسی گائے ہوئے سنجیدہ نغمے کی مقدس فضا اور اس کے سحر و اثر کے طلسم کو توڑنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ گویا یہ اس نغمہ کی اہمیت اور متانت کا خاکہ اڑاتا ہے۔ اس کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن قیاس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد ان ہنگامی جذبات کی شوریدگی اور جوش میں ایک توازن پیدا کرنا تھا جو کسی نغمے کی الاپوں سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوجاتے ہیں یا یہ کہیے کہ اس جذباتی شدت اور ہیجان میں ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے گایا جاتا تھا۔ اس کی یہ اصلاحی روح آج بھی برقرار رہی۔ اگرچہ موسیقی سے رزمیہ، پھر ڈرامہ اور پھر ادب کی دوسری اصناف تک آتے آتے اس کی نوعیت میں تغیر ہوگیا ہے۔ کیسیلس کی ادبی قاموس میں پیروڈی کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا کہ

" پیروڈی انتہا پسندی اور جارحانہ روش کے خلاف ایک طرح کا اقدام تحفظ ہے اور سب سے بڑا تحفظ، یہ ہماری حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کے سنگین جرم کے خلاف ہے "

شاید اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بائرن اور سوئنبرن جیسے ممتاز اور صاحب طرز شاعروں نے خود اپنے فن کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئیں۔

یونان میں فنی حیثیت سے اس صنف کا موجد ارسطو نے Hegemon of Thasos کو مانا ہے اگرچہ (Marton) بھی اس کی اولیت کا دعویدار کہا جاتا ہے جس نے ہزار دو ... ہومر کی رزمیہ شاعری کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے بعد (Hipponax) نے ایلیڈ کو ایک کامیاب پیروڈی کے آئینے میں پیش کیا۔ اس ابتدائی دور کی پیروڈی میں طرز نگارش کے ساتھ ساتھ تصانیف کی فکری نوعیت اور ان کے داخلی موڈ کو بھی تنقید و تضحیک کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اردو میں اس صنف کا تعارف براہ راست انگریزی کے اثر سے ہوا اور اگرچہ انگریزی میں اس کی روایت اور اس کے فن کا تصور وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا۔ لیکن وہاں بعض ذہین شاعروں اور ادیبوں نے اپنے بلند تر مقاصد کے حصول کے لیے ایسی اصناف کو بھی رواج دیا ہے جو اگرچہ پیروڈی کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن کچھ اوصاف میں اس صنف سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں مثال کے طور پر Mock Epic یا ظریفانہ رزمیہ۔ اس میں شاعر کلاسیکی رزمیہ شاعری کی فنی نزاکتوں، اس کی مخصوص بحر پرشکوہ انداز بیان مصنوعی صناعی اور اشخاص کے کارناموں کا مبالغہ آمیز بیان تمام اوصاف کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن اس کا مواد وہ روزمرہ کی عام زندگی سے لیتا ہے۔ اس طرح عام انسانوں اور ادنیٰ واقعات کو رزمیہ انداز کے اہتمام شان و شکوہ اور عظمت کے آئینے میں دکھا کر وہ قدم قدم پر ایک پرمزاح تضاد اور ظریفانہ صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس نوع کے ظریفانہ رزمیوں کے نقوش ہمیں پوپ کی "زلفوں کی عصمت دری" سے لیکر ایلیٹ کی "ویرانہ" تک میں ملتے ہیں۔ (یہ تسلیم کہ "ویرانہ" مزاح سے عاری ہے) دراصل ان نظموں کا مقصد رزمیہ کی تنقید نہیں بلکہ طنز کے پیرائے میں اپنے عہد کی زندگی کی تنقید ہے۔ اس لیے ان کا فن پیروڈی کے فن سے مشابہت کے باوجود بہت مختلف ہے۔

انگریزی ادب میں Issac Howkins Brown کو پیروڈی کا موجد کہا جاتا ہے جس نے پوپ اور تھامسن وغیرہ کے طرز نگارش کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ انیسویں صدی میں اس صنف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور سے نظم کی پیروڈی کو اس عہد کا شاید ہی کوئی صاحب طرز شاعر ہو جس کے اسلوب کا خاکہ نہ اڑایا گیا ہو یا جس نے اپنے ہم عصر شعراء کے بارے میں پیروڈی کے انداز کی نظمیں لکھی ہوں۔ شیلی نے ورڈس ورتھ کی مشہور نظم Petes Bell کی پیروڈی لکھ کر فطرت کے اس پجاری کے فن اور دلکشی کو ہلا کر رکھ دیا۔ سوئنبرن نے ٹینی سن کی شاہکار نظم In Memorium کی جو پیروڈی لکھی تھی اسے اپنے زمانے میں ٹینی سن کی نظم سے کم شہرت حاصل نہ تھی۔ اگر آپ کے ذہن میں ٹینی سن کے طرز خاص اور اور اس

نظم کا دھندلا سا خاکہ بھی ہے تو آپ سوئنبرن کی پیروڈی کے ان مصرعوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں ۔

God whom we see not is.
And God who is not we see.
Fiddle, we know is diddle,
And diddle we take it, is dee

یہاں پیروڈی لکھنے والے نے الفاظ اور خیالات میں ایک خاص لوچ اور تکرار پیدا کر کے بائرن کی معنوی نزاکت اور بلندی کو جس طرح پستی دکھائی ہے اور ایک متوازن تخیلی مبالغہ آرائی سے جس طرح بائرن کے شاہکار کا خاکہ اڑایا ہے وہ اس فن کا کمال ہے۔

انگریزی کے نثری ادب میں بھی پیروڈی کے بہت کامیاب نمونے ملتے ہیں ۔ اس صدی میں جیمس جوائس نے اگر مبتذل انداز کے اخباری قصوں کو (جو اس زمانے میں بہت مقبول تھے) پیروڈی کا موضوع بنایا تو اسٹیفن لیکاک نے جاسوسی قصوں کی ہیجان خیزی تجسس آفرینی اور مجرمانہ خوف و ہراس کی فضا کو اپنی پیروڈیوں کا ہدف بنایا۔ جیمس جوائس نے انگریزی نثر کے نمائندہ اسالیب کو بھی بڑی کامیابی سے پیروڈی کے قالب میں پیش کیا ہے اور اگر قریب سے دیکھا جائے تو ایک بڑے کینوس پر اس کا عظیم ناول "یولیسس" بھی پیروڈی ہی ہے جس میں ایک طرف اس نے حقیقت نگاری کی روایت اور دوسری طرف رزمیہ قصوں کے کرداروں کی رفعت و عظمت کا مضحکہ اڑایا ہے ۔ اس ناول کے پیروڈی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اس کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے اسے اس صدی کا سب سے بڑا پیروڈی نویس مانا ہے ۔

بہرحال یہاں میرا مقصد انگریزی یا اردو پیروڈی کی تاریخ کا جائزہ لینا نہیں بلکہ اس صنف کے چند فنی پہلوؤں اس کی وسعت اور امکانات کی طرف اشارہ کرنا ہے ۔ انگریزی میں اس ادبی روایت کی تعمیر و ترقی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے مشاہیر اور چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس طرح ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری سے اس روایت کا نشو و نما ہوا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ معیاری پیروڈی کی تخلیق صرف اس فنکار کے بس کی بات ہے جو اپنی صلاحیتوں اور ذہن و فکر کے اعتبار سے اس ادیب سے کم تر نہ ہو جس کے فن یا اسلوب کو وہ پیروڈی کا موضوع بنا رہا ہو۔

اردو میں اس روایت کی پس ماندگی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے مشاہیر نے اسے ہاتھ لگانا کسر شان سمجھا ۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیبوں نے اگر کبھی تفنن کے طور پر طبع آزمائی کی ہے تو اس کا فنی معیار ان کی ذہنی سطح سے بلند نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب کا دامن اس روایت کے گلہائے گراں مایہ " سے خالی نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اس کی کوئی روایت نہ رہی ہو ۔ غالب کی طرزِ بیدل والی غزلوں کی عصری پیروڈیوں سے لیکر تہذیب الاخلاق کے اسالیب کی نقالی، اودھ پنچ کے عہد کی ناک بازی، داستانوں کے قالب میں نئی زندگی کی فسوں طرازی ـــــــ پھر سفرناموں اور ترقی پسند شعر و ادب کی پیروڈیوں تک اگر تلاش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اس صنف کا قابل قدر خزانہ ہاتھ آ سکتا ہے ۔ لیکن بقول غالب ؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ؟

(اسکالر)

دیوانِ افسر

قاضی عبدالودود

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں ہے: "افسر غلام اشرف ولد غلام رسول کہ در مرثیہ و سلام اشرف تخلص میکند و در شعر افسر قرار دادہ۔ قوم شیخ، بزرگانش چودھری گاؤخانۂ بادشاہی بودہ اند۔ مشارٌ الیہ۔۔ زیک دو سال فکر مرثیہ و سلام۔۔ کردہ و میکند۔ در ایامیکہ مولف طرح مشاعرہ انگندہ در آن روزہا بتر غیب فقیر مجموع پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ از نظر فقیر گذرانیدہ طبعش مناسبت تمام بدرستی کلام دارد۔" تذکرۂ مذکور کا زمانۂ آغاز و اختتام دوازدہم ہے اور یہ ۱۲۰۹ھ میں انجام کو پہنچا۔ یہ فیصلہ کہ افسر کا ترجمہ کس سال حوالۂ قلم ہوا مشکل ہے۔ افسر نے اپنے دیوان میں دو جگہ مصحفی کو یاد کیا ہے۔

جہاں میں مجتمع بائیس جلدیں کر کے رحلت کی   اے افسر مصحفی شاعر بڑا استاد کامل تھا
رو برو کس کے غزل اپنی پڑھوں اے افسر   مصحفی سا کوئی محفل میں جو استاد نہ ہو

دیوان افسر میں مصحفی کی ایک غزل (مصرع ا "برق گلشن میں جو چمکی ترے رخساروں سے") کا مخمس ہے، اور ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ (مادّہ "مصحفی نے سجا مقام بہشت" ۱۲۴۰)۔ افسر کا سال رحلت معلوم نہیں، لیکن، روشن الدولہ کی وزارت کے زمانے میں ان کا زندہ ہونا ثابت ہے۔ کتب خانۂ خدا بخش کا نسخۂ دیوان فی الحال ۱۰۹ اوراق (مسطر ۱۵ سطری، بعض صفحات سادہ) پر مشتمل ہے؛ ورق ا کے بعد کے بعض اوراق غائب ہیں۔ کاتب کا نام اور زمانۂ کتابت اس نسخہ میں درج نہیں، لیکن قرینہ ہے کہ افسر کے دورانِ حیات میں لکھا گیا تھا۔ دیوان کے کل مصرعوں کی مجموعی تعداد ۴۷۳۵ ہے، اس کا امکان ہے کہ اس میں دس پانچ کی غلطی ہو) مثنوی ۶۴۶، قصیدہ ۶۷۸، غزل ۳۵۹۲، ترکیب بند ۱۸۲، مخمس ۳۲۵، قطعہ ۲۴، رباعی دو بیتی قطعات جو دیوان میں زیر عنوان رباعی درج ہیں ۲۶۔ مثنویاں ۸ ہیں، پہلی میں ایک غم انجام واقعہ نظم ہوا ہے، اس کی تاریخ تصنیف افسر نے "کشتۂ معشوق" (۱۲۴۱ھ) سے نکالی ہے جو بیت ۳۹ میں ہے۔ ورق اب میں جو اس کے ۶ ابیات ہیں ان میں سے ۳ اور مثنوی کی بیت آخر درج ذیل ہیں:

عطا کر لطف سے اپنے الٰہی   مجھے ملک سخن کی بادشاہی
سکندر کا علم میرا علم کر   قلمرو سب مرے زیر قلم کر
وہ دے علم و ہنر کا تاج مجھ کو   کہ کیکاؤس بھیجے باج مجھ کو
بفیض روح مولانائے جامی   ملے اس مثنوی کو خوش کلامی

اس کے موجودہ ابیات کی تعداد ۴۰ ہے، اور اس کے ساتھ ایک رنگین تصویر بھی ہے، مثنوی دوم مناجات ہے (ابیات ۴۵)، بیت اول و آخر

الٰہی ترا جز ہے ہر اک بسیط   تری ذات ہے کلّ شیئٍ محیط
بس افسر سمند مناجات تھام   اجابت کا مالک ہے ربّ انام

اس مثنوی کا شعر ذیل ان کے شیعہ ہونے پر مشعر ہے:

بحق دہ و چار معصوم پاک   مرا سیم کر گوہر تابناک

مثنوی سوم (ابیات ۴۴) کا عنوان "ڈھیلہ و بتہ" (کذا) ہے اس میں ڈھیلے اور پتنے کا مکالمہ ہے، بیت اول و آخر:

نہ ہے صنعت خاک آباد سنلق   کیا جس نے ڈھیلے پہ ایجاد خلق
دلا ختم بس اب یہ تقریر کر   نہ اہل سماعت کو دلگیر کر

مثنوی چہارم (ابیات ۴۴) "عرضی درفرمایش شخصے سکندر نامی برائے شاہ زمن" (غازی الدین حیدر) بیت ۱:

پیر و مرشد قبلۂ اہلِ جہاں　　مہر اوجِ حشمت و گردوں مکاں

مثنوی پنجم (ابیات ۳۲) بھی اسی نوع کی ہے، کسی محبوب الاسم شخص کی فرمایش پر کہی گئی تھی بیت اوّل:

رائے صاحب فیض بخش انس و جاں　　نسخۂ اکرام فیاض زماں

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں مثنویاں بطور مکتوب ہیں: ۶ - بنام احمد علی خاں (ابیات ۱۴) انھیں افسر نے مصحفی کا دیوان دوم بھیجا تھا، اس کا ذکر ہے، ۷ - نام مکتوب الیہ مرقوم نہیں (ابیات ۱۵) بیت اول و ابیات آخر:

اے نہال سبز باغ دوستی　　تازہ ہے تم سے دماغ دوستی

خط کیا ہندی میں اس باعث تم　　ربط ہیگا فارسی سے تم کو کم

لیکن اے مشفق کرم فرما شتاب　　وقت فرصت بھیجنا اس کا جواب

۸ - یہ بھی مثل ۷ (ابیات ۱۹)، ابیات اول و آخر:

گل خندان گلستان محبت (کذا)　　نہال سبز بستان محبت

بس آگے کیا کریں احوال تحریر　　نہ ہے شتون الفت کی تو تقریر

قصیدے ۶ ہیں: ۱ - مدح حضرت علی (۷۵ ابیات) بیت اول:

چرخ بیمہر میں تجھو نہ چمکتے اختر　　بہر سوز جگر خلق بھرے ہیں انگر

۲ - مدح روشن الدولہ (۴۶ ابیات) بیت اول:

اٹھا جو آج عذار سحر سے شب کا حجاب　　سروش باد صبا نے کیا یہ مجھ سے خطاب

۳ - مدح غازی الدین حیدر (ابیات ۹۸) بیت اول:

صبح پراں جو ہوا طائر خور زریں بال　　ہاتف دل نے کہا مجھ سے کہ اے نیک خصال

۴ - ممدوح کا نام درج نہیں (ابیات ۲۴) بیت اول:

ہوا جو خواب سے میں آج صبحدم بیدار　　سروش غیب نے آکر دہیں کیا اظہار

۵ - مدح روشن الدولہ (ابیات ۲۷) بیت اول:

صبحدم ذہن رسا بلبل باغ تقریر　　پایۂ عرش کی نیتی ہے خبر جس کی صفیر

۶ - تہنیت خلعت روشن الدولہ (ابیات ۲۹) بیت اول:

روشن الدولہ بہادر دیکھ تیری نامکی　　اغنیا سوگند کھاتے ہیں ترے اقبال کی

غزل کے ابیات اول و آخر اور کچھ دوسرے اشعار جو مختلف نقطہ ہائے نظر سے منتخب ہوئے ہیں درج ذیل ہیں:

حسن جہاں ہے عکس تری آب و تاب کا　　دریا سے اتصال نہیں کس حباب کا

دست سیاہ ناز سے افسر بتان ہند　　تاراج اپنا کشور اسلام کر چلے

شب ساقی مہوش کے کس ناز کرشمہ سے　　اک ہاتھ میں شیشہ تھا اک ہاتھ میں پیمانہ

کیا خار الم دل پر کھٹکا جو ہیں بلبل نے　　آغاز کیا گل کی فرقت کا شب افسانہ

افسر جو گلستاں میں نرگس کا میں شیدا ہوں　　بھاتا ہے مجھے دل سے کس چشم کا شرمانا

خوباں فرنگ آتے ہیں خوش دل کو اے افسر　　ہے جی میں ذرا کیجے لندن کا نظارا

پلٹن کی طرح آنسو ہر چشم سے رواں ہیں — گو رو رہے ملکِ دل کا غارت کیا جزیرہ
دارِ فانی میں اگر شاہِ زمن ہوں تو کیا — ایک دن چھوڑ کے میں رنگ محل جاؤں گا
خفتگانِ خواب مضطر ہی نظر آئے بخواب — مرنے پر بھی گیا ہرگز نہ دل کا اضطراب[1]
خالی نہیں فساد سے یہ ساتوں آسماں — اک اک کی ہے بغل میں بھری فطرتیں ہزار
شاید صبا تری بولائی چمن کے اندر — پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر
باتیں کرے ہے غیر سے ایہام میں تو کیا — آگاہ سب ہیں تری زرگری سے ہم
شام جدا تا صبح کریں ہم آہ تڑپ کر اور کہیں — بزمِ طرب میں جلوہ کناں وہ شوخ ستمگر اور کہیں
طرفہ چلن اے ساقی مہوش تو نے ہم سے نکالا ہے — شیشہ ہمیں تمالی دکھلانا بھر کر ساغر اور کہیں
وعدہ وصل تو کرتے ہو ہم سے جان فدا ہے اور کہیں — زلفیں یاں سلجھاتے ہو بیٹھے دل الجھا ہے اور کہیں
خاکساروں سے ہو کیونکر اس ہمہ انوار کو ربط — سخت مشکل ہے زمیں سے آسماں ملنا نہیں
رخصت چمن کی جب نہ ملے نو بہار میں — کیا دل لگے پھر اپنا بھلا اس دیار میں
فصلِ خزاں میں دیکھا نقشہ عجب چمن کا — نہ گل ہے بلبلوں کی شیریں مقالیاں ہیں
شورِ جنوں جہاں سے گم ہے برنگ عنقا — ویراں ہیں قید خانے زنجیر خالیاں ہیں
سوگند ہے صبا مجھے بلبل سے بات کی — کب میں نے اس چمن میں کسی گل سے بات کی
لکھنؤ سے اٹھ گیا وہ آصف دوراں کہ لوگ — نام پر آتے تھے جس کی ہفت کشور سے چلے
جن کی خدمت میں بسر کرتے تھے اوقات کبھی — ان سے ہوتی نہیں اب ہنس کے ملاقات کبھی
کہتے تھے ہم کہ دل نہ لگا ایسے شخص سے — رکھتا ہے کوئی چشم وفا ایسے شخص سے
داغ نہ تازہ دو کوئی مر کے مجھے چراغ سے — کلبۂ غم میں روشنی ہے مرے دل کے داغ سے
سبزۂ گلشن کیوں آنکھوں میں نشتر خار کی صورت ہے — ہجر میں کس گلرو کے اپنی بلبل زار کی صورت ہے
کوٹھیاں دل کی لٹیں دیکھیے اب کس کس کی — آج نیلام میں اک ماہ فرنگ آتا ہے
لوٹ لیتا ہے ملک استنبول — پان جب وہ صنم چبا آتا ہے
تڑپ کر شام سے بیمار تیرا صبح کرتا ہے — نہ پوچھا تو نے کیا صدمہ ترے دل پر گزرتا ہے

ترکیب بند بعنوان "ہفت بند" مدح حضرت علی میں ہے، بیت اول جو افسر کے شیعۂ غالی ہونے پر دال ہے:

السلام اے از ازل ہمنام رب العالمیں — دے امام اول و ہمنامے ختم المرسلیں

مخمس ۸ ہیں، تو سین میں بندوں کی تعداد اور مخمس کا مصرع سوم درج ہے۔ ۱۔غزل افسر (۹، "باغ آفاق میں کوئی ایسا نخل") ۲۔ ایضاً (۱۵، "کچھ ہمارے درد سے آگاہ لیطلیموس ہے") ۳۔غزل مصحفی اس کا ذکر ہو چکا ہے ۷ بند۔ ۴۔غزل سودا (۸، "ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے") ۵۔ ایضاً (۶ "بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا" ۶۔ ایضاً ("بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور" ۵) ۷۔غزل میر (۷، "تا بمقدور انتظار کیا") ۸۔ ("خانۂ حسرت دعم ہو وطن غیبت کو" ۸)

بدگماں اس لئے نہ آقا ہی کیے نوکر سے — باپ سے بیٹے لڑیں بیٹی لڑے مادر سے
تفرقے اس نے کیے لاکھ زن و شوہر سے — رام نے جس گھڑی سیتا کو نکالا گھر سے

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

[1] دیوان میں مرقوم ہے کہ یہ مصرع سعادت علیخاں کا ہے۔

مصطفیٰ زیدی

(اردو کا ایک بیباک، نڈر اور طنّاز شاعر)

ڈاکٹر محمد باقر

آپ بھی ناراض ہوں گے اور شاید مصطفیٰ زیدی بھی کیوں کہ ان سطور (جنھیں لکھتے لکھتے میں ایک مضمون بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں) میں آپ کو ایک بھی تو ملکی اور غیر ملکی بڑا نام نظر نہیں آئے گا جس کی شاعری کا مقابلہ میں نے زیدی کے اشعار سے کیا ہو۔ حالانکہ زیدی کو پڑھتے ہوئے میرے صفحۂ ذہن پر معاصر اشعار کے ایسے درجنوں بت ابھرے جو زیدی کے اشعار سے ٹکر لینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے قلب و نظر کا تقاضا تھا کہ لذت کے اس احساس فراواں کو محفوظ رکھا جائے جو زیدی کے شعر پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جب زیدی کے اشعار کی لذیذ حکایت بیان ہو تو بات اس کے اشعار تک ہی محدود رہے لہذا آپ کو اس قسم کی تنقید و تحسین سے اگر پہلے سابقہ نہیں پڑا تو اب ملاحظہ فرما لیں۔ آپ کی تنقید میرے علم میں اضافہ کرے گی۔

بات یوں ہوئی کہ مری کی ایک سہانی شام کو (غالباً ۱۹۵۹ء میں) مری لٹریری یونین نے میونسپل لائبریری ہال میں حسب معمول ایک مشاعرہ کیا۔ میں بھی سامعین کی حیثیت سے مدعو تھا۔ ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جدید وضع کا خوش پوش نوجوان چشمہ لگائے صدارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مقامی سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہیں اور نام مصطفیٰ زیدی ہے۔ ابھی چند شاعروں نے اپنا کلام سنایا ہی تھا کہ صدر کرسی اور مصروفیت کی وجہ سے جلسہ سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ اپنا کلام سنائیے۔ مصطفیٰ زیدی صاحب نے اپنی ایک نظم کا حصہ پڑھ دیا۔ میں حیران ہو کر سن رہا تھا کہ اردو میں اس قسم کی نظم بھی لکھی جا رہی ہے! اسے میری ناواقفیت پر محمول کر لیجیے لیکن یہ حقیقت تھی کہ فارسی سے مستعار لیے گل و بلبل کے قصے سننے سنانے والی زبان میں پہلی دفعہ میں نے ایسے شعر سنے جن کی مثال مجھے پہلے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ لوگوں نے ہل من مزید کے نعرے تو بہت لگائے لیکن صدر یہ جا وہ جا کرسی صدارت خالی چھوڑ کر چل دیئے۔ اور میں ابھی اپنے تاثرات کو مجتمع بھی نہ کر پایا تھا کہ ہجوم (مشاعروں میں اکثر ہجوم ہی ہوتا ہے) نے خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ مشاعرہ ہوتا رہا اور شاعر داد و بیداد کے شکار ہوتے رہے۔ لیکن میں سارا وقت یہ سوچتا رہا کہ کاش مصطفیٰ زیدی صاحب کچھ دیر اور پڑھتے بلکہ صرف وہی پڑھتے رہتے تو یہ محفل کتنی پر لطف ہوتی۔ اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی کہ کبھی موقع ملا تو صرف مصطفیٰ زیدی کو سنیں گے۔ اس طرح کی خلش ایک آرزو بن کر دل میں بیٹھ گئی۔

زیدی صاحب کو سننے کی آرزو تو کئی سال تک پوری نہ ہوئی لیکن اب وقتاً فوقتاً ان کے اشعار مختلف جرائد میں نظر آتے تو میں خاص انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا۔ بلکہ بعض چیزوں کو بار بار پڑھتا کہ اس سے تفہیم و تحصیل لطف میں ہر بار کے مطالعہ سے اضافہ ہوتا۔ اور پھر ایک دن مجھے "روشنی" "شہر آذر" اور "موج مری صدف صدف" یعنی زیدی صاحب کی تینوں کتابیں مل گئیں۔ یہ زیدی صاحب کا عطیہ تھا۔ جو ایک خط کے جواب میں مجھے ملا۔ پھر میری درخواست پر آپ نے زیر طباعت مجموعۂ اشعار "گریبان" بھی مجھے بھجوایا۔ کہاں تو زیدی صاحب سے چند شعر سننے کی آرزو تھی اور کہاں کامل زیدی اب میرے سامنے تھا۔

معلوم ہوا کہ مصطفیٰ زیدی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے خود اسی سال بی اے پاس کیا تھا۔ زیدی صاحب نے الہ آباد سے انگریزی کا ایم اے کیا۔ اور پھر ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔ پہلے اسلامیہ کالج کراچی اور پھر کچھ مدت پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس میں منتخب ہوئے اور اس وقت سے اب تک مختلف اداری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے یورپ اور شرق اوسط کا طویل سفر کیا۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہے کیونکہ آپ کے اشعار کے سلسلہ میں اس واقعہ کا حوالہ پیش خدمت ہوگا۔ مجھے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

زیدی کا پہلا مجموعۂ شعر "روشنی" کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو غالباً ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں الہ آباد سے شایع ہوا

تھا۔ تازہ اشاعت میں کچھ ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب اس میں ۵۴ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب ۴۵ء اور ۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہیں زیدی کا اپنا خیال ہے کہ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جب محض تجربے کے لیے آدمی بڑی بڑی تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب متوقع باتیں غیر متوقع طور پر ہوتی رہتی ہیں اور جب نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسنا تا رہتا ہے:

ایک سرکش امنگ سینے میں — اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی
اس کے نم عارضوں کے سائے میں — اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی (روشنی ص - ۳۸)

یا یہ کہ:

دلِ ناداں نے جھکتی ہوئی تاریکی کو — اپنے معیار کی عظمت کا اجالا سمجھا
ہائے وہ تشنگی ذہن و تمنا جس نے — جب کبھی صحرا پہ نظر کی اسے دریا سمجھا (روشنی ص - ۵۷)

لیکن اس تشنگی ذہن کے باوجود زیدی نے کبھی کبھی قلب و نظر میں وہ ہم آہنگی محسوس کی ہے کہ اسے اپنے محبوب شہکار کی بات کہتے ہی بنی ہے۔ اور اس کی تجسیم اس نے یوں کی ہے:

تیری نظروں میں روایات کی سلمائیں ہیں — جیسے بچوں کی بتائی ہوئی بازار کی بات
جیسے پربت کی بلندی سے زمیں کے مینار — جیسے اک حلقۂ الحاد میں اوتار کی بات
تیرے لہجے کی کھنک تیری ندامی آنکھیں — جیسے اک نائو پہ دس دس کی اس پار کی بات
جو بکتی صبح کی چہرے پہ خمار یک شب — چاندنی رات میں خیام کے اشعار کی بات
یوں لپکتی ہوئی چہرے پہ حیا کی تنویر — جیسے اقرار زدہ ہونٹوں پہ انکار کی بات
جیسے ٹھہرے ہوئے اشعار کی تخلیق کے وقت — ذہن شاعر میں خیالات کی رفتار کی بات
حسن کو چھو بھی نہ سکے کوئی سمجھ بھی نہ سکے — اتنی نازک ہے ترے روپ ترے پیار کی بات

لکھ سکا کون سا ہومر ترے شہکار کی بات (روشنی ص - ۳۰)

شیلے اور ہومر کو شہکار کی بات نہ لکھ سکنے کے قائل تو اگر بھی زیدی خود اس کی نہایت حسین و جمیل تفسیر پیش کر گیا ہے۔ اور یہی اس کی فنکاری کا کمال ہے۔ حسن کی بنیاد" روشنی" سے لے کر "گریبان" تک صرف خلوص پر رکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے نہایت دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کے جذبات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان جذبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ باور نہ ہو تو اس نظم کو سن لیجیے۔ بات معمولی سی ہے۔ ہر محب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ محبوب التفات فراداں کے بعد کبھی کبھی یہ انداز اختیار کرتا ہے جیسے وہ محب کو جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ قدیم شعرا کے ہاں دن کو "گریہ زاری" اور رات کو "اختر شماری" ہوا کرتا تھا۔ اور قاری اس حادثے کی غم انگیز تفاصیل سنتے سنتے اکتا جاتا تھا لیکن زیدی کے ہاں یہ سانحہ صرف اس قسم کی حیرت اور تعجب پیدا کرتا ہے جو بالکل طبعی ہے۔ ہاں ان میں کبھی کبھی بیتے ہوئے دنوں کے التفات فراداں کی یاد کی کسک ضرور شامل ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساتھی — ورنہ اس راہ پہ ذرات ہیں پامال جہاں
اس کی آنکھوں میں تھی انجان ستاروں کی تلاش — کھیلتے گھومتے گنگارتے بہاروں کی تلاش
جھومتے ڈولتے خاموش اشاروں کی تلاش — آج آنکھوں میں تڑپ تھی نہ اشارا ساتھی
اب تو یہ فکر بھی بیکار ہے یہ غم بھی فضول — کہ اسے مجھ سے بہر طور محبت بھی نہ تھی
کہ اس الجھن کا سبب کوئی رقابت بھی نہ تھی — آج تو اس کی نگاہوں میں حقارت بھی نہ تھی

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساتھی (روشنی ص ۸۱، ۸۳)

مصطفیٰ زیدی

(اردو کا ایک بیباک، نڈر اور طنّاز شاعر)

ڈاکٹر محمد باقر

آپ بھی ناراض ہوں گے اور شاید مصطفیٰ زیدی بھی کیوں کہ ان سطور (جنھیں لکھتے لکھتے میں ایک مضمون بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں) میں آپ کو ایک بھی تو ملکی اور غیر ملکی بڑا نام نظر نہیں آئے گا جس کی شاعری کا مقابلہ میں نے زیدی کے اشعار سے کیا ہو۔ حالانکہ زیدی کو پڑھتے ہوئے میرے صفحۂ ذہن پر معاید اشعار کے ایسے درجنوں بت ابھرے جو زیدی کے اشعار سے ٹکر لینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے قلب و نظر کا تقاضا تھا کہ لذت کے اس احساس فراواں کو محفوظ رکھا جائے جو زیدی کے شعر پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جب زیدی کے اشعار کی لذیذ حکایت بیان ہو تو بات اس کے اشعار تک ہی محدود رہے لہٰذا آپ کو اس قسم کی تنقید و تحسین سے اگر پہلے سابقہ نہیں پڑا تو اب ملاحظہ فرما لیں۔ آپ کی تنقید میرے علم میں اضافہ کرے گی۔

بات یوں ہوئی کہ مری کی ایک سہانی شام کو (غالباً ۱۹۵۹ء میں) مری لٹریری یونین نے میونسپل لائبریری ہال میں حسب معمول ایک مشاعرہ کیا۔ میں بھی سامعین کی حیثیت سے مدعو تھا۔ ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جدید وضع کا خوش پوش نوجوان چشمہ لگائے صدارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مقامی سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہیں اور نام مصطفیٰ زیدی ہے۔ ابھی چند شاعروں نے اپنا کلام سنایا ہی تھا کہ صدر کسی اور مصروفیت کی وجہ سے جلسہ سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ اپنا کلام سنایئے۔ مصطفیٰ زیدی صاحب نے اپنی ایک نظم کا حصہ پڑھ دیا۔ میں حیران ہو کر سن رہا تھا کہ اردو میں اس قسم کی نظم بھی لکھی جا رہی ہے! اسے میری ناواقفیت پر محمول کر لیجیے لیکن یہ حقیقت تھی کہ فارسی سے مستعار لیے گل و بلبل کے قصے سننے سنانے والی زبان میں پہلی دفعہ میں نے ایسے شعر سنے جن کی مثال مجھے پہلے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ لوگوں نے ہل من مزید کے نعرے تو بہت لگائے لیکن صدر یہ جا وہ جا کرسی صدارت خالی چھوڑ کر چل دیئے۔ اور میں ابھی اپنے تاثرات کو مجتمع بھی نہ کر پایا تھا کہ ہجوم (مشاعروں میں اکثر ہجوم ہی ہوتا ہے) نے خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ مشاعرہ ہوتا رہا اور شاعر داد و بیداد کے شکار ہوتے رہے۔ لیکن میں سارا وقت یہ سوچتا رہا کہ کاش مصطفیٰ زیدی صاحب کچھ دیر اور پڑھتے بلکہ صرف وہی پڑھتے رہتے تو یہ محفل کتنی پر لطف ہوتی۔ اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی کہ کبھی موقع ملا تو صرف مصطفیٰ زیدی کو سنیں گے۔ اس طرح کاہش خلش ایک آرزو بن کر دل میں بیٹھ گئی۔

زیدی صاحب کو سننے کی آرزو تو کئی سال تک پوری نہ ہوئی لیکن اب وقتاً فوقتاً ان کے اشعار مختلف جرائد میں نظر آنے تو میں خاص انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا۔ بلکہ بعض چیزوں کو بار بار پڑھتا کہ اس سے تفہیم و تحصیل لطف میں ہر بار کے مطالعہ سے اضافہ ہوتا۔ اور پھر ایک دن مجھے "روشنی" "شہر آذر" اور "موج مری صدف صدف" یعنی زیدی صاحب کی تینوں کتابیں مل گئیں۔ یہ زیدی صاحب کا عطیہ تھا۔ جو ایک خط کے جواب میں مجھے ملا۔ پھر میری درخواست پر آپ نے زیر چھاپ مجموعۂ اشعار "گریبان" بھی مجھے بھجوایا۔ کہاں تو زیدی صاحب سے چند شعر سننے کی آرزو تھی اور کہاں کامل زیدی اب میرے سامنے تھا۔

معلوم ہوا کہ مصطفیٰ زیدی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے خود اسی سال بی اے پاس کیا تھا۔ زیدی صاحب نے الہ آباد سے انگریزی کا ایم اے کیا۔ اور پھر ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔ پہلے اسلامیہ کالج کراچی اور پھر کچھ مدت پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس میں منتخب ہوئے اور اس وقت سے اب تک مختلف اداری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے یورپ اور شرق اوسط کا طویل سفر کیا۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہے کیونکہ آپ کے اشعار کے سلسلہ میں اس واقعہ کا حوالہ پیش خدمت ہوگا۔ مجھے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

زیدی کا پہلا مجموعۂ شعر "روشنی" کا دوسرا اڈیشن میرے سامنے ہے جو غالباً ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۹ء میں الہ آباد سے شایع ہوا

تھا۔ تازہ اشاعت میں کچھ ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب اس میں ۲۵ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہیں۔ زیدی کا اپنا خیال ہے کہ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جب محض تجربے کے لیے آدمی بڑی بڑی تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ سب متوقع باتیں غیر متوقع طور پر ہوتی رہتی ہیں اور جب نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسنا تا رہتا ہے :

ایک سرکش امنگ سینے میں　　　اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی
اس کے نم عارضوں کے سائے میں　　　اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی　　　(روشنی ص - ۳۸)

یا یہ کہ :

دلِ ناداں نے چمکتی ہوئی تاریکی کو　　　اپنے معیار کی عظمت کا اجالا سمجھا
ہائے وہ تشنگیِ ذہن و تمنا جس نے　　　جب بھی صحرا پہ نظر کی اسے دریا سمجھا　　　(روشنی ص - ۵۷)

لیکن اس تشنگیِ ذہن کے باوجود زیدی نے کبھی کبھی قلب و نظر میں وہ ہم آہنگی محسوس کی ہے کہ اسے اپنے محبوب شہکار کی بات کہتے ہی بنی ہے، اور اس کی تجسیم اس نے یوں کی ہے :

تیری نظروں میں روایات کی سلمائیں ہیں　　　جیسے بچوں کی بنائی ہوئی بازار کی بات
جیسے پربت کی بلندی سے زمیں کے مینار　　　جیسے اک حلقۂ الحاد میں اوتار کی بات
تیرے لہجے کی کھنک تیری ندامی آنکھیں　　　جیسے اک ناؤ پہ اس دیس کی اس پار کی بات
چونکتی صبح کی چہرے پہ خمار یک شب　　　چاندنی رات میں خیام کے اشعار کی بات
یوں لپکتی ہوئی چہرے پہ حیا کی تنویر　　　جیسے اقرار زدہ ہونٹوں پہ انکار کی بات
جیسے نکھرے ہوئے اشعار کی تخلیق کے وقت　　　ذہن شاعر میں خیالات کی رفتار کی بات
جس کو چھو بھی نہ سکے کوئی سمجھ بھی نہ سکے　　　اتنی نازک ہے ترے روپ ترے پیار کی بات
لکھ سکا کون سا ہومر ترے شہکار کی بات　　　(روشنی ص - ۳۰)

شیلے اور ہومر کو شہکار کی بات نہ لکھ سکنے کے قابل بتا کر بھی زیدی خود اس کی نہایت حسین و جمیل تفسیر پیش کر گیا ہے۔ اور یہی اس کی فنکاری کا کمال ہے۔ جس کی بنیاد "روشنی" سے لے کر "گریباں" تک صرف خلوص پر رکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے نہایت دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کے جذبات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان جذبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ باور نہ ہو تو اس نظم کو سن لیجیے۔ بات معمولی سی ہے۔ ہر محب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے، کہ محبوب التفات فراد ان کے بعد کبھی کبھی یہ انداز اختیار کرتا ہے جیسے وہ محب کو جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ قدیم شعرا کے ہاں دن کو "گریہ زاری" اور رات کو "اختر شماری" ہوا کرتا تھا۔ اور قاری اس حادثے کی غم انگیز تفاصیل سنتے سنتے اکتا جاتا تھا لیکن زیدی کے ہاں یہ سانحہ صرف اس قسم کی حیرت اور تعجب پیدا کرتا ہے جو بالکل طبعی ہے۔ ہاں ان میں کبھی کبھی بیتے ہوئے دنوں کے التفات فراواں کی یاد کی کسک ضرور شامل ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی　　　ورنہ اس راہ پہ ذرات ہیں پامال جہاں
اس کی آنکھوں میں تھی انجان ستاروں کی تلاش　　　کھیلتے گھومتے گنگناتے بہاروں کی تلاش
جھومتے ڈولتے خاموش اشاروں کی تلاش　　　آج آنکھوں میں تڑپ تھی نہ اشارہ ساقی
اب تو یہ فکر بھی بیکار ہے یہ غم بھی فضول　　　کہ اسے مجھ سے بہر طور محبت بھی نہ تھی
کہ اس الجھن کا سبب کوئی رقابت بھی نہ تھی　　　آج تو اس کی نگاہوں میں حقارت بھی نہ تھی
آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی　　　(روشنی ص ۸۱، ۸۳)

لیکن یہ انداز تسکین توصرف اپنا دل بہلانے کے لیے تھا۔ اور اس حیرت اور تعجب پر قابو پانے کے لیے جو اس سانحہ نے پیدا کیا ہے ورنہ رقیب نے جو دراندازی کی تھی زیدی نہ صرف اس سے غافل نہیں بلکہ اس کی پوری تفصیل رقیب کی زبان سے کہلواتا ہے ۔

سنا تم نے زیدی کا کردار کیا ہے　　ثنا خوانِ ابلیس و بدخواہ یزداں
وہ خانہ بدوشِ زنخانہ بدوشاں　　وہ آوارہ گرد سے زآوارہ گرداں
وہ مصروفِ طاعت گذاریِ نغمہ　　وہ محوِ سجودِ نگارانِ رقصاں
وہ جس کا تکلّم وہ جس کا ترنّم　　حدی خوانیِ کاروانِ حسیناں
سنگتا ہوا خود فریبی کا بادل　　گرجتا ہوا جہل و وحشت کا طوفاں
نمازوں میں دیکھا نہ روزوں میں دیکھا　　نہ صبحوں کو خنداں نہ راتوں کو گریاں
کبھی انقلاب اور بغاوت کا شعلہ　　کبھی دود گرمِ دلِ نازنیناں
نہ اندازِ حکمت نہ آثارِ دانش　　فقط عکس مہ پاریِ مہ جبیناں
نہ لہجہ ہی ساکن نہ نغمہ ہی مدغم　　فقط برق و آتش فقط ابرو باراں
اسے کیا ثواب و طہارت سے مطلب　　وہ شاہِ صبوحی شہنشاہِ رنداں
یہی ہے تمہارے پجاری کا جتھا؟　　یہی ہے وہ سرکردۂ خوشہ چیناں
یہی ہے وہ شہ پارۂ آلِ سید؟　　یہی ہے وہ تفسیرِ خونِ شہیداں

یہی ہے وہ پروردۂ ابر و باراں؟

زیدی کے دوسرے مجموعے "شہر آذر" میں ۴۹ نظمیں اور ۲۰ غزلیں ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا۔ گو زیدی کے بقول اس مجموعے میں جتنی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، میری نہیں ہیں بلکہ تیغ الہ آبادی کی ہیں۔ تیغ الہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے لیکن آخر انھیں علیحدہ ہونا ہی پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا تھا لیکن آخر تخلص کے بغیر بھی گذر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی سے ابھی تک میں ہی مانوس نہیں ہوا ہوں۔ آپ کو تو شاید اور بھی مدت درکار ہو (شہر آذر ص ۱۹)۔ اس مجموعے کی نظموں پر شاعر نے خود یہ تبصرہ کیا ہے کہ ان نظموں میں دیکھنے سے زیادہ سوچنے اور چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔" اور یہ تبصرہ نہایت درست ہے سوچ اور حس کرنے کا کامیاب تجربہ "تہذیب" کی مختصر سی نظم میں کیا گیا ہے۔

تہذیب

شہر میں غل تھا کہ بنگال کا ساحر آیا
مصر و یونان کے اہرام کا سیّاحِ عظیم
چین و جاپان کے افکار کا ماہر آیا
ایک ٹیلے پہ مروّت کا نمونہ دیکھا
میں نے بھی دل کے تقاضوں سے پریشاں ہو کر
آخر اس ساحرِ طنّاز کا چہرہ دیکھا
کتنا مغرور تھا اس شخص کا مضبوط بدن
کتنا چالاک تبسم تھا جواں ہونٹوں پر
کیسے رہ رہ کے لپک جاتی تھی آنکھوں میں کرن

کتنا مرعوب تھا ہر فرد مری ملت کا
ڈرتے ڈرتے سوچیں تو یہ راز کھلا
وہ فقط موم کا ایک خوف زدہ پتلا تھا

نظم کے آخری تین مصرعوں میں وہ سب کچھ سما گیا ہے جو فکر شاعر نے تحلیل کیا ہے اور جسے پڑھنے کے بعد آپ اس تمثیل کی تمام تفاصیل کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور شاعر کے ہمنوا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سوچ تو ہم بھی یہی رہے تھے لیکن کہنے کی جرأت صرف تمہیں نصیب ہوئی ہے۔ مہذب آدمی تہذیب کی باتیں اسی انداز سے کہا کرتے ہیں جیسے زیدی نے اس نظم میں کی ہیں لیکن حوادث فکر کبھی کبھی شاعر کو اس ڈگر پر بھی لے آتی ہے جہاں وہ برملا کہنا شروع کر دیتا ہے :

آج کل رنگ و صباحت کی بہت قیمت ہے　　　آج کل جشن و مسرت کی بہت قیمت ہے
مفلسی دھات کے سکوں کو جنم دیتی ہے　　　زندگی موت کے حیکلوں کو جنم دیتی ہے
روحیں تہذیب کے شعلوں سے جھلس جاتی ہیں　　　کونپلیں رب کے پہیوں میں کچل جاتی ہیں
قمقمے جلتے ہوئے گوشت کی بو دیتے ہیں　　　اسپتالوں کو جراثیم نمو دیتے ہیں
خون بھی ملتا ہے ہوٹل میں رگ تاک کے ساتھ　　　عمداً زہر دیا جاتا ہے خوراک کے ساتھ
اسی منڈی میں جہاں صاف کفن بکتا ہے　　　جسم بکتے ہیں ادب بکتا ہے فن بکتا ہے
عشق بیبیوں کی ترازو میں تلا کرتا ہے　　　حسن تیزاب کی بوتل سے ڈھلا کرتا ہے　　　(شہر آذر ص ۴۲)

زیدی کی یہ نظم ایک طویل آس انگیز شکوائیہ ہے لیکن انہی چند اشعار کو دیکھیے کہ ان میں کتنی تفاصیل آگئی ہیں اور ان تفاصیل کا کینوس کس قدر وسیع ہے۔ پھر اس کینوس پر آپ کو ہر طرف طنز و تنقید کے تیر و نشتر بھی چلتے نظر آرہے ہیں۔ لیکن میں نے اس نظم کو آس انگیز شکوائیہ کہا ہے۔ حزنیہ نہیں کہا کیونکہ خون انگیزی کی بجائے بات اس امید افزا ترغیب پر ختم ہوتی ہے :

آؤ ہم لوگ بھی ایک عزم سے اک ہمت سے　　　اپنے بیتے ہوئے حالات کو ٹھکرا کے چلیں
اپنی فرسودہ روایات کو ٹھکرا کے چلیں　　　وقت کی ریت پہ وہ نقش قدم چھوڑ چلیں
جن کی آتی ہوئی نسلوں کو ضرورت ہوگی　　　(شہر آذر ص ۴۷)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے حقیقت پسندی اور برملا گوئی زیدی کا خاصہ ہے۔ امن پسندی اور اس کی ترغیب دلانے والے وعظ تو آپ نے کئی سنے ہوں گے، لیکن زیدی نے امن شکستگی کی جو بے مثال بھیانک تصویر کھینچی ہے اس کو سننے کے بعد آپ کے رونگٹے اگر کھڑے نہیں ہوتے تو جنگ سے نفرت ضرور پیدا ہوتی ہے۔

اگر کہیں پھر یہ آگ لپکی
تو اس کی زد سے ہماری تہذیب کی بہاریں نہ بچ سکیں گی
تمہیں تو یہ بات یاد ہوگی،
کہ دوسری جنگ ہی میں پانی کے بدلے کیچڑ پیا گیا ہے
غذا کے بدلے سپاہیوں کو نجاستیں پھانکنی پڑی ہیں
ہزاروں مائیں جوان بچوں کے واسطے خون رو چکی ہیں
شکستگی بے بسی میں چمڑے کی پیٹیاں چاٹنی پڑی ہیں
ضعیف باپوں کے تھرتھراتے ہوئے قدم سرد پڑ چکے ہیں

سہاگنوں کی نگاہیں دولہا کی واپسی کو ترس چکی ہیں
سسکتی بہنوں نے بھائیوں کو کفن پنہا کے جدا کیا ہے۔ (شہر آذر ص ۹۵)

یہ پچھلی جنگ کی بات تھی۔ آئندہ کیا ہوگا۔ وہ بھی سن لیں:

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی
تو آدمیت نکیلے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اٹھے گی
تمہارے گھر کے برآمدے میں جھلستی اینٹوں کے ڈھیر ہونگے
تمہارے شوہر کا جسم بیسیوں گولیوں سے فگار ہوگا
تمہارے چہرے پہ دانت کے نیل ہوں گے لب پہ خراش ہوگی
تمہارے چولھے میں لکڑیوں کے عوض تمہارا بدن جلے گا
تمہاری اپنی زمیں جلے گی تمہارا اپنا وطن جلے گا (شہر آذر ص ۹۹)

اور پھر

یہ بات تم تک نہیں رہے گی
یہ زہر دھرتی کی ایک اک نس میں گھل کے ہر چیز کو کاٹ دے گا
یہ زہر رگ رگ کو چاٹ لے گا
زمین گیہوں نہیں جنے گی
کہ اس کے ہونٹوں پر آدمی کے لہو سے پپڑی جمی ہوئی ہے
ملوں میں کپڑا نہیں بنے گا
کہ کلیوں کو گھمانے والوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں
ادب کا نام و نشاں نہ ہوگا
کہ درسگاہوں میں گدھ مدرس کی لاش سے خون پی رہے ہیں
کہیں تقدس نہیں رہے گا
کہ شاہراہوں پہ فوج کے روسیاہ کتے زنا کریں گے (شہر آذر ص ۹۹)

۱۹۵۷ء کا ذکر ہے میں حکومت پاکستان کی طرف سے دسمبر میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی نمائش کے لیے ایران اور ترکیہ سے نوادر مستعار لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میونک (جرمن) میں کانگرۂ مستشرقین میں شرکت کروں۔ اگست ۵۷ کی ایک شام کو میں اور جمیل رضوی صاحب (جواب مسٹر جسٹس جمیل حسین رضوی ہیں) میجر جنرل رضا صاحب سفیر کبیر پاکستان در ایران کے مکان پر تہران میں کھانے پر مدعو تھے کہ خبر ملی کہ ایک پاکستانی مجتبیٰ زیدی خراساں میں مشہد کے قریب موٹر کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ یہ انگلستان سے اپنی کار میں وطن واپس آ رہے تھے اور اس کار کی ٹکر ایک بس سے ہو گئی۔ اس خبر سے ہمیں اور ہمارے میزبان کو بہت رنج ہوا اور تہران کے پاکستانی حلقوں میں کئی دن تک اس پر غم کا اظہار ہوتا رہا لیکن مصطفیٰ زیدی نے جب مجھے اپنے اشعار کا مجموعہ "موج مری صدف صدف" بھیجا جس کا انتساب انھوں نے اسی حادثے میں ہلاک ہونے والے بڑے بھائی کے نام سے کیا ہے تو اسے پڑھ کر پھر ایک دفعہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ نامکمل نوحہ خلوص و صداقت کا ایک نادر نمونہ ہے:

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے بھائی آواز اگر دے تو سنو گے کہ نہیں

دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے　　کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے　　تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا
ہم تو جس وقت بھی جس دن بھی پریشان ہوئے　　تم نے آکر ہمیں محفوظ کیا راہ دکھائی
اور جب تم پہ برا وقت پڑا تب ہم لوگ　　جانے کس گھر میں کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۲)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے　　ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس زیست میں بس ایک نگیں پایا تھا　　کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا

رقت انگیزی صرف نالہ و شیون اور آہ و بکا سے سرانجام نہیں پاتی۔ اور انفرادی غم کو عالمگیر وسعت دینا ہر غمزدہ کے بس کی بات نہیں لیکن جب آپ ان سطور کو پڑھتے ہیں:

دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے　　کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے　　تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا

تو بھائی کے تلملاتے ہوئے دل کی تمام کیفیات آپ کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

یہ ایک تعارفی جملہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ زیدی کا تیسرا مجموعۂ کلام "موج مری صدف صدف" پہلی دفعہ فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیامِ انگلستان یا سفرِ یورپ کے زمانے کی ہیں۔ یہ چند خاکے جن سے شاعر کے بقول ذہن کی ایک خاص فضا مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ فضا اس معصوم رندکی ہے جو ایک چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد کبھی اس پر تنقید کرتا ہے اور کبھی اس سے محظوظ ہوتا ہے لیکن اس میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا۔ یہ سب نظمیں وہ تاثرات ہیں جن کو ایک مخصوص جذبے کے ساتھ جذباتیت سے اوپر اٹھ کر نظم کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے کسی یورپی شہر کے ہماہمی کے مراکز کو دیکھا ہے اور انھیں دیکھتے رہنے کے بعد ایک خاص قسم کے ذہنی دنیا میں بسایا ہے کچھ وہی لوگ "چیرنگ کراس" کے ایک منظر یہ بند اور ایک جذباتی بند کے تاثرات کو محسوس کرسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تاثرات ان کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں جن کا اثر تو غالباً ہر چشمِ ناظر قبول کرتی ہے۔ لیکن صفحۂ قرطاس پر تاثر کی حقیقی شدت کے ساتھ منتقل نہیں کرسکتی۔ یہ کام صرف شاعر ادیب اور آرٹسٹ ہی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور زیدی اس نظم میں بیک وقت ان تمام فرائض سے عہدہ برآ ہوا ہے:

کوئی تم سے پوچھے ــ
ستاروں کی رونق، چراغوں کی قربت، شبستاں کے اسرار
کافی نہیں تھے
جو تم نے کسی طاقِ دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو
بھی چرالی؟

کوئی ہم کو دیکھے ــ
سر رہگذر ایسے بیٹھے ہیں جیسے
کسی نے ذرا بھی جو پوچھا تو اس سے بگڑ کر کہیں گے
یہ دیر و حرم تو نہیں، کعبہ و آستاں تو نہیں ہے
خدا کی زمیں ہے، رہ عام ہے کوچۂ یار نامہرباں تو
نہیں ہے ــــ

یورپ کی پاپیادہ سیاحت (دراصل آپ موٹر میں سفر کر رہے تھے) میں زیدی نے بعض ملکوں اور شہروں کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جیسا کہ ہر سیاح کرتا ہے۔ لیکن اس مشاہدہ سے زیدی کے جذبات میں جو ہلچل پیدا ہوئی ہے وہ فلسفہ، نغمہ اور آرزو کا ایک سیل رواں بن کر بہ نکلی ہے۔ جرمنی کی بات سنیے:

کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنت ہے یہاں — کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے
خواب اس وقت کا جو وقت نہیں آ سکتا — خواب اس وقت کا جس وقت کو آنا ہوگا
گیت جس میں لب و رخسار کے افسانے ہیں — گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانا ہوگا
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب — جس کو بت وقت کے آہنگ پہ گاتا ہوگا

آگ کے دشت پڑے خون کے صحرا آئے — اب بھی لیکن وہی رفتار جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث — ہائیڈل برگ وہ حکمت کی دکاں ہے کہ جو تھی

فرض کرتے ہیں تری مرگ وہی لوگ جنھیں — خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور
تیرے ماتھے پہ نئے عہد نئے دن کی امنگ — تیری آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب کا نور
وگنر کا یہ سبک ساز یہ فولاد کے گیت — تیرے سینے کی امنگیں تیرے بازو کا غرور

ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ہیں — اک ذرا آگ ہمیں بھی ملے اے شعلۂ طور

جرمنی کا مقابلہ روضۂ شاہ شہیداں سے کیجیے، جس کے حضور میں شاعر کامل خشوع و خضوع کے ساتھ پہنچا ہے اور یہ دیکھ کر حیران ہے کہ ان تبرکوں کے مجاور اور یہاں کے منبر کے خطیب بیل ایرا در کر سلرکاروں میں آنے والے زائرین سے فلس و دینار کا بھیک مانگنے کے سوا کارزار حیات میں اور کوئی مہم سر نہ کر سکے۔ اس کی حیرت ایک نوحے کی شکل اختیار کر لیتی ہے:

غیر تو رمز غم کون و مکاں تک پہنچے — کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے
تیرے دیوانوں کو اے شاہد دریائے فرات — اپنے مانگی ذہن میں کیا ملتا ہے (موج مری صدف صدف ص ۹۰)

یوروپ کی سیاحت کے بیان کے علاوہ اس مجموعے میں جو رومانی اور علامتی نظمیں شامل ہیں ان میں ایک وہ تصویر جلتی ہوئی دکھائی گئی ہے جسے چاہنے والے نے ایک عرصے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس تصویر کو دیا سلائی دکھانے سے لے کر راکھ ہوتے ہوئے دیکھ کر جھنجھلائے ہوئے دل میں جو تاثرات پیدا ہوئے ہیں ان کو بڑی چابکدستی سے رومانی انداز میں نظم کیا گیا ہے:

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی — جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی

اس جھنجھلاہٹ کی جو حسین توجیہہ کی گئی ہے وہ بھی سن لیجیے:

اور اب یاد کے اس آخری پیکر کا طلسم — قصۂ رفتہ بنا زیست کی باتوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا — دھوپ کا ڈھیر ہوا دھوپ کی باتوں سے ہوا
اس کا پیار اس کا بدن اس کا مہکتا ہوا رنگ — آگ کی نذر ہوا اور انہی ہاتھوں سے ہوا (موج مری صدف صدف ص ۴۷)

اسی مجموعے میں دو پر تاثیر علامتی نظمیں "گواہی" اور "ایک سہرا" کے عنوانات سے شامل ہیں جن کا مطالعہ مفید ہوگا۔

زیدی کا چوتھا مجموعۂ کلام "گریباں" کے نام سے زیرِ چاپ ہے جس میں آپ کو تازہ ترین زیدی نظر آئے گا۔ اس کا خیال ہے "کہ ادبِ عالیہ اس طرح تو جنم لیتا نہیں کہ خواہ مخواہ رزمیہ لکھا جائے یا عشق و عاشقی کے ذکر سے ارادی گریز کے راستے اختیار کیے جائیں۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موضوع نکالنا اور تلاشِ عظیم کے بعد علامتیں وضع کرنا کوئی ایسی صحیح الدماغی کی بات نہیں" اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں اس نے وارداتِ قلب کو سیدھے سادے رومانی انداز میں بیان کر دیا ہے۔

تو مری شمعِ دل و دیدہ

وہ کوئی رقص کا انداز ہو یا گیت کا بول — میرے دل میں تری آواز ابھر آتی ہے
تیرے ہی بال بکھر جاتے ہیں دیواروں پر — تیری ہی شکل کتابوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کسی عیار کا پُر ہول طلسم — تو ہے یا شہرِ طلسمات کی ننھی سی پری
ہر طرف سیل رواں، بس کا دھواں ریل کا شور — ہر طرف تیرا تنک گام تری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کے لیے چشم براہ — جیسے تو آئے گی بس کوئی گھڑی جاتی ہے
تیری پرچھائیں ہے یا تو ہے مرے کمرے میں — بلب کی تیز چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹیک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے — دن گزرتا ہے ترا سایۂ ابرو لے کر
فلسفے تند حقایق کی شعاعیں ڈالیں — شام آتی ہے تری آنکھ کا جادو لے کر

لنگر انداز ہوں ساحل پہ شپنیوں کے جہاز — رات ڈھل جاتی ہے مہکے ہوئے گیسو لے کر
میں اسی گیس کی دنیا میں تعفن کے قریب — شعر کہتا ہوں ترے جسم کی خوشبو لے کر

اور اس عشق و عاشقی کی بات کے ساتھ ساتھ شاعر خودنگری اور فلسفہ سنجی میں بھی مصروف ہے۔

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے — میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا

میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا — نہ خلاؤں کا طلبگار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے

اپنا سایہ بھی گریزاں ترا داماں بھی خفا — رات کا روپ بھی بیزار دیراغاں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا شامِ غریباں بھی خفا — وزد ایماں بھی خفا اور نگہباں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے

ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے — تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے — جاگ اے روح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے (گریباں کا خطی نسخہ)

آخر میں ایک حسین منظر یہ ملاحظہ ہو جس میں رفتار و احساسات کی تمام تفاصیل خوشگوار رومانی انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

ائیر ہوسٹس

شہر کی روشنیاں کر بک آوارہ ہیں
نہ وہ ہوٹل کے دریچے نہ وہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطراف نہ رفتار کا گم نام سکوں
ہر گھڑی ساعت پرداز بنی جاتی ہے
سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہو گی زمیں
کہیں پیڑوں کے مرکز کہیں سڑکوں کا غبار
تار کے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار
مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے
تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
کہ مشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بظاہر غافل
تیری صورت تری غماز بنی جاتی ہے
ہم سفر انجنیں گرم کیے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

زیدی کا قلم ابھی جوان ہے۔ وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے لیکن اس کے اپنے بقول "گریبان" میں اس کی محبت کے پیچھے جو عورت ہے وہ نہ تو "شہر آذر" کی آسیا گردان بتول ہے اور نہ "موج مری صدف صدف" کی حریم تنہا نشین"۔ اس موقع پر زیدی کی شاعری کے متعلق قطعی حکم لگانا درست نہ ہوگا صرف ایک امید لگائی جا سکتی ہے کہ خلوص و سادہ نگاری مناظر کے ساتھ اور بڑھے گی اور چمکتی ہوئی شاعری کی اس لہر کو مزید تابانی بخشے گی۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ یہ مضمون تحسین و تنقید جمال کے لیے مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس لذت فراواں کو مجتمع کرنے کے لیے جو زیدی کے کلام کے مطالعے سے حاصل ہوئی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔

باغ و بہار کا ماخذ — نوطرزِ مرصّع

سید ابوالخیر کشفی

نوطرز مرصع باغ و بہار کا ماخذ ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ باغ و بہار کا سرورق اس حقیقت کا ثبوت ہے:

" باغ و بہار — تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے۔ فارسی قصہ چہار درویش سے "

ہندوستان میں باغ و بہار کے جو ایڈیشن شایع ہوئے ان میں اس عبارت کی غیر موجودگی نے بڑا ستم ڈھایا اور غلط فہمیوں کو میر امن کے مقدمے نے زیادہ مضبوط بنایا۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعے سے بجا طور پر اسی نتیجے پر پہنچے:

" باغ و بہار جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھ دیئے ہیں جو نوطرز مرصع میں ہیں "

مولوی صاحب مرحوم نے ان دونوں کتابوں کے مشترک مقامات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ میر امن نے نوطرز مرصع کو اپنے سامنے رکھا نہ کہ اصل فارسی کو۔ مولوی صاحب کا مقدمہ باغ و بہار کے مطالعہ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس بحث کو دہرانا نہیں چاہتا۔

میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا کہ اصل فارسی کتاب کس کی تصنیف ہے۔ میرا تعلق تو باغ و بہار اور نوطرز مرصع کے باہمی تعلق سے ہے اور مجھے بیچارے تحسین سے ممتاز حسین صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر خاصی ہمدردی ہوگئی ہے کہ " میر امن اور نوطرز مرصع کو اپنا ماخذ ٹھہرائیں۔ اور یہ معلوم اللہ اس کا ایک جملہ تو درست ہے ہی نہیں "

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ نوطرز مرصع شمالی ہند کی پہلی اہم اور مکمل اردو تصنیف ہے۔ نوطرز مرصع میں وہ اسلوب کلبلاتا ہوا نظر آتا ہے جس نے میر امن کی باغ و بہار کے صفحات پر آنکھیں کھولیں اور صفحہ بہ صفحہ اُن کے ذہن اور زبان کی فضا میں پرورش پاتا ہوا بالغ ہوگیا۔ اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے جذبہ کے تحت۔

دوستی میں ایک بات ممتاز صاحب سے بھی کہنا چاہوں کہ حضرت! تحسین جیسے تھے سو تھے مگر ایسا بھی کیا کہ وہ مجھ سے اور آپ سے بھی بری نثر لکھتے۔

حاشیہ میں ممتاز صاحب نے تحسین کا ایک جملہ نقل کیا ہے سوچتا ہوں کہ میں بھی ممتاز صاحب کے مقدمۂ باغ و بہار کا ایک آدھ جملہ یہ کہتے ہوئے پیش کردوں کہ " ملاحظہ ہو "۔

"........ اس لیے صوفیانہ شاعری اور آرٹ جس میں داستان گوئی بھی شامل ہے، سمبالک ہوتا ہے، یعنی ایک ہی معنی میں تخصیص و تعمیم کے دونوں پہلو رکھتا ہے نہ ایلیگاریکل جہاں تعمیم خصوص سے باہر ہوتی ہے ...."

اب ٹکڑے ملاحظہ ہوں ...... " یہ قصہ محمد شاہی عہد میں موضوع یا مخترع نہیں ہوا " " نیرنگی روزگار " " کہ صنایع و بدائع پرور دگار " کہاں تک نمونے پیش کروں۔ ممتاز صاحب " علمیت " اور " علمی موضوع " کی بنا پر ایسی اردو لکھنے پر مجبور رہتے اور تحسین بھی ایسے ہی دوسرے حالات کے اسیر تھے۔

اس طویل جملۂ معترضہ کے لیے معافی چاہتا ہوں آپ سے بھی اور ممتاز صاحب سے بھی۔

فارسی قصہ کے بارے میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میرے خیال میں قصہ چہار درویش نہ تو امیر خسرو کی تصنیف ہے اور نہ عہد محمد شاہی کی تخلیق۔

چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے اس موضوع پر مرحوم پروفیسر شیرانی بڑی تفصیل سے داد تحقیق دے چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی درست نہیں۔ چہار درویش حکیم محمد علی (مخاطب بہ معصوم علی خاں) کی تصنیف بھی نہیں ہے۔ خسرو کی تصنیف تو اس لیے نہیں ہے کہ اس میں دوربین کا تذکرہ ہے جو خسرو کے عہد میں ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ علاوہ بریں فارسی قصہ میں نظیری و عرفی کے اشعار بھی ہیں اور یہ شاعر خسرو کے بعد ہوئے۔ فارسی قصہ میں جن منصب داروں کے عہدے اور خطاب موجود ہیں وہ خطاب بھی عہد مغلیہ میں وضع ہوئے اور حکیم محمد علی کا دعویٰ یوں درست نہیں ہے کہ ان کے مخطوطے سے پہلے کا ایک نسخہ ۱۷۲۵ء کا لکھا ہوا دستیاب ہوگیا ہے۔ حکیم محمد علی کا نسخہ ۱۷۳۲ء میں مکمل ہوا فارسی قصہ چہار درویش عہد محمد شاہی سے پہلے لکھا گیا۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

ان چند باتوں کے بعد اب میں نو طرز مرصع کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے اس کا سال تصنیف ۱۷۹۸ء بتایا اور بعد والے مدتوں اسی سنہ کو دہراتے رہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نو طرز مرصع اس سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے "نو طرز مرصع" کے دیباچے میں ڈاکٹر گیان چند کے حوالے سے لکھا ہے کہ تحسین کی نو طرز مرصع کا ذکر سب سے پہلے مہر چند کھتری مہر کے "قصہ ملک محمد و گیتی افروز" میں ملتا ہے۔ یہ قصہ ۸۹-۱۷۸۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نو طرز مرصع ۱۷۹۸ء سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ "انھیں دنوں میں عطا حسین خاں نے چہار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی میں تضمین کر کے "نو طرز مرصع" نام رکھا۔ مولف نو طرز مرصع ہے مگر جو ریختہ زبان میں الفاظ دقیق اور عبارت رنگین موزوں کیا ہے۔ اس سبب سے مطبوع انگریزوں کے نہیں ہوا۔"

یہ اقتباس اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے نو طرز مرصع کے سبب تالیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نو طرز مرصع کے دیباچہ میں تحسین نے اپنے بارے میں اور اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جنرل اسمتھ اس قصے کے محرک اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی پسندیدگی نے کتاب کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد دی۔ تحسین کی زندگی کا بڑا حصہ انگریزوں کے ساتھ اور ان کی نوکری میں گزرا۔ اس فسانہ کی ابتدا الہ آباد سے کلکتہ تک "جرنیل" اسمتھ کی معیت میں کشتی کے سفر میں ہوئی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر اس سفر کا سنہ اور تاریخ معلوم ہو جائے تو اس فسانہ کی ابتدا کی تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" جلد ۴ (پنجاب یونیورسٹی) میں عماد السعادت کے حوالے سے اس سفر کی تاریخ دی گئی ہے۔

"شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد تحسین نے ۱۷۷۵ء میں جنرل رچرڈ اسمتھ کی معیت میں الہ آباد سے کلکتہ تک دریائے گنگا کا سفر کیا...
......۱۷۷۲ء میں وہ فیض آباد کے ریذیڈنٹ کپتان ہارپر کی ملازمت میں تھے (عماد السعادت)

ڈاکٹر سید سجاد مرحوم نے جنرل رچرڈ اسمتھ کے حالات کے متعلق بڑی تحقیقی کاوش کا ثبوت دیا ہے ان کی تحقیقات کے مطابق وہ نومبر ۱۷۶۶ء میں جنرل بنایا گیا تھا اور ۱۷۷۰ء سے پہلے انگلستان واپس چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر سجاد مرحوم کی تحقیقات کے مطابق یہ کتاب ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ مکمل ہو چکی تھی۔ دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴ کے مطابق اس کا سال تکمیل ۱۷۸۰ء (۱۱۹۵ھ) کے لگ بھگ ہے (قاموس الاعلام میں تحسین کا سال وفات ۱۲۱۲ھ دیا گیا ہے)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ڈاکٹر گلکرسٹ کے مقدمہ اور باغ و بہار کے سرورق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نو طرز مرصع اس کا ماخذ اور بنیاد ہے۔ Lewis F. Smith نے ۱۸۴۲ء میں باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

" The Bagho-Bahar compiled by Meer Ummar of Dhailwi from

Nautarz Morassa which was translated by Ata Hussain Khan

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ میر امن اور نوطرزِ مرصع کو اپنا ماخذ بنائیں۔ ایسے معاذ اللہ"۔ فنی طور پر کوئی ناقص یا ناتمام نقش ایک بڑے فن کار کے لیے چیلنج ہوتا ہے۔ وہ اس زمین کو آسمان بنا دیتا ہے۔ نوطرزِ مرصع غالباً انگریزوں کو زبانِ اردو سکھانے کے لیے لکھی گئی یہ اس مقصد کو پورا نہ کرتی تھی۔ میر امن نے اسے نئے قالب میں ڈھالا اور اس طرح کہ باغ و بہار جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ یہ بات میں سادگی و سلاست کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ سادہ اسلوب کا آغاز میر امن سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سید سبط حسن نے "ہم قلم" ستمبر یا اکتوبر ۶۲ء میں جدید اردو نثر کی پہلی کتاب پر تفصیل سے لکھا ہے۔

میں اس ضمن میں یہ عرض کروں گا کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش خود نوطرزِ مرصع میں موجود ہیں (اس کی تفصیل آگے آئے گی) میر امن کا کمال توازن کا آہنگ اور اسلوب میں نثر کے نئے امکانات کو اجاگر کرنا ہے۔ نثر کی شہزادی مدتوں سے تصنع کے بلوری صندوق میں بند تھی اور زندگی سے محروم ـــــ میر امن نے اس صندوق کے ڈھکنے کو اٹھایا نثر کی شہزادی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور وہ جاگ اٹھی۔ مدتوں کا طلسم بکھر گیا۔ یہ ہے باغ و بہار کی اہمیت۔

ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش نوطرزِ مرصع میں موجود ہیں۔ اور ان نقوش کی دھیمی روشنی نے میر امن کو ایک جہانِ نو کی تخلیق میں یقیناً مدد دی تھی۔ نورالحسن ہاشمی صاحب کی یہ رائے مجموعی طور پر درست نہیں ہے کہ "نوطرزِ مرصع میں یہی سطحی اور مصنوعی مرصع کاری ہر جگہ ملتی ہے۔ یہ سطحی اور مصنوعی مرصع کاری نوطرزِ مرصع کے ابتدائی صفحات میں جنسِ ارزاں کی طرح موجود ہے۔ مگر اس کتاب کے اختتامی حصوں کا انداز بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی حصے میں تحسین اور میر امن کے اسالیب کے درمیان دو دنیاؤں کا فرق ہے۔ ملاحظہ ہو:

"نوطرزِ مرصع"

اتفاقاً اس عرصہ میں نظرِ مبارک بادشاہ کی طرف ایک آئینہ کے مقابل مکان عشرت گاہ کے نصب کیا تھا جا پڑی۔ جو سن شریف اُس کا قریب پچاس سال کے پہنچا تھا وقت مشاہدہ جمال مہر تمثال اور معائنہ صورت حال اپنے کے دیکھتا کیا ہے کہ ایک دوسرے سفید درمیان داڑھی سیاہ کے مانند سہیل ستارے کے بیچ آخر شبِ تاریک کے کہ واقعی اس نشان کے تئیں ختم عمر کا کہتے ہیں۔ نمودار ہوا۔

"باغ و بہار"

ایک شیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے۔ شاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے

اس اقتباس سے تحسین کے روایتی اسلوب اور میر امن کی نثرِ تازہ کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی افتادِ طبع بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میر امن "قصہ زمین برسرِ زمین" کے قائل تھے۔ سفید بال ان کے یہاں تارِ مقیش کی طرح چمک رہا ہے اور تحسین کے ہاں سہیل ستارے کی طرح ـــــ پھر اپنے اختصار کے باوجود میر امن نے "نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھتے" کے ٹکڑے سے آزاد بخت کے کردار کے ایک پہلو کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

تحسین کی اس سطحی اور مصنوعی مرصع کاری کے مزید نمونے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اسلوب کے اس پہلو کو یارانِ طریقت مدتوں سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

"الفاظ دقیق . . . . مہر چند کفر کی مہر

"اس کی زبان فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی بہتات کی وجہ سے قابلِ اعتراض تھی۔ گل کرسٹ سے لیکر ممتاز حسین صاحب کے

"ارے معاذ اللہ" تک کہہ لیجیے۔ اب نوطرز مرصع میں اردو نثر کے نئے دور کی اولین کرنوں کا جلوہ دیکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ اس میں کوئی جملہ درست ہے کہ نہیں۔"

(۱) "یہ سن کر زیر لب خندہ کیا اور کہا کہ اے دائی شاید تجھ کو نیند آتی ہے۔ اس نے از راہ عقل دریافت کرکے کہا کہ واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہنا چاہیے۔ دعا و ثنا کہہ کر اٹھی اور محل خواب گاہ میں جا کر سو رہی۔ ملکہ نے بعد ایک لمحہ کے پیالہ مانگا۔ میں نے پر کرکے دیا۔ جس وقت شراب پی کر پیالہ میرے تئیں دینے لگی میں نے بوسہ اور دست مبارک کے دیا اور پیروں پر پڑا۔ نازنین صنم نے ہاتھ جھاڑ کر کہا کہ اے جاہل! بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے"

(۲) "ایک مدت پیچھے سوداگروں نے اندازہ دریا ارادہ وطن کا کیا جس وقت کہ مجھ کو کہا کہ تو بھی تیاری اپنی کر۔ میں نے واسطے رفع تہمت کے کہا مگر کس منہ سے یہ ارادہ کروں۔ بقول آنکہ ادھی اوپچھی کھائے۔ تب انھوں نے کہا کہ اس کفرستان میں کب تک رہے گا؟ میں نے کہا خوب اگر تم ایسا ہی کہتے ہو تو ایک میں، اور ایک لونڈی، اور ایک کتا اور ایک صندوقچہ ...... یہ کچھ بساط ہے۔ میرے لائق جہاز میں جگہ مقرر کیجیو۔ میں شہر میں جا کے اور اسباب لا کے تمہارے ساتھ ہوتا ہوں۔"

(۳) "کہا کہ میں دختر وکیل مطلق بادشاہ کی ہوں۔ شب زفاف میں شوہر میرے کو درد قولنج نے لیا کہ جاں بحق ہوا۔ تو اپنی حقیقت کہہ میں نے سرگزشت اپنی بیان کی اور اس ماہ روشن لب کے ساتھ ہم بستر ہوا اور خوش رہنے لگا۔ الغرض ہر ماہ میں ایک مردہ آتا اور میں آزوقہ پر متصرف ہوتا تھا۔ تا آنکہ وہ سرو جوئبار خوبی کی حاملہ ہوئی اور ایک طفل تولد ہوا۔ کئی ماہ اور گزرے۔ طرح محبت و مودت کی ایسی پڑی کہ باہم بہ لہو لعب خوش رہتے تھے۔ ایک روز میں نے ہم خوابہ سے کہا کہ کوئی طرح گزاری کی اس قید فرنگ سے کیا چاہیے۔"

ان تینوں اقتباسات کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کو میرامن سے ہیٹا نہ پائے گا۔ ملکہ کے کہنے پر کہ "شاید تجھے نیند آتی ہے" نوطرز مرصع میں دائی کس سلیقے سے کہتی ہے کہ ــــ "واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہا جائے" اور باغ و بہار میں دائی کا جواب یہ ہے کہ "ہاں مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے" تحسین کا جملہ ہے "اے جاہل بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے"ـــــ میرامن اسی بات کو یوں کہتے ہیں "اے جاہل ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا"

دوسرے اقتباس کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کا اثر اسلوب اور بیان پر صاف صاف نظر آئے گا ــ "میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں؟ یہی ایک لونڈی، ایک کتا، ایک صندوق بساط میں رکھتا ہوں۔ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اس کا قول مقرر کرو تو میری خاطر جمع ہو۔ میں بھی سوار ہوں۔"

میرامن کے یہاں "ایک میں" کا ٹکڑا نہیں ہے اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس ٹکڑے نے تحسین کے یہاں مخاطب کی بضاعتی کو کیسی دردمندی کی فضا دیدی ہے۔

تیسرے اقتباس میں ہم خوابہ کیسی خوبصورت اور برمحل و مناسب ترکیب ہے۔ مردہ گھر میں تحسین نے دونوں کے تعلقات کو فطری تقاضوں کے تحت پیش کیا ہے۔

ان معروضات کی بنا پر میں یہ عرض کروں گا کہ نوطرز مرصع یقینی طور پر باغ و بہار کا ماخذ ہے۔ صرف کہانی کی حد تک نہیں بلکہ تحسین کے اسلوب بیان نے بھی میرامن کو راستہ دکھایا ہے اور یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرامن نے اس زمین کو آسمان کر دیا۔ ویسے باغ و بہار، نوطرز مرصع، اور فارسی قصہ چہار درویش کے مطالعہ سے یہ بات بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ میرامن نے فارسی قصہ کو بھی اپنے سامنے رکھا تھا اور کہیں کہیں ان کی ترتیب نوطرز مرصع سے مختلف اور اصل کے مطابق ہے۔ باغ و بہار میں آزاد بخت اور خواجہ سگ پرست کی کہانی دوسرے درویش کے قصے کے بعد ہے اور تحسین کے یہاں تیسرے درویش کی سیر کے بعد۔

باغ و بہار کا ادبی مرتبہ نو طرز مرصع سے کہیں بلند ہے باغ و بہار ایک زندہ کتاب ہے اور اسی کتاب کی زندگی و پائندگی نے ہمیں نو طرز مرصع کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اکثر ادبی کارناموں کے ماخذ کم مرتبہ ہوتے ہیں مگر ان کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ وہ ادبی شہ کاروں کی بنیاد بنتے ہیں۔ حسرت کی شاعری میں رنگ کا جو احساس ہے وہ شاید مصحفی کے گہرے مطالعے کے بغیر یوں نہ ابھرتا۔ حسرت نے رنگ مصحفی کی تکمیل کردی۔ شکسپیر کے بیشتر ڈرامے طبع زاد نہیں ہیں مگر وہ پرانی کہانیوں کے اینٹ پتھر خاک دخون اور خام مواد سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ——————

———————— رومیو جولیٹ

کی کہانی پر سے مس انگھیس کی کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہے[1]۔ اس کے علاوہ رومیو جیولیٹ کی رگوں میں قرونِ وسطیٰ کے ناکامی محبت کے کتنے ہی افسانے خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔

نو طرز مرصع اور باغ و بہار کے سلسلے میں کہیں کہیں میرے لہجے میں قدرے تیزی آگئی ہے۔ جسے میں زندگی کی علامت جانتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کہیں تو اس کے لیے میں معذرت بھی کر سکتا ہوں۔

[1] بحوالہ عزیز احمد — مقدمہ رومیو جیولیٹ

واجد علی شاہ کے زمانہ قیام کلکتہ کے بعض اہم حالات

امیر حسن نورانی

اودھ کے حکمراں نواب واجد علی شاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۶ء میں تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا، وسط ماہ مئی ۱۸۵۶ء کو شاہ موصوف اپنے متوسلین کے ساتھ کلکتہ پہونچے اور راجہ بردوان کے محل میں قیام کیا جسے پہلے ہی مولوی مسیح الزماں کے ذریعہ کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں مٹیا برج کے علاقہ میں بڑے بڑے محل، مکانات بنوائے، باغات لگوائے بیس ہزار سے زیادہ ملازمین و متوسلین شاہ موصوف کے ساتھ رہتے تھے، یہ علاقہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کا نمونہ نظر آتا تھا، ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو واجد علی شاہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کلکتہ کے اس طویل زمانۂ قیام میں جو حالات و واقعات مٹیا برج میں پیش آئے ان کو ہندوستانی اور انگریز اہل قلم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تحریر کیا ہے۔ واجد علی شاہ کے حالات زندگی پر متعدد کتب موجود ہیں اور ان میں قیام کلکتہ کے حالات بھی درج ہیں۔ لیکن کچھ حالات و واقعات اس زمانہ کے اخبارات میں بھی نظر آتے ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شایع ہوتے تھے۔ اودھ کے باشندوں کو خاص طور سے شاہ معزول کے حالات سے گہری دل چسپی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق اہم اور غیر اہم خبریں شایع کرنے میں ہفتہ وار "اودھ اخبار" پیش پیش تھا۔ اور اس مقصد کے لیے منشی نولکشور مالک اخبار مذکور نے مٹیا برج کلکتہ میں اپنا ایک "نامہ نگار" مقرر کیا تھا۔ اسی لیے ہر ہفتہ واجد علی شاہ کے متعلق کوئی خبر شایع ہوتی تھی۔

اس وقت میرے پیش نظر "اودھ اخبار" مطبوعہ ۱۸۶۲ء کی مکمل فائل ہے اس کے مختلف نمبروں میں جو خاص خاص خبریں شایع ہوئی ہیں ان کو بجنسہٖ پیش کر رہا ہوں۔ ان خبروں کا تجزیہ کرنے سے شاہ اودھ کے سوانح نگاروں اور ان کے حالات سے دل چسپی رکھنے والے اہل ذوق کو کچھ نہ کچھ مواد مل سکتا ہے۔

"اودھ اخبار" کے ایڈیٹر کو شاہ اودھ سے ہمدردی ہو یا نہ ہو لیکن اخبار کا نقطۂ نظر حکومت کی خوشنودی تھا اسی لیے کہیں کہیں اخبار کا لب و لہجہ اور انداز بیان طنزیہ نظر آتا ہے۔ میں نے جنوری ۱۸۶۲ء سے نومبر ۱۸۶۲ء تک شایع ہونے والی خبروں کو ترتیب وار نقل کیا ہے۔ ہر خبر کے سلسلہ میں وہی سرخی درج کی ہے جو ایڈیٹر "اودھ اخبار" نے قایم کی تھی۔ بعض الفاظ کا املا اس طرز سے مختلف ہے جو اس وقت رائج ہے۔ جیسے روپیہ کو روپیا لکھا ہے۔ اس کو ناظرین کاتب کی غلطی نہ تصور کریں اخبار میں جس طرح تھا بجنسہٖ نقل کر دیا گیا ہے۔

شاہ معزول اودھ

مدت سے ہمارے ناظرین اخبار کو شاہ اودھ کے حالات معلوم نہ ہونے سے شاید خیالات گوناگوں گذرتے ہوں گے۔ اب اخبار حیدری مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء میں انگلشمین سے لکھا ہے کہ شاہ معزول اودھ نے بہت سے مکانات مع زمین اثنا و متصل ریچھ باغ کے خریدے ہیں اور ہزار ہا آدمی سوائے اپنے ملازموں کے وہاں بسلائے یہ لوگ اکثر جواری، تماشا بین، چور، ہیجوا وغیرہ ہیں۔ جس بدنام کو کہیں جائے سکونت نہیں ملتی وہ یہاں بود و باش کرتا ہے شب و روز استعمال عیوب کا دروازہ کھلا ہے اہالیان پولیس کا اس میں گذر نہیں کہ کسی طرح سیاست کریں اور اکثر مردم بد شعار سزائے عدالت سے بچکر اس جگہ پناہ گیر ہوتے ہیں کئی لاکھ روپیہ قرض شاہ ممدوح پر ہو گیا ہے۔ اور خرچ اس قدر زیادہ کہ آیندہ کو قرض ملنا ممکن نہیں میجر ہربرٹ صاحب ہمیشہ ان کو فہمایش کرتے ہیں مگر کچھ اثر پذیر نہیں۔ صاحب کمشنر کی تجویز ہے کہ ایک چوکی پولس کی ریچھ باغ میں مقرر کی جائے اور اس کا خرچ وہاں کے باشندوں سے وصول ہو۔ بالفعل ۳۶ سپاہی اور افسر وہاں رہتے ہیں مگر وہ فقط حفاظت راستے کی کرتے ہیں مداخلت انکی

اندر باغ کے بالکل نہیں لفٹنٹ گورنر نے نواب گورنر جنرل کو لکھا ہے کہ وہ شاہ مذکور کو ہدایت کریں کہ بدچلن اور بدوضع آدمیوں کو اپنے مکان سے نکال دیں یہ بھی سنا گیا کہ ایک جماعت مفسدوں کی جو فساد ایام گزشتہ اودھ میں شامل اور ممد و معاون تھی اور معافی نامے کی رو سے بری الذمہ ہو گئی وہ سب آنکہ اب پھر بادشاہ کے نوکر ہوئے ہیں۔ فقط

صاحب اخبار حیدری نے جو کچھ کہ شاہ معزول اودھ کی نسبت تحریر فرمایا یہ نو ہزار میں سے ایک شمہ بھی نہیں اندنوں بضرورت بعض امور کے راقم اودھ اخبار کا کلکتہ گیا تھا جو کچھ لکھنؤ کے باہر سن سن کر خیال کرتا تھا کہ ع باطل است انچہ مدعی گوید۔ وہ سب آنکھوں دیکھا متواتر سنا اور اُن سماعی باتوں کے لاکھوں قرینے حضرات رفقائے شاہ معزول اودھ در حضرت شاہ کے دیکھے کہ ایسے امور لغو و نالائق حرکات کا درج صحیفہ کرنا عار معلوم ہوتا ہے۔ ایک شمہ یہ ہے کہ حضرات رفقا نے حضرت اودھ کو ایک کلدار پتلا بنا رکھا ہے جس طرف چاہا پھیر دیا۔ تعدد ہا فاحشہ عورات رذیل قوم کو پیشکش شاہ دیکر اپنا رسوخ ظاہر کرتے ہیں اور روز دس بیس محل کی متعہ اور نکاح سے بھی بھرتی ہوتی ہے کے مقام گاہ میں حضرت کی وجہ سے روز رندانہ جلسے رہتے ہیں حضرت شاہ کی مری مٹی کو خراب کرتے ہیں کسی سے کوتاہی نہیں کی لاکھوں روپیہ کھا گئے شاہ کے سر پر قرض اس قدر ہو گیا ہے کہ عمر بھر مخلصی ممکن نہیں وہاں کے سرخیل نالایقان ایک حضرت نے بادشاہ کو اس طرف اپنا مطیع کیا ہے کہ خود شاہ اودھ ہو رہا ہے وہاں کے بنگالیوں اور مؤسلانے موجی کہولہ سے مکانات کرایہ لے کر بادشاہ کو دھوکا دیتے ہیں کہ حضرت سلامت یہ مکان مول لیا گیا اس قدر روپیہ چاہیئے اسیطرح مکانات کی قیمت وصول کر کے صرف کرایہ پر مالکوں سے اُس مکان کو لیتے ہیں۔ سوا اس کے عجیب عجیب حرکات نالائق ایسے مشہور ہیں کہ ہماری تحریر کی چنداں حاجت نہیں۔ راقم کلکتے ہی میں تھا سنا کہ ۳ دسمبر کو ایک فہمائش نامہ جناب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے معرفت جناب میجر ہربرٹ صاحب کے خدمت شاہ معزول اودھ میں ارسال ہوا اس کے مضمون کا انتخاب یہ سنا گیا کہ خواب غفلت سے جاگیئے ورنہ آپ کے ہاتھ پکڑ کر تنبیہ حرام کی جاوے گی نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند حجلہ حرکات سے مطلع ہوئے ہیں۔ تمہاری نالائق شکایتوں کو سن سن کر کانوں میں درد پیدا ہوا۔ دل میں جگہ نہ رہی مفت میں تمہارے نالائق مصاحب جہنم کی راہ بتانے والے ایکدن ہٹائیں گے۔ اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایسے ایسے نالائق حضرات جو اغوا کنندہ حضرت ہیں ان کو نواب معتمد الیہ کے ملازمان درگاہ خوب جانتے ہیں فقط۔ اسی طرح بہت کچھ لتاڑ تھی مگر وہاں کے شیاطین طینت جو حضرت کو راہ راست سے کوسوں دور رکھتے ہیں اُنکی روش کو خراب کرنے ہیں اکثر حضرات نے مشہور کر دیا ہے کہ ہم نے روپیہ خرچ کر کے ایسا بندوبست کر لیا کہ مبشر حالات گورنمنٹ کی غشام کے جلد ہو جاتے ہیں اور ہم اس کا تدارک اوپر ہی اوپر کر سکتے ہیں اس بہانے سے بھی لاکھوں روپیہ بنام تہادر رشوت کہ فلاں صاحب کو دیں گے۔ فلاں صاحب نے وعدہ کیا ہے لیتے ہیں اور خود نقد روپیہ ہاتھ نہیں آتا تو اسم فرضی پر تمسک لکھوا کر جھوٹا قرض اپنا اپنا ٹھیرا لیا ہے اور شاہ کو اس قرضے سے دبائے ہوئے ہیں حضرت اس خوف سے نہایت مضطرب رہتے ہیں۔ ہمارے ایک عنایت فرمانے وعدہ کیا ہے کہ ہفتہ وار حضرت کے حالات سے مطلع کرتے رہینگے فقط۔

(اودھ اخبار مطبوعہ ۸ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۲۵، ۲۶)

شاہ اودھ

اودھ گزٹ سے معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ شہر کلکتہ مقام مٹیا برج میں ایک بڑا مکان تعمیر کراتے ہیں ان کے وہاں مکان بنوانے سے گرد نواح کی رعایا کو بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ اور دوسری تکلیف یہ ہوئی کہ کاشی پور میں جو ویسعہد بہادر نے مکان بنوایا وہاں کی رعایا کو بھی نہایت تکلیف ہوئی سرکار اس کو خیال فرمائے۔

(اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۴۴)

شاہ اودھ

شاہ اودھ نے درخواست اپنی پنشن اور ضبطی ملک اودھ ۱۸۵۹ء تک دی صاحب آف اسٹنٹ انڈیا نے منظور نہ کی اور لکھا کہ

آج تک شاہ اودھ نے قبول نہ کی اب اُس روپیہ کے مستحق نہیں۔ فقط (اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۶۸)

شاہ اودھ

بسبکہ حضرات اوباش شہوت کا بیشتر موچی کھولہ قیام گاہ حضرت شاہ اودھ میں ہوا تھا اور اس وجہ سے اکثر حکام منتظان سے شکایت بدوضعی تا حضور نواب گورنر جنرل بہادر پہنچی تھی۔ چنانچہ واسطے اصلاح بعض بعض خرابیوں کے نیوجہ ہربرٹ صاحب ایجنٹ گورنر جنرل کا اجلاس موچی کھولے میں ہوا کیے گا اور اسی جگہ یہ صاحب ممدوح تشریف رکھیں گے۔ ایک داروغہ پولیس بھی مقرر ہوئے نالاہے چوری کثرت سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ اودھ کے دل افروز محل کے بطن مبارک سے دختر زہرہ جبین تولد ہوئی دایہ ہرکارہ وغیرہ خدمتگار کو خلعت عطا ہوئے۔ شاہ اودھ کو کمال ملال ہوا۔ کیونکہ حضرت نے بہ توقع تولد نیراوج اقبال سلطنت کے ہزار ہا روپیے کا سامان مہیا فرمایا تھا مگر قسمت۔ (اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء صفحہ ۱۸۴)

"انتخابات اخبارات"

شاہ اودھ

بسبکہ حضرات رفقا اور ندماکی عنایات سے حضرت محتشم الیہ کا نہایت درجہ حال بتلا ہو چلا تھا ہر ایک متنفس نے جو ذرہ بھی دخیل ہو گیا بادشاہ کو دھوکا دے کر لاکھوں کے قرض جھوٹ موٹ لکھوالئے۔ اور پھر بادشاہ کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ غرض ایسی ایسی حرکات سے شاہ ششدر میں تھے۔ اور بیشتر عدالت کے ضوابط سے ایک نوع کی نگہداشت حفاظات تعظیم شاہ محتشم الیہ میں چنداں لحاظ نہ رہا۔ اگرچہ اُن حضرات رفقا اور ندماکی بے اعتدالیوں سے اس طبقے بھر میں حمیت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اور یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سے مقدمات خفیفہ کے واسطے شاہ محتشم الیہ کے دستخطی مختار نامے کہ جن کے عنوان کی عبارت میں بیشتر یہ تھا (منکہ واجد علی سابق شاہ اودھ ام الخ) پھر ہمارے ناظرین اخبار ملاحظہ فرماویں کہ کہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ ہر چند اکثر دل جلے یا صاحب دانش و فرہنگ ایسا کہہ سکتے ہیں کہ جب تخت و بخت جاتا رہا تو پھر کونسی منزلت باقی رہی مگر نہیں یہ شاہ محتشم الیہ کے رفقا اور ندما کے حسن لیاقت کا اظہار ہے ورنہ عرصہ تک خاندان تیموریہ کے عہد تب کی نگہداشت کیسی رہی اور کس داب سے زمانے کے اتفاق تک اتفاق کیا اگر بسبکہ سرکار انگریزی کی ہر ایک امور میں جہاں بلند نظری کام کرتی ہے اُس جگہ کچھ بھی ضرور نہیں ہے کہ کوئی درخواست ہی دے تو بادامے بلکہ داب سلطنت شاہنشاہی کہاں جاتا ہے۔ اندنوں بنظر حفاظت منزلت و مراتب شاہ اودھ کے ایک خاص قانون اجرا ہوا جس سے ہر عنوان سے شاہ محتشم الیہ کی حفاظت کی مگر ایک بڑی آسایش اس ایکٹ کے جاری ہونے سے ہوئی اور وہ یہ ہے کہ اب کوئی قرضہ شاہ موصوف کو نہ دے گا۔ کیا معنی کہ جب قرضخواہ کا زور عدالت جاتا رہا۔ تو پھر قرضہ کے وصول کی تدبیر نہیں پھر حال متدام شکر کا ہے کہ جب کوئی قرضہ نہ دے گا تو بادشاہ اسراف بھی نہ کرسکیں گے۔ تو اس صورت میں یہ نتیجہ نکلا کہ اپنی زندگی بھر آسایش پائیں۔

ایکٹ نمبر ۸ سنہ ۱۸۶۲ء

ایکٹ برائے نگہداشت منزلت ذاتی شاہ اودھ

ہرگاہ بموجب اس اقرار کے جو کہ منجانب سرکار انگریزی شاہ اودھ سے کیا گیا تھا واسطے قائم رکھنے شاہ موصوف کی منزلت ذاتی کے یہ قرین مصلحت ہے کہ شاہ موصوف عدالت ہائے دیوانی اور محکمات مال اور فوجداری کے احاطہ اختیار سے کسی قدر مستثنیٰ ہوں لہٰذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے۔

دفعہ ا۔ ازروئے دفعہ ہذا کے شاہ اودھ اختیار عدالتہائے فوجداری سے باہر قرار دیئے گئے ہیں۔ اور باہر ہیں مگر بجز ان جرموں کے جن کے واسطے موجب مجموعہ تعزیرات ہند سزائے موت مقرر ہے اور واضح ہو کہ جرائم مذکور کے سوا کوئی عدالت فوجداری یا مجسٹریٹ اختیار کسی نالش کی تحقیقات کا جو بنام شاہ موصوف ہو یا صدور کسی حکمنامے کا بنام انکے نہ رکھے گا۔

دفعہ ۲۔ کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر بلا وارنٹ کے شاہ موصوف کی گرفتاری کا اختیار نہ رکھے گا۔ اور کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر عام اس سے کہ کسی وارنٹ

کے اجرا کے واسطے مامور ہو یا نہ ہو مجاز نہ ہوگا کہ بغرض گرفتاری کسی شخص یا تلاشی کسی شئے کے ایسے مکان کے اندر جو کہ اس وقت مسکن شاہ موصوف ہو بخبر موجودگی اور اجازت اس عہدہ دار کے جو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے شاہ موصوف کے پاس بطور ایجنٹ مقرر کیا جاوے داخل ہو یا اس مسکن میں ٹھہرے۔

دفعہ ۳۔ اگر کوئی نالش یا اطلاع نسبت شاہ موصوف بابت کسی ایسے جرم کے جو جرائم متذکرہ دفعہ اول ایکٹ ہذا سے خارج ہو گذرے تو جو عہدہ دار کہ شاہ موصوف کے پاس بعہدہ ایجنٹ متعین ہو اُسے اجازت ہے کہ مقدمے کی تحقیقات کر کے کیفیت اس کی نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجے اور نواب محتشم الیہم با اجلاس کونسل بر وقت پہنچنے اس کیفیت کے اس جرم کے تجویز کے واسطے کمیشن مقرر فرما دیں اور اُس کمیشن کو کوئی اختیار منجملہ اُن اختیارات کے جو کہ از روئے مجموعہ ضابطۂ فوجداری کی عدالت کو حاصل ہیں۔ اس باب میں عطا کریں۔ مگر ملحوظ رہے کہ در صورت ثبوت کے اہل کمیشن مذکور کو اختیار صدور حکم سزا کا نہ ہوگا۔ لیکن اپنی رائے سے نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کو مطلع کرنا چاہیے۔ کہ نواب محتشم الیہ در باب حراست ذات یا نہایا جائداد شاہ موصوف کے یعنی جیسا کہ بحسب صورت مقدمہ ضروری تصور ہو حکم صادر کریں گے۔

دفعہ ۴۔ کوئی رٹ یا حکمنامہ نسبت ذات یا مال یا جائداد شاہ موصوف کے کسی عدالت دیوانی یا محکمہ مال و فوجداری سے کسی وقت صادر اور عمل پذیر نہیں ہو سکتا ہے۔ الا اس صورت میں کہ اسکی بابت پیشتر منظوری نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی حاصل کر کے منگالی گئی ہو اور وہ منظوری مصدق بدستخط سکرٹری گورنمنٹ ہند ہو۔ اور جو رٹ یا حکمنامہ بلا حصول ایسی منظوری کے شاہ موصوف کی ذات یا مال یا جائداد پر کسی وقت صادر یا عمل پذیر ہو وہ بالکل باطل اور ناجائز ہوگا۔

دفعہ ۵۔ شاہ موصوف کسی عدالت میں یا روبرو کسی اہل کمیشن کے جو کسی عدالت سے مقرر ہو واسطے دینے اظہار یا اظہار حلفی کے جب کہ وہ کسی مقدمے یا کارروائی مرجوعہ عدالت دیوانی یا محکمۂ مال فوجداری میں مطلوب ہوا ہو مثلاً بطور گواہ حاضر نہ کرائے جاویں گے۔

دفعہ ۶۔ در صورتیکہ شہادت شاہ موصوف کی ایسے مقدمے یا کارروائی میں مطلوب ہو تو عدالت یا وہ شخص جو چاہتا ہو سوالات تحریری واسطے اظہار شاہ موصوف کے مرتب کرے اور جو مقدمہ یا کارروائی اس قسم کی ہو کہ کوئی فریق ثانی قانوناً مستحق سوالات تردیدی کا ہو تو وہ بھی مجاز طیار کرنے سوالات تردیدی کا ہوگا اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی ایجنٹ حاضر باش شاہ موصوف کے پاس بھیجے جاویں گے اور وہ انہیں شاہ موصوف کو دکھلائے گا۔ اور ان کے جوابات باقرار صالح قلمبند کرے گا۔ بعد ازاں سوالات مذکورا اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی مع جوابات کے اُسی عدالت میں واپس بھیجے جائیں گے کہ جس میں مقدمہ یا کارروائی مذکور دائر ہو اور اس کے ساتھ ایجنٹ مذکور اپنا سارٹیفکٹ بایں مضمون کہ جوابات حسب ضابطہ لیے گئے ہیں معطوف کرے گا۔

دفعہ ۷۔ جس وقت کہ نسبت اظہار حلفی کے شاہ موصوف کا حلف کسی مقدمے یا کارروائی میں لینا مطلوب ہو تو وہ اظہار اور حلف روبرو ایجنٹ مذکور کے لیا جائے گا۔ اور ایجنٹ مذکور اس اظہار کو مع سارٹیفکٹ اس امر کے کہ اس کی نسبت حلف حسب ضابطہ کیا گیا اس عدالت یا حاکم کے پاس جس کے روبرو مستعمل ہونے والا ہوگا بھیج دے گا۔

دفعہ ۸۔ جس وقت شاہ موصوف سے سوالات کے جواب یا حلف نسبت کسی اظہار کے حسب احکام ایکٹ ہذا لیا جاتا ہو کوئی دوسرا شخص بجز ایجنٹ مذکور الصدر کے سوائے اس صورت کے کہ خود شاہ موصوف اجازت دیں مجاز حاضر ہونے کا نہ ہوگا۔

دفعہ ۹۔ جواب سوالات کے یا اظہار حلفی شاہ موصوف کا جو کہ بموجب احکام ایکٹ ہذا قلمبند ہوئے ہوں یا جس کی نسبت حلف کیا گیا ہو بطور شہادت منظور ہوں گے۔ مگر جو اعتراضات کو جوابات یا حلف مذکور کی نسبت سر اجلاس عدالت یا معرفت کمیشن کے ہونے کی صورت میں ہوتے وہی صورت متذکرہ بالا میں بھی ہو سکیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ ایکٹ ہذا بعد وفات شاہ موصوف کے نافذ نہ رہے گا۔ فقط۔　　　　(اودھ اخبار مطبوعہ، مئی ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

خدا مہربان تو کل مہربان

مصحفی جب مرے ایام برے آئیں گے :: بن بلائے میرے گھر آپ چلے آئیں گے۔

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار فیض بار ہفتہ ماضیہ میں نظر راقم سے وہ سرکلر گذرا جو مجوزہ جناب مسٹر سٹیل بیڈن صاحب ممبر کونسل حرفاً حرفاً پیشگاہ نواب گورنر جنرل باجلاس کونسل سے درباب حفظ مراتب شاہ مظلوم اودھ کے منظور ہوا جسکے منشا کا یہ انتخاب ہے کہ باستثنائے جرم مستلزم القصاص کے اور نالش کسی قسم کی شاہ موصوف پر نہ دائر ہو نہ کوئی عدالت مجاز سماعت ہے۔ نہ شاہ کی گرفتاری جائز اور امور واجب الاستفسار بذریعہ صاحب ایجنٹ حاضر دربار شاہ موصوف کے اوسنے دریافت کیا جایا کریں گے۔ سبحان اللہ کیسے نیک نیت پاک طینت ممبر اور حاکم ہیں کہ گئے گذرے زمانے پر حفظ مراتب شاہی کو مرعی فرماتے ہیں بعد شکر خالق کے ان اصحاب و سیر ائے اور گورنمنٹ کی نیک نیتی اور پاسداری حق بجانب قابل ہزار تحسین اور صد ہزار آفریں کے ہے ع این کار از تو آید و مردان چنیں کنند :: چیرا نباشد گوے لیا مگر سرکار ہی کا بختا تخت و تاج ہے. گورنمنٹ ہی کو ان کی لاج ہے مردہ بدست زندہ مردانگی اور سیر چشمی اسی کا نام ہے نیت شاہانہ پادشاہوں کا کام ہے۔ جہاں تک یہ قواعد مجوزہ تجویز ہوئے بہت انسب میں آئندہ کو شاہ مظلوم اپنے بدخواہ ملازم شکم پرور مطلب آشنا کے فریب اور دغا سے بجکیر حیات مستعار اپنی سلامتی اور عافیت سے گذرانینگے. مگر چند امور گزشتہ اور بھی جن کی ترمیم و تجویز از ہمہ مقدمات ہے واجب الاصلاح ہیں ورنہ یہ تپ دق قرض اور تباہی جو عارض حال شاہ ہے دفع نہ ہوگی وہ بیان کرتے ہیں تاکہ گورنمنٹ وہ بھی تجویز فرماکر نافذ اور بطور ضمیمہ کلیہ کے قائم فرمائے در ہو بذا۔

تن پرور بدخواہ مفسد بندہ غرض عیار مکار ملازمان شاہی نے جن کو شاہ موصوف کی بے زبانی اور مجبوری سے جو بقول جعفر زٹلی بادشاہ کاٹھ زبان عادت شاہی کے مزاج شاہی میں درخور اور راہ بیجا جزو و کل پر محیط ہیں واسطے حاصل کرنے زر خطیر کے کارخانہ یا نام نہاد شاہی یا کارخانہ وخرید وغیرہ شاہی کے نقد و جنس سوداگر اور مہاجنان کلکتہ سے اصل قیمت سے چار گونہ بلکہ دہ گونہ قیمت پر اپنا حصہ ٹھہرا لیا اور مکمہ سے نام کو پیروی کرکر نالش سے شاہ پر ڈگریاں کرادیں اور رقعہ تمسک لکھدیئے۔ اس میں آپ تو فاقہ مستی سے بچے قارون بن گئے مگر شاہ بیچارہ بیخبر و غافل کا قفل ہو گیا لوٹ اور کوٹھی جو خریدکی اور سود لوٹ بھی اپنے نام کرالیے اور اس میں لاکھوں روپیا شاہ پر اپنا فاضل نکال لیا دیکھو ایک تو سلطنت اور دولت گئی دوسرے مال متاع جو تھا وہ نیلام ہوا اس پر ڈگریاں بھی ہوئیں اب شاہ میں صرف یک بینی و دو گوش و استخوان پوست باقی رہ گیا ہے سو یہ آدم خور لیم خصال اب استخوان خوری دشمنان شاہ کیواسطے ہما بنکر وہ بھی چکھنے کو تیار ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین استغفر اللہ و لاحول ولا۔

اندریں حالات ایک کمیٹی چند حکام و سوداگر انگریز و دو ایک معتمد شاہی جو دل سے دردمند و دلسوز شاہی ہوں اور متدین بشرکت صاحب ایجنٹ کے مقرر ہو کر جو قرضہ شاہی ہے اور جس کی ڈگری ہو چکی اور جس کا دستگرداں یا رقعہ یا تمسک کی بابت ہے اور جس کی قسط بندی بھی ہو گئی عام اس سے کہ قارض ملازم شاہی ہو یا اسم فرضی یا بازار کا سوداگر یا مہاجن وغیرہ لیں قیمت اشیا جو واجب و عین المال ہے. اس کی اصل قیمت قائم کرکر اس قدر مسلم رکھا جاوے باقی بد۔ اور منسوخ تخمینہ لاگت عمارات کا بھی بمعیت کمیٹی و صاحب انجینئر کے ٹھیک ٹھیک لگاکر حساب شاہی سب گاد خورد کرکرا اوسیکو مسلم گردانکر اس کل قرضے اور اصل کی میزان کرکر منجملہ لاکھ روپیہ تنخواہ شاہ کے جس میں سے وہ ـــــ۔ ماہانہ قسط قرضہ ادا کرتے ہیں۔ مگر خائن غابن اہلکار آپ ہی شیر مادر کرکے جانتے ہیں ہر قرضے کی قسط بندی مقرر کرکر بآسانی ادا کرادیا جائے۔ اور آئندہ کو ممانعت ہو کہ کوئی نقد و جنس قرض نہ دے ورنہ نالش اس کی سماعت نہ ہوگی۔ اسمیں تغلب سب نکل جاوے گا۔ بلکہ چھٹی کا دودھ بھی حرام خوروں کا لبوں پر آوے گا سب قارض کی حق رسی ہو جاوے گی سب سرکار کے مشکور ہونگے۔ اور شاہ بھی کچھ دن زندگی کا چین اور استقلال سے گزرانیں گے۔ اگر یہ نہوا تو پچھلے قرض اور رقعہ اور ڈگری میں ان کا کام تمام ہو جاوے گا۔ اور ہو گیا ہے قابل شرکت کمیٹی کیپٹن دیانت الدولہ کے کہ واقعی اسم بامسمیٰ شخص نیکرنگ و ایماندار ہے اور مطلع صاف۔

ملازم شاہی میں کئی بڑے آدمی ایسے ہیں جنکا حکم سرکار سے اخراج کا ہے مگر حیلہ حوالے سے ابتک شاہ کا پیچھا نہیں چھوڑتے دینی بر باد اور بدنام کرتے ہیں اونکی بد وضعی بد معاملگی اور باشی نمک حرامی زمین سے آسمان تک روشن ہے وہ بھی مردود و مخرج ہوں غرض شاہ کو کیا بیا سہل دیا جائے جس سے یہ سب سدے دور ہو جاویں جب تو مرض کہنہ کو شفا ہوگی ورنہ نیم حکیم خطرۂ جان ہے۔

ساتھ اس کے علاوہ باہر کے قرضخواہوں کے شاہ کا حساب لاکھوں روپیہ کے مال خانے اور توشہ خانے اور نقد و جنس وغیرہ کا جو اونکی اہالی سے متعلق ہے بحضور کمپنی، صاحب ایجنٹ وغیرہ اولنسے سمجھا جاوے (دیتساری کا چوہا جب ٹھنڈا اور خوش مزا شفاف پارہ دیکھ کر پی جاتا ہے پھر اس سے ہلا نہیں جاتا) غرض مال مست لوگ کھا کھا کر ایسے بھاری ہو گئے ہیں کہ مثل قارون کے زمین کے میخ ہو گئے۔ نکالے سے کبھی نہیں نکلنے شاید نیچے سے سرنگ لگے تو اوڑ جاویں مگر کھایا پیا سب خاک میں مل جاوے گا۔ چاہیئے کہ پہلے اونکا حال قال پوریا بدھنا سنبھال لیا جاوے ہند کے باشندوں کا تو خیریت سے کہیں زمین کے پردے پر کھوج بھی مل جاویگا۔ اور جو حال کے مچھلی ہے وہ اگر کہیں کشمیر کے ڈل میں غوطہ لگا کر سوت کھینچ گئی تو ہزار ہا مانجھی جال ڈالیں اور نہایو اور دہبان سو بکاریں مگر خبر بھی نہ ملے گی خیر شرط ہے۔

(تنبیہہ) اب ایک اندیشہ باقی رہا کہیں گیہوں کے ساتھ گھن نہ پس جاوے یا للیے کے ساتھ کوئی کونست کا ٹکڑا احباب کر شلغم نہ کھا جاوے اس واسطے ہم سب اصحاب کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس حساب کتاب اور تغلب اور مد میں کہیں بیچارے منشی صفدر صاحب کا کچھ روپیہ یا حساب کتاب جو قریب ۲۰ لاکھ وہ اپنا ذمہ شاہ کے بتاتے ہیں نہ مارا جاوے (راے صاحب اودھ اخبار میں ایک سوال کے جواب میں بڑے ششش و پنج میں ہوں یعنی ایک بزرگ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ شاہ معلوم تو بے زبان ہیں۔ یہ منشی صفدر صاحب لسان السلطان کہاں سے ہو گئے آپ بڑے زبان آور ہیں اور سائل زبان دراز اب براہ زبان دانی ضرور ایک جواب دندان شکن ایسا دیجیے کہ زبان زد ہو جائے اور پھر سوال سائل زبان پر نہ آئے جراحات السنان لہا التیام ؛ و ما لا یلتیام ما جرح اللسان تا لوگ آپ کو مجیب کہیں اور جواب کو عجیب آمین یا مجیب الدعوات آمین ؛

چند اصحاب یہ بھی متنفسر ہیں کہ منشی صاحب بے نشان لا مکان تھے صرف سے رکے نواب منور الدولہ کے نوکر رہے اونکی جہت سے دربار شاہ تک راہ پائی اور کوئی کارندہ نہ تھا ذو الفقار الدولہ کی ناکاروائی اور کاہلی نے اُنکو محیط اور قابو یافتہ کر دیا وہ بیک بینی و دو گوش آئے تھے اب لاکھوں کے آدمی کہاں سے ہو گئے۔ جن کا ۲۰ لاکھ بادشاہ پر فاضل ہے جس کے وہ شاہ سے دعو بدار ہیں اور چند کوٹھی اور لوٹ شاہی اپنے نام سے لیے اور عدالت میں آپ کو سوداگر لکھاتے ہیں نام ملازمت شاہی سے یہ عار ہے اُنکے پاس یہ دولت کہاں سے آئی۔ کشمیر کے سوداگر اعلیٰ تو پشمینے کے ہیں اور ادنیٰ پشمینہ باف اور سب پٹو فروش یا کاتب یا ماہی گیر باقلی اس سرد ملک سے اگر ایک وقت کھانے کو ملے تب بھی باہر نہیں آتے۔ منشی صاحب یا اُنکے بزرگ کس چیز کے سوداگر تھے ایک سوداگر کا اور فرق بھی ہے جو کابل ایران لاہور شملہ کلکتہ تک ہوتی ہے۔ سبحان اللہ دولت حسن بھی کیا چیز ہے ہم اس کے جواب سے بھی قاصر ہیں۔ عقل کام نہیں کرتی مگر ہم اس قدر رائے دیتے کہ منشی صاحب یہ کہدیں کہ ہم نے منور الدولہ سے نیکر صرف کیا تھا اور پھر چپکے سے لوا کر منجھ رہیں ورنہ کشمیر لے گئے تو وہاں عملداری جس بیدار مغز کی ہے ظاہر ہے وہ نہ ہو کہ ع زر زر کشد در جہاں گنج گنج۔

پھر ایسا داؤں تہ لگے گا حضرات کشامرہ کی وفاداری اور شرافت اور خوبیوں کی ایک کتاب منشی صاحب نے تالیف کی ہے خدا وہ صحیفہ ہم پر نازل کر دے تو ہم بے نقط تفسیر اس کی لکھیں جس سے سب کو عبرت ہو اور حیرت ع من خوب مے شناسم البیس بے وفا را فقط راقم کلمۃ الخیر　　(اودھ اخبار مطبوعہ ۴ جون ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۷۵ تا ۳۷۷)

کوائف شاہ اودھ

نامہ نگار ان اخبار نامہ اودھ گائیڈ مقام موچی کھولہ سے ایسا لکھتے ہیں کہ بیہ سراپا نیاز عرصہ دراز ہوا کہ آپ کی طرف سے اس بات کا مجاز ہے کہ گاہ گاہ بارگاہ سلطانی کے اخبار کہ سلطان الاخبار ہے آپ کی خدمت میں لکھا کروں مگر کثرت کار و ہجوم افکار سے لکھنا

دشوار ہے اور نہ لکھنا ناگوار چار و ناچار یہ چند سطور مسطور ہوتی ہیں امید کہ شرف قبول پائے اور آپ کے پرچہ اخبار میں چھپ جائے۔ کئی سال سے یہ شکستہ بال یہاں کا حال بریں منوال دیکھتا ہے کہ بہت سے دولہ جمع ہوکر کچھ میں لوں کچھ تو لے کر رہے ہیں اور دولت خانہ سلطانی کو خالی کر کرا گھر بھر رہے ہیں۔ انھیں کارندوں کے کردار سے بسر کار عالی وقار گورنمنٹ انگلشیہ کے دربار میں غیر منتظم اور غفلت شعار ٹھہرائی گئی اور ایک عالم میں اس سلطان عالم کی بدنامی ہوئی خلق نے ناحق اس شاہ بیگناہ کو بدنام کیا اور اُن کو جھوٹ دان کو الزام دیا ان پر الزام اس وقت لاکلام ہوتا کہ ان کا کوئی حکم باعث خلل نظام ہوتا سو حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر کام کا انتظام اس کارخانہ کے مدار المہام کے ہر اقتدار میں دیا ہے اور اپنے کو اس کے خیر و شر سے بری کیا ہے کسی طرح کا دین لین اپنے ذمہ نہیں لیتے اور کسی تمسک اقرارنامے یا حسابات کارخانجات پر دستخط نہیں کرتے ہم ان کو غافل تب کہتے کہ قبالجات پھیر نہ لیتے اور پرامیسری نوٹوں کا معاملہ بے تصفیہ چھوڑ دیتے اس کا قصہ یوں ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپئے اپنے کارندوں کو حوالے فرمائے۔ کہ کئی قطعہ مکان بنام بندگان عالیشان سلطان مول لیویں اور قبالجات داخل خزانہ سلطانی کردیویں مگر اُن کارندگان خوش اطوار کے کردار سنیئے کہ چند کوٹھیاں تو خریدکیں مگر قبالجات احمد محمود کے نام لکھوا لیے اور بادشاہ سے یہ کہدیا کہ پیرو مرشد خانہ زاد نے حسب فرمان واجب الاذعان مکان مول لیا اور غلامان شاہی کا اس پر قبضہ کر دیا باقی رہا قبالجات سو بعض ضروریات کے سبب بندے کے ہاتھ میں ہیں۔ اب یہاں ہوشیاری و دانش شعاری اس بادشاہ خجستہ اختر مروت پیکر کی سنیئے کہ اُس وقت کثرت مروت اور شدت رافت سے چپ رہ گئے اور بھولے بنکر درگزر فرمایا اور ایک عرصہ دراز تک خاموش رہ کر رنگ دیکھا کئے آخر جب دیکھا کہ یہ لوگ تمام ہضم ہی کرنے کی فکر میں ہیں تب کئی بار بطور تذکار اُن قبالجات کو پوچھا نوٹوں کا ذکر کیا مگر انھوں نے مال مردم خوری کے طریقے سے سمجھا دیا اور ایک پرزہ نہ دیا تب تو بادشاہ نے تنگ طلبی کی اور جس طرح بن پڑا قبالجات کو بدلوا اپنے نام کرلیے اور نوٹ جو زر جو دیتے وہ لے لیے جو عدم اطلاع میں سلطان عالم کے بک گئے وہ واپس آنے والے ہیں اب دیکھیے کہ یہ ہوشیاری ہے یا غفلت شعاری بیدار مغزی ہے یا ناتجربہ کاری۔ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے بمقتضائے اتحاد اور ایسی وجوہ بیدار مغزی سے بادشاہ کو مواخذہ دیوانی و فوجداری سے بری الذمہ کیا کہ جی کھول کے ایسے معاملات کارندوں سے سمجھ لیویں لیکن مفصل معلوم نہیں کہ اصلاح ان امور میں کون کارندہ ذریعہ خیر خواہی ہوا۔ آئندہ جو دریافت ہوگا عرض کریں گے فقط

دوربین

(اودھ اخبار مطبوعہ ۲۵ رجون ۱۸۶۲ء صفحہ ۴۲۵)

" دیوان افسر " بقیہ صفحہ ۱۳

بقیہ صفحہ ۱۳

یعنی ابلیس نے آکر زقن غیبت گو

قطعات ۶ ہیں: ۱۔ نعت و منقبت۔ ۲۔ تہنیت، جلوس فعن الدولہ (غازی الدین حیدر) ۳۔ تاریخ غسل صحت سعادت علی خاں (مادہ "نہایا بنایید سجان پاک، وزیر الممالک میاں دو عید": ۱۲۱۸) ۴۔ تاریخ وفات مفتی غلام حضرت (مادہ " روح نے خلد میں کیا ہے مقام: ۱۲۳۵) ۵۔ تاریخ ٹھاکر دوار الالہ فتح چند و لچھمن رام "فیض مجسم ٹھاکر دوار ا" (۱۸۷۱ سمبت) ۶۔ قطعہ تاریخ وفات مصحفی۔ رباعیاں جن میں ایسے دو بیتی قطعے بھی شامل ہیں جن کی بیت اول مصرعے ۱۳ ہیں۔ وہ رباعیاں یہ ہیں:

افسر غم عشق دل سے کھونا معلوم
جب وصل صنم سے شاد ہونا معلوم
مثل شب ہجر عمر رفتہ میں کٹی
آرام سے غیر مرگ سونا معلوم

ہمبزم کی تیرے بات ہم نے کاٹی
یا خیمے کی شب قنات ہم نے کاٹی
بد بر ہوا اس قدر کہ پھر بات نہ کی
رو رو کے تمام رات ہم نے کاٹی

دیوان کی بیت آخر یہ ہے:

ہو علی حیدر بعطائے علی
گلشن عالم میں بعشرت مقیم

دیوان میں ورق ۱۳ الف سے (۹) تک حاشیے میں نثر جس کے آغاز کی عبارت یہ ہے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مثل نوسو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی اس کا اصل مطلب یوں سنا جاتا ہے۔"

غالبیّہ ——— دوسرا باب

اکبر علی خاں

اس بار غالبیّہ کا دوسرا باب شایع کیا جارہا ہے۔ اس میں ایسے حضرات کی اطلاعات کو نقل کیا گیا ہے جو غالب سے ملاقات کے مدعی ہیں۔

غالب بڑے وسیع تعلقات والے تھے۔ ان کی شہرت بھی کم نہ تھی۔ اطراف وجوانب سے جو لوگ دلی آتے تھے اُن میں سے نہ معلوم کتنوں کے لیے غالب کی ذات باعث کشش ہوتی ہوگی۔ خود دہلی بھی مجمع صاحبان تصانیف وتالیف تھی اور اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو غالب کو نہ جانتا ہو مگر غالب کے اس وسیع حلقے میں سے صرف چند اشخاص ہی ایسے نکلے جنھوں نے اپنی ملاقات کو قلم بند کیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ناسف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کی حیثیت صحیح معلومات کے پیش نظر مشکوک ہے۔ مثال کے طور پر امجد علی اشہری کا بیان سراسر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف غالب کا الہ آباد جانا کسی اور ذریعے سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ آخر عمر میں کوئی بھی سفر قرین قیاس نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اشہری نے اپنی کم عمری کی بنا پر کسی دوسرے صاحب کو غالب سمجھ لیا ہو۔

اسی طرح صفیر بلگرامی کے بیان کے بعض حصے بھی غور طلب ہیں جنھیں بغیر پوری جانچ پڑتال کے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں غوث علی شاہ قلندر اور ریاض الدین امجد کی تحریریں اپنی قدامت کے لحاظ سے بڑی اہم ہیں اور ان کی صداقت پر بھی کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی صحبت میں ان سب تحریروں کو پیش کیا جا رہا ہے، یقین ہے کہ ان کے ذریعے غالب کی تصویر کو کچھ ایسے رنگ ملیں گے جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے اور ان کی تعارفی علامات کو زیادہ یقینی اور مضبوط بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

تذکرہ غوثیہ ——— سید غوث علی شاہ قلندر

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آ کر لے گئے۔ اور ہمارا حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو　　　تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔

غزل مرزا نوشہ

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں　　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف　　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد　　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں میخوار، روسیاہ، گنہ گار، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا: چہار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے: اور فسانۂ عجائب کیسی ہے۔ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے: اجی لاحول ولا قوۃ اُس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اُس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم اُن کے ہمراہ ہو لیے۔ اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اُس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن اُن کی دعوت کی ہم کو بھی بلایا۔ اُس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دلآزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا: کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم نے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔
(۱۰۰-۱۰۲)

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کسی شخص نے مرزا تو شہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کھال دھونکی رہ گیو اور تر بجھ گئے انگار — اہرن کو ٹھکو ٹھو اور اٹھ گئے میت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہو — سدا نہ جوبن تھر رہے اور سدا نہ جیوے کوئے

شنیدم کہ در روزگار کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بفردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی از دار فانی گذشت — نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل درکشید — بسر چتر اشعار سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
وزاں پس چو نوبت بجامی رسید — جہان سخن را تمامی رسید

عدم ہے یا کوئی کوے صنم ہے — چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غایت اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مئی و شرابی و سرودی
زنہار ازان قوم مباش کہ فریبند — حق را بسجودی و نبی را بدرودی

قطعہ

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم — کنند باز کہ آن روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آن را ز سرنوشت ازل — اگر زیادہ دکم باشد آن گناہ من است

رند مشرب بے شر، رحم دل تھے۔ اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔

ندی ناؤ کا بیٹھنا ہلک ایک کی ہے ریت — پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگت جات ہے جگ دیکھے ہم جائیں — ہم تو بیٹھے راہ پہ کس کس کو پچھتائیں (۳۵۵-۳۵۶)

سیرِ ریاض ——— شیخ محمد ریاض الدین امجد

بیان قلعہ معلیٰ میں جانے کا اور جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسد اللہ خاں غالب دام افضالہم کی ملاقات سے لطف اٹھانے کا:

چھبیسویں جولائی ۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم ۱۲۷۷ھ کو صبح کو اٹھا۔ دہلی کے قلعے میں اکبر آبادی دروازے سے پہنچا۔ یہاں پہلے چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکان ہندستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بنائے تھے۔ ہر طرح کا تکلف تھا، خوب سجائے تھے لیکن بہ نظر صفائی ان کو سرکار دانش مدار نے مسمار کر دیا۔ میدان ہموار کر دیا۔ دیوان عام میں خاص گوروں کا مقام ہے۔ اور دیوان خاص میں عام صاحب لوگوں کا قیام ہے۔ دیوان عام آگرے کے دیوان عام سے چھوٹا ہے اور دیوان خاص آگرے کے دیوان خاص سے بڑا ہے۔ اور سامنے مہتاب باغ ویران پڑا ہے۔ لیکن بادشاہی چھتہ تا حال ویسا ہی بنا ہے۔ یہ نہیں ٹوٹا ہے۔ پہلے یہاں دکانیں تھیں بازار آباد

تھا ہر شخص شاد تھا کہتے ہیں کہ یہ جگہ ٹکسال تھی۔ چھل چھلا کر خیرات دیر آدمی چڑھ جاتا تھا۔ بول چال اچھوں کی بن جاتی تھی۔ حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ وہاں سے نکلتے دروازے سے نکل کر سرن داس کے باغیچے کے نیچے ہو کر نئے پل کے اوپر پہنچا۔ اور سلیم گڑھ اور نیلی چھتری کی طرف دور سے دیکھ کر کہ پاس جانے میں دیر ہوتی تھی، نہانے والیوں کے دیکھنے کی اور نگم بود گھاٹ پر آنے کی جلدی تھی۔ نگم بود کے گھاٹوں پر گیا۔ ان گھاٹوں کی اچھی تعمیر ہے۔ عمارت دلپذیر ہے۔ پختہ ہیں خام نہیں بدنمائی کا نام نہیں۔ بندرابن کے گھاٹوں کے برابر متھرا کے گھاٹوں سے بہتر عورتیں ہر قسم کی نہاتی تھیں کوئی نہاتی تھی کوئی بالوں کو سکھاتی تھی۔ کوئی ماہ پارہ سورج کی پوجا کرتی تھی اور کوئی زہرہ جبیں ماتھے پر قشقہ بھرتی تھی۔ رخساروں پر چھاپے لگاتی تھی الغرض نگم بود گھاٹ سے بڑھ کر نگم بود دروازے سے نکلا میگزین کی طرف چلا۔ یہ دو بڑے انگریزی مکان میں نہایت عالی شان ہیں اور نہر کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بڑے تماشے کی بنی ہیں۔ اندر پنکھیاں لگی ہیں۔ باہر ان کا عجب تماشا تھا بڑی دیر تک دیکھا کیا۔ بعد اس کے ہوا کھاتا ہوا بادل پورے میں گیا۔ پھیر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارات وسیع اور مکانات رفیع، دروازہ عالی شان، مکلف مکان صحن کشادہ، صاف گلی کوچے شفاف موجود ہیں، لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا بیگم کے باغ میں آیا۔ یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ پایا۔ اب کمپنی باغ اس کا نام ہے۔ کیفیت کا مقام ہے سرکار دولت مدار نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے روش سٹرکوں سے درست کر دیا ہے۔ بیچ میں نہر جاری روز بروز بڑی طیاری ہے۔ روشیں بلند ہیں سٹرکیں اہل فرہنگ کو پسند ہیں۔ ہر طرف باغ میں نگھیاں رواں ہیں آبشاریں رواں ہیں۔ روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے اچھی رنگت چھائی ہے۔ غرض کہ آم اور جامن اور مولسری کے پرانے پرانے پیڑ تھے اور نیچے مولسری کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر تھے۔ خدا بخش نے دو چار پھول اٹھائے ایک ہار گوندھا تین گجرے بنائے۔ اور تھوڑے سے مرزا نوشہ کے مکان پر جس کا ذکر آگے آوے گا گر پڑے سو وہیں چھوڑ آئے۔ وہاں سے خواص پورے میں جہاں عام لوگوں کی بستی تھی اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے یہاں سکونت کی حویلی لی تھی پہنچا۔ وہاں سے سرائے میں آیا۔ یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور بیچ میں ایک دروازہ ہے اس میں خدا بخش خیاط کی دکان ہے۔ اب بھی پانچ چار وہاں بڑے بڑے مکان ہیں پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں جناب اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ رہتے تھے گیا۔ مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ یہ سرآمد زبان دانان شیراز و صفاہاں ہیں۔ مغتنمات روزگار نفیس الطبع، قدیم الوضع، عالی وقار، والا تبار، ناخدائے سفینۂ سخن وری، در یکتای بحر معنی پروری آسمان زمین ذی کمالی، زرد بان نازک خیالی مجموعہ اوراق خرد مندی شیرازۂ اجزائے جرائد سخن بندی مہر سپہر بلاغت اسد بیشۂ فصاحت اندشک انوری روشن طالب حق تو یہ ہے کہ شعرای ماضی و حال ہر فن شاعری میں غالب۔ قد میانہ نہیں بلکہ دراز، اکبر آباد کے سارے انداز کترے ہوئے سفید کچھ سیاہ داڑھی کے بال، گورے چٹے خوبصورت مدرجۂ کمال لا زالت شموس بلاغتہ طالعًا وغمام فصاحتہ متفاطرًا۔ میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں۔ اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔ فرمایا کہ: کچھ سنا ہیے، طبع کے جوہر دکھایے، غرض کہ ہیچ مداں نے دو غزلیں ایک فارسی دوسری اردو کی سنائیں۔ مرزا ملتے ستائشیں جس کے سزاوار نہ تھا فرمائیں۔

غزل فارسی

شنیدم از صبا من آید انیک شہسوار من　　زبان دادم کہ بر خیزد بہ تعظیمش غبار من
نمی آید صبا اکنون ز مدت بر مزار من　　غبار خاطر او گشت شاید این غبار من
گذار اے باغباں مارا گماں دزدی مبر ظالم　　کہ گلہا نیستند ایں لخت دل اندر کنار من
بدامادی سخن پرداز آں لو کتخدا ہستم　　عروس فکر ہر شب می نشیند در کنار من
ریاض آرزوی وصل آں گل چاک گردیدم
کہ زیں سودا چو آتش سوخت آخر مشت خار من

غزل اردو

پھر وہ آئے گھر میں مجھ ناکام کے　　کٹ گئے دن گردش ایام کے

وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے　　　دل کو سینے کو جگر کو تھام کے
لائیے ہاتھوں ہاتھ اہل کارواں　　　ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے
ہاتھ اٹھاؤ ہمرہان قافلہ　　　اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے
عشق جس کو ہے وہی انسان ہے　　　ورنہ ہیں سب آدمی ہیں نام کے
یہ صدائے قیس تھی اور جذب شوق　　　ناقہ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے
تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں　　　ولولے ہیں اگلے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا شعر اپنا لاکر چار مصرعوں کا ایک قطعہ بنایا تھا۔ خیر وہ بھی سنایا تھا۔

قطعہ

اب نہیں ہیں آپ کی مدت کے ہم　　　رات کے دن کے نہ صبح و شام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا　　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر آیا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اسے یوں پڑھ رہے ہو یوں کہو کہ ضعف نے غالب نکما کر دیا یا دہر نے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا پھر ارشاد کیا کہ رنگینی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو، خاصے شعر ڈھالتے ہو۔ الحاصل دلی کے ثقات لکھنؤ کے حضرات ہند و مسلمان یہ نوجوان ملک ایک لڑکا بھی خیر آباد کا رہنے والا آفت کا پرکالہ مولوی فضل حق کا نواسہ سن میں ذرا سا قطبی میر پڑھتا تھا بات بات میں لڑتا جھگڑتا تھا حاشیہ نشینان بساط ادب تھے، اہل کمال سب کے سب تھے بعدہ مرزا نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے چلائے۔ وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دست خاص سے لکھ دیے۔

مرثیہ

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو　　　اے دجلہ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو　　　اے ماتمیان شہ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو　　　ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو　　　گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمہ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا　　　کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا　　　ہوگا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہ وہ برق نہیں ہے

مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔ . . .　　　(ص ۲۱ - ۲۷)

اس دن شہادت کی رات تھی۔ لیکن تعزیہ داری کا کیا ذکر یہ عجیب بات تھی۔ اول تو وہاں پہلے ہی تعزیہ داری نہیں ہوتی تھی نہ سرے غدر کے

سبب سے کسی میں وسعت نہ رہی زیادہ تر کم ہوگئی۔ سچ جو پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے۔ ہر دم تازہ غم والم ہے۔ اب بھی قدیم مکانوں میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں۔ سو وہاں بے سروسامانی ہے بڑی پریشانی ہے۔ جہاں بڑی طیاری کے علم تھے۔ اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا ہے۔ امام باڑہ دیکھا نہیں جاتا ہے۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں گو افسردگی ہے لیکن دن کو محفل قرینے کی ہوتی ہے۔ وہی بقول جناب فیض مآب اسد اللہ خاں غالب کے کہ اب بھی مرثیہ لکھیے تو ایک کا لکھیے تو جہ کیجیے تو دو کا کیجیے جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے۔ (ص ۴۳-۴۴)

دوبارہ حاضر ہونا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں اور دیکھنا ایک مجذوب کا اور جانا اکثر بڑے بڑے کوچوں میں اور معائنہ کرنا عمارات خوش اسلوب کا

یکم اگست ۱۸۶۰ء (بارھویں محرم ۱۲۷۷ ہجری) صبح کو جناب مستغنی عن الالقاب اسد اللہ خاں غالب کے مکان پر آیا۔ انھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا۔ فارسی کا دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر خیر الدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کوتوال اور دیگر عمال کے جلسوں کا جو آگرے میں گزرے ہیں جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے سنایا۔ دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا ہے چار اہل کمال سب جگہ موجود ہیں افسوس کہ قدردان نابود ہیں زمانہ ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل شاعر بے بدل اسی شہر میں پیدا ہوتے گئے۔ خلوت کدہ عدم میں سوتے گئے۔ علی الخصوص ۱۲۰۹ ہجری میں خواجہ میر درد صاحب کیسے صاحب کمال اہل قال باحال ہوئے جن کا کلام معجز نظام دردمندان عشق کو تریاق تجربہ کا اثر دکھاتا ہے اور بیماران محبت پر کار مسیحائی کرتا ہے۔ مردہ دلوں کو زندگی کا مزہ آتا ہے۔ ازاں بعد ۱۲۲۵ھ میں جناب میر تقی میر صاحب ریختہ گوئی میں صاحب ایجاد ہوئے اجلہ شعرا کے استاد ہوئے۔ اقلیم سخن ان کے قبضۂ قدرت میں آئی انھوں نے صدائے کوس لمن الملکی بلند فرمائی۔ پھر میر سوز صاحب کی آتش بیانی نے حاسدوں کو جلایا۔ وہ تحریر فرمایا کہ آج تک روشنی بزم سخن وری کا ہے۔ سچ جو پوچھیے تو انھیں لوگوں سے ایجاد شاعری ہے۔ اور نہ جو میاں نصیر تھے تو یہ بھی اس فن میں بے نظیر تھے۔ بعدہ حسرتی اور ممنون اور شیفتہ ہوئے۔ لوگ ان کے کلاموں پر بھی فریفتہ ہوئے۔ ازاں بعد خان معروف اور عارف اور احسان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس فن میں کمال بہم پہنچایا۔ بلکہ شاعری کو خوب چمکایا۔ اور ذوق تو ملک الشعرا تھے۔ اپنے عہد میں یکتا تھے۔ اور مومن خاں یہ شخص جادو بیان عجیب طرح کا انسان تھا۔ اس کی معجز بیانی سے بت بھی سر ہلاتے تھے اور آدمی حق شناس اس قدر چپ ہو رہتے تھے کہ بت بن جاتے تھے۔ لیکن سب کی ایک ہی بانگ تھی ہمیشہ طرز عاشقانہ میں منہ کھولتے، بخلاف ناسخ و آتش کہ یہ ہزار داستان تھے۔ سب گہر بولتے تھے موتی رولتے تھے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قائم رکھے اس شہر میں دائم رکھے۔ خیر مرزا سے رخصت ہو کر بازار میں آیا۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۵۶-۵۷)

غلام غوث بے خبر

آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا۔ خیال ہوا کہ دلی پہنچ لوں، حضرت غالب سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت سب ایک ہی دفعہ لکھوں۔

اس کی حقیقت یوں ہے کہ چھٹی نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا، رڑکی میں لشکر سے جا ملا۔ جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دلی نہ جائیں گے، میرٹھ پہنچ کر موقع ملا، جی نہ مانا، دو روز کی رخصت لے کر دلی گیا۔ احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی دو دن میں کیا کرتا۔ بہرحال اور دوستوں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا، اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیر فانی ہوگئے ہیں، اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں، عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی، جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے۔ مگر ہوش و حواس بہت درست شوخی طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم، بہ خلاف مولوی صدر الدین خاں کہ ان کے حواس میں کچھ فتور کلی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(مکتوب بنام عبد الرزاق شاکر بحوالہ احوال غالب ۳۷)

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جارہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لیے دہلی اتر پڑے، سرائے میں قیام کیا پھر اسٹیشن پر جانے کے لیے اڈے سے بگھی منگوائی، ابھی بگھی آئی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے، فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے، کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا، اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرادوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا، ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بغل میں ایک کمرا اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسی بیاسی برس کا ضعیف العمر بیٹھا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے، یہ مرزا غالب دہلوی ہیں۔ جو بگمان غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی، آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا، ہم نے سلام کیا، بہ مشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے، ہم کو اپنے پاس بٹھایا، قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا، اور کہا! آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا، جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو، نام و نشان پوچھا، ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی، جب ہم نے نام و پتا لکھا تو کہا: "مجھ سے ملنے گئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے، کچھ اپنا کلام بھی سناؤ" ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے، بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کیے، پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ، ہم نے یہ مطلع سنایا:

مہ مصر است داغ از رشک مہتابی کہ من دارم　　زلیخا کور شد از حسرت خوابی کہ من دارم

(غالب کو 'مہ مصر' کی ترکیب میں تامل ہوا، کہا، ماہِ کنعاں سنا ہے، 'مہ مصر' نئی ترکیب ہے، صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے)[1] عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا اور حد سے زیادہ تعریف کی، پھر آدمی سے کہا کھانا لاؤ، ہم سمجھے بہ خیال مہماں نوازی تکلف کر رہے ہیں، لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے دہلی اتر پڑے تھے، ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے اسباب بندھا ہوا رکھا ہے، پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں، کہنے لگے، آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے، اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ شوربا بھی پڑا ہوا تھا، پھلکے کا باریک پرت لیکر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا اٹھوا دیا، تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار خوراک پر کیوں بسر کرتے ہیں۔　　(اردوئے معلی طبع لاہور)

صفیر بلگرامی

مولف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

سنہ ۱۲۸۰ھ میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں صاحب بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا، جب

---

[1] قوسین کی عبارت مقدمۂ کلیات عزیز سے ماخوذ ہے۔

مارہرے پہنچا اور ناناصاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا، ناناصاحب سے اور اُن سے ایک ربط خاص تھا، مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں، اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد "مثنوی ابر گہربار" اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجکر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا، حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دیکر بھیج دیا، جب میں نے بوستان خیال کو اردو کرکے اس کی جگہ ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی، اس وقت سے خط وکتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دلّی چلنے کی تحریک کی اور بے نشان وگمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا ناناصاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کردیئے، میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا، دس بجے شب کو دلی پہنچا، شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا، حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے، ماموں صاحب بھی حاضر ہوے، دیکھ کر بشاش ہوگئے، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں، عرض کیا صغیر، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا، بولے ذرا ٹھہر جایئے، یہ کہہ کر بدقّت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے، اور بغل گیر ہوے، اور برآمدے سے اندر آکر بیٹھے، گرمی کے دن تھے صفر کا مہینہ تھا، حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا، پاجامہ سیاہ پونے دار اور ریس کا کلی دار، نیمہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہ پر داڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہوکر اینٹھ گئی تھیں، اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقّت ہوتی تھی آنکھوں میں نور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آکر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے ناناصاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں، اتنے میں نواب ضیاء الدین صاحب بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے اُن سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کرتا پہنے، غلطہ دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، جریب ہاتھ میں، بعد اُس کے حضرت نے اُن سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں، اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی۔ جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا، ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے لیے، آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ پر بنا ہوا تھا۔

لطیفہ: فرمایا بلامبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے، یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن میں دلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرد ہوتی ہے۔ الغرض پھر کوٹھے سے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھلانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجایش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں، اس لیے ضیاء الدین خانصاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے، گو تھوڑا سا دور ہے۔ مگر آرام بہت ملے گا۔ میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا، اس مکان میں پہنچے وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک برسر سڑک جس پر ایک بنگلہ خوش نما بنا ہوا، اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش وفروش سے آراستہ، سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا، دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا، ہم سب چھ آدمی تھے، اس مکان کے ایک کونے میں سماگئے۔ الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے انھیں رفیق کے ساتھ آئے، معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے، میں خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں، الغرض کھانا کھایا بہت مزیدار اور خوش گوار تھا، قورمہ، قلیہ، شیرمال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا، بعد کھانے آم جو کھانے

میٹھا، صورت حرام نظر آئے بالکل کھٹے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھلائے، اس سے کہیں بہتر پائے، پھر تو نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے:

کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم

اور سب آم منگا لیے، آم کا شوق حضرت کو بہت تھا، الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی، قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا، صبح کو نسیم صفیر رسالہ تذکیر و تانیث لے کر گیا، حضرت نے خود دے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا، اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور عود ہندی میں بھی موجود ہے۔

ہر روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوتی رہی، ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو پلوائیے، ہنس کر بولے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کنوئیں سے پانی لے آؤ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، منہم' اور میری طرف اشارہ کرکے فرمایا "منّا"

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہو گیا دو بند یہ ہیں:[1]

پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمول پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیرمال، وغیرہ بھیج دیتا ہوگا۔ آج میرا کھانا دیکھیے، الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا، ایک دسترخوان بچھا یا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور تانبے کی رکابی میں تین پھلکے رکھے گئے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی، پھر وہ رفیق آکر بیٹھے انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے، پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آبیٹھے، پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے، البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے، شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی، بہت تکلف کا کھانا کھلایا، میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا۔ بہت دیر تک باتیں ہوا کیں،

ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے، ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا، وہ میلہ بھی قابل دید تھا، دلی کا میلہ کیا کہنا ہے، میں نے دلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی، جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے ..... تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہما السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دلی عجیب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو، کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان خمخانہ

---

[1] یہ تین بند بعینہ وہی ہیں جو ریاض الدین امجد کی سیر دہلی میں مندرج ہیں اس لیے یہاں حذف کر لیے گئے ہیں۔

میں چھپی ہے۔

غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اٹھائے، آخر رمضان ۱۲۸۲ ہجری تک آرے چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے، خط و کتابت جاری رہی، آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔

کلام معجز نظام اُن کا فارسی اور اُردو ہر جگہ موجود ہے، مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھتا ہوں، ایک وضع اول کی دوسری وضع ثانی کی[1]

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالہ کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے حضرت نے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے، اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی پانچ چھ جز کا رسالہ تھا، جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے، چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا، اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا، وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے، الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا، فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے۔ اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا، اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے۔ ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اُس کے کلام میں مزا پاتا ہے، ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا، مگر یاد رہے، اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا، پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہو تا کیا، میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا، جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کی ہے، میاں جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے، اُس وقت فارسی کی شاعری دلی میں بہت چمکی تھی، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی۔ اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دیتا تھا، کچھ ایسی دقت نہ ہوئی پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی ہر ایک کی نئی طرز ہو گئی، مگر ناسخ کے کلام نے دلی میں آ کر سب کو حیران کر دیا، اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا، دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام آور دہ تھے، میں اور مومن خاں اور ذوق، ذوق نے ادھر کم رغبت کی، کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں مگر مومن خاں نے خیال کیا، پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی، ادھر میں نے بھی، غرض ہم دونوں دہلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی، اور کوئی ناسخ سے نہ ملی، میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اُسی رنگ میں رہے، خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی۔ وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے، ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہو اوہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے۔ ایک تمہارے بحر صاحب فرماتے ہیں!

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے۔ اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند

---

[1] جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۲۱ - ۲۲۸

شعر پڑھے، میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جائے اور باندھنے سے کام ہے، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے، نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق، ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں، میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے، دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے، مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے، من جملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا:

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں　　لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے، آپس میں کہنے لگے، بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے، جناب پھر پڑھیے گا، میں نے پھر پڑھا، ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آجائے اس کو باندھ دینا چاہیے، رکیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے، کسی کو گورا پسند ہے، کسی کو سانولا، معشوق من است آن کہ بہ نزدیک تو زشت است کا حال ہے۔

یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے، مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے، وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد ہیں، فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا — خیالہائے نازک اور معانی بلند کا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرداز دیا، صائب کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی تحریر نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا، جس کو بہ ظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر، اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پوچھنا اور جو مجازی میں پورے نکلے، وہ بھی قائم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے لیے مدرجے ولے سب حقیقی میں ہیں:

اگرچہ شاعران نغز گفتار　　زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضی حریفاں　　خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ "چیزے دگر" حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو　　رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار　　خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں　　ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے یہاں بیشتر، یہ نیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں۔ میں نے التماس کیا کہ یہ ان لوگوں

کے شعر عرض کروں، فرمایا ہاں پڑھو:

ناسخ

یہ بھی کہنا ہے جلوہ میرے بت کا — کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں

جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم — وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں

رکھو کسی طرح تو سرِ کار، مہرباں — کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے

مر چلا ہوں امیدواری میں — ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سُن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہ یار آئے — رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جان سے آتش، دیکھیے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

سجدۂ شکرِ خدا یا میں کیے رکھتا ہوں — قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، ان میں بھی بعض [1]

نثار علی شہرت

میں نے دیکھا کہ حضورِ جہاں پناہ (بہادر شاہ ظفر) گاؤ تکیے سے سر لگائے آرام میں ہیں اور سامنے چند شعرا موجود ہیں غرضکہ مجکو بھی ان کے عقب میں کھڑا کر دیا گیا۔ اول غالب صاحب نے غزل پڑھی جنھوں نے ایک ایک شعر اس عمدگی سے پڑھا کہ سننے والوں کو نقش تصویر بنا دیا......

(آئینۂ داغ ص ۱۰)

ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے۔[2] میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں:

"ہاں! آپ مولوی آ گئے ہیں"

میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا اُس میں کچھ بنانے لگے، غالبؔ اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گزارش کی:

"جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں؟" تو فرمانے لگے۔

"اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیے گئے ہیں اس لیے انھیں نکال رہا ہوں اور شستہ الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں۔"

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی:

"آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے۔" فرمانے لگے:

"وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت! بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا۔"

پھر فرمانے لگے:

"دلی والوں کی جو اردو ہے جس کو مشک و عنبر کہنا چاہیے، اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے، آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے۔"

---

[1] جلوۂ خضر جلد اول: ۲۴۰ دد ذکرِ مومن — [2] کھانا کیا تھا سامنے ایک چھوٹے سے گلاس میں ماءاللحم رکھا ہوا تھا۔

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی! "داغ کی اردو کیسی ہے؟" فرمانے لگے:
"ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے"۔
(آئینۂ داغ ۳۴ ـ ۳۵)

میر حیدر حسین سہیل

اسد اللہ خاں غالب کو میں نے دیکھا ہے یہ والد کی ملاقات کو فراش خانے آئے تھے میں بہت کم سن تھا، اتنا یاد ہے کہ رنگ گورا تھا داڑھی کتروان تھی، بال ترشوائے تھے، کشیدہ قامت قوی الجثہ تھے۔ (صلائے عام جنوری ۱۹۱۱ء)

سید امجد علی اشہری

غالب: مجھ کو دلی کی آبادی اور شاعری میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھ لینا دلی و سودا سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے ۱۲۸۵ھ میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا تھا ان کی شیوا بیانی سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والی سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر میرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا۔
میرزا غالب کا اردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ ــــــــــــ اگر اردو میں شاعری کی صورت نظر آسکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا معمولی بات نہیں۔ اس لیے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکل کشائی کا کام لینا چاہیے۔
میرزا غالب فارسی کے شاعر ہیں اور اُن کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں استادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے اُن کی اردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب اور صرف میرزا غالب کا حصہ ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خاں اور استاد ذوق ان کے مشہور اور مستند ہم عصر ہیں لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری (ایشیائی شاعری)

نورانی تیل

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئو ناتھ بھنجن یوپی

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے اور درد، چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے

Summit Advt.NU/9

42ND YEAR OF PUBLICATION

NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.

MARCH 196

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

Per Copy 75 n.P.
Annual Rs 10

رام پور رضا لائبریری کی مطبوعات

نگار بک ایجنسی نے، رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات فراہم کرنے کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے حسن ترتیب وطباعت کے لحاظ سے ہندوپاک میں ممتاز مقام رکھتی ہیں اور خوبصورت نسخ اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں۔ ہمارے مشہور ومعروف محقق اور ادیب مولانا امتیاز علی عرشی کا نام ان کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے اس لیے کہ ان کتابوں کی ترتیب وتصحیح کا کام موصوف نے خود انجام دیا ہے۔ یا انکی زیر نگرانی ترتیب واشاعت کے مراحل طے ہوئے ہیں

دستور الفصاحت: یہ احد علی یکتا لکھنوی کی کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ ہے جسے تذکرۂ شعراء کے طور پر علیحدہ چھاپا گیا ہے۔ اس میں ۳۵ اساتذہ اردو کا حال اور منتخب کلام درج ہے۔ مولانا عرشی کے مبسوط دیباچے اور تفصیلی حواشی نے اس کی اہمیت میں چند در چند اضافے کیے ہیں۔ اردو کے کلاسکی شاعروں پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لیے کہ مرتب نے حواشی میں سارے اہم غیر مطبوعہ تذکروں سے احوال شعرا کا اضافہ بھی کیا ہے۔ بہت سے تذکروں سے بے نیاز کرنے والی یہ کتاب اردو میں اعلیٰ اڈیٹنگ کا نمونہ ہے جسے بغیر جھجک ہم کسی بھی زبان کے تحقیقی کارناموں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں (طباعت ٹائپ) قیمت ——— ۶ روپے (مجلد)

مکاتیب غالب: یہ مرزا غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو فرمانروایان رام پور اور ان کے متوسلین کو لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں بیتاب رامپوری اور ناظم رامپوری کے اشعار پر اصلاحیں، نیز مولانا حالی، صفیر بلگرامی، ارتج میرٹھی اور تیر دہلوی کے غیر مطبوعہ قصائد وقطعات بھی موجود ہیں۔ یہ متفقہ امر ہے کہ خطوط پر مشتمل کوئی بھی مجموعہ اتنے تفصیلی مباحث کے ساتھ آج تک شایع نہیں ہوا۔ اردو میں انداز ترتیب وتہذیب کی ایک متعین راہ بتانے والی یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے پاس ہونا چاہیے (طباعت لیتھو) قیمت ——— ۸ روپے مجلد

فرہنگ غالب: اس کتاب میں مولانا عرشی نے مختلف ماخذ کے ذریعہ غالب کے بتائے ہوئے عربی فارسی اردو وغیرہ زبانوں کے الفاظ ومعانی جمع کر دیے ہیں۔ اور اپنے دیباچے میں ہندو پاک کے ان فرہنگ نگاروں کی خدمات سے بحث بھی کی ہے جن کے مرہون منت خود ایرانی بھی ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم نیز خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ زبان ولغت کے بارے میں غالب کا رویہ جاننے کے لیے یہ کتاب بے حد ضروری ہے۔ (طباعت لیتھو) قیمت ——— ۶ روپے (مجلد)

سفرنامۂ مخلص: رائے رایان انند رام مخلص کا سفرنامہ جسے ڈاکٹر اظہر علی مرحوم نے باضافۂ حواشی مرتب کیا تھا۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ۹ روپے

نواب کلب علیخاں خلد آشیاں: مربی علم وادب کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن وہ خود بھی ایک خوش گو شاعر تھے۔ ان کا کلام کئی جلدوں میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت چار حصے موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں درۃ الانتخاب۔ توقیع سخن۔ تاج فرخی۔ دستنبو خاقانی۔ ہر حصے کی قیمت ۲ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یو۔پی

نگار

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دور ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں سے بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارہ نگار یہی کوشش کریگا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے۔

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

جلد ۴۲	فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۳ء	شمارہ ۴

ملاحظات

اقبال اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کی شاعری کا شمار مقصدی شاعری میں ہوتا ہے اور جس کے پاس کہنے کے لیے وہ تھا جو اس کے علاوہ اگر کسی شاعر کے پاس ہوتا بھی تو اتنا جاندار کشش اور تاثیر سے بھرا ہوا نہ ہوتا جتنا اقبال نے اسے بنا دیا۔

شاعری اور مقصد قریب کی چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا ملاپ بہت دور کی بات ہے اتنی دور کی بات کہ اردو شاعری کی تاریخ میں صرف تین مثالیں ملتی ہیں۔ حالی، اکبر اور اقبال۔ عجیب اتفاق ہے کہ اقبال کے فکر و فن کا ذکر آتے ہی حالی اور اکبر بھی معرض بحث میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ حالی اور اکبر کا رنگ ایک محدود عرصہ روزگار کے لیے تھا اور اب ہم قصہ ماضی کی طرح ان سے کبھی لطف لیتے ہیں اور کبھی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یہ دونوں اپنی ملت کے مرثیہ خواں بن کر رہ گئے ایک غم و اندوہ سے رو پڑا اور دوسرے نے دکھ اور درد کی نشتریت سے طنز و مزاح کو تیز کیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا حالی اور اکبر کا ذکر اقبال کے ساتھ لازماً آتا ہے اس لیے کہ اقبال اپنے ابتدائی دورِ شاعری میں ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں شکوہ و جواب شکوہ اقبال کے ذہن پر حالی کی گرفت اور بانگ درا کا ظریفانہ کلام اکبر کی گرفت کے واضح نشانات ہیں جن کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

حالی و اکبر سے اقبال کی اثر پذیری کی وجہ وقت کا مطالبہ کہی جا سکتی ہے یا ان کا دل دردمند اس سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اقبال کا ذہن جو مطالبات کرتا ہے اس کو مطمئن کرنے کے لیے آپ ہی سوچیے ان دونوں کے پاس کیا ہے۔ ان کے خلوص کے تو وہ ہمیشہ قائل رہے ہیں لیکن ان کا تاثر زیادہ دن قائم نہیں رہا اور وہ ان کی تقلید سے بہت جلد آزاد ہو گئے۔

وہ زبان و بیان میں غالب اور داغ سے بھی متاثر نظر آتے ہیں چنانچہ اقبال کی بالکل ابتدائی غزلوں پر داغ کی زبان کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کا ذہن بالغ تر ہوتا جاتا ہے غالب کی "بیدلیت" کا جادو چڑھتا نظر آتا ہے۔ اردو کے کلاسیکی شاعروں میں وہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ساتھ دے بھی نہیں سکتے۔ یا پھر

کسی قدر عرفی و نظیری کی بلند خیالی کا حسن انھیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کیوں کہ "یہ لوگ تاکتے ہیں تو ثریا کی سنہری بوتل"۔

اقبال کا کلام اپنے مواد، وزن و وقار اور قدرت زبان و بیان کے لحاظ سے اردو شاعری کا نمایاں ترین کارنامہ ہے۔ مواد کے معاملے میں اقبال کہہ سکتے ہیں کہ تمتع زہر گوشہ یافتم اگرچہ یان کی آخری پناہ گاہ اسلام ہے۔ ان کی رائے میں توازن یا کسی خیال پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہاں خیالات کوئی وقتی رد نہیں تھے بلکہ اقبال کا ذہن ہزار بار غور و فکر کی کسوٹی پر کس کر ان خیالوں کو رد و قدح کی منزل سے گزارتا تھا ان کے موضوعات زندگی کے جن سنجیدہ مسائل سے علاقہ رکھتے تھے ان کا لازمی نتیجہ کلام میں وزن و وقار کی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیے تھا۔ زبان و بیان پر وہ خود اثر انداز ہوتے تھے اور اس معاملے میں وہ بھر منفرد ہیں۔ کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی اقبال کی زبان میں کچھ اور ہیں۔ قلندر۔ فقیر۔ مومن۔ خودی جیسے الفاظ کے مفاہیم کو جو وسعت اقبال نے دی اُس کا ہلکا سا بھی تصور کسی دوسرے کے یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا فقیر اور قلندر اخلاق علم اور عمل کے لحاظ سے جس بلندی پر فائز ہے وہ ہمارے عام عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ ایک معمولی کرشمہ ہے اقبال کی زبان کا۔

یہ درست ہے کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے۔ لیکن یہ تضاد ایسا ہے جسے تاریخی نقشے کے طور پر تو ہم آپ استعمال کر سکتے ہیں لیکن اقبال کے خلاف کوئی فرد جرم مرتب نہیں کر سکتے۔ وہ کون شخص ہے جس کے یہاں فکری ارتقا نہیں ہوتا حق کی تلاش و جستجو میں سالک کو مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سفر کا کوئی اثر اس پر مرتب نہ ہو۔ یہ سب تو راستے کی باتیں ہیں منزل پر پہنچ کر اس نے کیا کہا اصل بات تو یہ ہے۔

اقبال کو زبان و مکان کی قیود میں رکھ کر نہ ہم اس کے ساتھ بھلا سلوک کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ۔ اس کی آفاقیت کے اپنے تقاضے ہیں۔ حق کو کسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، حق سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اُسے جغرافیائی حد بندیوں میں بھی نہیں جکڑا جا سکتا۔ اور نگ و نسل سے بننے والی دیواریں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اقبال کا کلام بھی فریادی ہے کہ اسے کسی مصنوعی قید و بند میں نہ رکھا جائے۔ اس کا خطاب اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر قدغن نہ کی جائے یہ مطالبہ ہمیشہ حق کا مطالبہ رہا ہے۔ اگر کبھی حق پر ان حد بندیوں کو جائز کیا گیا تو وہ خود ان بندشوں کے خالقوں کے لیے بھی سود مند نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حق کو اپنانے کے لیے جس وسعت قلب و نگاہ کی ضرورت ہے اگر حق کی ملکیت کے دعوے دار کے پاس ہوتی تو اس تفریق کا امکان ہی کہاں تھا۔

آپ ہی بتائیے کہ اقبال کے مندرجہ ذیل چند اشعار میں وہ کونسی بات ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کا خطاب ہندوستان کے تمام شہریوں سے نہیں کسی مخصوص فرقے سے ہے۔ یا اس کا مطالعہ صرف ایک فرقے کی قوت فکر و عمل میں بیداری اور جوش و خروش کا باعث ہو سکتا ہے باقی میں نہیں

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں　　پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں　　سو بار ہوئی حضرت آدم کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے　　صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات　　فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے　　دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ہے
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

گرما دو غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے

اقبال کی فکر نے جو چراغ روشن کیا ہے اس کو تہ داماں رکھنے سے کسی کو راستہ نہ ملے گا۔ برصغیر ہند اپنے اس عظیم فرزند سے اگر اس دور میں بھی کچھ نہ لے سکا جب کہ یہ دور تعمیر و ترقی کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے تو کب لے گا، جب آئندہ کا مورخ ہماری کوتاہیاں گنانے وقت بیٹھے گا کہ ہم اپنے اچھوں کو پہچان نہیں پایا۔ آئندہ نسلیں شرم سے گردن جھکا لیں گی۔ ان نسلوں کی سرخروئی کا سامان ہم آج بھی کر سکتے ہیں جس میں خود ہماری بھی سرخروئی ہے۔

نگار کا زیر نظر شمارہ ہندوستان کے اس قابل فخر فرزند کی یاد منانے کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں جو تحریریں شامل ہیں ان میں سے دو آج سے دو سال پہلے رامپور رضا ڈگری کالج کے یوم اقبال میں پڑھی گئی تھیں یعنی "خطبۂ صدارت" اور "اکبر و اقبال"۔ یہ تحریریں ایک خاص حلقے سے آگے نہ پہنچ سکیں اس لیے ان کو اس نمبر میں شریک کر لیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت لازماً سنہ ۶۲ء کو سامنے رکھنا چاہیے۔

مولانا عبدالسلام خاں صاحب کا مضمون خصوصیت سے اس شمارے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مضمون اپنی موجودہ شکل میں نامکمل ہے۔ اس میں اقبال کے فکری رجحانات کی نشاندہی صرف ۱۹۰۸ء تک کی گئی ہے۔ آئندہ قسطوں میں اس سلسلے کی مزید کڑیاں سامنے آئیں گی۔ صاحب مقالہ اقبال پر اپنے کئی وقیع مضامین کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ نگار کے اس جدید دور میں موصوف سے دستگیری و تعاون کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

خطبۂ صدارت یوم اقبال

جو گورنمنٹ رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو پڑھا گیا

رشید احمد صدیقی

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو! آپ نے مجھے یاد فرمایا، اس عزت افزائی پر ذاتی حضرات کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے متعلقہ ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرور صاحب آپ میں ممکن ہے پانسہ دیتے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم، اے ہیں جن کا مقالہ آپ سے پیش ہوگا۔ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کے طالب علم اور شعبہ کے معلم بھی ہیں۔ تیسرے مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم، اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رام پور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یوم اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علیگڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا ولولوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعراء شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے، حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے، ہمیں دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعراء پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹوں کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ حسن ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں یہ ایک سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعراء نے تعزیہ یا تفریح سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی، زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعراء ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض مواقع پر اچھے راستے پر لگایا ہے، اس کی پہلی مثال انیس کے ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اس کو منقلب کرنے کا سہرا انیس اور انیس کے

خطبۂ صدارت یوم اقبال

جو گورنمنٹ رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو پڑھا گیا

رشید احمد صدیقی

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو! آپ نے مجھے یاد فرما کر میری توقیر بڑھائی ہے۔ میں ذاتی منزلت کے ساتھ شعبۂ اردو کی علمی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعدد ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرور صاحب آپ کے لیے ممکن ہے بیگانے ہو چکے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم اے ہیں جن کا مقالہ آپ ابھی سن سکیں گے۔ یہ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کے طالب علم اور شعبے کے معلم بھی ہیں۔ تیسرے مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رام پور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے۔ گو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یوم اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علی گڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجدد یا تبدیلی کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعرا شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے، حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے، دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعرا پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹ کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ حسن ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں یہ ایک سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعرا نے تفریح یا تفریغ سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی، زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض مواقع پر اچھے راستے پر لگایا ہے اس کی پہلی مثال انیس کے ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اس کو منقلب کرنے کا سہرا انیس اور انیس کے

کے خاندان کے سر ہے۔ انھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رخ بدلا لیکن اپنے زمانے کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے شعر و ادب کو گراں مایہ کیا۔ مذہبی شاعری میں محسن کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محسن کے اس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دل کش بنا دیا، دیا شنکر نسیم ان سے پہلے گزرے ہیں جن کی گلزار نسیم کی بے ساختہ صناعی کی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسن کو چلنا پڑا نسیم اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیس اور انیس کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سدھارا اور سنوارا — بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوز مزاج کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

انیس کے بعد حالی نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گزرنے کا موقع دیا جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی رو اور روانی میں زور آیا۔ حالی سے پہلے شعر تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش میں بطور کار خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالی زہر غم قلب و جگر میں اتار چکے تھے۔ ان کا رنج و الم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ ان کے غم سے انسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالی کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالی نے غالباً سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش کیا کہ خلوص دردمندی، علم آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے شاعری میں حالی نے سچائی کو آزمائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالی کا لہجہ دھیما ہے لیکن اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالی کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال اور افسردگی پیدا کر دی۔ یہ بات درست نہیں ہے حالی کی مثال اس شخص کی ہے جو سردار کی بے گور و کفن نعش پر جھول میں دبکا نہیں کرتا بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سرے سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدس سے قطع نظر حالی کی شکوہ ہندی میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اوجھل ہو گئی تھی۔ حالی نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال منوایا ہے۔ حالی نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوت حزیں سے کیا ہے اس نے شکوۂ ہند کو دنیائے ادب کی عظیم المرتبت المیہ کے بہت قریب کر دیا ہے۔

حالی اور اکبر کا زمانہ ایک ہے لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں۔ حالی کے مدنظر اسلام اور مسلمان ہیں، اکبر مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں اور اپنی بےبسی پر کڑھتے ہیں۔ اکبر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی، وہ مغرب سے ناواقف تھے، وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدس و محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے اس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحب فکر و نظر یورپ کی اس تصنیعت سے مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی۔ اس زمانہ کی متعدد تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اور تو اور ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابل اعتبار سمجھتے تھے جس حد تک اس کی سند جواز مغرب کے اعمال و اذکار میں ملتی تھی۔ اس زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جو آج اسی دیار اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبۂ حیات میں تسلیم کرتے ہیں۔

اکبر کی مصطلحات شاعری ذرا سہ رخی قسم کی ہیں۔ ان کے مدعو بنائی تنقیدی برہمنوں کو نہیں بھاتے، اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی پیچ کے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے شعر و ادب کے "اشارات و کنایات" گھبراتے ہیں یہ رویہ نقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر ہر شاعر کو اختیار رہنا چاہیے وہ کل سے جزو کا استنباط کرے چاہے جزو سے کل کا۔ اکبر ہی نہیں کوئی بڑا شخص یا شاعر کو لیش فرسٹری نہیں بنا سکتا۔ اس کے ہاں مقامات نہیں ہوتی۔ یعنی یہ بھی درست اور وہ بھی درست نہیں"۔ شاعر کا یہ ٹکنیک نہیں ہوتا۔ یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو ترتیب اور ترازو سے تلپنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور چاہنے کے لیے ذوق ذہانت سے کام لیں۔

حالی کے زمانے میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طور پر حالی سے آگے ہیں۔ ہاں سودا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے۔ یہ کام حالی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

صاحبو! میری یہ گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہو گی لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ان مقامات سے گذرنا ضروری

تھا۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبال اب اس درجہ پر فائز ہیں جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبال کا معتقد نہیں وہ خود بے بہرہ ہے۔ کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے، اگر وہ سارے جہان کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو۔ آپ اور میں اقبال کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے۔ اور نہ ایسا سمجھنا اقبال ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے۔ اقبال کو میں انہیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہان کا مذہب سمجھتا ہوں۔ اگر رحمۃ اللعٰلمین سارے جہان کے لیے باعث رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا، خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر سارے جہان کے لیے شاعر اور لیڈر ہوگا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبال سے ناواقف ہیں یا اقبال کے قائل نہیں ہیں وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جا سکتا جو آفاق گیر شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے ناآشنا ہو۔

شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانان ہند میں کسی اور شاعر اور مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا، فرداً فرداً ممکن ہے ہمارے بعض شعرا کا پایہ اقبال سے برتر ہو لیکن بحیثیت مجموعی اقبال ہمارے اردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مجھ تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم طویل مدت تک اردو شاعری میں اقبال کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں، مذہب ہی نہیں شاعری میں بھی نبی اکثر گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ رسول کم ہوئے ہیں۔

صاحبو! جب اقبال نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھا لیکن ان کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آ گیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبال کا قائل نہ ہو۔ ہم ان کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور ان کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتدا میں ان کی شدید مخالفت کی جائے اور آخر میں ان پر جان نثار کی جائے۔ اردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر اقبال کی جو عالمگیر گرفت ہے وہ کمتر کسی کے حصے میں آئی۔ یہاں تک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبال کی خاصان خدا کے زمرے میں رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اردو میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اس کا اعتراف خود اقبال نے کیا ہے۔ غالب کے عجمی تصورات سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالب کی زبان جہاں کہیں انھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے علمی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیس و محسن کو حاصل ہے گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ مرثیہ نگاروں میں انیس وہ ہیں جنھوں نے مرثیے کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیے کو چمکایا۔ زبان کے اعتبار سے انیس کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلم ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اردو بیشتر شاعرانہ زبان رہی ہے اس لیے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو یہ خوب کام دیتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اس میں ایسے عناصر داخل کیے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے تو یہ ناہموار نظر آنے لگی ایسی ناہموار کہ اس کے پرستار اس شاعری کے بھی قائل نہ رہے جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا غالب اور حالی کا یہی حشر ہوا۔

صاحبو! اقبال کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑا انیس کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیس نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصناف سخن میں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس حتیٰ کہ ڈراما اور افسانہ سب کے خصوصی امتیاز بڑے دل کش اسلوب میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ میر کے بعد انیس کو زبان پر جو قدرت تھی وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ اقبال کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ میر و مومن کے مقابلے میں آپ اقبال کی زبان کو شاید ناقابل التفات سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدنظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے اور کامیاب یا ناکام رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ اقبال کا موضوع سخن کیا ہے۔ ان کا انداز تخاطب کیا ہے۔ ان کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرف تھی۔ ان کا مقصد کیا تھا اور ان کے مخاطب کون ہیں تو آپ اقبال کی زبان کے قائل ہو جائیں گے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ و فکریہ کو شعر میں ڈھال کر دل نشین اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے۔ غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن و شگفتہ ہے گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس وادی کے

دلوں میں اتار دیتی ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی فن کو نصیب نہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے ان افکار و تحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستے پر رہنمائی کرنے والا ہم میں عرصے سے نہیں پیدا ہوا تھا۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے۔ آجکل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنی ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی۔ اقبال نے زندگی اور زمانے اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل پر، حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دل کش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلے سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاع یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہل ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازار مصر میں آ موجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشوونما اور ذہنی حوصلوں پر کیسا عظیم الشان اثر ہے۔

صاحبو! اسلام نے اپنے پیروؤں کو دین و دنیا کی ان منزلتوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سہمیہ یا مسخر کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر مذلت میں جا پڑے اور اس تصور نے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے ان کو شدید نقصان بھی پہنچایا، یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں ہم نے ہر طرح کے جتن کیے لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے مدتوں نصیب نہ ہوئی۔ مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار رہتے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور مشیر ادارے اس پر گواہ ہیں۔ اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک ہوتے اہل پڑے اور کتنے سوئے ہوئے ساز نغمہ سرا ہو گئے، ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہیے دے لیجیے، یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لیے انیس و غالب، حالی و اکبر، سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

صاحبو! اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو در کنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا تھا۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مستند اور مشرق کا ہر تصور دلفریب مردود تھی۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی۔ اب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے۔ بعض فروعی باتوں سے قطع نظر اقبال نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اقبال کی تعلیم کی بنیاد قرآن و حدیث، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبال نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے، اور اس طور پر محترم بنے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چلا گئی ہیں۔

صاحبو! ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبال کو مفکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ

آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے ماخوذ ہے یا ان کا خوشہ چیں ہے، اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبال نے جو بات کہیں بھی مفید مطلب پائی اختیار کر لی اور باقی کو ترک کر دیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں نہ کہ تکذیب، واقعات صحیح ہیں صرف ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدنی آثار و کسر انکسار سے یکسر محفوظ و علیحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا وہ جملہ دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی۔ ناسخ اس لیے کہ اسلام دین کامل قرار دیا گیا اس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مرد کامل ہے اور اس طاقت نے اس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آسکتی اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس سے اسلام کا درجہ فروتر کیوں کر ہوا؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اس لیے کہ دنیا کی تاریخ تقدیر الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو! اس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبال نے مفکرین یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور اقبال نے مفکرین یورپ کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں (بقیہ سے نہیں) تو کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرین یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے یہ بحث بڑی طولانی ہے اس صحبت میں میں صرف اقبال کو مدنظر رکھنا چاہتا ہوں اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفہ مغرب کا کافی اثر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اقبال نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات و عقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلام پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبال مغربی مفکرین سے متاثر ہی اس لیے ہوئے کہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن و عمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی سے لے جاتے ہیں جن کا ایک سرا میلاد آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراج آدم میں پوشیدہ۔

صاحبو! اس بحث میں گفتگو کی گنجائش ہے لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور اپنے ان نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطالعہ کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبال ان مفکرین کے اسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک سے ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے کچھ تعجب نہیں آئندہ سال یوم اقبال کے موقع پر پروفیسر صاحب کی معرفت آپ اس طالب علم کے اس مقالہ سے اسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبال کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارے یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے رو گرداں ہو جاتے ہیں اور اس قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آسکے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ زندگی کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اوجھل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی۔ یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی اور خدا پر ہی ختم ہو جاتی ہے انسانی زندگی کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرتفع تر و مستحکم تر ہوتی رہے۔ انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے اس لیے کہ انسان کا خدا بن جانا انسانیت

کے مقاصد میں نہیں ہے۔ استحکام خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ختم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

صاحبو، یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ مذہب اس بحث سے بلند بھی ہے اور علیحدہ بھی۔ در اصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمام تر عمل پر ہے۔ بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اتریں، عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹیفک ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ فلسفہ در اصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے۔ اگر اسلام مذہب عمل نہ ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تجر اسلام میں نمی و تموج ہے یہی سبب ہے کہ اسلام پر برے سے برا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہیں ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درس خودی میں اقبال اسی جہد پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں محبت "فاتح عالم" بھی شامل ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اسلام کے خدا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر بر سر کار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت و شخصیت میں "فولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں۔ ضرب کاری بھی اور خوئے دلنوازی بھی۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہیے۔ بہت ممکن ہے آج کی صحبت میں کسی گوشے سے ان پر تفصیلی گفتگو سننے میں آئے۔

صاحبو! میں نے اقبال کا کلام پڑھا ہے۔ بار بار پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے، پھر بھی سرد صاحب سے کم پڑھا ہے، مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبال کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے گرمی، برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پر اسرار ڈراتے والی، تسکین دینے والی حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات جیسے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے دم بدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من "جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان بن کو جب دیکھیے، جتنا دیکھیے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی!

صاحبو! آپ کو یاد ہوگا، میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے مسلمانان ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔ ان کے فلسفہ نے نئے علم کلام کا دروازہ کھولا، شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں، ہمارے آپ کے پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں، ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے وہ کام کیا جو ابتک پورا نہ ہوا تھا، اقبال ہی کے تصور سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشو و نما ہوئی۔ اقبال کے کلام و پیام سے مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور حضرت اسمعیل شہید کے کارناموں کو از نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر ابتک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اس کی یادگار منانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے اور اقبال مندی بھی! خدا آپ کی مدد کرے۔

اقبال کا فکری ارتقاء

محمد عبدالسلام خاں

ظروف اور ذہنی فعالی

واردات انسانی فکر کی صورت میں ہوں یا وجدان کی شکل میں۔ ان میں ماضی کے تجربے مستقبل کے تقاضے اور موجود ظروف و احوال کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کے فلسفیانہ نظام، سائنسی اکتشافات اور جمالیاتی اظہار ہزاروں سال پہلے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہوتے اور ہمارے حصے میں بزرگوں کے ورثے کی حفاظت کے سوا کچھ آتا تاہم یہی سب کچھ نہیں ہیں فرد کا شخصی تأثر اور اس کی ذہنی صلاحیت، شخصیت کی ذاتی فعالی اور ناگزیر عامل ہیں ان واردات کی آمد، صورت پذیری اور ظہور میں۔ ورنہ یکساں ظروف میں ہر شخص افلاطون و ارسطو ہوتا، ہر فرد ایڈیسن اور اسٹیفنسن بنتا، غالب اور اقبال میں کوئی ندرت، نہ ہوتی۔

اقبال کی حکیمانہ فکر اور فلسفیانہ نظام میں بے شبہ دانایان مغرب اور حکمائے مشرق دونوں کے افکار کا نمایاں اثر ہے۔ مغرب کے مادی ارتقا کو بھی دخل ہے اور مشرق کی زوال آمادہ ثقافت سے اثر پذیری کو بھی۔ ان کی فکر میں اسلامی دنیا کے ہر جہتی انحطاط کا عموماً اور ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کا خصوصاً ایک مقام ہے۔ امت مسلمہ کی رفعت کی عام آرزو خود بھی ایک محرک ہے۔

فکر اقبال کے ظروف

اقبال کا گھریلو صوفیانہ مذہبی ماحول اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، مکتبی اور مدرسی مضامین اور اساتذہ کی صحبتیں ان کی فکر کو ایک خاص سمت میں ڈالدینے کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی عصبیتوں اور فرنگی استعمار کی سیاست کاریوں کو بھی ان کی فکری تعمیر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کی صحت بخش آب و ہوا، جسمانی طاقتیں اور ان کو بڑھانے کے وسائل سے دلچسپی، قوت کے مظاہرے اور اقبال کی ان سے عملی دلچسپی ان سب کا ایک طرح سے اثر ہے ان کے خیالات کے میلان میں۔

اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں مغرب کی مادی قوتوں کا ہندوستان پر کامل استیلاء اور اس کے افکار و تصورات کی قوت قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذہبی عقائد اور ان کی دینی روایات کو بھی متزلزل کیے ہوئے تھے۔ سرسید مرحوم کے اعتذاری مباحث اور اجتہادی انتقادوں نے بڑی حد تک اس تزلزل پر نظری طور سے قابو پانے کی کوشش کی۔ سرسید کی ان بحثوں اور تنقیدوں کا علمی فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی مباحث کی تحقیقات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور مجتہدانہ نظر و بحث کے لیے نئے رستے کھل گئے۔ شبلی اسکول نے ان آزاد بحثوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ شبلی اور ان کے رفقاء اور شاگردوں کے علم و فضل، اعتدال پسندی، عمق اور ثقاہت نے اس اعتذاری لے کو بہت ہلکا کر دیا اور بے روک ٹوک اجتہاد کی بندش کی۔ مولانا آزاد مرحوم نے قرآنی صداقتوں کو اور مسلم کرداروں کو عملی ماحول میں جس اچھوتے خطیبانہ انداز میں پیش کیا، اس نے ان میں نئی زندگی بھر دی۔ اسی فضا کی ایک عظیم شخصیت خود اقبال بھی تھے۔

یہ احوال و ظروف کتنے ہی موثر سہی لیکن ان سے اقبال کی فکر کی کامل توجیہ نہیں ہوتی۔ ایک خاص رخ سے معلومات و محسوسات کا انتخاب جمع، جائزہ، ترتیب اور استنباط کسی خاص جذبے یا جذبات کے رہین منت ہو سکتے ہیں لیکن خود اقبال کی اپنی ذہنی ساخت اور اس کی فعالی اُن کے نظام فکر کی تشکیل میں سب سے اہم عامل ہے۔ دوسری چیزوں کی حیثیت محرکات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کا نشو و نما اور تعلیم و تربیت

اقبال جو اس عہد کے ایک عظیم مفکر تھے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک

ایسے متوسط الحال اور پیشہ ور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں صوفیانہ خیالات اور بزرگوں کی کشف و کرامات کا خاصا چرچا تھا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے دلچسپی تھی۔

اقبال نے مکتبی تعلیم جس میں فارسی ادبیات کے اوسط اور عربی کے ابتدائی مروجہ نصاب تک کی کتابیں شامل تھیں، کسی ٹھیٹ ملائے مکتبی کے بجائے قصبے کے روشن خیال، صوفی منش، جدید تعلیم کے ہمدرد اور سر سید اور ان کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی رکھنے والی اثر انداز شخصیت مولوی میر حسن شاہ کے پاس پائی۔ ان بزرگ کی نگرانی اور تعلیم و تربیت میں رہتے ہوئے ان کی ہدایت پر ہی اقبال اسکاچ مشن ہائی اسکول میں (جو بعد میں اسکاچ مشن کالج ہو گیا تھا) داخل ہو گئے اور وہیں سے ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کیا۔ اسی زمانے میں اقبال کی پہلی شادی ہوئی لیکن باہم خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہو سکے اور شادی کے باب میں اقبال کی جو خوش آیند توقعات ہونگی وہ بر نہ آ سکیں۔ بہر حال ان ازدواجی علائق کے ساتھ ہی ۱۸۹۵ء میں اقبال نے اسی کالج سے ایف اے کر لیا۔

مکتب و مدرسہ کی قید و بند کے باوجود اقبال لڑکپن کے عام شوقوں میں آزادانہ حصہ لیتے تھے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی ان کے مرغوب شغل تھے۔ پنجاب کے متوسط گھرانوں کے نوعمروں کی طرح ڈنڈ پیلنا، مگدر ہلانا اور اکھاڑوں میں زور کرنا اقبال کے دلچسپ مشاغل تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ فطری تھا طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سیالکوٹ میں جو چھوٹے موٹے مشاعرے ہوتے ان میں شریک ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ داغ کو اُستادی کے لیے اقبال نے اسی زمانے میں انتخاب کیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آ گئے اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی ادب اور فلسفہ لے کر امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے کیا۔ ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے مشہور استاد، پریچنگ آف اسلام کے مصنف اور شبلی کے دوست اور استاد پروفیسر آرنلڈ کے شاگرد خاص کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج سے ہی فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ لاہور میں رہ کر اقبال کا ذوق شاعری خوب نکھر گیا۔ غالباً ۱۸۹۵ء کی بات ہے کہ لاہور کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوئے اور غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے　　　یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی تھا جس پر مرزا ارشد گورگانی عش عش کہہ گئے تھے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے　　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس زمانے کی شاعری میں اگر ایک طرف مجازی عشق سے دل بہلایا ہے تو دوسری طرف صوفیانہ واردات کو بھی نظم کیا ہے عشق حقیقی کی چاشنی بھی ہے۔ تاہم مذہبی کرداروں سے شیفتگی، دینی روایات سے محبت اور ملت اسلامیہ سے گہری وابستگی ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا کے چند سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندوستانی قومیت میں اختلاف و افتراق کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ فرقہ پرورانہ مطالبوں اور ان کے ردعمل سے سیاسی فضا مکدر تھی۔ جمہوری خطوط پر قومی حقوق طلبی کی جدوجہد اور حکومت کے نظم و نسق اور اس کی حکمت عملی پر عوامی نقطہ نگاہ سے تنقید نظر کو مسلمانوں کا سربرآوردہ طبقہ اپنے فرقہ وارانہ مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ خاص طور سے یو۔پی اور بہار کے مسلمان وطنی تحریکوں کے خلاف صف آرا تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان غیر معمولی اقلیت میں تھے یا اپنی ایک گونہ اکثریت کی وجہ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ان کا انداز نظر بدلا ہوا تھا۔ عام مسلمان کشمکش میں مبتلا تھے۔ جذبات کی رو میں کہیں قومیت کے خلاف صف آرا ہو جاتے کبھی شانہ بشانہ برادران وطن کے ساتھ نظر آتے۔ مسلمانوں کی کوئی مستقل، مستحکم اور مرکزی پالیسی نہ تھی۔ علی گڑھ قیادت سے آزاد جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس افتراق و اختلاف سے متنفر تھا اور چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان ایک جان اور دو قالب ہو کر خالص وطنی بنیادوں پر اپنی سیاسی جدوجہد کو استوار کریں اور نفرت و اختلاف کو قومیت متحدہ کے وسیع مفاد میں محو کر دیں۔

اقبال کا اس زمانے میں یہی رجحان تھا۔ چنانچہ ملت سے پوری وابستگی، مذہبی روایات سے پوری شیفتگی اور ملی کرداروں سے پوری عقیدت کے باوجود انھوں نے قومی جذبات سے معمور نظمیں لکھیں جن میں ملکی روایتوں قومی کرداروں اور وطنی علامتوں سے والہانہ دلچسپی کا اظہار تھا۔ اور وطنیت و قومیت کو فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد بنا کر متحدہ قومیت کی طرف دعوت دی تھی۔ آفتاب۔ ایک آرزو۔ ترانۂ ہندی۔ نیا شوالہ

ہندوستانی بچوں کا گیت اور تصویر درد جیسی نظمیں وطنیت و قومیت کے جذبات سے معمور دل کی پکار ہیں۔ نالۂ یتیم، یتیم کا خطاب۔ خط منظوم عرض بجناب حضرت نظام الدین اولیاء۔ ہلال عید اور سپاس جناب امیر وغیرہ نظمیں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان نظموں میں مذہبی تلمیحات کے ساتھ ملی روایات سے عشق، اسلامی کرداروں سے والہانہ تعلق پوری شدت سے موجود ہے۔

ایم اے کر چکنے کے بعد اقبال سب سے پہلے اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاد ہو گئے اور غالباً عربی درسیات کے مضامین تاریخ فلسفہ وغیرہ کا درس ان سے متعلق ہو گیا اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کی درسیات کے اساتذہ کی رفاقت میں انھوں نے تعلیمی کام انجام دینا شروع کر دیا۔ کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں آرنلڈ تھے اقبال بھی فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۵ء تک وہ اسی اسامی پر رہے۔

اقبال کا مذہبی تصور اور وطنیت

اس عہد کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مذہب کے ہر جہتی اصول زندگی ہونے اور اجتماعی و انفرادی تمام شعبہائے حیات کے لیے اس کے شیرازہ بند ہونے کے تصور تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک باطنی لگاؤ، روحانی تعلق اور قلبی لطیفہ ہے جس سے انسانی جذبات میں لطافت اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے عالم سے یگانگی اور دوستی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ عام خلوص ہمدردی اور محبت اس کے لوازم ہیں۔ دل آزاری اور شکوہ سنجی اس کی روح کے خلاف ہیں۔ "التجائے مسافر" میں التجا ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے　　　کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجکو

مذہب کا نچوڑ محبت ہے۔ "سپاس امیر" میں "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کو اصل اصول قرار دے کر حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہیں:

اے باب مدینۂ محبت　　　اے نوح سفینۂ محبت
اے مذہب عشق را نمازے　　　اے سینۂ تو امین رازے

"فریاد امت" میں اسلام کی حقیقت کی اس طرح توضیح کرتے ہیں:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے　　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مذاہب کا اختلاف ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں ان میں باطنی تضاد یا تصادم نہیں۔

اصل محبوب ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی　　　ایک بیاض نظم ہستی کی ہیں تصویریں سبھی

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری　　　ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے

اقبال کی اس متصوفانہ مذہبیت کا تقاضا ہے صلح کل اور عام دعوت اتحاد۔ افتراق و اختلاف سے نفرت:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے　　　وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے　　　اس عبادت کو کیا سراہوں میں
میں کسی کو برا کہوں توبہ　　　ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

"فریاد امت" میں واعظوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں:

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا　　　پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

اس روحانی لطیفے اور باطنی مقدس حرارت کا کوئی متعین عملی تقاضا نہیں، کوئی خاص بندھی ٹکی ثقافت نہیں، خاص صورتوں اور خاص رسموں میں محدود نہیں، اس کے اپنے تیے تلے مطالبے نہیں اس لیے اس کا نہ کسی قومیت سے تصادم ہے نہ کسی نظام سے:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی　　کچھ اسی کے دم سے قایم شان ہے انسان کی
روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے　　آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں　　خون آبائی رگ تن سے نکل سکتا نہیں

چنانچہ اقبال ترانۂ ہندی میں اعلان کرتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نیا شوالہ میں اختلاف و افتراق کی خلیج اس طرح پاٹتے ہیں:

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو　　یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو　　آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے ایک نرگن کہتے ہیں پیت جس کو　　دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

مذہب کا یہ تصور کچھ تو اس دور کے عام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذاق طبع کا آئینہ دار ہے جو خاص طور سے اس کے عملی تقاضوں اور شعائر و رسوم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور ایک بہت نجی معاملہ سمجھ کر اس کی باطنیت اور روحانیت کو ہی سب کچھ جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ایران کے عام صوفی شعراء کے کلام سے حقیقی مذہب کا جو دل آویز اور روحانی تصور ماخوذ ہوتا ہے اس کی سرمستی اور سرجوشی کو چھوڑ کر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جب ہر شئے میں ایک ہی ازلی ابدی حسن کی جھلک ہے۔ بلبل کی چہک کی دوسری صورت گل کی مہک ہے۔ غنچے کی چٹک کا دوسرا نام انسان کا سخن ہے۔ جگنو کی چمک سوز ہے اور مرغ خوشنوا کا نغمہ ساز[1] تو پھر تسبیح زنار کی دوسری صورت کیوں نہ ہو۔ اذان ناقوس ہی کی صدا کیسے نہ ہو۔ حقیقت کا یہ شاعرانہ تخیل، وجود کا یہ جمالیاتی تصور، تہذیبوں کی آویزشوں اور نصب العینوں کے تصادموں کے لیے جس طرح کوئی گنجایش نہیں چھوڑتا اسی طرح مذاہب کی ہنگامہ آرائیوں کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں مہیا کرتا۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو　　ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال اور جستجو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا یہ تصور اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کی عام مذہبی توجیہیں اقبال کے دل و دماغ کو مطمئن نہ کرسکیں چنانچہ آغوش مذہب میں پرورش پایا ہوا اور بزرگوں کی عقیدت مندیوں کے گہوارے میں جھولا ہوا، شاعرانہ احساسات سے معمور، ذوق و وجدان کی وسعتوں سے روشناس، مغربی فلسفے کا یہ نوجوان طالب علم جب کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی فلسفیانہ فکر سراپا استفسار و جستجو بن جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے کہ آیا اس ہنگامۂ بود و نابود کا کوئی مقصد ہے یا یہ جمع و تالیف اور شکست و ریخت محض عناصر کا کھیل ہے؟ کبھی ہمالہ سے پوچھتا ہے:

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے　　دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

---

[1] حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

پرندے اور جگنو کا مکالمہ ہے۔ جگنو کی زبان میں:

چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو　　دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز　　جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

کبھی گل رنگین سے سوال ہوتا ہے کہ "راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے" اگر واقعی یہ عالم رنگ و بو کوئی بامقصد اور سوچا سمجھا کارنامہ ہے تو پھر چیزوں میں ہم آہنگی اور توافق کیوں نہیں۔ اس رزمگاہ اضداد کی کیا توجیہہ ہے۔ اگر اس عالم سے ماورا بھی کوئی جہان ہے تو وہ کیا ہے اور کیسا ہے اور کیا وہ بھی ناآہنگی کا شکار اور اضداد کی آماجگاہ ہے؟ "خفتگان خاک سے" استفسار کرتا ہے:

اے مئے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم   کچھ کہو اُس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی   اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا   اُس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا   اُس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا
رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں   اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں
اس جہاں میں ایک معیشت اور سو افتاد ہے   روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے   قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے

پھر اس تضاد اور ناآہنگی کے دور ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ "آفتاب صبح" میں اپنی اس آرزو کو بیان کیا ہے:

دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں   ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے   حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

پھر کائنات کی سب سے دل چسپ اور دل آویز مخلوق انسان کی کہاں سے ابتدا ہے اور کونسی اس کی منزل ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں   کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

پھر انسان جو اپنی ساخت اور استعداد صلاحیت کے اعتبار سے قدرت کا شہکار ہے کیا واقعی اس کی قسمت نیستی ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے   موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

اگر موت عدم محض نہیں ہے فقط انتقال مکانی ہے تو یہ انتقال تدریج کے بجائے دفعتاً کیوں ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے   موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے

اس دوسری زندگی کی تشخیص و تعبیر میں جنت و دوزخ کے حوالے کا مفہوم کیا ہے، ان کی کیا حقیقت ہے، کیا توجیہہ ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے   یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے   آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

اگر یہاں ہمارا علم حقیقتوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تو کیا اس زمان و مکان سے آزاد عالم میں اس کی یہ محدودیت ختم ہو جائیگی اور ہم حقیقتوں کو براہ راست محسوس کر سکیں گے یا یہی جستجو اور استفہام ہماری تقدیر ہے؟

اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے   علم انساں اُس ولایت میں بھی کیا محدود ہے
دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی   لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا   واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

اقبال کے سلسلے میں یہ سوالات محض شاعرانہ تخیل آفرینی یا وقتی لطیف احساسات نہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کے پیچھے متفکر ہے مستقل دل کی کریدہے۔ دماغ کی مسلسل الجھن ہے۔ تصوف اور فلسفے کی آویزش ہے۔ عقیدے اور استدلال کی کشمکش ہے اور مادیت اور روحانیت کا تصادم ہے۔ چنانچہ ان کے پورے کلام پر نظر ڈال جاؤ۔ ان کے عمر بھر کے فلسفے کا جائزہ لے لو وہ ان ہی سوالوں کے گرد گھومتا نظر آئیں گے۔ ان کی پختہ فکر اور فلسفیانہ نظر مذہبی عقائد اور صوفیانہ شعور کے سہارے خالص مادی ماحول میں ان ہی سوالوں کا جواب

ہوئی نظر آئے گی۔ ایک خاص میلان کے تحت ان کے آئندہ نظام فلسفہ کے لیے منتشر نقطے اور دھندلے خطوط ان سوالوں کی روشنی ہی میں متشکل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وسائل علم اور ذرائع معرفت کی تنقیح اور انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ خود اصل کائنات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے شاعرانہ وجدان اور متصوفانہ شعور نے اُس کی ہستی کے راز کو اسی زمانے میں ان پر بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کائنات اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے مسلسل اور متواتر تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے؟ طبیعی اسباب و علل زیادہ سے زیادہ اتفاق اور مصاحبت تک پہنچاتے ہیں۔ ان کو دائمی مان لو لیکن یہ کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس کا جواب عقل کے پاس کہاں تھا۔ عقل مشاہدات و محسوسات سے تجرید و تعمیم کے ذریعے کلیات کا استخراج کرے لیکن وہ محسوسات تک ہی تو محدود ہوں گے۔ محسوسات سے ماوراء اور ان کی پشت پر اگر کوئی اندرونی واقعیت ہے تو اس کی اصل حقیقت اور پھر اس حقیقت کے ذاتی لوازم اور بلاواسطہ اوصاف اگر کچھ ہوں تو وہ عقل و فکر کی گرفت میں کیسے آتے۔ عقل و فکر کا خام مواد وہ احساسات اور ارتسامات ہیں جنکو حواس معروض کی ظہوری حیثیت سے اخذ کرتے ہیں عقل اپنے اصول و ضوابط کے تحت انھیں مرتب و منظم کرتی ہے۔ لیکن کسی معین معروض عقلی تصور کے لیے صرف انھیں احساسات اور ارتسامات کی ترتیب و تنظیم کافی نہیں جو حواس نے کسی خاص وقت میں اس معین معروض کے کسی خاص رخ اور خاص مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہیں بلکہ دوسرے گزشتہ اوقات کے اور دوسرے رخوں اور دوسری مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہوئے احساسات اور ارتسامات سب اس خاص زمانی اور خاص مکانی ارتسام کے ساتھ شامل ہو کر عقل کا خام مواد ہیں جن کو عقل مرتب اور منظم کرکے کسی معین معروض کا تصور مکمل کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ کسی معروض کے عقلی تصور کے لیے کوئی خاص متعین زمانی اور مکانی ارتسام کافی نہیں بلکہ گزشتہ زمانی اور مکانی تجربات کے تحت معروض کو مجموعی طور سے جیسا ہونا چاہیے — اس کو ٹھیک لیا ہونا چاہیے

غرض یہ کہ عقل کا عمل ظواہر پر ہوتا ہے، اصل حقیقت جو ظواہر کی تہہ میں ہے، وہ اس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے اس لیے عرفان حقیقت اس کے حدود کار سے بہت بلند ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود کے تحت فکر کرتی ہے جن کا اصل حقیقت پر اطلاق نہیں ہوتا محض اس اصول کے پیش نظر کہ ہر اثر کے لیے اثر آفریں اور معلول کے لیے علت درکار ہے، وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکتی ہے لیکن خود حقیقت یا حقائق اپنی اندرونی حیثیت میں اس اصول کے تحت میں یا اس اصول کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا، اس پر عقل کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ وہ تو صرف ظواہر کا یا دوسرے لفظوں میں معروضات کا اپنے طریقوں اور اپنے شروط کے ساتھ جائزہ لے سکتی ہے مگر خود حقیقت کو اس کی واقعی نوعیت کو، اس کے حقیقی لوازم و اوصاف کو، ظواہر کے ساتھ اس کے تعلق کو اگر کچھ ہو تو، پھر اس تعلق کی نوعیت کو کسی طرح نہیں محسوس کر سکتی۔[1]

حقیقت کو دریافت کر لینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو براہ راست محسوس کیا جائے۔ جب حقیقت خود محسوس ہو جائے گی تو شاید کائنات سے متعلق 'کیا ہے'، 'کیوں ہے'، اس کے تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے، اور کب سے اور کہاں سے ہے، جیسے سوالات کا جواب خود بخود ہی واضح ہو جائے گا۔ لیکن کیا اس کو براہ راست محسوس کرنا ممکن بھی ہے۔ اقبال کا جواب غالباً صوفیانہ مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ ہے کہ ممکن ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اقبال دل کو براہ راست احساس حقیقت کا منصب دیتے ہیں۔ دل سے اقبال کی مراد غالباً وہ مقدس الٰہی لطیفہ ہے جو انسانی ظواہر میں بحیثیت باطن ذات یا حقیقت انسانیہ کے پوشیدہ ہے اور یہی محل ہے تجلیات الٰہیہ کا دل کے براہ راست محسوس کرنے کی ہی دوسری تعبیر وجدان ہے۔ اقبال عقل کے ادراک اور دل کے مشاہدے کا فرق اور عقل کے حدود اور قیود اور

---

[1] عقل کے دائرہ عمل اور طریق کار کی تشریح میں کانٹ کے زاویۂ نظر کو پس منظر کے طور پر بالقصد سامنے رکھا گیا ہے۔ مجھے برگسانی انداز نظر کی تائید میں اقبال کے اس عہد کے کلام میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔

اس کے مقابلے میں دل کی آزادی کو بیان کرتے ہیں :

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے　　اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے　　اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے　　تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی　　حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکان سے رشتہ بپا　　طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　عرش رب جلیل کا ہوں میں

شاید عقل کی اس "مظاہر وابستگی" اور "زمان و مکان سے رشتہ بپائی" کا انکشاف اور دل کی اس باطن بینی اور "سدرہ آشنائی" کا شعور ہی تمہید ہے اقبال کے "شمشیر ذوق جستجو" کے زخموں کے اندمال کی ابتدا کا اور "دیدہ دری" کے رستے میں گرم سیر ہونے کا۔

اقبال اور وحدت وجود

دل یا انسان کی باطنی ذات عقل کے واسطے کے بغیر اصل حقیقت کو خود بخود محسوس کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دراصل ایک ہی حقیقت ہے جو انسان بھی ہے اور دراصل بھی۔ کسی چیز کے براہ راست شعور کے لیے معروض شعور اور شاعر کو ایک ہونا چاہیئے یا ایک دوسرے کا براہ راست وصف ہو یا دونوں کسی تیسری ذات کے براہ راست اوصاف ہوں۔ آخری دونوں صورتوں کا مآل بھی یہی ہے کہ محل اور موصوف یا ذات اور بطن ایک ہی حقیقت ہے جو حامل ہے متعدد اوصاف اور اعتبارات کی۔ غرض یہ کہ دل کی باطن بینی اور انفس و آفاق کی وحدت لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اپنے اس ابتدائی دور میں جہاں دل کی باطن بینی اور معرفت پر زور دیا وہاں انفس اور آفاق کی اندرونی وحدت یا دوسرے لفظوں میں نظریہ وحدت وجود کی بھی حمایت کی جو کسی نہ کسی حیثیت میں آخر تک ان کے فلسفے کا بنیادی عنصر رہا۔

۱۹۰۵ء تک کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے سامنے 'وحدت وجود' کا کوئی متعین اور مستند نظریہ اپنی تفصیلوں اور عقلی توجیہوں کے ساتھ نہ تھا۔ ان کا وحدت وجود کا تصور غالباً ان منتشر معلومات پر مبنی تھا جو مختلف ماخذوں اور متعدد مکاتیب سے ماخوذ تھے۔ اس میں نہ ناقدانہ انتخاب ہے نہ عالمانہ ترتیب و تعمیر۔ یہ بھی بعید نہیں کہ اردو، فارسی اور ہندی شعرا کے متفرق صوفیانہ کلام نے خاص طور سے اس باب میں ان کی رہنمائی کی ہو۔ بہرحال ان کے اس عہد کے تصور میں کسی فلسفیانہ گہرائی یا براہ راست صوفیانہ احساس کو بہت کم دخل ہے تاہم انھوں نے اپنی "امتیاز دیر و حرم میں پھنسی ہوئی" فکر کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے "سیمابی جوش اضطراب" کو ٹھنڈا کرنے کی ایک راہ نکالی ہے۔ یہ علم کی بے تابی کو تسکین دینے کے لیے ایک شاعرانہ تخیل ہے جس میں متعدد مکاتب خیال کے خاص خاص نقطے، ان کے عقلی نتائج کو سامنے رکھے بغیر شامل ہیں[1]۔

---

[1] یوں تو کثرت کی وحدت سے توجیہہ مشرقی مفکرین کا ہی امتیاز نہیں فلاسفہ مغرب بھی۔ قدیم یونانیوں میں بھی وحدت وجود کے حامی رہے ہیں اور یورپ کے جدید علمار میں بھی متعدد اہل فکر کا یہی میلان رہا ہے۔ میں یہاں صرف شنکراچاریہ اور ابن عربی کے نظریوں کی تلخیص پر اکتفا کر رہا ہوں۔ آیندہ پتہ چلے گا کہ اقبال نے بھی انہیں کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہی مشرق کے مشہور نظریے ہیں جو خواص ہی نہیں بلکہ عوام تک پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اور اقبال کے تصور میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی دونوں کا اثر ہے۔ شنکراچاریہ کے نزدیک دراصل حقیقت صرف برہما ہے۔ برہما اپنی ذات کے اعتبار سے ازلاً ابداً یکساں ہے۔ ہر قسم کی دوئی سے منزہ، صور اور اشکال سے ماورا، ہر قسم کے تعلق اور آمیزش سے بری، صرف ذات محض، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے برتر شعور محض، سکون خالص۔

کائنات اپنی تمام جزئیات اور پوری تفاصیل کے ساتھ برہما کی مظہری صورت ہے۔ اس ظہور کی علت اور اس کا محل اور ہیولیٰ بھی خود برہما ہی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی ہستی نہیں۔ عالم یا یہ مظہری کثرت عملی اور کاروباری واقعیت کے طور پر موجود ہے، ذہنی تخیلات اور خواب کے محسوسات سے بالکل مختلف اور جدا۔

برہما کی اس مظہری ہستی یا کثرت میں اور انسانی "انا" کی مظہری ہستی میں تلازم ہے۔ جب تک مظہری واحد اپنی مظہری شخصیت کو قائم رکھے ہوئے ہے ربانی

اس زمانے کی مشہور نظم "شمع" اور بعض دوسرے متفرق اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حقیقت اور واقعیت صرف ایک ہے جس میں خالق اور مخلوق، علت اور معلول یا کائنات اور مکوّن کا فرق نہیں۔ یہ جیسی تھی ویسی ہے۔ ایک ہی تھی اور ایک ہی ہے یہ ظاہری کثرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ اس کثرت کا واقعی فرد ہے اور کثرت اس کے لیے واقعی حقیقت ہے۔ اس کی یہی مظہری واقعیت بنیاد ہے اس کے سماجی تعلقات کی اور اسی پر مدار ہے اس کے مذہبی فرائض وواجبات کا۔ اعمال اور ان کے اثرات کی واقعیت اسی مظہری ہستی سے مشروط ہے۔

لیکن یہ کثرت واقعۃً حقیقی نہیں۔ اس کی بنیاد محض بے علمی یا جہالت ہے۔ جوں ہی اصل حقیقت کا عرفان ہوا کہ "تو ہی ہے" اور "انا" حقیقتاً خود ہی برہما ہے تو یہ کثرت غایب ہو گئی۔ اب نہ اعمال ہیں نہ ان کے اثرات، نہ تعلقات ہیں نہ متعلقین فقط برہما ہی برہما ہے؛ ایک اور یکساں، جب تک جہالت رہتی ہے اور حقیقت کا عرفان نہیں ہوتا "میں" "میں" رہتا ہوں اور "تو" "تو"۔ جہالت رفع ہوئی تو نہ تو تو ہے نہ میں میں: صرف برہما ہے، ہر قسم کی کثرت اور ہر طرح کے تعلقات سے مقدس، بے صورت، بے قید، حقیقت خالص اور شعور محض۔

یہ عدم عرفان یا جہالت شخصی تو ہے ہی لیکن چوں کہ پوری مظہری کائنات کی بنیاد ہے اس لیے عالمی یا کائناتی بھی ہے اور چونکہ پوری مظہری کائنات اصل حقیقت کے اعتبار سے برہما ہی برہما ہے اس لیے یہ جہالت یا عدم عرفان بھی برہما ہی ہے اور مظہری کائنات کی طرح خود بھی عملی اور کاروباری واقعیت ہے لیکن چوں کہ اصل عرفان کے ساتھ یہ فنا ہو جاتی ہے اس لیے بے حقیقت اور لاشئی محض ہے۔ حقیقت تو وہی ہے جو لازوال ہے۔ گویا کائنات یا کثرت نتیجہ ہے جہالت کا جو بے حقیقت اور بے بود ہے اور برہما کا جو حقیقت ہے اور ہست۔

ابن عربی کے نزدیک ذات یا حقیقت صرف ایک ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی حقیقت نہ کوئی وجود۔ ذاتی حیثیت میں یہ حقیقت مجہول الکنہ اور مبہم ہے، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے ماورا، خود ابہام اور اطلاق بھی اس کے لیے قید نہیں۔ تمام اعیان اور اسماء وصفات سے بالاتر۔ ازلیت اور ابدیت سے بھی برتر۔ ہستی یا مصدری وجود بھی ایک تعین ہے اور اپنی اس حیثیت میں ذات تعینات سے بلند ہے۔ ناقابل تعبیر ہے، بے عنوان اور بے اسم غیب محض بغیر فعلیت وظہور۔

یہ حقیقت متعدد تنزلات یا درجات کے لحاظ کے بعد سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تنزل ایک طرح کے تعین ہیں چنانچہ سب سے پہلا تعین وجود ہے دوسرے تمام اوصاف اور تعینات سے معرّا۔ یہ ذات کا وجود ہے اور صرف ذات کے لیے۔ ہر قسم کے علم و ادراک سے ماوراء۔ حقیقت کا یہ وجودی تعین منشاء ہے اس کے علمی تنزل کا۔ موجودہ حقیقت جو اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور امکانات پر مشتمل ہے، علم ذات کا موضوع ہے۔ ذات کا یہ عرفان خود اپنے آپ کا عرفان ہے جو شامل ہے ذات کی تمیز اور متعین حیثیت کے علم کو اور اپنے تمام متمیز متعین امکانات اور صلاحیتوں اور قوتوں کے علم کو۔ ذات کا یہی علمی تعین مبدأ ہے اس کی علیت کا۔ بہرحال ذات کی یہ اندرونی صلاحیتیں ایک دوسرے لحاظ سے ظواہر عالم کی حقیقتیں ہیں جن میں ظواہر کے تمام امکانات شامل ہیں۔ یہ صلاحیتیں جو علم حق میں اپنے کیفی امتیاز کے ساتھ ازلاً ابداً ثابت ہیں "اعیان ثابتہ" کہلاتی ہیں۔ ذات حقہ اپنے امکانات کے علم کے ساتھ مبدا ہے ان امکانات کے ظہور کا۔ ان امکانات کا ظہور جو ظہور ہے کائنات کا، ذات حقہ کا ظہوری تنزل ہے۔ یہ ظہور جس طرح تقاضا ہے ذات کا اسی طرح خود یہ امکانات یا اعیان ثابتہ بھی اپنے ظہور کے متقاضی ہیں۔ ذات کے تقاضائے ظہور کی منشا محبت یا عشق ہے اس حب ظہور کا پہلا مطلوب ظرف ظہور کا حصول ہے۔ یہ ظرف ظہور جس میں اشیاء اپنی مکانی یا درجاتی ترتیب سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں ظہور اشیاء سے پہلے محض ایک وہمی اور خیالی خلا ہے۔ عماء کہلاتا ہے۔ ذات کے ظہوری تنزل کے معنی ہیں اس کے امکانات کا جو دوسری حیثیت میں ظواہر عالم کے امکانات یا اعیان ثابتہ ہیں، ظاہر اور مشہود ہو جانا۔ یہ امکانات علم حق سے قطع نظر غیر متمیز استعداد ہے جو مادہ ہے عالمی کثرت کا، چنانچہ شیخ اس کو "ہباء" کا نام دیتے ہیں۔

ہباء استعداد اور امکان ہے ذات حقہ کا۔ اس کی حقیقت ذات حقہ کے علاوہ کچھ نہیں، اس کی ہستی کے معنی ہیں ذات کی ہستی اس کے ظہور کا مفہوم صرف ذات کا ظہور ہے۔ ذات کے ظاہر ہونے کا مطلب اتنا ہی ہے کہ قوتیں فعلیتیں ہو جاتیں۔ ذات کی کسی فعلیت کا نمودار ہونا ذات کا اس طرح موجود ہونا ہے کہ اس سے ایک خاص انداز نمودار ہو۔ مثلاً زید کی کسی استعداد جیسے قیام کی سکت، قعود کی سکت یا لکھنے پڑھنے کی سکت کے عملی حقیقت بن جانے کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو کائنات یا عالم کہا جاتا ہے ہمارے اپنے شعور اور آگہی کا ساختہ ہے، حقیقت میں نہ "من" ہے نہ "تو" ہے نہ کوئی ملند ہے نہ پست، نہ کہیں مہک ہے نہ کہیں مستی:

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے — گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی — اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

اگر یہ شعور و آگہی فنا ہو جائے تو یہ تمام تعینات ختم ہو جائیں اور وہی ازلی اور ابدی حقیقت رہ جائے جس میں من و تو کا کوئی فرق نہیں:

آزاد دست برد بقا و فنا ہوں میں — کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

یہ مجہول الکنہ حقیقت جو وحدت صرف ہے بے جہتی اور اطلاق محض ہے بے تعین، عرفان ذات کی خواہاں اور نمود کی متقاضی ہے۔ ذات کا یہ تقاضائے نمود، حقیقت کی یہ خواہش عرفان علت ہے کثرت کی اور سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تقاضائے نمود یا عشق نظارگی دعوت بے حجابی ہوتی ہے۔ اور تعینات اور امتیازات نمایاں ہو جاتے ہیں: وحدت کثرت نظر آنے لگتی ہے اور دعوت بے حجابی کو مہمیز کرتی ہے:

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق — آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

اب خواہش دید پیدا ہو گئی، چشم شعور وا ہونے لگی:

یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ — ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

ذات کا مرتبۂ اطلاق و ابہام وجود سے برتر اور شعور و آگہی سے ماورا ہے۔ ہستی ہی عین شعور و آگہی ہے۔ ہستی وہ کائنات کی ہو یا حقیقت مطلقہ کی بنیاد ہے تعین و امتیاز کی، اساس ہے تعلق اور وابستگی کی بنیاد کی۔ ہستی سے جہاں ذات متعین اور متمیز ہوتی ہے۔ وہیں اشیاء یا کثرت اور کائنات باہم دگر بھی اور خود اصل حقیقت سے بھی متمیز ہو جاتی ہے اور متعین و حدتیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں؛ من و تو میں فرق ہو جاتا ہے بلندی اور پستی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گل میں مہک، اور شراب میں مستی صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ حسن و عشق کے الگ الگ موضوع دکھنے لگتے ہیں؛ ہستی کا یہ پردہ سب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ الگ الگ قیدی اور الگ الگ قفس۔ حقیقت سے دور ہر ایک اپنے اپنے غمکدے میں غربت کے دن گزارتا رہتا ہے:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی — شام فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیب درخت طور مرا آشیا نہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معنی یہی ہیں کہ زید ایک ایسے انداز اور ایسی وضع میں موجود ہے کہ دیکھنے والا اس کو کھڑا، بیٹھا یا لکھتا ہوا، پڑھتا ہوا محسوس کرے۔ کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے، یا لکھنے پڑھنے کی نہ تو کوئی الگ ہستی ہے اور نہ ان کی کوئی الگ حقیقت ہے۔ چنانچہ یہ ہماری یا استعداد محض فعلیاً اختیار کرتی ہے اور ذات حق کی شہودی تجلی کا محل بن جاتی ہے تو کائنات یا کثرت نمایاں ہو جاتی ہے۔ گویا کائنات ذات باری کا اپنا ایک خاص انداز وجود ہے اور بس۔ شیخ کے نزدیک کائنات اپنی نوعی حیثیت میں قدیم ہے۔ ذات حق ازلاً اور ابداً موجود ہے اور اس کی موجودگی کے لیے کوئی نہ کوئی انداز وجود ضروری ہے۔ اس کا یہ انداز وجود اس کے کسی نہ کسی امکان کا ظہور ہے اور ہر امکان کا ظہور کسی نہ کسی فعلیت کی نمود ہے۔ یہی فعلیت کوئی نہ کوئی شے ہے۔ اور یہ سلسلہ ازل سے ابد تک برابر جاری ہے۔

ابن عربی کے نزدیک اگرچہ کائنات کی اپنی الگ کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا کوئی اپنا الگ وجود ہے تاہم وہ حقیقی اور واقعی ہے نہ کوئی دھوکہ ہے نہ کوئی التباس اور فریب۔ ذات باری سے بھی ممتاز اور اس کی کثرت باہم بھی ممتاز، ایک دوسرے سے الگ۔ ہر شے خود ہی شے ہے نہ کہ دوسری۔

ہستی کا سراپا جستجو ہونا، راز حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا حقیقت سے اسی غیر شعوری تعلق کے غماز ہیں:

یاد وطن فسردگی بے سبب بنی　　شوق نظر کبھی کبھی ذوق طلب بنی

من و تو کا یہ فرق، گل و بلبل کا یہ امتیاز، شمع و پروانہ کی یہ تشخیص، گلشن کن کی یہ بہار کیا سچ مچ واقعی ہے؟ کیا حسن و عشق حقیقتاً الگ الگ ہیں؟ عالم کی یہ کثرت کیا حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے جس کو شعور و آگہی کی غفلت آفرینی نے اپنے اظہار کے لیے گھڑ لیا ہے:

چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے　　عالم ظہور جلوۂ ذوق شعور ہے

ورنہ صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماورا، یہاں تو "محمود" ہے اور بس "ایازی" جہالت کا اختراع ہے:

محمود، اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے　　کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے

شعور غفلت آفرین اور آگہی غلط نگر کا یہ کائناتی سلسلہ، زمان بردوش اور امکان در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا اور حقیقت مطلقہ صید و صیاد میں اور حلقۂ دام و بام حرم میں جدا جدا محصور ہو گئی ورنہ واقع میں نہ کوئی پہلے ہے نہ بعد، نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ تنہا ایک حقیقت ہے جس کو چاہو ناز کہہ دو چاہو نیاز نام رکھ دو؛ ناز نیاز ہے اور نیاز ناز، ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر:

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے　　طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں　　اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں

صیاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ　　بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں　　پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اس شعور و آگہی کا سبب، جس کی غلط نگاہی سے حقیقت جدا جدا تعینوں اور امتیازوں میں مقید ہو جاتی ہے خود ہستی ہے اس لیے حقیقت کے بے قید وحدت اور بے تعین اطلاق کے لیے اس ہستی کا فنا ہونا ضروری ہے:

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ　　پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

گویا شخصیت کا نصب العین اور "انا" کا مطمح نظر خودی کو فنا کرنا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنا:

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ　　اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا　　حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

اقبال کے اس شاعرانہ "وحدت وجود" کا غالباً حاصل یہ ہے کہ صرف ایک ہی حقیقت ہے بے قید بے امتیاز؛ اس کی اندرونی ذات اپنی خواہش عرفان کے تحت ظہور کی متقاضی ہے۔ یہ مظہری وجود یا کثرت اسی تقاضے کا جواب ہے۔ وہ شعور خالص جو خود ذات ہے اور ذات کا ہے اور صرف ذات کے لیے ہے۔ مظہری صورت میں وحدت کو جدا جدا اور زمانی مکانی تعینوں میں دیکھنے لگتا ہے لیکن جس طرح حقیقت کا یہ رخ محض مظہری ہے اندرونی اور باطنی واقعیت نہیں، اسی طرح شعور کی یہ گرفت بھی اندرونی اور باطنی حقیقت کی گرفت نہیں۔ یہ مظہری ہستی باطل یا نظر انداز ہوئی اور اصل حقیقت سامنے آئی تو پھر وحدت ہی وحدت رہ جاتی ہے؛ بے امتیاز اور بے تعین۔ خود شعور کا بھی یہ غیر واقعی انداز ختم ہو جاتا ہے۔ اب حقیقت ہی حقیقت محسوس ہوتی ہے 'تو'، فنا ہو جاتا ہے اور 'میں' ہی 'میں' رہ جاتا ہے۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ　　میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

زندگی سے فرار کی خواہش اور وحدت وجود

اس زمانے کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ وحدت وجود کا اقبال کی فکر پر خاص اثر نہ تھا: نہ وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے نہ ان کے

یہاں معاشرتی تعلقات سے گریز کی تلقین ہے نہ وہ ظواہر سے بچ کر گزرنا چاہتے ہیں نہ باطن ہی باطن کی تلقین کرتے ہیں نہ ان کے کلام سے کسی ہمہ گیر انفعالی دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔" ایک آرزو" میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی سے فرار، عزلت گزینی کی غیر معمولی خواہش، مظاہر قدرت سے انفعالی دلچسپی نمایاں ہے:

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا　　ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری　　دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں　　دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں　　چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا　　ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

لیکن اس کے لہجے میں سنجیدگی اور طمانیت نہیں، آرزو میں خلوص اور طلب میں سچی تڑپ نہیں ہے بلکہ جھنجلاہٹ ہے مایوسی کا وقتی ردعمل ہے، ناکامی کا غصہ ہے۔ اہل وطن کی بے حسی کا ماتم ہے۔ چنانچہ اسی نظم کے دوسرے بند کے اشعار ہیں:

شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن　　ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر　　میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت　　ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

اہلِ وطن کا یہی اختلاف اور افتراق تھا جس سے فلسفی اقبال کا نہیں بلکہ شاعر اقبال کا دل بجھ گیا اور وہ نت نئے ہنگاموں سے اکتا اٹھا:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب　　کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اور اس کو مذہب سے تعلق کے باوجود ملا اور پنڈت دونوں سے دلچسپی نہیں رہی:

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن　　میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں　　روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

لیکن اس پر بھی ان کے دل کی تمنا یہی ہے کہ:

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے　　بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال کا میلانِ طبع | اس ابتدائی دور میں اقبال کے مخصوص فلسفے کی تلاش تو عبث ہے لیکن بلند نظری، عالی حوصلگی اور احساسِ ذات کی مثالیں ان کے کلام سے انتخاب کر لینی مشکل نہیں۔ ان کی طبیعت کی یہی افتاد تھی جس سے ان کے آئندہ فلسفے نے ایک خاص میلان حاصل کیا:

ہم صفیر و نغمہ مری عالی نگاہی دیکھنا　　شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لیے

ایک دانے پہ ہے نظر تیری　　اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن　　دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ساتھ ساتھ شاعرانہ واردات کی ہی صورت میں سہی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو آگے چل کر فکری شکل میں ان کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی نظام کے عناصر بنے۔

انسان کی اہمیت | اقبال نے گوناگوں طریقوں اور مختلف اسلوبوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان قدرت کا شہکار

اور کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے:

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا ۔۔۔ سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا ۔۔۔ سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

کائنات کی آرائش و پیرائش اسی کے دم سے ہے۔ کائنات کی تعمیر میں جو خرابیاں مضمر ہیں، جو ناآہنگیاں اور فساد و فتنہ اس میں چھپے ہوئے ہیں ان کو دور کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اسی کا منصب ہے۔ "انسان اور بزمِ قدرت" میں قدرت کی زبان سے اس کے منصب اور ذمہ داریوں کا دوسرے مظاہر سے مقابلہ کیا گیا ہے:

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود ۔۔۔ باغباں! ہے تری ہستی پئے گلزار وجود
انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں ۔۔۔ عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے ۔۔۔ بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے

انسان کی اس عظمت کا اصل راز اس کا شعور اور آگہی ہے "چاند" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو ۔۔۔ سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے ۔۔۔ یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

محض شعور ہی نہیں بلکہ شعورِ ذات اور یا احساسِ نفس اپنی اہمیت کا پورا پورا وقوف، خاص عنصر ہے انسانی فضیلت کا "آفتابِ صبح" سے خطاب ہے:

اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ۔۔۔ ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

آرزو

حیاتِ انسانی کی کائناتی اہمیت اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں پوشیدہ ہے۔ آرزو ہی ہے جو اس کو خوب سے خوب تر تک لے جاتی ہے، انتشار میں اصلاح کا خواب دکھاتی ہے، ناآہنگیوں میں آہنگ کا خیال آتا ہے، مظاہر سے اسباب و علل کی طرف نظریں اٹھتی ہیں:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا ۔۔۔ علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

"گلِ رنگیں" سے مخاطب ہیں:

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو ۔۔۔ اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

عمل

اقبال محض آرزوؤں اور تمناؤں میں کھیلتے رہنے کو انسانیت کا جوہر نہیں سمجھتے۔ اصل مقصد ان آرزوؤں اور تمناؤں کو عملی حقیقت بنانا ہے۔ فرزندِ آدم کا حقیقی امتیاز یہ ہے کہ وہ اسباب و علل کو سمجھے اور خوب سے خوب تر کو پیدا کرے، فساد کی بنیادوں کا پتہ چلائے اور اصلاح کے میدان ہموار کرے، اس کے لیے "زیبِ محفل ہونا" کافی نہیں "شریکِ شورشِ محفل ہونا" ضروری ہے۔ ہنگامۂ عالم کا دور سے تماشا کرنا فضول ہے۔ بلکہ اس کے صدموں کو برداشت کرنا ناگزیر ہے:

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں ۔۔۔ یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں

"سید کی لوحِ تربت" پر وہ یہ وصیت پڑھتے ہیں کہ "ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں"۔ "تصویرِ درد" میں اہلِ وطن کو سبق دیتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو ۔۔۔ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے ۔۔۔ جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

عمل کے لیے بے خوفی، دلیری اور خلوص ضروری ہے، اس کو وہ مومن کی خصوصیت سمجھتے ہیں:

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے ۔۔۔ قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

شخصی بقاء

سلسلۂ ارتقاء کا یہ آخری حلقہ! انسان جس کی حیاتیاتی قدر و قیمت اسی کی حد تک محدود نہیں بلکہ خود کائنات کی اصلاح و ارتقاء کے لیے بھی اس کے وجود کی اہمیت ہے! اقبال کے لیے اسی وقت سے دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کی شخص

حیات کا اتنا مختصر وقفہ اور پھر ہمیشہ کے لیے فنا کے بے پایاں اور گہرے سمندر میں ڈوب جانا ان کی فلسفیانہ طبیعت کے لیے کبھی طمانیت بخش نہیں ہوا۔ ان کا تخیل فنا کو زندگی کا منتہا اور غایت تسلیم کرنے کو کبھی آمادہ نہ ہوا۔ وہ زندگی کہتے ہی اس کو ہیں جو فنا سے دوچار نہیں ہوتی "صبح کے ستارے" کی زبانی کہتے ہیں:

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل ۔۔۔ کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

لیکن حیات کا ایک نہایت مختصر مدت کے بعد زوال روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، "کنار راوی" پر کشتی کو دور افق میں غائب ہوتے ہوئے دیکھ کر اقبال کا شاعرانہ تخیل انسانی حیات کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی توجیہہ پیدا کر لیتا ہے:

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہیں ۔۔۔ ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا ۔۔۔ نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

چنانچہ ان کے نزدیک موت زندگی کی فنا نہیں بلکہ وہ خود ایک خاص طرح کی زندگی ہے جس کو عام نظریں محسوس نہیں کر پاتیں:

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شرار زندگی ۔۔۔ مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن فنا کیوں کر ہوا

۱۹۰۵ء تک کا فکری تجزیہ

یورپ روانہ ہونے سے پہلے تک کی اس مختصر مدت کے کلام کے اس تجزیے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی نظر کے سامنے اکثر وہ بنیادی سوال آ چکے تھے جو آخر تک ان کی فکر کا محور رہے۔ ان سوالوں کو جہاں تک حل کرنے کا تعلق ہے اس زمانے کے کلام میں اس کی کوششیں صاف نمایاں ہیں لیکن ان میں فکر کی پختگی سے کہیں زیادہ شاعرانہ تخیل ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی فکر کا رخ گو پوری پوری طرح نہ سہی مگر ایک بڑی حد تک متعین ہو چکا تھا۔

اقبال یورپ کے تعلیمی اور معاشرتی ماحول میں

۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اقبال یورپ روانہ ہو گئے اور ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور ازسر نو کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ یہاں انھیں مشہور استاد فلسفہ ڈاکٹر میک ٹیگرٹ اور وہاں دوسرے وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن اور ان کے نامور ڈاکٹر نکلسن سے تعلقات نے مثنویات کے ذوق کو پھر تازہ کر دیا چنانچہ ڈاکٹریٹ کے لیے اقبال نے "ایرانی مابعد الطبیعیات" کا موضوع منتخب کیا اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ اس تقریب سے برلن، میونک اور ہائیڈل برگ کے اساتذۂ فلسفہ سے بھی استفادہ کیا۔ ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی مناسبت سے اسلام کے بنیادی عقائد اور ان کے اثرات، مسلم خصوصاً ایرانی اثرات سے متاثر تصوف اور ان کے اثرات کی تحقیق کا بھی ان کو موقع ملا اور اس موضوع کے خصوصی ماہرین کے مشورے اور رائیں بھی انھیں ملتی رہیں اور بحث و تنقید کی سہولتیں بھی میسر آئیں مغربی فلسفہ تو ان کا ہندوستان سے ہی ابتدائی مضمون تھا کیمبرج میں اس پر زیادہ وسیع اور زیادہ عمیق نظر ڈالنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

یورپ میں قیام کے دوران حمایت اسلام کا فریضہ انجام دینے والے مشہور اسلامی مصنف جسٹس امیر علی اور بہت سے دوسرے اکابر علم سے روابط پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک کی اہم اور نمایاں شخصیتوں سے ملاقات اور گفتگوؤں کے وقتاً فوقتاً اتفاقات رہے۔ متعدد بار اسلامی ممالک کے اکابر اور طلبہ سے بھی بات چیت رہی ہوگی۔ ان روابط اور گفتگوؤں سے انھوں نے بین الاسلامی رشتے اور وطنی تعلق دونوں کے فرقوں کو محسوس کیا ہوگا۔

ہندوستان کی جامد اور بے کیف زندگی کے مقابلے میں انھیں یورپ کی فعالی اور متحرک زندگی کو اندر اور باہر سے دیکھنے کے، سمجھنے کے، اس کے عوامل اور محرکات کو جاننے اور مختلف پہلوؤں سے اس کو جانچنے کے اور اس کے اثرات کی ناپ تول کے پورے مواقع حاصل ہوئے، جن سے ان کی فلسفیانہ طبیعت نے فائدہ اٹھایا۔ مغربی ممالک کے قومی غرور اور بین الاقوامی احساس اور ان کے مظاہر کا اور ان کے بنیادی اسباب و محرکات کا مطالعہ کیا ان کے تہذیبی اور معاشرتی نتائج اور امکانات پر نظر ڈالی اور مختلف نظری اور عملی فلسفوں سے روشناس ہوئے۔ غرض یہ کہ اقبال نے یورپ میں دیکھا بھی اور سیکھا بھی، سراہا اور اثر لیا، ناپسند کیا اور نفرت بھی کی۔

یورپ کی فعالی کا اقبال پر اثر

یورپ کی تحریک عمل اور فعالی کا جہاں تک تعلق ہے اقبال اس سے خاص طور سے متاثر ہوئے

حتیٰ کہ ایک زمانے میں اسی تاثر کے پیش نظر انھوں نے شعر وسخن کو بھی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا:

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہدے　　جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

لیکن بعض احباب کی فہمائش اور اپنے استاد مسٹر آرنلڈ کے فیصلے کے سامنے انھیں اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔

اقبال ہندوستان میں بھی مادیت پسند اور مظاہر پرست نہ تھے لیکن یورپ کی فعالی میں اس کے مادی زاویہ نظر اور خالص کاروباری نقطۂ نظر کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہ اقبال کی فلسفیانہ افتاد طبع تھی کہ انھوں نے یورپ کی فعالی کو تو گرہ میں باندھا لیکن اس کی مادیت اور مظاہر پسندی سے انھوں نے کوئی رشتہ نہیں جوڑا بلکہ اس کی ہلاکت باری کی پیشنگوئی کی:

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

چنانچہ اس زمانے میں اقبال نے مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پہلوؤں سے حرکت، عمل، جدوجہد اور زندگی کے پیہم تقادم اور پیکار کی ضرورت کی خاص طور سے دعوت دی ہے۔ پہلے عمل کی حیثیت ان کے یہاں خیال و ارادہ سے زیادہ نہ تھی لیکن اب وہ مستقل پیام بن گیا ہے:

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے　　کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی　　یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے

[illegible] میں کوئی عظمت نہیں، گویا یہ وسیلہ نہیں مقصد ہے، محرک نہیں خود زندگی ہے:

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں　　کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

[illegible] کے ساتھ ساتھ شاید کسی ذہنی جذبے کے تحت یہ بھی کہنے لگتے ہیں:

[illegible] دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری　　گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

[illegible] واردات ہے۔

آرزو اور طلب

ہندوستان میں جو مبہم آرزو تھی اب وہ مستقل طلب کی صورت میں نمایاں ہو گئی ہے گویا آرزو اور طلب لازم اور ملزوم بن گئے ہیں۔ آرزو محض خلش نہیں "آرزوے نو" ہے "تخلیق مقاصد" کا مقدمہ ہے:

دیکھو مغرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار　　قیس کو آرزوے نو سے شناسا کر دیں

[illegible] مقصد ہے، جدوجہد کا مطلوب ہے، تڑپ کا مدعا ہے:

غرض ہے پیکار زندگی سے، کمال پائے ہلال تیرا　　جہاں کا فرض قدیم ہے تو، ادا مثال نماز ہو جا

[illegible] کسی کی قسمت نہیں۔ مال مسالہ بکھرا پڑا ہے، فراہمی اجارہ داری نہیں، نہ آئینہ سازی سکندر پر موقوف ہے:

[illegible] ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے　　تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

طلب [illegible] پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ مطلوب کو ہمیشہ حاصل سے آگے رہنا چاہیے اور کسی بھی حاصل پر اکتفا نہ ہونا چاہیے:

[illegible] قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری　　وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اس لیے زندگی ہی کا دوسرا نام طلب ہے، طلب نہ ہو تو پھر زندگی زندگی نہیں موت ہے۔

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو　　گردش آدمی ہے اور، گردش جام اور ہے

لاموجود الا اللہ

عمل اور جدوجہد کی اہمیت کو فکری طور پر محسوس کر لینے اور اس کو اپنا مستقل پیغام بنا لینے کے ساتھ ساتھ اقبال وحدت وجود کے حامی نظر آتے ہیں اور کثرت کو اصل حقیقت کی ہی جلوہ گری اور اس کا تنزل سمجھتے ہیں۔ سب ایک ہی سرمدی

حقیقت کے تعینات ہیں۔ اگر ان تعینات کے بطن کو محسوس کر لیا جائے تو صرف ایک ہی حقیقت ہے جو موجود ہے باقی سب معدوم۔

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو		کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن اب وہ اس کثرت کو غالباً محض آگہی کا زائیدہ نہیں خیال کرتے اور نہ اصل ہستی کو پردہ مان کر اس کو اٹھا دینے کی فکر میں رہتے ہیں وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کثرت کے بطن میں جو وحدت پنہاں ہے اس کو نظر انداز نہ کیا جائے اور حسن ازلی کا سب کو مظہر جان کر سب سے عملی دلچسپی لی جائے اور چیزوں میں امتیاز و غیریت کی ناقابل شکست دیواریں نہ حائل کر لی جائیں، زاویۂ نظر کو بدل جانا ہونا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کے یہ سب مختلف مظاہر ہیں اور ہر مظہر اپنا ایک مقام رکھتا ہے:

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ		چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ان مظاہر کے عقب میں صرف ایک ہی وجود ہے جو قائم و دائم ہے اور وہی ان مظاہر کا وجود ہے، اس وجود کے علاوہ مظاہر کا کوئی الگ وجود نہیں؛

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا		لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

مظاہر تو اس وجود برتر کے فقط اطوار و اعتبار ہیں۔ یہ محض بحر وجود کی موجیں ہیں اور حقیقت کی اپنی ترنگیں ہیں:

چشم نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے		تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل حقیقت کا عشق اور اس سے تعلق کا شدید احساس ان اطوار وجود اور اعتبارات حقیقت کو باطل کر دیتا ہے تاہم یہ ایک حال ہے، یہ عشق کی سرمستی ہے جو اس بت اعتبار کو توڑ دیتی ہے:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق		ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

وحدتِ وجود کا یہ تصور اب محض شاعرانہ نہیں رہا ہے بلکہ ابن عربی کے مستند نظریے سے کچھ زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ تعینات کے واقعی ہونے میں اور باہم امتیازات کے حقیقی ہونے میں ان کا کلام واضح اور قطعی نہیں ہے۔ تاہم اس کی تشریح ابن عربی کے مذاق پر بھی کی جا سکتی ہے[1]۔

نقاضائے نمود

ظہور کا تقاضا یا نمود کی خواہش جو پہلے صرف ذات حق تک محدود تھی اب پوری کائنات پر چھا گئی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر وحدت ظہور کا تقاضا رکھتی ہے، ہر شے میں نمود کی خواہش ہے۔ دریائے ہستی کا ہر قطرہ ہستی کی لذت سے آشنا ہے:

لذت گیر وجود ہر شے		سرمست مے نمود ہر شے

وجود سے یہ لذت گیری اور نمود کی یہ ابدی خواہش مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہے اقبال کی دعوت حرکت و عمل کی اور خاص عنصر ہے ان کے آئندہ فلسفے کا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہستی کی نفی ہی حقیقت ہے، حقیقی کمال فنا ہے اور فطرت کا مطالبہ سکون محض ہے تو پھر حرکت و عمل جو اظہار ہے ہستی کا اور خروش ہے بحر وجود کا، حقیقت سے بغاوت ہے اور مقابلہ ہے فطرت کا۔

تغیر اور نمود

اقبال کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کی آئندہ فکر کا جو مسالہ خیالات کی صورت میں برابر جمع ہوتا جا رہا تھا اس میں شاید خالص شاعرانہ توجیہہ کے ضمن میں، تغیر کا اضافہ اسی زمانے میں ہوا ہے۔

---

[1] خاص طور سے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر سے ترجیحاً واضح ہے کہ وہ تعینات کو فریب نظر ہی سمجھتے تھے لیکن چوں کہ غزل کا شعر ہے اس لیے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور تاویل بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ان کا حقیقتاً یہی نقطۂ نظر ہے تو عمل سے اس کا پیوند بہت دشوار ہو گا:

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا		یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا

"حقیقت حسن" میں حسن خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟" اس شکایت کا جواب دیا گیا ہے کہ:

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی ۔۔۔ وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

نمود کے لیے یا دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازم ہے۔ جو شے حرکت نہیں کر رہی ہے تو اس کی فعلیتوں کا بھی اظہار نہیں ہو رہا ہے اور ایسی حالت میں اس کے ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں۔ کامل سکون اور مطلق جمود ہستی نہیں محض عقلی تجرید ہے۔ نمود یا وجود برابر بدلتے رہنے یا محض امکانات کے فعلیتوں میں ظاہر ہونے کا نام ہے اس لیے کسی ہستی کے لازوال ہونے کا مفہوم اس کی نیستی یا مکمل خفا ہے۔ مسلسل بدلتے رہنے کا ہی نام شے ہے۔ ایک فعلیت دوسری فعلیت کو جنم دیتی جا رہی ہے اور دوسری تیسری کو، فقط ثبات تغیر کو ہے زمانے میں۔"

وطنیت کے بجائے ملیت

وطن کے خالص جذباتی ماحول سے علیحدگی، مختلف اسلامی ممالک کے باشندوں سے تعلقات اور ان سے یگانگی کا احساس "ایرانی مابعد الطبیعیات" کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور مختلف وطنوں کی شخصیتوں عمومی وحدت خیال، جذبۂ وطنیت کے مظاہر اور اس کے دور رس نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کی اس سے دلچسپی اور تحریک وحدت اسلامی ان سب کے ملے جلے اثرات نے غالباً اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا اور ان کے جذبات میں کھلا انقلاب آ گیا۔ ایک "ضبِ العتیر" کی صورت میں وطنیت سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب وہ ملت اسلامی کو سماجی وحدت کے ساتھ ساتھ ایک مستقل سیاسی وحدت بھی سمجھنے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل تھا، یہ ایک بڑی موڑ تھی جس نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اگر وہ ملت کی انفرادیت اور وحدت کو مطمح نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی مستقل رخ نہ اختیار کرتی اور وہ دنیا کو ایک نیا خیال نہ دے سکتے۔ خود ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کر پاتی جس نے ان کو شعراء کی صف میں مستقل اور قابل رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا اور شاید ان کی شخصیت بھی اتنی پرکشش اور محبوب نہ رہتی نہ ملکی حیثیت میں اور نہ بین الاسلامی بلکہ اب تو بین الاقوامی حیثیت میں بھی

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا بنانے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم قومیت خود مستقل وحدت ہے جو کسی وطنیت اور کسی قومیت میں محدود نہیں۔ یہ ایک نیا سماجی مظہر ہے جس کے تحفظ کے طریقے بھی نئے ہیں:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا ۔۔۔ بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

کیوں کہ اس نئے سماجی مظہر کا کوئی اپنا وطن ہی نہیں ہے دنیا تو دنیا اور مذاہب کے برخلاف اس کا نصب العین عقبیٰ بھی نہیں ہے:

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ ۔۔۔ نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصول حیات ہیں جن کا شعار اور علامت حرم کی صورت میں پوری قوم کے لیے جاذب ہے:

جاذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا ۔۔۔ اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

محدود وطنیت اور ملکی قومیت افتراق کے بت ہیں جن سے ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنے دامن کو ان بتوں سے بچائے جانے کی یہی تدبیر ہے کہ ملی وحدت کے شعار میں جذب ہو جائیں:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا ۔۔۔ بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

• عبدالقادر کے نام پیغام میں اسلامی قومیت کے اصول کو جو اس غوغائے وطنیت میں نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، ان کا حسن و جمال دکھا کر ملت میں ان کے لیے نئی تڑپ پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں:

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو ۔۔۔ تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

اور یہ غلط خیال جو ملت کے دل میں جا دیا گیا ہے کہ ملی تصورات مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہیں اس کی عملی تردید کا سامان بہم پہنچائیں:

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بت کدۂ چین سے اٹھالیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

فرد اور ملت

اقبال کے فلسفے میں اگرچہ خودی کے اسرار کا انکشاف مقدم ہے تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک ابھی سے نظر آنے لگی ہے۔ جبکہ خودی ابھی ان کے ذہن میں شخصی میلان سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس زمانے میں ملت سے ان کا غیر معمولی شغف بھی جرمنی کا فلسفیانہ ماحول، غالباً ان کا ہی اثر تھا کہ اقبال نے فرد کی مستقل وحدت سے صرف نظر کرلی اور فرد پر اسی اسلامی ملت کے جزو کی حیثیت سے نظر ڈالی جس کی ترکیبی ساخت وطنیت اور قومیت کے بجائے اصول پر ہے۔

چنانچہ فرد کے انفرادیت سے متمتع ہونے کے معنی ملت کے جزو ہونے کی حیثیت سے ملت کے ضمن میں متمتع ہونے کے ہیں اس کی اپنی الگ کوئی ہستی ہی نہیں، اس کی ہستی تو ملت کے ایک ترکیبی جزو کی ہستی ہے اس لیے اس کا پورا اور صحیح تحقق ملت کی ہستی کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے اپنے مفاد کے معنی ہی ملت کا اجتماعی مفاد ہے اور سب افراد کی ہستی کو محض ان کی اپنی ہستی کہنا مجاز اور تسامح ہے:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن مجاز ہو جا

اقبال کی وطن کو واپسی اور انکا فکری نشو و نما

اقبال جولائی ۱۹۰۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی' اے، لندن سے بیرسٹر اور میونک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹر ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس طرح ان کی رسمی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا۔ ان کی فکری نشو و نما کا جہاں تک تعلق ہے تو گویا تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کے نظام فکر کے بہت سے اجزاء کے نقوش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ نقوش کچھ تو گہرے تھے اور کچھ اُتھلے اور بعض کی حیثیت رخ اور میلان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان میں ترمیم و تنسیخ ہوئی اور اضافہ بھی یہاں تک کہ "اسلامی الٰہیات کی تعمیر نو" میں ان کی فکر نے ایک منظم اور مربوط فلسفے کی صورت اختیار کرلی۔

(باقی)

اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمود الٰہی

حیدر آباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں، ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرفہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور پھر وہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک و قوم کی فلاح مضمر ہے اس لیے انھوں نے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔

قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دلدادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے جس سے ان کے ابتدائی رجحانات اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لسان العصر ریاض رضواں اور مرآۃ المثنوی کا شمار قاضی صاحب کے ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ قاضی صاحب کے خطوط کی نقل تو موجود نہیں لیکن علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ میں حامد علی صاحب کا شکرگزار ہوں نہ صرف یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے یہ خطوط مجھے دیے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا:

لاہور　　۳ جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے۔

بہاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدر داں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں، میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوشگوار تبدیلی ان کے مصاحبین میں ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر سید راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہل علم کے قدر داں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کرا کر بھیجیے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام　　محمد اقبال لاہور

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بت کدۂ چین سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
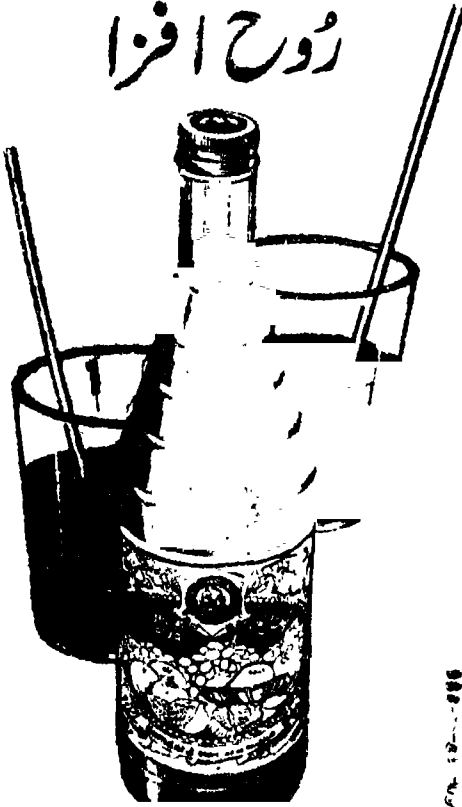
فرد اور ملت اقبال کے فلسفے میں اگرچہ خودی کے اسرار کا انکشاف مقدم ہے تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک ابھی سے نظر آنے لگی ہے۔ جبکہ خودی ابھی ان کے دھندلے شخصی میلان سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس زمانے میں ملت سے ان کا غیر معمولی شغف کچھ جرمنی کا فلسفیانہ ماحول، غالباً ان کا ہی اثر تھا کہ اقبال نے فرد کی مستقل حیثیت سے صرف نظر کرلی اور فرد پر اسی اسلامی ملت کے جزو کی حیثیت سے نظر ڈالی جس کی انوکھی ساخت وطنیت اور قومیت کے بجائے اصول پر ہے۔

چنانچہ فرد کے انفرادیت سے متمتع ہونے کے معنی ملت کے جزو ہونے کی حیثیت سے ملت کے ضمن میں متمتع ہونے کے ہیں اس کی اپنی الگ کوئی ہستی ہی نہیں، اس کی ہستی تو ملت کے ایک ترکیبی جزو کی ہستی ہے اس لیے اس کا پورا اور صحیح تحقق ملت کی ہستی کے اندر ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے اپنے مفاد کے معنی ہی ملت کا اجتماعی مفاد ہے اور سب افراد کی ہستی کو محض ان کی اپنی ہستی کہنا مجاز اور تسامح ہے:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

اقبال کی وطن کو واپسی اور انکا فکری نشوونما

اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے، لندن سے بیرسٹر اور میونک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹر ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس طرح ان کی رسمی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا۔ ان کی فکری نشوونما کا جہاں تک تعلق ہے تو گویا تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کے نظام فکر کے بہت سے اجزا کے نقوش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ نقوش کچھ تو گہرے تھے اور کچھ اُتھلے اور بعض کی حیثیت رخ اور میلان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان میں ترمیم و تنسیخ ہوئی اور اضافہ بھی یہاں تک کہ "اسلامی الٰہیات کی تعمیر نو" میں ان کی فکر نے ایک مستقل اور مربوط فلسفے کی صورت اختیار کرلی۔

(باقی)

اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمود الٰہی

حیدر آباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں، ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرِ فہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور پھر وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اُس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک و قوم کی فلاح مضمر ہے اس لیے انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔

قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دلدادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے جس سے ان کے ابتدائی رجحانات اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لسان العصر ریاض رضواں اور مرآۃ المثنوی کا شمار قاضی صاحب کے ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ قاضی صاحب کے خطوط کی نقل تو موجود نہیں لیکن علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ میں حامد علی صاحب کا شکر گزار ہوں نہ صرف یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے یہ خطوط مجھے دیے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا:

لاہور　　۳؍ جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے۔

بھاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدر داں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں، میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوشگوار تبدیلی ان کے مصاحبین میں ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر سید راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہلِ علم کے قدر داں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کرا کر بھیجیے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام　　　محمد اقبال لاہور

(۲)

جناب من السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ ابھی اپنی کتاب نواب صاحب کی خدمت میں ارسال نہ کیجیے۔ آٹھ دس روز تک حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہوگی۔ یورپ جانے کا قصد نہیں ہے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۷ر جنوری ۱۹۳۵ء

(۳)

بھوپال ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء

جناب قاضی صاحب السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں۔

اس وقت بھاول پور کی ریاست ہندو مسلم مناقشات میں الجھی ہوئی ہے۔ موقع موزوں نہیں تاہم اگر آپ مراۃ المثنوی وہاں بھیجنا چاہیں تو عرضداشت کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام بھیجیے۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ دیا ہے جو اسی لفافے میں بند ہے۔ خط بھی عرضداشت کے ہمراہ بھیج دیجیے۔

والسلام

محمد اقبال

(۴)

جناب من

آپ کا لفافہ ابھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے میری صحت عام تو اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۷ر جولائی ۱۹۳۶ء

علامہ اقبال بحیثیت استاد

صالحہ الکبریٰ عرشی

یوں تو علامہ اقبال کے کلام کی تفسیر و توضیح اور اس کی ترویج و اشاعت کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں مضامین کی بھرمار ہے اور ان موضوعات پر مستقل کتابوں کا بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی حیات کے شب و روز سے ــــ جو رنگ و نور سے روشن و تابندہ ہیں۔ لوگ بے پروا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چند ہی سال ایسے ہیں جن میں وہ ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ ابھی ایسی آنکھیں باقی ہیں جنھوں نے اس عظیم شاعر کو دیکھا ہے اور ابھی وہ لب و گوش قوت سماعت اور طاقت گویائی رکھتے ہیں جنھوں نے اس محبوب اور محترم شخصیت سے گفت و شنید کا لطف اٹھایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام بزرگوں سے پرزور درخواست کی جائے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کی ایسی بے شمار کڑیوں کو ملانے میں مدد دیں جو ان کی زنجیر ایام سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ رہیں گے تو پھر ہمارے سارے ذرائع کمزور اور سارے وسیلے ایک حد تک یقین کی اس بلندی سے نیچے اتر آئیں گے جن پر وہ آج ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اداروں پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زیر بحث کام میں عملی دل چسپی لیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کو خصوصیت سے گفتنی اور ناگفتنی کی رسمی اور مذموم قید کو توڑ کر لکھنا چاہیے اور درج گزٹ ہر وہ بات ہونا چاہیے جو اس شخصیت کو یا اس کے کارناموں کو سمجھنے میں کسی نہج سے بھی کارآمد اور مفید ہو سکتی ہو۔ اس موقع پر حضرت یزداں میں چپ نہ رہنے والے بندۂ گستاخ کی مثال جرأت پیدا کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوگی چاہے وہ خود ذراسی زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے والے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں تو ہم سب کو چاہیے کہ ان اصحاب کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگر یہ حضرات لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی جائیں اور سوالات کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کرنے کی سعی کی جائے جس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان کے سینوں میں ایک راز کی صورت ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

اسی جذبے کے تحت ایک بے حد دل چسپ اور بیش قیمت تاثراتی تحریر علامہ اقبال کے ایک شاگرد اور میرے والد (امتیاز علی عرشی صاحب) کے ایک عزیز اور قریبی دوست میاں عطاء الرحمٰن کی پیش کی جا رہی ہے جو لاہور کے مشہور صاحب علم و ثروت خانوادے (میاں سر محمد شفیع باغبان پورہ) کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے علامہ اقبال کو اس عالم میں دیکھا جس میں کم لوگوں نے دیکھا ہوگا

میاں صاحب کی یہ تحریر رام پور رضا انٹر کالج کی طرف سے منعقد کیے گئے یوم اقبال کی ایک نشست منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء میں پڑھی گئی تھی جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کی تھی۔ اس جلسے کی دوسری اور تیسری نشست جس میں کلام اقبال سے متعلق تفسیری تصاویر کی نمائش بھی شامل تھی رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین کے زیر صدارت ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر رام پور کے دو مصوروں عظمت اللہ خاں اور دیا ماکی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

میاں صاحب مرحوم کے اس مضمون کی نقل میرے پاس محفوظ تھی جس کے محفوظ رہنے میں علامہ اقبال اور چچا عطاء الرحمٰن

دونوں سے عقیدت اور محبت کو دخل رہا ہے۔ امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تحریر بذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علامہ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کچھ اور پرکشش ہوگی۔

مضمون نگار (میاں عطاء الرحمٰن مرحوم) کے بارے میں بھی یہ عرض کردوں کہ وہ سالہا سال رام پور میں مقیم رہے اور ریاست کے محکمہ فنانس کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں کے منتظم رہے اور آخر میں ہز ہائی نس کے پرائیویٹ سکریٹری بھی۔ وہ بڑے خوش مزاج زندہ دل اور پرخلوص آدمی تھے۔ انھیں ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ دخل بھی تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور سے شایع بھی ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ واپس لاہور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔

مضمون اور مضمون نگار کے تعارف کی رسم کے بعد مجھے رخصت کی اجازت دیجے اور اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

مجھے کالج چھوڑے ہوئے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقع ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گرد و نواح کی فضا کے اثر سے میرے جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ جب آتش جواں تھا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بے شمار چیزیں شایع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن ان کے کسی شاگرد نے بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کیے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی نوع کی بہترین تخلیقات خیال کی جاتی ہیں۔ اور اس مطالعہ میں وہ لطف حاصل کیا ہے جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعراء کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب پہلے پہلے میں نے انھیں دیکھا۔ میاں شاہنواز بیرسٹرایٹ لا مرحوم سے ہمیشہ ان کے خاص تعلقات رہے۔ ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی اور آخر تک بھی یہ دونوں جب بھی ملتے گفتگو کا وہی پرانا رنگ شروع ہو جاتا۔ میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہنواز ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے غالباً سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہاں میرے دو ہم عمر رفیق رہتے تھے مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے، اس کے برابر والے کمرے میں ان زندہ دل جوانوں کی بے تکلفانہ محفل جما کرتی تھی۔ ہمیں اس میں شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن ہم دروازوں کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ اقبال ان دنوں محفل کے روح رواں تھے۔ اور ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے زندہ مشرب ہیں۔ ان کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لیے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں ہے۔

اسی زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے اور چوں کہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا تھا۔ ہم بھی کئی کئی دنوں کا پروگرام ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب اس وقت کے نوجوان شعراء، جن میں سے خان احمد حسین خاں اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے، اپنا کلام سنانے والے ہوں مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت، ہلکی پھلکی سی عینک لگائے گلے کا بٹن کھلا ہوا شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے۔ اور ان کے آتے ہی وہ ہنگامہ جو چندہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال میں برپا رہا کرتا تھا، تالیوں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر وہ نغمے فضا میں گونجنے لگتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھٹکے برداشت کیے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں آتا تھا یا نہیں کہ شاعران نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں۔ بہر حال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آجاتا تھا جو شاید

کسی محفل رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلف دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دی جاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولوی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہل میں نے وہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز اتنی نہ تھی کہ تمام حاضرین سن سکتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور مسودہ اقبال کو دے دیا جو انھوں نے اپنے مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔ اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے اور کئی سال تک۔ ہاں اتنا ہے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے یاد کرنا اور گانا شروع کر دیا۔ ان کا یہ اضافہ ہو سکا ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں فرق آ گیا اور اس میں کم از کم اس وقت ہمارے لیے وہ رندانہ کیفیت نہ رہی جو ان کی ولایت سے لکھی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی کہیں سر رہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہو گا

اقبال کے ولایت سے واپس آ جانے کے بعد غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں اسکول سے کالج میں پہنچ چکا تھا، انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اڑا دی گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نظم پڑھنے والے ہیں۔ میں کچھ کیا تھا وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لیے اور ابھی پنڈال اچھی طرح بھرا نہ تھا ہمیں ڈائس کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لیے کرسیاں بھی تھیں پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار یا پانچ نوجوان کہیں تہیہ کر کے بیٹھ جائیں تو انھیں کوئی رعب یا دھمکی دے کر اٹھا تو لے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے جب میں اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں وہ چار ڈالوں اور حفاظ ان کے ہمراہ آراستہ اور اٹھائی ہوئی بازو پھیلا دیا گیا ہے ... ہم تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ کسی نے مذاق کی پھبتیاں کسیں کسی نے ... کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے ہم نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرض یہ کہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور حسب معمول ڈائس پر تھوڑی دیر کھسر پھسر کے بعد وہ اپنی نظم پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بے حد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان "شکوہ" ہے۔ اقبال یوں پڑھتے گئے:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دے جائے۔ دوسرا بند شروع ہوا:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

جوں جوں اقبال نظم پڑھتے جاتے تھے سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا جس کے خاموش ہونے تک اقبال کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔ اسی ہنگامہ پر درشان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی۔ اور نئے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آج تک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے ان میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو۔

جس قدر اس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

شکوہ کے شایع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں، اخباری مضامین میں، نثر میں، نظم میں، درجنوں پمفلٹ شایع ہوئے۔ کچھ مولویوں نے اقبال کو برا بھلا کہا۔ لیکن اقبال بالکل خاموش رہے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلی تعلیم یافتہ اسلامی پبلک کے اس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیے گو اس کی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اس سے بھی چند ماہ یا شاید ایک سال بعد جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے، جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا اس پر جوش امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں "زمیندار" والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا۔ اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا۔ اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لیے جمع ہوگئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اس میں پہلے یہ مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا شعار اسلامی نہیں رہا، وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبال کی طرف سے اہل اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یعنی یہ کہ زمانہ گزشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں، اسلام فنا نہیں ہو سکتا، اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اور اللہ تعالی کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے چند بند سن لیجیے تاکہ اقبال کے درد قومی کے خلوص کا اندازہ ہو سکے۔ اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھیے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہ رو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں تک تو اللہ تعالی کی طرف سے اقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب پیغام سنیے:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو، ذرے سے بیاباں ہو جا نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

انجمن کے جلسوں میں بعض اوقات حاضرین اور منتظمین کے درمیان بڑی دلچسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اردو کے ان دنوں غالباً سب سے زیادہ مقبول اخبار "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ لڑکے خوش طبعی سے انھیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ لیکن عبدالعزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے جلسوں میں چندہ جمع کرنے کے لیے سب سے زیادہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی اور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی بڑے شاعر کی نظم یا اچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا عبدالعزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سننے کے لیے بے چین ہیں وہ موجود ہیں اور سنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن چندے کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے پانچسو اور دلوائیے تو نظم شروع ہوگی۔ ورنہ جب تک پانچ ہزار روپیہ نہ ہوں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگ جلدی جلدی دوڑتے اور رقم پوری کر دی جاتی تو نظم شروع ہوتی۔ اس کا جواب حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اس طرح دیا جاتا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر کسی جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوتی اور حاضرین میں موجود ہیں تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہٰذا علامہ اقبال سے ان کے چند غیر مطبوعہ اشعار سنوا دیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ بھی نہیں ہوگا۔ تمام حاضرین تہیہ کر کے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دینا۔ چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کر کے اشعار پڑھواتے۔ ایک ایسا موقع یاد ہے کہ اقبال مسکرا اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مذاحیہ شان میں پڑھی، ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں۔ کچھ اس طرح تھے: باپندہ باقی۔ بہت ہے چندہ باقی۔ اور ابھی تو رہتا ہے بندہ باقی وغیرہ۔ اور یہ سنا کر بیٹھ گئے حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن شوق پورا نہیں ہوا۔ حسرت رہی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور پھر چند اشعار سنا کر چندے کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا۔

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن سنہ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ اقبال کئی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوتے۔ لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شاید پرنسپل کی غیر موجودگی، یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا اور ہماری بے حد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعرا کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں۔ ان میں جہاں تک مجھے یاد ہے ملٹن کی Lycidas اور Penseroso, Allegro اور کیٹس کی Isabella ڈرائڈن کی Mac Flecknoe اور غالباً کولرج کی Ancient Mariner شامل تھیں Grey's Elegy کے علاوہ شیلے کی Adonais جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بلا مبالغہ یہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے۔ شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعراء کی طرح گہرا اور پُر معنی ہوتا ہے اور جس طرح ہمارے شعرا ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اسی طرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پوری طرح سمجھنے کے لیے قدرے محنت درکار ہوتی ہے۔ اس خاص نظم کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر استاد کی استادانہ حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے۔ لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر (Keats) کے مرثیے کے طور پر لکھی تھی جس کا صرف چوبیس برس کی عمر میں، نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراض کرنے کے صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمام نظم صحیح معنوں میں درد و غم کے اثرات سے معمور ہے اور ہر مصرعے میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے نظم کے آخری تین چار بندوں میں اس انتہائی مایوسی اور شدتِ غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا۔ شیلے کی اپنی موت کا جو اس

نظم لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی ہو بہو نظارہ موجود ہے گویا یہ ایک قسم کی پیشنگوئی تھی کہ میری موت اس طرح واقع ہونے والی ہے۔ گویا اول تو لکھنے والا شیلے۔ دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی جذبے کی حالت میں لکھی گئی۔ اور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر محمد اقبال جو خود گہرے تخیل کا بادشاہ ہے اس مجموعے نے شاگردوں کی جماعت کے ان افراد پر جو حساس دل رکھتے تھے، وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہو سکتا۔

اس نظم کے پچپن بند ہیں اور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں نو، نو مصرعے کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو پڑھانے میں جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہوگا۔ جب شیلے کے خیالات کو علامہ اقبال جیسا آدمی سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اور خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اپنے اور اردو شعراء کے خیالات بھی پیش کرے تو سامعین کی خوش قسمتی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایک دریا تھا جو بہا چلا آتا تھا۔ علامہ کے منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھاتے جائیں۔ اور ہم عمر بھر خاموش بیٹھ کر سنا کریں۔ کالج کا ایک گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لیے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لیے ہوئے آتا ہے۔ اس گھنٹے کے ختم ہونے سے دل پر چوٹ کی شکل میں لگتا تھا۔ اور با دل نخواستہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ شیلے کی (Adonais) سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کر دوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گھنٹوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے دوسرے بند کی آخری سطور میں شیلے کہتا ہے کہ ان کی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ انسان کی بے ثباتی اور نفرت انگیز صورت پر ہنستے ہیں۔ کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اپنے آخری نغموں سے اس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی۔

کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تو وہ پھول انسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں، دوسرے وہ انسانی لاش کے ڈراؤنے پن کو اپنے حسن سے چھپا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرزا غالب فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

ان میں قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دل فریب صورتوں کا ایک حصہ ہیں جو اس خاک میں دفن ہیں اور جنھیں ان کے حسن کی طاقت نموئے مٹی کے باہر ظاہر کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شیلی کہتے تھے۔ اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لیے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ یعنی قاف کو کاف ہی کہتے تھے۔ اور حقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتحپوری نے اپنی مشہور ڈائری میں اقبال کی صورت شکل اور طرز گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ بیان کیا ہے۔ لباس کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج یا ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر استری کے۔ ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بندھی بندھائی لوچ کالیا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پروا نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے۔ پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ بعد میں پالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی۔ باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی اے کی جماعت جو شروع سنٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لیے مشہور چلی آتی تھی۔ اور خصوصاً برے تلفظ والے پروفیسر کا ناک میں دم کر دیا کرتی تھی، ان کے گھنٹے میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو۔ بلکہ دھمکی تک بھی کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ ... علم ہوا ہے کہ ان کی داہنی آنکھ بیکار تھی۔ جماعت میں ہمیشہ ان سے قریب بیٹھتا تھا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے علامہ اقبال کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا۔ گو سنا ہے کہ حقہ کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کاغذ کا رجسٹر لیے۔ سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے ادھر ادھر دکھائی دیتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔

ان دنوں کالج میں ایک سوسائٹی بزم سخن کے نام سے تھی جس کے جلسے عام طور پر پندرھویں دن یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندہ دل پروفیسر شیخ نور الٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے۔ ہر جلسہ میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے تھے جتنے کمرے میں سما سکتے۔ اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے۔ بعض اوقات طرح مقرر کر دی

جاتی تھی جس پر سب مشقِ سخن کرتے تھے۔ اور جیسا کہ ہمارے صدر میں پہلے عرض کر چکا ہوں، زندہ دل تھے، وہ مبتذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس وقت شعرا میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی لیکن مذاق اور پھبتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں اور پروفیسروں تک کو شعر میں باندھ دیا جاتا تھا جس سے جلسہ کی دلچسپی روز افزوں تھی۔ خدا جانے اب تک وہ بزم قایم ہے یا نہیں۔ بہرحال اس وقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو درکنار علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ (COLLEGE DAY) کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لیے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا۔ اس مقابلے میں جو لڑکے نظمیں بھیجتے تھے ان کے جج علامہ اقبال ہی ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ کالج میں پڑھاتے بھی نہ تھے، تو یہ نظمیں فیصلے کے لیے انھیں کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ بعد میں وہ نظمیں جو اول، دوم، اور سوم درجہ پر رہتیں کالج ڈے پر تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے اور انعام حاصل کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر بھی علامہ اقبال نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکٹھے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔ فرمایا کہ بھائی میں کبھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا کرتا۔ جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو۔ لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو یہ مشغلہ اچھا نہیں۔

اقبال کے ملنے والے عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ شعر کہتے وقت اکثر زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہ ان سے عند الطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے، جب تک ان پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو اور طاری ہو تو بیسوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے، حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مصنفوں ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگے۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اس میں ایک مصرعے کے یہ معنی تھے کہ شاعر کے لیے زبان کے الفاظ اظہارِ خیالات کو کافی نہیں ہوتے۔ اقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور فرمایا کہ آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہوتی ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خیالات ایک طوفان کی طرح امڈے چلے آتے ہیں، اس کو ہر خیال کے لیے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں پھر عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد ایک شعر بنتا ہے۔ اس وقت تک درجنوں ایسے خیالات بھول کر ضائع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آ جاتے تو اس مخصوص شعر سے شاید کہیں بہتر ہوتے۔ شاعر بعض اوقات سخت بے چین ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ اظہارِ خیال کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس خاص بحر یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے جس میں نظم یا غزل لکھی جا رہی ہے۔

(اقبال ریویو سہ ماہی)

اکبر اور اقبال

نور محمد ایم، اے

کمال اور زوال، بلندی اور پستی، سرفرازی اور تنزلی، ان الفاظ میں دنیا کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان مغلوں کے زمانے میں اپنے عروج کا شباب دیکھ چکا تھا، شاہجہاں کے عہد میں پر دیسیوں کی نظرِ بد اس شباب کو گھن بن کر لگ گئی اور بسرعت تمام نشیب میں تبدیل ہوتا چلا گیا تا آنکہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ رونما ہوا ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ نے ایک سنبھالا لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا اور وہ یا بری شمع جو اس بزم رنگیں کو تین سو سال تک جلا دیتی رہی جھلملا کے ختم ہو گئی اور اپنے ساتھ پرانے ہندوستان کو بھی ختم کر گئی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نیا جنم لیا۔ غالب نے واقعۂ ۱۸۵۷ء کو "رستخیز بیجا" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ "رستخیز بجا" تھا۔ ۱۸۵۷ء نے جدید ہندوستان کی بنیاد رکھی، وہ ہندوستان جو اورنگ زیب کی وفات کے وقت سسکیاں لے رہا تھا کب تک زندہ رہتا۔

قوموں کی زندگی کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مذہبی، ادبی، سیاسی۔ تنزل پذیر قوم ان تینوں چیزوں سے محروم ہو جاتی ہے اس کے ایمان میں تزلزل، اس کے ادب میں انحطاط اور اس کی سیاست میں گتھیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسا مذہبی سرگروہ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں اس کی رہنمائی کرے اور نہ کوئی ایسا سیاست داں ملتا ہے جو قوم کے سامنے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرے قوموں کا زوال ایک یا تین دن کی بات نہیں ہوتی، سال یا دو سال کا واقعہ نہیں ہوتا قوم کو بنتے اور بگڑتے صدیاں لگ جاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا منحوس ترین سانحہ ہے یہ ایک ایسا جانگداز اور روح فرسا صدمہ تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھے، مذہب سے مسلمانوں کا اُکھڑنا اور بچھڑنا بے روگردانی شروع ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس غیر متوقع آفت نے رہے سہے عقائد اور اعتقادات بھی ڈھیل کر دیے اور اس طرح ایمان میں تزلزل کی بنیاد پڑی۔

بھولا ہوا خواب جب حقیقت کا روپ دھار ان نہ کر سکا تو مسلمانوں کے ہوش مختل ہو کر رہ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دہلی کی سلطنت ان کی میراث ہے اور اس کی بقا اور حفاظت ان کی سیاست۔ جب یہ ہاتھ سے نکل گئی تو ان کی سیاست کا خاتمہ ہو گیا انھیں اب کوئی شاہراہ عمل سجھائی نہیں دیتی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ ان کی بدحواسی، بےچینی اور اضطراب نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کاوش فکر کرتے اور اس غیر متوقع مصیبت کا کوئی ٹھیک حل ڈھونڈ نکالتے۔ یہ تھے وہ حالات جہاں سے سیاست میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں شروع ہوئی ہیں۔

"دکل کی نوخیز چھوکری" سلطنت کا سایہ عاطفت اٹھ جانے کے بعد مبہوت ہو کر رہ گئی، یتیمی کے صدمے نے اس سے بھلے اور برے میں امتیاز کرنے کی قوت سلب کر لی اور وہ اپنے خیر خواہوں میں تمیز نہ کر سکی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شاہی حرم اور دربار میں پرورش پائی ہوئی بیگموں اور شاہوں کے منہ لگی ہوئی کیا جانتی کہ مصیبت کیا چیز ہوتی ہے، جس وقت قلعے سے نکالی گئی نادان تھی، عوام کے نرغہ میں جا پھنسی، جوانی کے دن تھے اور امنگوں کی راتیں، ان سے کھل کھیلی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عزت ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو دوسری طرف اثاثہ لٹتا دکھائی دیا، غرضکہ اس طرح ادب میں انحطاط رونما ہوا

ایمان میں تزلزل سیاست میں پیچیدگیاں اور ادب میں انحطاط ان تینوں نے مل کر مسلم قوم کے لیے نہ صرف زوال کے سامان مہیا کر دیئے بلکہ اسے اس مقام تک لے آئے جہاں اس کی بقا کے لیے کسی مردِ کامل کی ضرورت لاحق ہوئی۔ توحید کی امانت سینوں میں رکھنے

والے اب نہ صرف ایک مذہبی رہنما کے محتاج تھے بلکہ انھیں اپنی بقا کے لیے ایک مجتہد ادیب کی ضرورت تھی اور سیاست میں ایک دور اندیش اور تجربہ کار سیاست داں کی۔ ان کی کشتیِ حیات بادِ حوادث کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت چند افراد خدا کا نام لے کر قوم کو بچانے کا عزم کر کے اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اصلاح ایک شخص کے بونے کا کام نہ تھا، مولوی ابو القاسم مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور دیوبند میں ایک مذہبی جامع کی بنیاد رکھتے ہیں، سر سید سیاسی رہنما کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں لیکن اس گُر سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے اسی لیے وہ علوم جدید و قدیم کی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے علی گڑھ میں ایک مرکزی دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور ادب کی اصلاح اور صحیح نہج پر لانے کا سہرا حالی کے سر رہتا ہے۔

حالی اردو ادب میں پہلی ہستی ہے جس کے یہاں اجتماعی شعور پایا جاتا ہے۔ حالی کو اپنے سے زیادہ قوم اور وطن کا خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے دلی سے حد درجہ متاثر ہیں ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس بے حسی اور بے دلی کو دور کرنے کے لیے وقف تھا انھوں نے ادب کو پہلی مرتبہ ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا حالی کے یہاں ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض ان کے اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے۔ حالی کے نزدیک مقصد اتنا اہم ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ غزل کی سی صنفِ ادب کو بھی وہ وسیلہ کے طور پر ہی کام میں لاتے ہیں "حالی رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" حالی نے ماضی کے گن گائے اور حال کی بدحالی پر نیر بہائے، حالی مغرب سے مرعوب تھے وہاں کی مادی ترقیات اور علوم و فنون کے عروج نے ان کی نظر میں خیرگی پیدا کر دی تھی، حالی کی یہ کیفیت بہت کچھ سر سید کی صحبت اور قربت کا نتیجہ تھی حالی کے کردار میں یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ شخصیتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، حالی نے سر سید سے متاثر ہو کر عمر بھر "پیرویِ مغربی" کے راگ الاپے حالی نے ایک پختہ کار اور ہوشیار فن کار کی طرح ہمارے سامنے دو متضاد تصویریں پیش کر دیں۔ ماضی کی رونق اور حالی کی خستگی اس درماندگی اور خستہ حالی کا علاج حالی نے "پیرویِ مغربی" تجویز کیا۔

لیکن حالی ہی کے زمانے میں ایک شخص نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری موجودہ پستی، افلاس اور ادبار کی وجہ ہماری مغرب کی اندھی اور کورانہ تقلید ہے ہم نے جادۂ حق کو چھوڑ دیا اس لیے ہم قعرِ مذلت میں گر پڑے۔ یہ آواز اکبر کی تھی۔ اکبر نے مسلمانوں کی بہبودی اور خوشنودی اسی میں دیکھی کہ وہ سختی کے ساتھ اپنے ماضی سے وابستہ رہیں۔ حالی مسلمانوں کے ماضی کو روشن اور شاندار تسلیم کرتے ہوئے بھی جب کشمکش اور الجھن کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو مسلمانوں کو "آتشِ نمرود" میں "بے خطر" کود پڑنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اکبر اس اندھی تقلید کے قایل نہیں قدامت پسندی ان کا مذہب اور شرقیت ان کا ایمان ہے "غیرتِ قومی" اکبر کے مزاج کا جزو لاینفک ہے خواہ وہ تعلیم ہو یا سیاست ہو یا مذہب ہو یا معاشرت اکبر کبھی غیرتِ قومی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اکبر کے بعد جس شخص نے مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی وہ اقبال تھے۔ اکبر نے قریب قریب ان ہی چیزوں کی مخالفت کی تھی جن چیزوں کی اقبال نے کی یعنی مغرب کی اندھی تقلید، عورتوں کی آزادی اور ان کی موجودہ تعلیم مشینوں کا غلبہ، مغربی تعلیم، قرآن اور مذہب سے بے نیازی وغیرہ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے منہ سے جب ہم ان باتوں کی مخالفت سنتے ہیں تو ہم انھیں محض تفریح کی چیز سمجھ کر ٹال جاتے ہیں لیکن جب اقبال کے منہ سے سنتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں —— اس سے پہلے کہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ کیوں اقبال کی آواز کو ندا کی آواز کا اثر رکھتی ہے کہ ہم بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کیوں اکبر کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی یہ مناسب ہوگا کہ میں ایک ہی موضوع پر اکبر کے اور پھر اقبال کے اشعار آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اشعار کی تعداد صبر آزما ہے لیکن میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ناگزیر سا امر ہے۔ اکبر مغرب کی اندھی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے　　بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی　　یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

جتایا جائے گا کس نے یہ کسی دن عقل سے کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے مقراضِ تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ ہیں یہ نیک نہاد ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے جی خوگر ہیں امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے حرمِ کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے بارے میں اکبر کی ظرافت کی پھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں:

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے خدمت میں ہے دلیری اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ان اشعار سے آپ یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیں کہ اکبر تعلیم نسواں کے مخالف تھے، یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی وہ عورتوں میں تعلیم کا رواج دیکھنا چاہتے تھے لیکن کس قسم کا یہ ملاحظہ ہو:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس سلسلے میں اکبر کی ایک طویل نظم "تعلیم نسواں" ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اقبال "آزادی نسواں" کے عنوان سے کہتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلو بند

اسی سلسلے میں اقبال کے اور اشعار پیش ہیں:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

تعلیم کے بارے میں اکبر کہتے ہیں:

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے — خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے — جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب
نظر ان کی رہی کالج ہی میں علمی فوائد پر — گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا — ذہن کو تپ آ گئی اور مذہب کو فالج ہو گیا
کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب — دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کیے
تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں — عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

اقبال کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے حاصل نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
پرہے افکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر — خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

نئی تہذیب کے متعلق اکبر کہتے ہیں:

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی — کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشوں کی
مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں — حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر — اگزبیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے
خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — ان حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنون بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا
انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا — اکبر نے کہا یہ تو عرابی کے ہیں آثار
معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر — تبدیلی صورت کے رہے گر یہی اطوار
حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا — شرمائیں گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار
آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے — انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

اقبال کہتے ہیں:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے — یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں تخیل میں — ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار — ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں

اقبال نے جب یورپی تہذیب اور تمدن کا بہ نظرِ غور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اکبر نے سات سمندر دور رہتے ہوئے بھی اقبال سے پیشتر یہ کہدیا تھا۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رہنا اپنے آپ کو

نفسِ انسانی پر مشینوں کے غلبہ کے بارے میں اکبر اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے (اکبر)
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبال)

قرآن کریم مسلمانوں کے لیے آئینِ حیات کا کام دیتا ہے مسلمانوں نے اگر دنیا میں شہرت و نیک نامی حاصل کی عظمت و بزرگی پائی ترقی و سرفرازی کے مدارج طے کیے تو یہ سب اسی آئینِ حیات پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا۔ اکبر و اقبال دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ع

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اکبر کہتے ہیں:

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم — قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

اور اقبال کہتے ہیں:

از یک آئین مسلمان زندہ است — پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است

اشعار کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھے احساس ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ایک ضروری امر تھا آپ نے ان اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ اساسی چیزوں کے متعلق اکبر اور اقبال دونوں ہم خیال ہیں لیکن اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اکبر کے مقابلے میں اقبال کیوں زیادہ کامیاب رہے اس کے کئی اسباب ہیں۔

آرٹ کی عظمت بہت کچھ آرٹسٹ کی شخصیت اور اس کے عقائد پر منحصر ہے۔ اکبر اور اقبال کی شخصیت میں بعد المشرقین ہے۔ ایک دیو پیکر ہے تو دوسرا بونا، ایک علوم جدید و قدیم کا ماہر تو دوسرا صرف علوم قدیم سے آشنا، ایک مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے مزین تو دوسرا گنے چنے لوگوں کے خیالات سے آگاہ، ایک فلسفی تو دوسرا صوفی معبد میں اور ظریف پہلے، اقبال کے کلام میں تاثیر ان کے غیر

اعجاز سے نہیں ہے کیوں کہ جہاں تک فنی خصوصیات کا تعلق ہے اکبر کا کلام کسی لحاظ سے، کسی پہلو سے اقبال کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو قدرت اکبر کو زبان پر حاصل تھی وہ شاید اقبال کو کبھی نصیب نہ ہوئی اس فرق کی وجہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں شاعرانہ اعجاز نہیں بلکہ شخصیتوں کا فرق ہے۔ اکبر کی شخصیت نہ اتنی بلند ہے جتنی اقبال کی ہے نہ اس میں وہ ہمہ گیری ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ زبان پر اگر قدرت ہے تو شعر میں شگفتگی، برجستگی، سلاست، طلاقت اور روانی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعر میں حسن بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک محرکاتِ شعری عظیم نہ ہوں آرٹ میں بلندی نہیں آسکتی۔ اکبر کے یہاں تخریبی پہلو نمایاں ہے اقبال کے یہاں تعمیری پہلو پیش پیش ہے۔

اکبر کے یہاں سوجھ بوجھ تھی اور بلا کی سوجھ بوجھ تھی لیکن غور و فکر کو بہت کم دخل تھا، اکبر ہر چیز کے مضحک پہلو کو پہلی نظر میں دیکھ لیتے ہیں اور اسی کو اساسی پہلو قرار دے کر طنز و ظرافت کے تیروں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ اکبر زیادہ تر چیزوں کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں، اقبال نے ان چیزوں کا مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر محفوظ و مثبت مقام سے نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفان سے چشمک زنی کی، وہ موجوں سے کھیلے اور چٹانوں سے ٹکرائے، اسی چشمک، کھیل اور ٹکر سے وہ شرارہ وجود میں آیا جس نے ان کے کلام کو زیادہ موثر، زیادہ بلند اور وقیع بنا دیا برخلاف اس کے اکبر ان چیزوں کو عمل بیابانی سمجھتے رہے۔ انھوں نے ایک محفوظ اور مثبت مقام سے طوفان کا صرف نظارہ کیا اسی لیے وہ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے ان کا مطالعہ کچا، خام اور ناقص رہا، اسی لیے وہ جزئیات پیش کرنے سے قاصر رہے وہ برائیوں پر زور دیتے ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، اکبر بات کو بتنگڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی چیز پر زور دیتے ہیں ان کا وار ہمیشہ کوٹ، پتلون، اور سایہ پر ہی پڑتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اکبر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرتے ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا اقبال ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور چیزوں کے حسن و قبح کا انحصار ان کی ظاہری سج دھج پر نہیں بلکہ ان کی تمام خصوصیات پر رکھتے ہیں ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی ناکامی کا سبب ان کے مطالعے کی سطحیت اور فکر و نظر کی کمی ہے۔ لیکن صرف اسی چیز کو اکبر کی ناکامیابی کی وجہ قرار دینا اکبر کے ساتھ ناانصافی ہوگی اکبر کے زمانے میں مغربی سیلاب نیا نیا تھا نئے سیلاب میں شدت ہوتی ہے، طاقت ہوتی ہے، زور ہوتا ہے، اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی حال اس وقت بھی ہوا سلطنت کے نقصان اور تعلیم کے فقدان نے یہ امر ذہن نشین کر دیا تھا کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کی پیروی شروع کر دیں مغربی معاشرت اور تمدن کا غائر نظر سے مطالعہ کسی نے نہیں کیا غلام قوم کے قوائے ذہنی مفلوج ہو جاتے ہیں وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتی خوب و زشت میں امتیاز نہیں کر سکتی اقبال کے الفاظ میں:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلامی کی بصیرت پر ‏ ‏ ‏ کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

فاتح کا ہر عیب مفتوح کی نظر میں حسن بن جاتا ہے اس کے علاوہ دور سے چمکنے والی چیز سونا ہی نظر آتی ہے۔ آقاؤں کا ہر فعل غلاموں کے نزدیک قابلِ تقلید ہوتا ہے اس کے علاوہ مغربی معاشرت میں ظاہری چمک دمک کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی نظر خیرہ ہو کر رہ گئی غرضکہ ایسے ماحول میں جب ذہن مفلوج ہو گئے تھے اور نظریں خیرہ، اکبر نے تن تنہا مغربی یلغار کو روکنے کی کوشش کی اکبر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں ایک اکبر تو کیا اگر دس اکبر بھی ہوتے تو اس سیلاب کو روک نہ سکتے میرا مقصد اس سے اکبر کی عظمت گھٹانا نہیں ہے۔ اکبر کی آفاقی اہمیت تو مسلم ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارے افکار و خیالات مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے انھوں نے اپنی بے پناہ طنز و ظرافت کے بل بوتے مغربی سیلاب پر اتنی شدید اور کاری ضرب لگائی کہ علی گڑھ اور برطانوی سامراج دونوں کا بڑھتا ہوا اثر اور ترقی کرتی ہوئی طاقت تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ علی گڑھ نے برطانوی قدروں کی حمایت کی تھی اور انھیں مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تھا لیکن اکبر نے اس ڈھول کا پول کھول دیا اکبر کو اگر ہم حکیم نہیں کہہ سکتے تو نقاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی عظمت کو منجملہ جن چیزوں سے دھکا پہنچا ہے ان سیاسی تحریکات کے بعد سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے اکبر کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اقبال کے لیے زمین ہموار کر دی اکبر کی عدم موجودگی میں اقبال کے کلام کا کیا حشر ہوتا یہ صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں۔

اقبال کی کامیابی اور اکبر کی ناکامیابی کی ایک وجہ اور ہے۔ اکبر نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا وہ طنز و ظرافت تھی۔

لطیف نازک اور پرمعنی ظرافت ہر شخص کے بس کی نہیں ہوتی اسی لیے اکبر کا کلام زیادہ تر قہقہوں میں اڑا دیا گیا اس معنویت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی اکبر نے ہنسا کر رلانا چاہا وہ تبسم میں آنسوؤں کا پیغام لائے تھے لیکن عوام کی کم فہمی اسے صرف قہقہہ سمجھ کر رہ گئی یہ نہ دیکھا کہ اس قہقہے میں کتنا کرب کتنا سوز، کتنی بے چینی پوشیدہ ہے۔ اکبر نے حکومت کے خوف سے سرد موسم اور پر غبار ہواؤں میں شاہد معنی کے لیے ظرافت کے لحاف کو ترجیح دی، طنز و ظرافت کا تعلق جہاں جذبات و حسیات سے ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہن و دماغ سے ہوتا ہے اکبر نے متفرق اشعار کہے لیکن ذہن پر جب تک کوئی عمل مسلسل نہ ہوا اثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی کامیابی بڑی حد تک اکبر کی ناکامیابی کی رہین منت ہے اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

یہ اقبال کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے خودی کا ہتھیار اس وقت استعمال کیا جب مسلمانوں کے دل اکبر کے نغمے سے تازہ تازہ گرم تھے۔ اکبر اور اقبال کے مزاج میں کتنا فرق تھا یہ آپ ان دو شعروں سے معلوم کر سکتے ہیں:

اس میں برائی کیا تھی جو میں احیائے رسم دیرینہ رہا
آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر تہذیب مغربی کی مخالفت کرتے رہے لیکن لوگوں نے اسے قبول کر ہی لیا۔

جلوۂ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں

اکبر کی ناکامی کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مغرب کی ترقی لادینی، عریانی اور چنگ و رباب سے ہے یہ ان کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اقبال کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بتایا کہ:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب نے ز رقص دختران بے حجاب
محکمی او نہ از لادینی است نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است

اکبر کی آنکھوں پر قدامت کی عینک تھی، قدامت پرست انسان تھوڑا بہت متعصب بھی ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اور بھلائیاں اسی تہذیب معاشرت اور تمدن سے ہیں جس کا وہ پیرو ہے وہ تو کنویں کا مینڈک ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بحر کی وسعتیں ایک لفظ مہمل ہے اکبر نے جو شعر شیخ جی کے بارے میں کہے تھے وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اقبال کے یہاں سب کچھ ملتا ہے لیکن تعصب نہیں ملتا وہ جانتے ہیں کہ مغرب باوجود اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اس قدر پست ہونے کے ہمیں بہت کچھ دے سکتا ہے اور وہ بہت کچھ ہے ندرت فکر و عمل

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے ذوق انقلاب ندرت فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی ندرت فکر و عمل سے سنگ خارا لعل ناب

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قریب قریب یہی بات کہی تھی:

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوتے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزارہا قسم کی کارآمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔"

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ ان کی تعلیم کا منفی پہلو بھی ہے انھوں نے صرف یہ کہدیا کہ یہ راستہ جس پر تم گامزن ہو خطرناک ہے لیکن یہ نہ بتاسکے کہ یہ دوسرا راستہ بھی ہے جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اکبر نے انسانوں کو اور انسانوں کے سماج کو چھوئی موئی سے زیادہ نازک سمجھ لیا تھا کہ جہاں چھوا مرجھا گیا شاید وہ ارتقا کے قایل نہ تھے:

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

شاید انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ وہ سماج ہی کیا جس میں لچک نہ ہو بڑے سے بڑا درخت اگر آندھی کا مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ زندہ اور قایم وہی رہتا ہے جس میں جھکنے اور طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے ممکن ہے کہ مغربی سیلاب بھی ایک تاتاری فتنہ ثابت ہوتا۔ جس طرح اسلام تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ حال ہوا اسی طرح اس نے ترقی بھی انھیں کے بل بوتے پر کی۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو ٹھوس اور جامد نہیں قرار دیا بلکہ نامی اور جدلیاتی تصور کیا۔ اسی سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"پچاس برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے ان بجلیوں کو علیحدہ کر دیجیے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی"

حالی کے یہاں مفاہمت ہے، اکبر کے یہاں احساسِ شکست ہے اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کی صدائے بازگشت ہے، لیکن اقبال کے یہاں اعلانِ جنگ ہے اور یہی وجہ اکبر کی ناکامی اور اقبال کی کامیابی کی ہے، حالی اور سرسید کے یہاں اندھا دھند تقلید کرنے کا نعرہ ہے اور اکبر کے یہاں قدامت پسندی کی تلقین ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے نقطۂ نظر انتہا پسند تھے۔ ان میں توازن کی ضرورت تھی، چناں چہ اقبال نے ہمیں ایسا پیغام دیا جس میں اعتدال اور توازن ہے مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے یہاں سرسید حالی اور اکبر کی بہترین تعلیم ملتی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں نہ انتہائی تعصب سے کام لیا گیا ہے نہ انتہائی عقیدت سے بلکہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ خودی کے فلسفے کو کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیجیے پھر دیکھیے کہ اقبال کے یہاں کیا رہ جاتا ہے یہی سرسید، حالی، اور اکبر کے خیالات کی صدائے بازگشت، یعنی مشرقیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو لیکن مغرب سے بھی جتنا حاصل کر سکو کرلو:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

شاعرِ مشرق

سعادت نظیر

یادِ ایام کہ مسموم تھی مشرق کی فضا ہر سخنور کی صدا دیتی تھی پیغامِ قضا
شاعری نام تھا الفاظ کی صناعی کا عام فقدان تھا مضمون کی رعنائی کا
نقشِ بے رنگ تھی اربابِ سخن کی محفل لیلیٔ حکمت و معنی سے تھا خالی محمل
عقل و دانش پہ تھا اک خوابِ گراں سا طاری بختِ خوابیدہ کہاں، اور کہاں بے داری
تو نے وہ بربطِ نو چھیڑ دیا، اے اقبال! جس کے ہر سر میں ہے فطرت کا جمال و جلال
تیری آواز سے اقوام و ملل جاگ اُٹھے اک نئی شان سے جذباتِ عمل جاگ اٹھے
تیرے نغمات پہ اربابِ وطن جھوم اُٹھے جھوم اٹھے اہلِ نظر، اہلِ سخن جھوم اٹھے
گونج اٹھے تیرے ترانے کچھ اس انداز کیساتھ نطق مربوط ہو جیسے لبِ اعجاز کے ساتھ
تیری آواز ہے یا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا درد میں، سوز میں ہے ڈوبی ہوئی تیری نوا
اللہ اللہ! ترا اسلوبِ بیانِ گل کار! نظر آنے لگے ویرانے میں آثارِ بہار
ذرۂ دل تھا جو تری سعیٔ خوش انجام کیساتھ جاگ اٹھا قوم کا اقبال ترے نام کیساتھ
تیرے افکارِ جواں نے وہ مسیحائی کی روح سی پھونک دی ہر جسم میں برنائی کی
تیری پرواز کی رفعت سے فلک ہیں پامال پایۂ عرش کو چھوتے ہیں ترے فکر و خیال
فکر سے تیرے ملا شعر کو کچھ ایسا مقام شاعری بن گئی اک حسنِ عمل کا پیغام
جس کے ہر شعر میں جادو ہے، وہ شاعر تو ہے فلسفہ جس پہ ہے نازاں، وہ مفکر تو ہے
تیری لے میں ترے نغمات جو سن پاتے ہیں حوصلے عشق کے کچھ اور ابھر آتے ہیں
تیری باتوں سے ٹپکتا ہے خرد ساز فسوں تیرا احساسِ خودی اور ترا ذوقِ جنوں
تو نے آئینۂ امروز میں فردا دیکھا جو نہ اوروں کو نظر آیا وہ جلوا دیکھا
زندگی بخش حقائق ترے اشعار میں ہیں اور عرفان کے نکتے تری گفتار میں ہیں
تیری ہر نظم میں ہے روشنی سیاروں کی تیرے ہر گیت میں خوشبو ہے چمن زاروں کی

جو درخشاں نہیں گردوں پہ، وہ خورشید نہیں
تو وہ شاعر نہیں، جو زندۂ جاوید نہیں
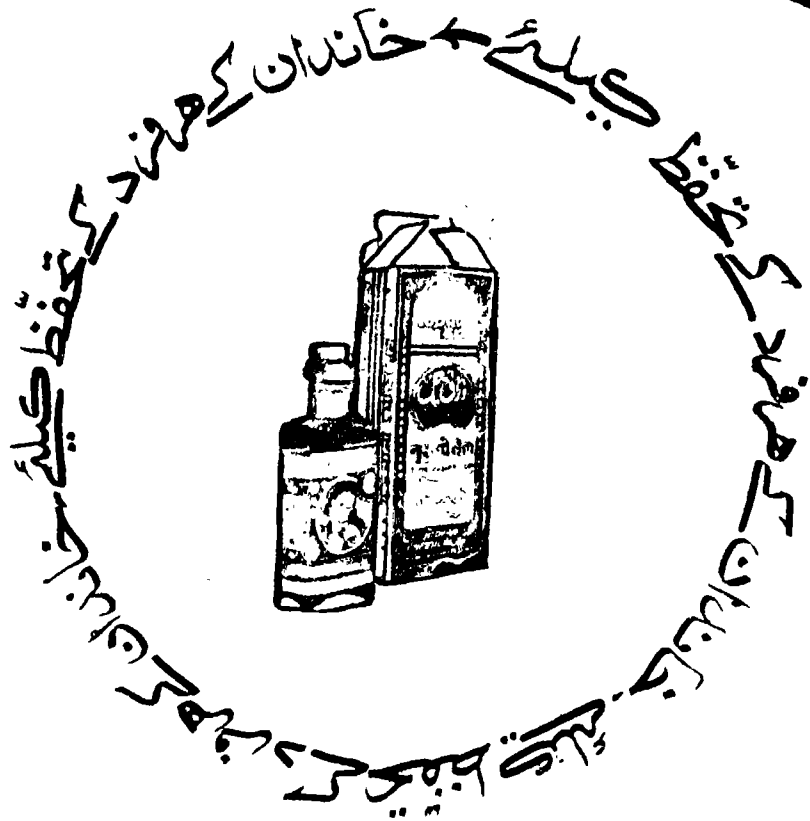
رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نسخۂ عرشی: غالب کے اردو دیوان کا یہ ایڈیشن اپنی تاریخی ترتیب مقدمے اور حواشی کے لحاظ سے ایک اہم یا لشان کارنامہ ہے۔ جس نے تحقیق و ترتیب کے فن میں اردو کا سر بلند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساہتیہ اکیڈیمی نے اسے ۱۹۶۰ء کی اہم ترین اردو کتاب قرار دیتے ہوئے ایوارڈ دیا۔ (طباعت ٹائپ۔ قیمت — ۲۰ روپے (مجلد)

نادراتِ شاہی: شاہ عالم ثانی کا اردو اور ہندی کلام جو تاریخ زبان کے مدونین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ مغل بادشاہوں کی خدمت زبان کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا عرشی کے تفصیلی مقدمے نے اس کتاب کی اہمیت اور اس دور کی تاریخ کو جس عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت — ۸ روپے (مجلد)

وقائع عالم شاہی: کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ جس میں شاہ عالم کے عہد کی نوادر معلومات درج ہیں۔ افراتفری کے دور کی ایک اہم تاریخ ہے۔ مولانا عرشی کے مقدمے اور حواشی نے مزید سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ تاریخ ہندوستان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت — ۸ روپے (مجلد)

سلکِ گوہر: انشا کی بے نقط کہانی جو خود انشا کی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو نثر کے کلاسکی نمونوں میں اس کتاب کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کا تعارف بھی مولانا عرشی ہی کے قلم سے ہے اور اسے بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح ظاہر و باطن کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت — ۳ روپے (مجلد)

متفرقاتِ غالب: مرتبہ سید محمد حسن رضوی ادیب۔ اس کتاب میں ادیب صاحب نے غالب کی بہت سی نظم و نثر کی ایسی تحریریں جمع کر دی ہیں جو اس سے پہلے کبھی اور شایع نہیں ہوئیں۔ غالب سے متعلق لٹریچر اس کتاب کے بغیر نامکمل رہیگا۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ۔ ۵ روپے (مجلد)

اوراقِ گل: مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، ریاست رامپور کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں کا انتخاب جو بہترین آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ شاعر کی تصویر عکس تحریر اور حالاتِ زندگی نے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جوش، جگر، دانش، اختر شیرانی جیسے دو سو سے زیادہ شعرا اس میں شریک ہیں۔ یہ تذکرہ شعرا اپنے اہتمام طباعت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مثالی ہے۔ قیمت — ۱۵ روپے (مجلد)

رامپور انتھالوجی: یہ کتاب مشرقی شعرا کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ جسے انگریزی کے مشہور شاعر جے اے چیپ مین نے ترتیب دیا ہے۔ حافظ، سعدی، غالب، خیام اور عرشی کے کلام کو جس خوبی سے انگریزی نظم میں منتقل کیا گیا ہے وہ لائق داد ہے اس لیے کہ کہیں بھی نزاکت بیان مجروح نہیں ہونے پائی۔ قیمت — دس روپے (مجلد)

نگار بک ایجنسی، رامپور، یوپی

APPROVED REMEDIES for QUICK RELIEF

for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
SYRUP

for
STHMA
ALERGIN
ABLETS

TONIC FOR
STUDENT
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON

for
FEVER & FLU
QINARSOL

for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI

PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla,
BOMBAY 9

AVAILABLE AT ALL CHEMISTS

قیمت { فی پرچہ — ۷۵ نئے پیسے
سالانہ — دس روپے }

رام پور رضا لائبریری کی مطبوعات

نگار بک ایجنسی نے، رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات فراہم کرنے کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے حسن ترتیب وطباعت کے لحاظ سے ہندوپاک میں ممتاز مقام رکھتی ہیں اور خوبصورت نسخ اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف محقق اور ادیب مولانا امتیاز علی عرشی کا نام ان کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے اس لیے کہ ان کتابوں کی ترتیب وتصحیح کا کام موصوف نے خود انجام دیا ہے۔ یا انکی زیر نگرانی ترتیب واشاعت کے مراحل طے ہوئے ہیں۔

دستورالفصاحت : یہ احد علی یکتا لکھنوی کی کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ ہے جسے تذکرہ شعراء کے طور پر علیحدہ چھاپا گیا ہے۔ اس میں ۳۵ اساتذہ اردو کا حال اور منتخب کلام درج ہے۔ مولانا عرشی کے مبسوط دیباچے اور تفصیلی حواشی نے اس کی اہمیت میں چند در چند اضافے کیے ہیں۔ اردو کے کلاسکی شاعروں پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لیے کہ مرتب نے حواشی میں سارے اہم غیر مطبوعہ تذکروں سے احوال شعرا کا اضافہ بھی کیا ہے۔ بہت سے تذکروں سے بے نیاز کرنے والی یہ کتاب اردو میں اعلیٰ ایڈیٹنگ کا نمونہ ہے جسے بغیر جھجک ہم کسی بھی زبان کے تحقیقی کارناموں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں (طباعت ٹائپ) قیمت ــــــ ۶ روپے (مجلد)

مکاتیب غالب : یہ مرزا غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو فرمانروایان رام پور اور ان کے متوسلین کو لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں بیتاب رامپوری اور ناظم رامپوری کے اشعار پر اصلاحیں، نیز مولانا حالی، صفیر بلگرامی، رنج میرٹھی اور نیر دہلوی کے غیر مطبوعہ قصائد و قطعات بھی موجود ہیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ خطوط پر مشتمل کوئی بھی مجموعہ اتنے تفصیلی مباحث کے ساتھ آج تک شایع نہیں ہوا۔ اردو میں انداز ترتیب وتہذیب کی ایک متعین راہ بنانے والی یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے پاس ہونا چاہیے (طباعت لیتھو) قیمت ـــ ۸ روپے (مجلد)

فرہنگ غالب : اس کتاب میں مولانا عرشی نے مختلف ماخذ کے ذریعے غالب کے بتائے ہوئے عربی فارسی اردو وغیرہ زبانوں کے الفاظ و معانی جمع کردیے ہیں۔ اور اپنے دیباچے میں ہندوپاک کے ان فرہنگ نگاروں کی خدمات سے بحث بھی کی ہے جن کے مرہون منت خود ایرانی بھی ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم نیز خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ زبان و لغت کے بارے میں غالب کا رویہ جاننے کے لیے یہ کتاب بے حد ضروری ہے۔ (طباعت لیتھو) قیمت ـــ ۶ روپے (مجلد)

سفرنامۂ مخلص : رائے رایان انند رام مخلص کا سفرنامہ جسے ڈاکٹر اظہر علی مرحوم نے باضافۂ حواشی مرتب کیا تھا۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ۹ روپے

نواب کلب علیخاں خلد آشیاں : مربی علم وادب کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن وہ خود بھی ایک خوش گو شاعر تھے۔ ان کا کلام کئی جلدوں میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت چار حصے موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں ذرۃ الانتخاب۔ توقیع سخن۔ تاج فرخی۔ دستنبو خاقانی۔ ہر حصے کی قیمت ۲ روپے

بغیر عنوان کے

احمد جمال پاشا (لکھنؤ)

نگار کے لیے پانچ خریداروں کے چندے جلد ہی بھجوا رہا ہوں۔

ذکیہ جیلانی (علیگڑھ)

کچھ پتے لکھ رہی ہوں ان کو میرے حوالے سے ایک سال کے چندے میں نگار وی، پی سے بھیج دیں۔ خود میرا چندہ یقینی ہے۔

شفقت فاطمہ (سیتاپور)

دو سالانہ خریداروں کے پتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کو وی پی کر دیجیے۔ میں نے پہلے گفتگو میں طے کر لیا ہے۔ اطمینان رکھیں۔

عطا محمد شعلہ (بنارس)

اپنا چندہ مبلغ دس روپے حاضر ہے۔ دو خریداروں کے پتے علیحدہ ایک خط کے ذریعے بھیج رہا ہوں، ان کے نام وی پی فرما دیں جلد سے جلد۔ آئندہ بھی کوشش جاری رکھوں گا۔

(منی آرڈر کوپن سے)

ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)

.... میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا۔

نقی احمد ارشاد (ڈمکا۔ سنتھال)

اس پہاڑی اور قباتی علاقے میں بھی مقامی ایجنٹ اس نادر اردو رسالے کو پہنچا دیتا ہے۔ جہاں اردو لکھنے والے تو در کنار بولنے والے بھی بہت کم ہیں۔

آئندہ سے میں نگار کا مستقل خریدار بن جاؤں گا۔

رزاق فاروقی (حیدرآباد دکن)

حسب وعدہ آپ کے نگار کو میں خریدار دے رہا ہوں۔ چھٹیاں ختم ہو جائیں تو کالج کا چندہ بھی پہنچ جائے گا۔ جن خریداروں کے پتے دیتے ہیں ان سے بھی توسیع اشاعت کے لیے کہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بھی نگار کو نئے خریدار دلائیں گے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو بہت خوب ہو

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

ضروری اعلان:
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کر دیا جائیگا
نمائندہ نگار ۶۱۷/این سمن آباد لاہور

جلد ۴۲　　فہرست مضامین مئی ۱۹۶۳ء　　شمارہ ۵

ملاحظات

خدا مغفرت کرے، شوکت تھانوی چل بسے. خبر بڑی اچانک سی تھی. وہ دن قاضی جی کی حیثیت سے ان کی حاضری کا تھا کہ ریڈیو نے قاضی عبد الغفور المخلص بہ مدفن کے مدفون ہونے کی خبر سنائی. دل کو ایک دھچکا لگا. کون سوچ سکتا تھا کہ جس کا کام ہنسنا ہنسانا تھا وہ رلا دے گا. کم لوگوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتی ہے. قلم کے ساتھ ساتھ آواز اور حرکات و سکنات پر جس بے پناہ قدرت کے وہ مالک تھے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی فنکار تھے اور ظاہر ہے کہ فنکاری کا یہ درجہ کتنا ممتاز ہے.

دو ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تھی. پہلی بار طفیل صاحب کے یہاں دفتر "نقوش" میں آ نکلے. اترتے ہوئے میں نے دیکھا اور بغیر کسی دقت کے پہچان لیا. جیسے وہ خود بول رہے ہوں کہ میں شوکت تھانوی ہوں. بڑے مضطرب سے معلوم ہوتے تھے. طفیل صاحب سے اپنی کتابوں کی ایک ایک جلد لی. شاید انگلستان کسی ادبی وفد کے ساتھ جا رہے تھے اور جلدی میں تھے مگر لطیفوں سے غافل نہ تھے. پھر ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی. بڑی محبت سے ملے اور اپنی دو کتابیں دیں. بار خاطر اور قاعدہ بے قاعدہ آخری کتاب دیتے ہوئے کہنے لگے کہ میں خود ہی بے قاعدہ ہوں کہ آپ جیسے باقاعدہ نوجوان کو قاعدہ پڑھا رہا ہوں. وہ صرف لفظوں کے بازی گر نہیں تھے. لفظوں سے اپنا الگ ماحول تخلیق کرتے تھے. اپنے نمایاں کرداروں کے ساتھ لکھنوی تہذیب کی اتنی پر لطف نمائندگی اب کسی سے کاہے کو ہوگی.

ان کی بہت سی تحریریں اخباروں میں چھپ کر رہ جائیں گی. طفیل صاحب ہی یہ کام کر سکتے ہیں کہ اخباروں کے اوراق سے نکال کر

ن سب کو ایک اچھے انتخاب کی شکل میں شایع کر دیں۔ اُن کے ورثہ کو بھی اس سے یک گونہ مگر بروقت تسکین کا سامان بہم پہنچے گا۔

اگر آج ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تو شوکت تھانوی جیسے کتنے ہی ہندوستانی پاکستانی مصنفوں کے حقوق محفوظ رہتے اور ان کے اہل و عیال پر آئی ہوئی مصیبت اتنی سخت نہ رہتی جتنی موجودہ صورت میں بن جاتی ہے۔

سنا تھا کہ انجمن مصنفین پاکستان سلسلہ جنبانی کر رہی ہے مگر شاید وہ بھی سپر انداز ہو گئی۔ اور یہ اہم ترین معاملہ جو کتنی ہی بدمعاملگیوں کا سدباب ہو سکتا تھا لیت و لعل میں پڑا ہوا ہے ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ بھی اس حق کے لیے آواز اٹھائیں۔ اس ملک کا تو وزیر اعظم بھی مصنف ہے۔ اس سے زیادہ اس "امت" کے حقوق کو کون جانے اور سمجھے گا۔ شوکت تھانوی کی موت نے مصنفوں کے جائز حقوق کی یاد دلائی ہے تو انھیں یہ حق ملنے بھی چاہئیں۔ کیا کتابوں اور رسالوں کی تجارت سے زیادہ بے ضرر تجارت ان دونوں ملکوں کے درمیان کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس تجارت سے زیادہ مبارک کوئی اور تجارت بھی ہے جس سے عقل و علم کی دنیا میں روشنی اور عمل کی دنیا میں ہما ہمی آئے۔

کشمیر کے مذاکرات ختم ہو گئے بغیر کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے۔ یہ اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھتا تو دو قریبی ملکوں کے تعلقات شستہ اور شائستہ ہو جاتے۔ لاکھوں انسان ادھر اور ادھر دونوں طرف آنے جانے کی پابندیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اعزا و اقارب کہاں ہیں اور خود کہاں، کتنے دوست بچھڑے کتنے اپنے دیکھتے دیکھتے اس حد بندی نے پرائے سے کر دیئے۔ ایسے قریب کے پڑوسی کب تک الگ تھلگ رہیں گے یا رہ سکیں گے۔

وصل و فراق کی یہ کیفیت اور امید و بیم کا یہ طلسم دیکھیے کب ٹوٹتا ہے۔ اور دو بھائی کب گلے ملتے ہیں ایسے کہ فرط مسرت سے ان کی آنکھیں اشک بار گلے رندھے ہوئے اور دل کی دھڑکنوں میں انبساط فراواں کے نغمے مچلتے ہوں۔ دو بھائی ——— ہند و پاک۔

جنوری میں نگار کے خاص نمبروں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ سب سے پہلے ذاکر حسین نمبر کی تیاری کرنا ہے یوں تو ادارہ نگار فرداً فرداً بھی تعاون کی درخواست کرے گا مگر ضروری نہیں کہ سارے متعلقہ حضرات تک پہنچ ہو سکے۔ اس میں بہت سی دشواریاں ہوتی ہیں بعض اوقات صحیح پتے نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے جو نگار دوست اس نمبر کی تیاری میں کوئی بھی مدد دے سکتے ہوں وہ اس سے گریز نہ فرمائیں اور اس بات کا بھی انتظار نہ کریں کہ براہ راست انھیں لکھا ہی جائے۔ اس انداز کے کاموں میں سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہیں رہنا چاہیے۔

جامعہ ملیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حیدر آباد میں ذاکر صاحب کے دوستوں عقیدت مندوں اور شاگردوں کے حلقے آباد ہیں۔ یہ حضرات توجہ کریں اور ذاکر صاحب کی شخصیت ان کے تعلیمی کارناموں پر لکھیں۔ ذاکر صاحب کے خطبات و پیغامات اور خطوط وغیرہ کو رودادوں اور رسائل و اخبارات کے صفحوں سے جمع کریں۔ ذاتی طور پر ان میں سے جو کچھ بھی جس کسی کے پاس ہو وہ اسے ملک و قوم کی امانت جانتے ہوئے ادارۂ نگار تک پہنچائے تو یہ نمبر ایک اہم دستاویز بن جائے گا اور اس طرح ادب و انشا کے شہ پاروں کے ساتھ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کے ایک اہم تجرباتی دور کی تاریخ بھی سمٹ آئے گی ———

جذبات نادر کے ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر برادرم رشید حسن خاں نے حسب عادت بڑی محنت سے تبصرہ کیا ہے۔ ترتیب کا کام جتنا آسان سمجھا جاتا ہے دراصل اتنا آسان ہے نہیں۔ اس کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو نولکشوری عہد کی کتابوں اور موجودہ دور کی مطبوعات میں کیا فرق ہوگا۔ یہ تقاضے ایسی صورت میں اور بھی سخت ہو جاتے ہیں جبکہ کتاب پہلے سے مطبوعہ شکل میں موجود ہو اور پیش کرنے والے کا یہ دعویٰ بھی ہو کہ اس نے ایڈیٹنگ کے ذریعے زیادہ مکمل شکل دینے کی کوشش کی ہے ——— اردو میں ایڈیٹنگ کا معیار کیوں بلند نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ اس کے وجوہ بہت سے ہیں جن میں مرتب اور ناشر اور ان دونوں کے ساتھ اہل علم کا تساہل بھی کچھ شامل ہے۔ آئندہ اس اہم مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

اردو ڈراما — حال اور مستقبل

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اردو ڈراما عہد جدید کی پیداوار ہے اور اس کے لیے ہم پرتگیز کا جس قدر احسان مانیں کم ہے۔ مغربی اقوام میں پرتگیز ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ من حیثیت القوم سب سے پہلے لوگ ہیں جو نامعلوم راستوں کو عبور کرتے ہوئے ساحل ہند تک پہنچے اور صرف بارہ سال کی کوشش سے نہ صرف گوا پر قابض ہو گئے۔ بلکہ اس کے ذریعے ایک وسیع علاقے کے حاکم بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بہمنی حکومت کے زوال پر احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور برار کی مسلم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اردو اپنی ابتدائی منزلیں طے کر کے عدالتی زبان بنتی جا رہی تھی۔ سلاطین دکن نہ صرف علم و ادب کے سرپرست ہی تھے بلکہ خود بھی سخن سنجی اور سخن فہمی کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔

یہ رومتہ الکبریٰ کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ اسپین کی عظمت ایک کیتھولک ملک کی حیثیت سے مسلمہ تھی اس لیے اسقف اعظم کے اشاروں پر چلنے والی حکومتیں فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ مبلغین کے دستے بھی روانہ کرتی تھیں جو "جاہل اور بت پرستوں" کو "خداوند یسوع مسیح" کا درس دیتی اور "آسمانی روشنی" سے ان کے دلوں کو منور کرتی تھیں۔

گوا کو مرکزی حیثیت ملتے ہی مبلغین تثلیث نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ چونکہ اردو عوامی زبان بن چکی تھی اس لیے پرتگیز نے اسی کو تبلیغ تثلیث کا ذریعہ بنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھر کر نہ صرف تقریروں کے ذریعے حضرت عیسیٰ کے پیغام کو پہنچایا بلکہ ان کی زندگی کے حالات بھی اسٹیج پر پیش کیے۔ یہیں سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگرچہ اب تک اردو کے ابتدائی دور پر تحقیق کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے اور یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ پرتگالیوں نے اپنے دور میں کس قدر مدارس اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے قائم کیے۔ نصاب کس قسم کا تھا۔ درسی کتابیں کس نے لکھیں اور کب لکھی گئیں اور آیا مابعد زمانہ میں وہ شائع ہوئیں یا نہیں پرتگیز مدارس کے مدرسین ہندوستانی تھے یا سب غیر ملکی، اردو اور فارسی کے علاوہ دکن کی اور کونسی زبانیں ان مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگر ان سوالات کا جواب ہم کو مل جائے تو نہ صرف اردو ڈراموں کی ابتدائی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ تاریخ ادب اردو کے ابتدائی دور کی ترتیب و تدوین میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اردو ادب کے محققین اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

پرتگالیوں کی خوش قسمتی سے مغلیہ حکومت کا آفتاب طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اکبر نے فتوحات دکن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس لیے مبلغین تثلیث کے ہاتھ ایک نیا میدان آیا اور انھوں نے دہلی اور آگرہ میں بھی تثلیث کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اکبر اور جہانگیر کی سرپرستی اور مسلم اراکین دولت مغلیہ کی ہمت افزائی نے ان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا اور وہ پنجاب اور کشمیر سے آگے بڑھ کر تبت تک جا پہنچے۔ پرتگیز مبلغین کو اس داد و دہش سے کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہم کو البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ تبت میں بھی اردو لکھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ تبلیغی سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رہا۔ بعدہٗ انقلاب زمانہ نے پرتگالیوں کو بیک بینی و دو گوش ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ ان کی جگہ پہلے ڈچ، پھر فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں نے لی۔

ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کی لہٰذا ہم اس عبوری دور سے گزرتے ہوئے سنہ ۱۷۵۰ء پہنچتے ہیں جب کہ انگریزی کا پہلا اسٹیج ہندوستان میں قائم ہوتا ہے۔ اس کا نام "بمبئی تھیٹر" تھا اور بمبئی گرین۔ بمبئی" میں تعمیر ہوا تھا یہ اسٹیج سنہ ۱۸۳۶ء تک قائم رہا۔ بعد کو قرض خواہوں کی نذر ہو گیا۔ دس سال کی کوشش اور جد و جہد کے بعد ایک دوسرا انگریزی اسٹیج سنہ ۱۸۴۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا سرکاری نام اگرچہ "بمبئی تھیٹر" تھا لیکن وہ "گرانٹ روڈ تھیٹر"، "رائل تھیٹر" اور "شنکر سیٹھ کا تھیٹر" بھی کہلاتا تھا۔ اس میں سنہ ۱۸۵۳ء تک صرف انگریزی ڈرامے دکھلائے جاتے تھے۔ سال مذکور میں

بئی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے کمپنی کی اجازت سے اس میں مرہٹی ڈرامے دکھلائے کیوں کہ مرہٹی شنکر سیٹھ کی مادری زبان تھی لیکن مرہٹے چونکہ اوسطاً غریب تھے اس لیے مسلسل نقصانات کے پیش نظر مرہٹی کے بجائے ہندوستانی یا اردو میں ڈرامے دکھلانے شروع کیے۔ چونکہ انگریز اردو زبان سے واقف تھے جو ان کو بطور زبان خاص ایسٹ انڈیا کالج لندن اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سکھلائی گئی تھی اس لئے انھوں نے اردو ڈراموں کو خوش آمدید کہا اور پہلا ڈراما " راجہ گوپی چند اور جلندھر" جو ۲۶ نومبر کو دکھلایا گیا تھا دیکھنے کیلئے گورنر بہ اجلاس کونسل کمانڈر انچیف اور دوسرے سول اور ملٹری عہدیداران سرکاری تشریف لائے۔

یاد رہے کہ " راجہ گوپی چند اور جلندھر" ۱۸۵۳ء میں دکھلایا گیا۔ گورنر اور کمانڈر انچیف کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔ ایک ایسے اسٹیج پر پیش کیا گیا جو لندن کے رائل تھیٹر ڈرروری لین کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا اور انگریز جسے " آدرش ڈرروری" کہتے تھے اور جس کا مکمل ریکارڈ اب بھی حکومت مہاراشٹر کے آرکیوز میں محفوظ ہے۔ پھر بھی بعض لوگ " رہس" کو " ڈرامہ" کے جامے میں پیش کرکے اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تو تاریخی شواہد کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ میں کوئی اسٹیج ہی نہ تھا۔ نہ پرتگیز نے تعمیر کیا تھا۔ نہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اور نہ کبھی انگریزوں نے اس کی تعمیر کا خیال ظاہر کیا تھا اس لئے اگر نوٹنکی۔ رام لیلا اور رہس وغیرہ کو ناٹک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب اسٹیج ہی موجود نہ ہو ۔ واجد علی شاہ جلیل القدر حکمراں نے ماڈرن اسٹیج ہی نہ دیکھا ہو اور امانت جیسے مصنف کو خواب میں بھی کبھی نظر نہ آیا ہو تو واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کا رہس کس طرح ڈرامے کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

" اردو ڈرامہ" کا مقدمہ کچھ طویل ہوگیا۔ آیئے اب ہم اردو ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اردو ڈرامہ پانچ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ڈاکٹر بھاؤ دا جی لاڈ سے شروع ہوکر نرمدا شنکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والے تقریباً سب پارسی تھے الا سوکر بالوجی ٹھلو کیکر کے جو ایک مرہٹہ تھا اور نرمدا شنکر کے جو گجرات کا باشندہ تھا۔ پارسی ڈراما نویسوں میں افضلیت کا شرف خان صاحب سنر وان مہروان جی آرام کو حاصل ہے جنھوں نے گل باصنوبر چہ کرد۔ ہیرا۔ چندراوتی۔ حاتم طائی۔ باغ بہار۔ لیلیٰ مجنوں۔ عالمگیر۔ گوپی چند۔ جوان بخت۔ گل بکاؤلی۔ نورجہاں بہرام اور شیریں نامی ڈرامے اور ایک درجن کے قریب اوپرا یعنی منظوم ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد ایدل جی بھائی۔ بندہ خدا۔ ڈاکٹر پارکھ۔ رانڈ صیلیا۔ فرامرز۔ کابراجی کھوری اور جہانگیر پٹیل کا نمبر آتا ہے۔ جنھوں نے خسرو شیریں۔ پاکدامن گلنار۔ بھولی گل دورنگی دنیا۔ رستم وسہراب۔ جمشید۔ شاہ زادہ سیاوش۔ خداداد بخش قیمل الزماں ظالم زر۔ ستمگر۔ عالمگیر۔ پاکدامن پردین وغیرہ لکھے۔ اس دور کے ڈرامے عموماً گجراتی زبان میں لکھے اور اردو میں ترجمہ کیے جاتے تھے۔ آرام کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ اردو فارسی سے واقف تھے اور براہ راست اردو میں لکھا کرتے تھے۔

دوسرا دور احمد حسین خاں سے شروع ہوکر بابو ہریش چندر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے بیشتر ڈرامہ نویسوں نے اپنے ڈراموں کی زبان کے لیے اردو کو استعمال کیا ہے یہاں سے واضح طور پر اردو کی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ لکھنے والوں میں السوں مراد آبادی۔ امراؤ علی لکھنوی۔ بالو با لشیور پرشاد۔ بزرگ لاہوری۔ میر حسین خاں بلبل۔ دھنپت رائے بیکس۔ فقیر محمد تیغ۔ سید سجاد حسین جوہر بنارسی۔ میاں چراغ الدین چراغ۔ لالہ چندن لال۔ محمد الف خاں حباب فتح پوری۔ درگا پرشاد۔ دینا ناتھ فتح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کے ڈراموں میں خورشید حسینا۔ نازاں۔ رزم بزم۔ طلسم عشق۔ جود جابر۔ ساحر سبھا۔ سحر سامری عشرت سبھا۔ طلسمات سلیمانی۔ اکبر اعظم۔ دلبر دلشیر۔ انجام الفت۔ ہما ماخد العصمت کا ڈاکو شرارہ عشق۔ حسن کوزسین۔ مار آستین وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اسی دور کے دیگر ڈراما نویسوں میں رونق بنارسی۔ سجاد دہلوی۔ کدارناتھ صورت۔ دناکیب پرشاد۔ غلام حسین ظریف۔ سید میر عباس علی۔ حافظ محمد عبداللہ۔ عبدالوحید قیس۔ پنڈت بنواری لعل عطا شمس آبادی۔ غلام قادر فصیح۔ مراد بریلوی۔ نظیر اکبرآبادی اور نظامی جبلپوری نے کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا تیسرا دور احسن لکھنوی سے شروع ہوکر یعقوب علی پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دور اردو ادب کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لیے ڈراما نویسوں اور ان کی تصانیف کی تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

احسن لکھنوی : کے دس ڈراموں میں چندراولی۔ خون ناحق۔ بزم فانی۔ الفرڈس۔ بھول بھلیاں۔ چلتا پرزہ۔ شریف بدمعاش کافی مشہور رہے۔

آرزو لکھنوی :۔ کے دس ڈراموں میں متوالی جوگن اور حسن کی چنگاری سے شہرت پائی۔

بیتاب دہلوی :۔ کے ۱۲ ڈراموں میں کرشن اوتار۔ گورکھ دھندا۔ میٹھا زہر۔ زہری سانپ۔ امرت۔ مہابھارت۔ رامائن۔ اور کرشن سداما اسٹیج پر مقبول ہوئے

حشر کاشمیری :۔ کے ۳۲ ڈراموں میں اسیر حرص۔ شہید ناز۔ صید ہوس۔ خواب ہستی۔ خوبصورت بلا۔ یہودی کی لڑکی۔ بلوا منگل بھگیرت گنگا۔ ہندوستان ترکی حور۔ سیتا بن باس۔ دھرمی بالک۔ بھارتی بالک۔ دل کی پیاس اور رستم و سہراب نے نام پیدا کیا۔

دیوانہ امرتسری :۔ کے کئی درجن ڈراموں میں تائید یزدانی۔ مہاراجیہ۔ آفتاب۔ اجودھیا۔ سبز پرستان کافی مقبول ہوئے۔

ذائق لکھنوی :۔ کے ۱۴ ڈراموں میں نور عرب۔ تاج نوران ستی ساوتری۔ زہر کی انگوٹھی۔ فخر عرب۔ دھرم یوگی۔ کنٹھوہ بھرتون نے شہرت پائی۔

رحمت علی :۔ کے نصف درجن ڈراموں میں درد جگر۔ باوفا قاتل۔ جلاد عاشق مشہور ہوئے۔

عباس علی :۔ کے ۱۲ ڈراموں میں۔ نیرنگ ستمگر۔ جہاں آرا۔ جاں نثار۔ نور اسلام۔ پنجاب میل۔ شریمتی منجری۔ موہنی بی اے۔ لیڈی لاجونتی پورن مل۔ ستی سندری نے عزت پائی۔

محشر انبالوی :۔ کے ۱۹ ڈراموں میں دشمن ایمان۔ جوش توحید۔ دوزخی حور۔ خون جگر۔ سنہری خنجر شکنتلا۔ خود پرست کافی مشہور ہوئے۔

مراد لکھنوی اشتر لکھنوی اور مراد لکھنوی کے ڈراموں نے بھی کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا چوتھا دور آرزو بدایونی سے شروع ہوکر کیتا پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں آرزو بدایونی۔ آصف مدراسی۔ اعظم حیدرآبادی۔ افسوں شاہجہانپوری۔ دل لکھنوی۔ راحت مرادآبادی۔ رادھے شیام۔ رندھیر۔ شمس گیاوی۔ اور شمس لکھنوی نے نام پیدا کیا۔

اس کے بعد جب اردو ڈرامہ اپنے پانچویں دور میں داخل ہوتا ہے تو کم از کم اپنی ٹکنک ختم کر چکتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو صرف مطالعہ کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔

اگرچہ اردو ڈراما آج ختم ہو چکا ہے اور اسٹیج کم و بیش مردہ تصور کیا جاتا ہے لیکن حالات بتلاتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب اردو اسٹیج دوبارہ اپنی سابقہ عظمت حاصل کرے گا۔

آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ عوام کو ڈرامے کے صحیح فن سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنے ڈراما نویسوں اور ان کے پیش کردہ ادب کو پہچان سکیں۔ آج دنیا کا ہر ملک اپنے ڈراما نویسوں پر فخر کرتا اور نظم میں ڈرامے کو سب سے بلند مقام دیتا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ شکسپیئر۔ شا۔ ابسن۔ گوئٹے۔ شلر اور گالسورذی کا درجہ اپنے ملک کے دوسرے ادیبوں پر بھاری ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو اسٹیج اور ڈرامہ کا مستقبل شاندار ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ اس میں دلچسپی لے کر اس کو اس کے صحیح مقام پر جلد یا بدیر پہنچا دے گا۔

حسرت کی رومانیت

سعادت نظیر ایم، اے

انسانی نفسیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا اتھاہ سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی طرح طرح کی وقت بے وقت ذرا ذرا سے تغیر سے ان گنت کیفیات کی موجیں جو احساسات و جذبات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں، پیدا ہوتی ہیں، جن کا مکمل نفسیاتی تجزیہ قریب قریب ناممکن ہے، انہی کیفیات میں رومانیت بھی ایک ممتاز کیفیت ہے، جو مختلف اور متعدد عناصر سے مرکب ہے جس کی فضا میں عقل و شعور کے اجزا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ البتہ ماضی پرستی، تجسس حسن، مرکزگریزی، جذبات کا ہجوم، احساس و وجدان پر اعتماد، تخیل کی خود کفالتی، ولولۂ مہم جوئی اور انقلاب حیات کا جوش داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے تو صحت و صفائی اور بیان کی وضاحت و تشریح سے زیادہ موسیقیت، اشاریت اور معنی و مفہوم کی تہیں اور ان کی وسعتیں بھی خارجی حیثیت سے ملتی ہیں غرض رومانیت بھی ایک عجیب کیفیت کا نام ہے جو دل میں ایک عجیب و غریب اضطراب سا پیدا کر دیتی ہے، جس کی تسکین کے لیے فطری طور پر خارجی ماحول میں دلبستگی و دل آویزی کی جستجو، جاذب نگاہ مناظر کی تلاش، ہم خیالی کا تجسس، یکدلی، یک جہتی، اور ہم آہنگی کی تمنا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ یقین سامانی کے ساتھ حسینوں کے ارتباط یا تذکرۂ حسن میں محسوس ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ترقی کرتے کرتے عشق و محبت کا روپ دھار لیتی ہے اور رفتہ رفتہ ہر شعبۂ نفسیات پر چھا جاتی ہے، رومانیت کا یہی بدلا ہوا روپ شعر و شاعری کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے، جیسے جیسے شاعر کو حسن کا گہرا احساس ہوتا ہے، ویسے ویسے وہ نامعلوم طور پر عام سطح سے بلند ہو کر نہ صرف حسن کے جلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہی ہوتا ہے بلکہ اپنے اس خصوصی احساس کو مترنم آہنگ کے ساتھ زبان و بیان کا خوش وضع لباس بھی عطا کرتا ہے، احساس کی اس پیش کش میں عموماً شاعر کی طبعی افتاد، علمی صلاحیت، عہد گزشتہ کے واقعات، ماحول کے اثرات اور اشاریتی انداز قابل لحاظ حد تک دخیل ہوتے ہیں اور یہ چیزیں اگر مناسب حیثیت سے مدد و معاون ہوں تو یہی رومانیت اس کو ایک معیاری مقام پر پہنچا دیتی ہے، اور اس کی شخصیت کو قابل قدر بھی بنا دیتی ہے اور شاعر اپنے جادو اثر نغموں سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو محظوظ کر کر کے مسحور کر لیتا ہے اردو شاعری کے افق پر کچھ ایسے آفتاب اثر شاعر بھی نمودار ہوئے ہیں، جن کے احساسات کی شعاعوں نے غم حیات کے طوفانِ باد و باراں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک نظر فریب قوسِ قزح کی تشکیل کی انھیں ممتاز رومانی شاعروں میں حسرت موہانی بھی ایک شخصیت ہیں جنھوں نے "چکی کی مشقت" کے دوران میں بھی رومانی غزل نگاری کو نظر انداز نہیں کیا۔

حسرت کے کلام میں حسن کی جلوہ سامانی، نشاط کی کیفیت، حواس کی آسودگی اور احساسِ جمال کی ندرت پائی جاتی ہے، ان کے یہاں ایک صحت مند با مذاق اور جمال پرست کی جگر تشنگی ہے، وہ حسن کے ہر جلوے کے پرستار ضرور ہیں مگر چونکہ بہارِ باغِ کائنات "صنف نازک" کا حسن ہی شعور و احساس پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے وہ بھی اسی بتِ ہزار شیوہ پر جان دیتے ہیں، ان کا مرکزِ دل اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مشرقی خاتون ہے، جو ہرجائی نہیں اور وضعیت بھی نہیں، پاک باز ہے، سادگی کا پیکر اور شرم و حیا کا مجسمہ ہے ؎

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی اے حسنِ حیا پرور! شوخی بھی، شرارت بھی

حسرت اپنی بیقراریِ دل کا اظہار کرتے ہیں مگر زبان سے نہیں، آنکھوں سے کیوں کہ محبوب کے خاطرِ نازک کا انھیں پورا پورا لحاظ ہے ؎

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر نگاہِ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

کبھی تو رعب حسن اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسرتِ اظہار دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

حسرت ایک صداقت پسند اور راست گو کی طرح دورِ ارتقا میں عہدِ ہوس کا ایک واقعہ جو غالباً ان کی رومانیت کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے

ی ہی سادگی سے بے جھجک جرأتِ رندانہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ نہایت اضطراب و اشتیاق کے ساتھ محبوب سے دل بستگی کے باعث بار بار اُن کی مشتاق نگاہیں،
ہ اختیار اس کی جانب اٹھ جاتی ہیں، وہ عاشق نواز بھی اپنے غرفے سے تاک جھانک کرتی ہے، اس سے کبھی وہ مل کر دفورِ شوق سے کچھ بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں
و شرم و حیا کی ماری دانتوں میں انگلی دبالیتی ہے، کبھی درازدستی سے پردہ گرادیتے ہیں تو وہ دوپٹے سے منھ چھپالیتی ہے، سوتے میں پاؤں چومنا چاہتے ہیں تو وہ شوق سے
ا کر مسکرا دیتی ہے، ابتدائی زمانہ یاد دلاتے ہیں اور جستہ جستہ واقعات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ چوری چھپے رات غیروں کی نظریں بچا کر آجایا کرتی تھی اور دورانِ ملاقات
کبھی ذکرِ فراق آجاتا تھا تو روتی بھی تھی اور رلاتی بھی تھی، دوپہر کی سی دھوپ میں ان کے بلانے کو ننگے پاؤں چلی آتی تھی، اس کی پھولوں میں بسی زلفیں مشامِ جان کو طبلۂ عطار
ا دیتیں اور اس کے مہندی میں رچے ہوئے دست و پا رنگینی کا منظر پیش کرتے تھے، چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوتیں اور وہ دشمن کے ذکر کو باتوں میں اڑا دیا
تی تھی، مختصر یہ کہ صحبتِ راز و نیاز گرم رہتی تھی، انھیں برگشتگی پر سو سو نا سے منایا جاتا اور وہ جب من جاتے تو وہ خود روٹھ جاتی، وہ چھیڑتے، گدگداتے، وہ
بگڑ کر منتی اور من کر بگڑ جاتی ہے

اے شوق کی بے باکی! وہ کیا تری خواہش تھی؟ جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

اُس نازنیں سے لڑائی بھی ہوتی ہے اور صفائی بھی، تقاضائے محبت کے ہاتھوں وہ وفا پر مجبور بھی ہے، لیکن دنیا کا خیال مانع ہے اور بدنامی و
سوائی کا خوف عناں گیر، حضرت کی اس ابتدائی سادگی و سیردگی کی جگہ آخر میں ربودگی و سنجیدگی لے لیتی ہے جس میں تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی
رائی سے ایک وزن پیدا ہوجاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ باتوں سے وصل کی تدبیر بنتی ہے نہ آرزو سے تقدیر پھرتی ہے، التفاتِ یار کو وہ آغاز
کا ایک ایسا خواب تصور کرتے ہیں جس کی تعبیر سچ نہیں ہوا کرتی، تیری عمر ہو کر انھیں عظمتِ عشق محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی عالی جنابی اور گردوں رکابی پہ بھی ناز کرنے
ے ہیں، عشق و محبت کے ابتدائی دور کی حسین یادیں ہی ان کی رومانی زندگی کے مایۂ ناز سرمائے سے کچھ کم نہیں گویا آغازِ الفت کے عیش با فراغت اور بیگانۂ رسم
غا محبوب کے لطفِ بے نہایت کے مزوں کی یاد ہی تادمِ مرگ اُن کی حیاتِ عشق کا آسرا بنی رہی:

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
اک بار ستی تھی سو مرے دل میں ہے موجود
اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری در دیدہ نگاہی
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

حالانکہ جیسا ان کے کلام سے پتا چلتا ہے، محبوب کی اور ان کی ملاقاتوں کی زندگی کبھی کی ختم ہوچکی ہے، باہمی چھیڑ چھاڑ کا واسطہ باقی نہیں رہا، سلسلۂ
راز و نیاز منقطع ہوچکا ہے، نہ وہ ہمنشینی ہے، نہ وہ بادہ پیمائی، بایں ہمہ قنوطیت، جو منجملہ لوازماتِ فراق ہے حسرت کے دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہوسکی
اور وہ کہیں نا امید و مایوس نظر نہیں آتے، اور انھیں یادوں کے سہارے اپنے رنگین ماضی کی دنیا خیالوں میں بساتے اور متکیف ہو کر ایسے نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ روداد
حال کا شبہ گزرتا ہے:

اے یادِ یار! دیکھ! کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائیں
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد
وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

دنیائے محبت میں حسرت پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ گزری، اسی کی سرگزشت تو ان کی رومانی شاعری کی جان ہے، جدائی کے عالم میں وہ کبھی روئے دل آرا کے
تصور سے کھیلتے ہیں تو کبھی خیالِ یار سے باتیں کرتے ہیں، کبھی یادِ جاناں کی رنگینیوں سے بہلتے ہیں تو کبھی غمِ ہجراں سے گھبرا کر بے اختیار وصالِ یار کی دعا کر بیٹھتے ہیں مگر
پچھتاتے بھی ہیں کہ کہیں ان کی التجا قبول ہوگئی تو انھیں کشمکشِ انتظار کی لذتوں سے محروم ہونا پڑے گا، لبوں پر شکوۂ بے اعتنائی ہوگا اور نہ خلشِ فرقت ہی
رہے گی کہ دل لطف اندوز ہوسکے۔ لیکن حقیقت ہے کہ محبوب کی غفلت شعاری عشق کا سخت ترین مرحلہ ہے ؎

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی　　حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اس منزل پر بھی آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں اور بے وفا ہو جائیں، عشق کے حسین زمانے کو ایک خوابِ فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھا لیں، کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائلِ آرام ہوں اور مشتاقِ شفا بھی، انھیں کوئی ارماں ہو نہ کوئی حسرت بلکہ بے نیازئ مدعا ہو، عہدِ وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اُس حسنِ ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس کا روگ ہے؟

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر　　اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل! اے دلِ مبتلا　　مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا

حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ کہیں انھوں نے ابتذال اور فحاشی کی بھی پروا نہیں کی، ان کے یہاں مذاقِ سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں، لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں جو ان کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں، جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ذوق جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان کے سحر آگیں شعروں میں ایک شاہ پارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسنِ کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام "جنوں" پڑ گیا جنوں کا "خرد"　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

قادرانہ رمز کاری شعر کو سرکش بنا دیتی ہے، تشبیہیں، استعارے اور کنائے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں، ان سے معنوں اور برمحل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا خوش رنگ دامن وسیع تر ہو جاتا ہے، مگر ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں جس حسن سے برتے گا، شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے، ان کی تشبیہات، استعارات اور کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں:

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں　　یا عکس مے سے شیشہ گلابی

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی　　کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا

اسی سے چھپتے ہیں، ہوتی ہے جس پہ اُن کی نظر　　اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نفسیات کی یہ بالکل روزمرہ کی ہوئی بیش پا افتادہ بات ہے کہ بات پر بات یاد آتی ہے، چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے:

نہ چھیڑ اے ہمنشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے　　شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہینِ نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے:

نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں　　شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوبِ اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے:

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت　　نگہِ شوق نے، کیا جانیے! کیا دیکھا ہے؟

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگا رنگ پہلوؤں سے کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی، نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے، مگر عوام کو یہ سارے جذبات گونگے کا گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ شاعر ہی کا حصہ ہے کہ بقدرِ قدرت کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہونچاتا ہے کہ ہر اک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اور مزہ لیتا ہے، شاعر اپنے جذبات ہی کو

ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے
کے ساتھ اپنی تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا چیخ اٹھتا ہے کہ گویا یہ بھی
میرے دل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرتِ کمال ہے، ان باتوں کا دارومدار
داخلی نوعیت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی
حیثیت سے ماحول، معاملات و تجربات کی اثر اندازی پر۔ جس شاعر میں رومانیت
جس شدت کی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ، موثر اور پسندیدہ ہوں گے،
حسرت کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت سموئی سموئی سی محسوس
ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری میں ایک دلکشی اور پسندیدگی آگئی ہے جو حسنِ قبول
کی ضامن ہے:

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لایا ہے دل پر کتنی خرابی!
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق
دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے؟
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

حسرت کے کلام میں احساسِ جمال، صحت مندیٔ ذوق، معاملاتِ حسن و عشق
کی بصیرت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں سادگی، شگفتگی اور لطافت وہ بے باکی ملتی
ہے، ان کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات
میں تندی نہیں، اعتدال ہے، اور احساسات میں کیف آگینی و نشاط انگیزی:

تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں　　شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی　　یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت مرہونِ فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب
تمدن کے اصولی قیود و بند سے آزاد ہو کر انبساطِ احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام
"رومانیت" ہے، گامزن ہو گئے ہیں۔ جہاں ان کے خیال اور جذبے کے پرکشش
نقوش کہیں ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں ابھر آتے ہیں، لب و لہجہ نوش گوار
ہو جاتا ہے، اضطراب و سرشاری، بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ لطیف
اشاریت جھلکنے لگتی ہے اور وہ اپنے اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک دوسرے
میں سمو کر لطیف پیرایۂ بیان میں اپنی طرب آفریں "رومانیت" کی جلوہ گری

کرتے ہیں:

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
جلد، اے حوصلۂ دید! مجھے تھام کہیں

دامِ گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

بقیہ سن انیس سو باسٹھ کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

نمکدان، پاک پنچ، پھلجھڑی، بھوپال پنچ، بیسویں صدی، شمع، بانو، کھلونا،
بھائی جان، امروز، جنگ، کوہستان، داستان گو، نصرت، لیل و نہار،
قومی آواز، پیج، انجام، سیاست، انقلاب اور ملاپ میں خبر لیتے نظر
آتے ہیں۔

اردو کارٹونوں کی تاریخ اودھ پنچ کی طرح نمکدان کے سیاسی اور
سماجی کارٹونوں کا ایک الگ باب تیار کرے گی۔ نجمی اور جمیل کے قلم
میں اودھ پنچ والی تیزی اور شوخی ہے۔ جنگ میں نجمی کا مستقل کارٹون
"آپ سے ملیے" امروز کے لیے "بڑے میاں" اور "وقت کی بات"
قومی آواز میں پرکاش کی "ایک ہی" اور "زمانے کی رفتار" کوہستان
میں حمید کا "میر صاحب" پیج کا "چلتی دنیا" انجام میں محمود بٹ کے "منشی جی"
سیاست حیدرآباد میں احمد کے مستقل کارٹون، انقلاب میں وہاب حیدر
کی "سنی سنائی" ملاپ میں پران کی "آج کی بات" شمع میں سدھیر کے ہنستے
گیت، پاک پنچ میں عزیز کے کارٹون، پھلجھڑی میں شہاب کے
کارٹون اور ان کے علاوہ داستان گو، نصرت اور اردو کے بیشتر
رسائل و اخبارات میں شنکر اور دوسری زبانوں کے کارٹونوں کے
چربے اس بات کے ضامن ہیں کہ کارٹون کے فن پر ہمارے ادب میں خاطر خواہ
توجہ دی جا رہی ہے۔ اور اس فن کا مستقبل خاصہ روشن ہے۔ خاص طور
پر بچوں کے رسائل کا۔ [illegible] کے بغیر [illegible] ہیں اور اخبارات
کا یہ رنگ روز بروز لازمی جزو بنتے جا رہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی طنزیہ و مزاحیہ ادب خاصہ آگے بڑھا ہے
اچھی کتابیں، اچھے مضامین اور اچھے لکھنے والے اچھے مستقبل کی
نشاندہی کرتے ہیں، ہر چند کہ بہترین ادب معیار و مقدار کے
اعتبار سے بہت زیادہ نہیں پیدا ہوا مگر پھر بھی رفتارِ ادب حوصلہ
شکن نہیں بلکہ خاصی حوصلہ افزا رہی، اور مستقبل میں طنزیہ و مزاحیہ
ادب کی نئی وسعتوں اور بلندیوں کے امکانات زیادہ واضح اور روشن

ذوق — ایک مطالعہ

محمد انصار اللہ نظر

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ عہد آفریں صرف وہی شخصیتیں ہوتی ہیں جو ماضی کی روایات کو اچھی طرح جانتی سمجھتی اور برت سکتی ہوں ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی ہونی لازم ہے کہ وہ ماضی سے مستقبل کے لیے صحیح نتائج بھی اخذ کر سکیں، ہر زمانے کے لیے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور یہ تقاضے ہر حال میں پورے ہو کر رہتے ہیں البتہ کچھ ذہین اور با استعداد اشخاص ان تقاضوں کو سمجھ کر ان کے لیے مناسب ذرایع پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں ایک انقلاب پیدا ہوا، زبان و ادب کو بھی ایک نیا انداز اختیار کرنا تھا۔ سرسید اور حالی، شبلی اور آزاد نے زمانے کے ان تقاضوں کو سمجھ کر مناسب اقدامات کیے اور اس طرح زبان و ادب بہت جلد صحیح نہج پر لگ گئے اگر ہمارے یہ بزرگ اس وقت نہ ہوتے تو بھی یہ کچھ ہو کر رہتا البتہ ممکن تھا کہ اس تبدیلی میں کچھ عرصہ اور لگ جاتا، سائنسی اصطلاح میں ان عہد آفریں شخصیتوں کی حیثیت (CATELYTIC AGENT) کی ہوتی ہے جو عمل کو تیز تر بنا دیتا ہے۔ وہ اس عمل میں کوئی حصہ نہیں کرتا بلکہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے عمل کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جدید طرز کے مشاعرے کی بنیاد رکھی یہ اس دور کا تقاضا تھا، آزاد کے ذریعہ یہ کام ہوا، آزاد نہ ہوتے تو بھی یہ ہو کر رہتا دیر یا جلد لیکن یہی کام ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ممکن نہ تھا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ذوق کی تربیت میں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا لیکن آزاد کے اس کارنامے کو صرف ذوق کی تربیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد سید ممتاز علی نے لکھا ہے:

"انھوں نے ابتدا سے ان میں یہی دھن پائی کہ وہ نظم اردو کے دوسرے دلی بن جائیں اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیں کہ یہ زبان بھی روئے زمین کی اور معزز زبانوں کی طرح تمام مطالب علمی کے لیے کارآمد ہو سکے اور جس کے الفاظ اور بندشوں میں ہمارا دل اپنی پوری حسرتیں اور ارمان نکال سکے۔ اس منصوبے کا ظہور اگرچہ ۱۸۷۴ء میں ہوا لیکن یہ وہ منصوبہ تھا جس نے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دامن تربیت میں نشو و نما حاصل کیا تھا۔" (مجموعۂ نظم آزاد۔ دیباچہ صفحہ ۳)

کچھ شک نہیں کہ ذوق کی شخصیت نہایت اہم تھی، ان کا علم و فضل، ان کی قادر الکلامی، تلامذہ کو اصلاح دینے کا انداز مسلّم ہے اس میں شک نہیں کہ ذوق اپنے دور کے شاعرانہ ماحول کے صحیح نمائندہ تھے، ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے دور میں پسندیدہ تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اپنے دور میں نہایت مقبول اور ہر دل عزیز رہے، تمام تذکرہ نویس ان کی خوبی کلام کے قایل اور معترف ہیں۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے افراد ان کے دامن تلمذ سے فیض اٹھانا فخر سمجھتے تھے، حالت یہاں تک پہنچی کہ:

"صبح سے شام تک تربیت طلاب کمال اور حک و اصلاح سخن سے خواب و خور کی مہلت نصیب اعدا تھی۔" (گلستان سخن)

قبول عام کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب انتقال ہوا تو سینکڑوں تاریخیں کہی گئی تھیں۔

"مسموع ہوا کہ ایک خوش مذاق نے سعی اور تجسس کو کام فرما کر ان قطعات سے کچھ کچھ بہم پہنچائے بعد شمار کے دریافت ہوا کہ تین سو سے زیادہ فراہم ہو گئے تھے۔" (گلستان سخن)

[illegible]

پیدا ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کسی آنے والے انقلاب کو محسوس کر لیا ہے۔ مشہور ہے کہ ذوق نے اپنے عہد کی روایات کو بڑی خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے نباہا، لیکن یہاں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اگر ساتھ دیا تو کس طرح؟ کیونکہ یہیں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔

ذوق سترہ سال کی عمر سے پہلے ہی شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو چکے تھے (مجموعہ نغز) شاہ نصیر استاد وقت تھے کچھ عرصہ کے لیے شاہزادہ مرزا ابوظفر کو اصلاح دینے پر بھی مامور ہوئے تھے، یہ بڑے قادر الکلام، بلکہ زور آزما استاد تھے "تیلیاں" کی ردیف میں مشہور معرکہ ہوا:

"شاہ نصیر کی ملاش پر ہزار آفریں ہے کہ ہر بار دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتا تھا اور ہر شاگرد کی غزل انہیں بیس سے کم نہ ہوتی تھی طرفہ یہ کہ وہ سب غزلیں بھی ایسی بلکہ تازہ عرصہ سخن کی طبع زاد ہوتی تھیں" (گلستان سخن)

اور یہ مشاعرہ "کئی مہینے تک" جاری رہا۔ ایسے زور آور اور کہنہ سال اور کہنہ مشق استاد کی شاگردی کا اثر یہ ہوا کہ خود ذوق بھی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے لگے۔ اس دور کی بعض غزلوں کے ردیف و قافیہ کو دیکھیے:

اب/غضب ہے کہ نہیں — آب/حساب تو دے — نایاب/بے تاب آوے کرنہ آوے — گردن/بدن کر لگے

ذوق نے ابتداءً اپنے عہد کے انداز غزل خوانی کو اپنایا اور اس میں خوب کامیاب رہے، سرکار شاہی سے خطاب پایا، بادشاہ اور ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے، اپنے منصب کی خاطر روایات کو برابر آخر عمر تک نباہتے رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۱ء کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس کا یہ شعر مشہور ہے

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی — دنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے (چراغ دہلی از حیرت)

آزاد نے بھی اس سلسلہ میں جا بجا استاد کے اقوال لکھے ہیں بعض یہ ہیں:

"۱۸۵۳ء میں ایک مشاعرہ ہوا ..... فرمایا ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں زمین ٹھنڈی ہوتی ہو کلام بے اصول نہ ہو" (دیوان ذوق صفحہ ۱۰۵)

"۱۸۵۰ء میں .... مشاعرہ کیا ..... میں نے کہا حضرت ضرور کہیئے چاہیے لوگ کہیں کہیں گے انھیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا، استاد کا ارادہ پھر مستقل ہو گیا اور غزل تمام کی" (ایضاً صفحہ ۱۹۲)

یہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ ذوق آخر عمر میں بھی مشاعرہ کی سخت سے سخت زمین میں شعر کہنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن اگر ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں اور آخر عمر کی وہ غزلیں الگ کر لیں جو انھوں نے اپنے شوق سے کہیں تو معلوم ہوگا کہ اب وہ عام بحروں، مختصر ردیفوں اور سہل قافیوں میں غزلیں کہنے لگے تھے، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ غزلوں کے ردیف و قوافی درج ہیں:

مرجھا/دکھلا گئے — رفو/وضو کرتے — خدا/جفا سمجھے

سہل زمینوں کا انتخاب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر اب یہ سمجھ چکا ہے کہ محض سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے میں کوئی افادیت نہیں چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو خود ترک کر دیا۔

"شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے، ان دنوں کی غزلوں میں (ذوق) نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ (دیوان ذوق صفحہ ۸)

ایک موقع پر آزاد نے ان قطعوں کو "شاگردی کا نمونہ" بھی کہا ہے۔

شاہ نصیر کے بعض مقطعوں میں "گرمی" کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

ذوق کی — نصیر اور بھی ایسی کوئی غزل پڑھ گرم

جو غزلوں میں کامل ایسی غزل کے مقطع نہ کہتے تھے

عاشقانہ جو غزل اب کہو پڑھ تو گرم

شاہ نصیر مرحوم نے انشا اور مصحفی کے ساتھ بھی بزمِ شعر میں شرکت کی تھی، ان کے اثر سے ذوق بھی اپنا دامن بچا نہ سکتے تھے۔ چنانچہ مصحفی اور شاہ نصیر کی مشہور معرکہ کی زمین میں ذوق سے بھی ایک غزل منسوب کی جاتی ہے۔

مثلِ خورشید ہے سیبِ ذقن سرخ ترا　　معدنِ لعل و گہر ہے دہن سرخ ترا　　(نگارستانِ سخن)

سید انشا نے دوغزلہ اور سہ غزلہ بہت لکھے اور ان میں درمیانی مقطع لکھنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا، شاہ نصیر نے بھی اس طرز کو اختیار کیا اور ذوق کے یہاں بھی یہی انداز ملتا ہے۔ مثلاً:

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل　　بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پرغم کے ساتھ　　(دیوان مرتبہ آزاد)

لیکن آخر دور میں ذوق کے یہاں نہ دوغزلہ سہ غزلہ کا شوق ملتا ہے نہ اس انداز کے مقطعے ہیں اور نہ غزلوں میں قطعات ہیں، اب شاعر کا رجحان معنویت کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے اشعار ایک زمین میں بہت زیادہ نہیں کہے جاتے، ذوق کی آخر عمر کی غزلیں بہ لحاظ تعداد اشعار مختصر بھی ہیں، طویل ردیفوں کی بجائے مختصر ردیفوں کا استعمال اور "گریہ" اور "گرمی" کے روایتی مضامین کا ترک، گویا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے بعد ہی وہ دور آئے گا جب ردیف اور قافیہ بلکہ وزن کے خلاف بھی ایک احتجاج ہوگا، رسمی مضامین کو نہ صرف واجب الترک سمجھا جائے گا بلکہ ان کو شاعری کا عیب جانیں گے۔

(۲)

مصحفی اور انشا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی دھوم تھی، آتش نے اپنے نظریہ کا اظہار ایک مقطع میں کر دیا ہے:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے انداز میں جو اختلافات ملتے ہیں ان کے باوجود "تلاشِ الفاظ" پر زور دینا دونوں کے یہاں مشترک ہے، اس موقع پر ناسخ کے ایک شاگرد نواب کلب حسین خاں نادر کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ نادر نے اپنی تصنیف تلخیصِ معلیٰ میں ناسخ اور رشک کے ان اصولوں کو بھی بیان کیا ہے جو بالخصوص شعرائے کے لیے اہم ہیں، یہ کتاب زبان کی صحت کے متعلق لکھی گئی ہے مگر اس کے موضوعات یہ ہیں:

"مقدمہ سبب تالیف کتاب میں
پہلی فصل امورِ واجب الترک و مستحسن الترک محاورات اردوئے قدیم و جدید میں
دوسری فصل دریافت تذکیر و تانیث اور بعض قواعد جمع بنانے کے با دیگر فوائد و زوائد میں
تیسری فصل اختلاف روزمرہ گفتگوئے ساکنانِ مغرب و مشرق لکھنؤ میں
چوتھی فصل بعض مصطلحات و مرکبات علم عروض و قوافی میں
خاتمہ بعض فوائد و زوائد و امور قابل ترک و اختیار محاورات و الفاظ وغیرہ"　　(تلخیص معلیٰ دیباچہ)

ناسخ کے تلامذہ میں شعر کہنے کا جو طریقہ رائج معلوم ہوتا ہے یہ ہے:

"جس طرح پر شعر کہنا منظور ہو اس کے سب قوافی پہلے لکھے ان میں سے غور کر لے کہ کتنے قوافی خاص لائق گنجایش مضامین ہیں انھیں کو سہل زمینوں میں موزوں کرے اول مصرعہ ثانی لکھے بعد اس کے مصرعہ لگا دے" (تلخیص معلیٰ)

اس عہد کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ان سے ہمیں زبان، قواعد عروض کے اصولوں کی اس دور میں اہمیت معلوم ہوگی۔ لیکن معنی، مطالب اور مضمون کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو۔ اس کو ہمیشہ ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

ذوق نے ناسخ سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، انھوں نے ناسخ کی کئی غزلوں پر غزلیں کہیں، اور زبان کے اصول و قواعد کی سختی سے پابند ہوئے۔ اس موقع پر ان کے دو مقطع پیش کرنا مناسب ہوگا۔

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق　　تری زبان کا مزہ تیری شعر خوانی میں

بے تمیزوں کو ہو نقصان لطف ذوق　　لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق اپنے اشعار میں لطف زبان کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر داد نہ ملنے کی شکایت بھی کرتے ہیں، ان کو بچوں کا ادھوا
م لینا بھی اس حد تک ناگوار تھا کہ اسے بھی بے تمیزوں کا شعار سمجھتے تھے، یہ سب صحیح ہے لیکن انسان کی ذاتی افتاد طبع بھی بڑی چیز ہے، اس دور میں جب بندش الفاظ
دہ اہمیت ہو جو بیان ہوئی ذوق نے ایک مقطع کہا (سترہ سال سے بھی کم عمر میں)

ٹک دیکھ اب تو چشم حقیقت سے اے ذوق　　ہر طرف جلوہ گر ہے اسی کا ظہور حسن　　(مجموعہ نغز)

اس مقطع کے مضمون سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی اہم ہے کہ لفظ "طرف" جو متحرک الاوسط ہے ساکن الاوسط نظم ہوا ہے۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس
مثالیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ میر تقی میر کے متعلق آزاد نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ لکھنؤ میں جب عمائد نے میر صاحب سے شعر کی فرمایش کی میر صاحب نے یہ مطلع پڑھا

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا　　دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور فرمایا "آپ کہیں گے خیال کی "ی" ظاہر کرو مگر جواب یہ ہے کہ محاورہ یہی ہے" (آب حیات) ـــــ ذوق کے بچپن میں میر صاحب زندہ تھے
اگرچہ لکھنؤ میں تھے) ان کے واقعات ذوق نے بچپن میں سنے ہوں گے، میر کے سودا اور قائم کے کلام میں بھی متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک نظم کرنے کی مثالیں
ی ملتی ہیں، ذوق نے بھی اپنے لئے دہلوی شعرا کی روایات کو زیادہ قابل عمل پایا، چنانچہ وہ حسب ضرورت اصول و ضوابط سے انحراف بھی جائز رکھتے ہیں
س سلسلہ میں وہ ناسخ کے مقلد بالکل نہیں ہیں، چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

وہ صبح کو اٹھے تو کروں باتوں میں دوپہر

اور:　　دوپہر ہے سایہ بھی بیٹھے ہے دب کر زیر پا

ایک ہی لفظ "پہر" کو ایک موقع پر ساکن الاوسط اور دوسرے پر متحرک الاوسط نظم کیا۔

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو

فراق گورکھپوری صاحب کو بھی ذوق کی یہ ترکیب کھٹکی ہے لیکن انھوں یہ کہہ کر کہ شاید ذوق کے زمانے میں ایسا ہی بولتے ہوں اسے اہمیت نہیں دی
ہے، اصول کے مطابق تنگیٔ زمانہ بھی صحیح ہے۔ لیکن شاعر نے قافیہ کی رعایت برتی، اسے ضرورت شعری کہہ سکتے ہیں۔

ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

یہاں بھی "آل کی" ہونا چاہیے تھا مگر ردیف یہی تھی ـــ اس موقع پر تلخیص معلی کا ایک اقتباس اہم ہے۔

"از انجملہ یہ ہے کہ اکثر اشعار میں مصرعہ اول اس طرح موزوں کرتے ہیں کہ جب تک دوسرا ایک لفظ مصرعہ ثانی میں شامل کر کے نہ پڑھے جائیں
تب تک مطلب واضح نہیں ہوتا اور یہ بے لطف محض ہے چاہیے کہ ہر مصرعہ کا مطلب جداگانہ ہو۔　(ذوق)
بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے　　ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا"

سی طرح ایک اور موقع پر نادر لکھتے ہیں:

"اور یہ دو حرف بڑے چھپے ہوئے دشمن ہیں ایک تو عین اور دوسرے ہائے ہوز کہ یہ اکثر وقت موزونی دھوکہ دے کر وزن سے خارج ہو کر
شاعر کو ذلیل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے استادوں نے دھوکا کھایا ہے"

گر مشغول ہو وے جلو ریز بہ دشت قبچاق

خود آزاد نے بھی اصولوں سے ذوق کے اس انحراف کو محسوس کیا تھا چنانچہ دیوان ذوق میں جا بجا اس کی مثالیں خود انھوں نے پیش کی ہیں (ملاحظہ ہو
ص۳۴ ، ص۱۶۲ ، ص۱۴۵ وغیرہ) آزاد نے کبھی کبھی اس مسئلہ پر استاد سے گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً ذوق کا مصرعہ ہے۔

صبا وہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

محاورہ ہے "گجر کا ہونا" ذوق نے اس کے خلاف نظم کیا ہے۔ آزاد نے پوچھا تو ذوق نے جواب دیا۔

مد یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی ڈھول لگی کہ تڑکا ہو گیا خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی

پیدا ہوا بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا قباحت کیا ہوئی "۔ (دیباچہ دیوان ذوق صـ۳۴)

اس شعر کے متعلق ذوق کہہ سکتے تھے کہ یہ بچپن کا کلام ہے حافظ شوق کے دور تلمذ کی یادگار رہے (عمدۂ منتخبہ) لیکن آزاد کے مذکورہ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذوق محاورہ میں اس تصرف سے شرمندہ بالکل نہیں تھے بلکہ وہ اسے زبان میں "وسعت کا ایک قدم" سمجھتے تھے اور اس پر وہ آخر تک قائم رہے اس زمانہ میں یہ کہ معمولی سی لغزش پر بھی برسر مشاعرہ ٹوک دیتے تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ بات کے لیے سند طلب کی جاتی تھی۔ ذوق کا اقدام بلاشبہ جرأت مندانہ ہے اس سلسلے میں شاہ نصیر کے دو شعر نقل کرتا ہوں جن میں ذوق پر گرفت کی گئی ہے۔

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے　　　قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہر خدا　　　بار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں

(انتخاب کلیات شاہ نصیر مطبوعہ اعلیٰ پریس میرٹھ)

عجب ہے کہ ان اشعار کو پنڈت کیفی نے لالہ گھنشیام داس عاصی کے نام سے شائع کیا ہے اور ایک شعر کا اضافہ بھی کیا ہے۔

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ　　　باندھیے گر ہو سکیں تار نفس کی تیلیاں　　　(خمخانۂ جاوید ۵/۴۳/۵)

ان معرکہ آرائیوں کے باوجود ذوق نے محاورات اور روزمرہ میں بھی تصرف کیا اور اس طرح یہ بتا دیا کہ قدیم روایات کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن ہر زمانے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ صرف قدامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جو شخصیتیں عہد آفریں ہوتی ہیں وہ نئے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں، زبان و ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے چشم پوشی کرنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور ان سے دامن بچا کر چلنے والا اپنے دور سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ ذوق کے زمانہ میں یہی بڑی بات تھی کہ انھوں نے نئے محاوروں، نئے الفاظ کو اختیار کیا، شاعری کے نئے مزاج کو پہچانا جو مضمون وہ نظم کرنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے اگر اصول کی پابندی کو خارج کرتے دیکھا تو اس قید کو توڑ دینے میں کوئی تکلف نہ کیا، ان کے نزدیک اصل چیز وہ خیال تھا جو نظم کیا جاتا تھا نہ کہ وہ اصول جس کے مطابق نظم ہوتا تھا، اصول کا مقصد خود یہی ہے کہ وہ مضمون کو زیادہ دلکش اور پر اثر بنا دیں نہ یہ کہ اس کی تاثیر اور کشش کو نقصان پہنچائے۔ ذوق کا شاعری کے متعلق جو نظریہ تھا وہ اس مقطع سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضمون ادق ہو

(۳)

ذوق آنکہ مدام ہمچو مردان خدا　　　برداشتہ بود دل ازیں جائے دنی　　　صہبائی

ذوق ایک خدا پرست شخص تھے ان کے نزدیک تمام انسان "انسان" تھے وہ ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے تھے کہتے ہیں:

مت بھول بندگی پر غرہ میں آ کے بندے　　　زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

مذہبی فرقوں کے متعلق وہ صرف اتنا ہی کہتے تھے کہ:

جو اس کے نزدیک رہبری ہے　　　وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

ان کے سامنے انسانیت کا ایک وقار تھا شرافت اور اخلاق کا ایک معیار تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا مطالعہ کیا تو ہر طرف ادبار و پستی نظر آئی، اس نے ان کو بہت متاثر کیا تھا چنانچہ مختلف انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں مثلاً:

(رباعی)

ان آنکھوں سے روئے لالہ گوں کو دیکھا　　　اور ان کو بحال سرنگوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھا نہ رنگ ہم نے اے ذوق　　　یوں بھی دیکھا جہاں کو وُوں بھی دیکھا

اپنے زمانے کے وضعداروں کو بگڑتے دیکھا اور ان کی تباہی سے متاثر ہوئے ایک رباعی میں اس قسم کا تاثر بیان کیا ہے۔

رباعی

حب تلک گرہ میں احمقوں کے پیسے　　سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق　　پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے تیسے

ذوق مسلمان تھے اور اس دور میں خصوصاً مسلمانوں کی تباہ حالی دیکھ کر بہت کڑھتے تھے دیکھیے اس کیفیت کو کس قدر دردناک انداز سے بیان کرتے ہیں:

قطعہ

حق کہ اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال　　دیکھتا ہوں یہ اب اے ذوق میں انکا احوال
جس طرح سے کہ ہنسا دیتے کو بے دینوں کے　　نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی بعض تحریروں کا عکس شایع کیا ہے، اس میں یہ قطعہ بھی ہے۔ اسی صفحہ پر نواب زینت محل بیگم کے مکان کی تاریخ کے کئی مادے ذوق نے لکھے ہیں جو ۱۲۶۲ھ کا واقعہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطعہ مذکور ۱۲۶۲ھ میں کہا ہوگا۔ مذکورہ رباعیات سے ذوق کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے، انھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب محض ہجر و وصال کی روایتی کیفیات کے بیان کا موقع نہیں ہے بلکہ اب ضرورت ہے کہ اخلاقی اور اصلاحی حقایق بیان کیے جائیں، چنانچہ ان کی غزلوں میں زندگی کی حقیقتوں اور نصیحتوں کا مختلف تمثیلوں کے ذریعے بیان ملتا ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت ہیں:

دیدۂ آبلہ پا کا ہے یہی اب رونا　　کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منھ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

جرأت اور حب الوطنی کے مضامین بھی ملتے ہیں نمونہ یہ ہے:

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب　　تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑے گا بدلا لیکر
یوں اسیران قفس تک کوئی پہنچا گلبرگ　　جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ
فراق خلد میں گندم ہے سینہ چاک ابتک　　الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

ذوق نے غزلیں کہی ہیں اور غزلوں میں انھوں نے اس قسم کے مضامین نظم کیے ہیں، ان سے پہلے ہی غزل کا مزاج مخصوص ہو چکا تھا اس کی اپنی زبان ہے اپنی اصطلاحات ہیں اور اپنا انداز بیان ہے اس کا بہترین نمونہ ہمیں ذوق کے دوسرے استاد بھائی حکیم مومن کے یہاں ملتا ہے غزل کو غزل کے صحیح معنوں میں استعمال کرنے میں مومن سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے غزل کا مروجہ انداز بہت تنگ تھا۔ ذوق کا عقیدہ تھا کہ:

کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

اور وہ کائنات کے ہر ذرہ سے فائدہ اٹھا لینا اپنا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں بھی روایتی اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی بہت نظم کیے ہیں، اس کے لیے غزل کی رمزیہ زبان ناکافی ثابت ہوئی۔ انھوں نے اشاروں، کنایوں کو چھوڑ کر صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
دین ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں　　اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

بعض اوقات تو ان مضامین کو اس قدر کھل کر نظم کر جاتے ہیں کہ وہ غزل میں کھٹکنے لگتے ہیں مثلاً:

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مضمون کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اس میں وہ کیفیت ہرگز نہیں جو غزل کے شعر کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ذوق کو ان تمثیلوں کے

استعمال میں بھی تکلف نہیں جن کو اساتذہ نے مبتذل کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا مثلاً:

جس کے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں　　کانٹا ہے گھر میں سیہ کا یا گل کنیر کا

سگ دنیا پس از مردن بھی دامن گیر دنیا ہو　　کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک　　اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بار حرص　　رہ گیا یہ تو گدھا دلدل میں بھینس کے بوجھ سے

وہ کان جو بلبل، طوطی اور قمری کا تذکرہ سننے کے عادی تھے زاغ و زغن اور سیہ کا ذکر یقیناً پسند نہیں کر سکتے، وہ طبائع جن کے سامنے ہمیشہ گل و نسترن نرگس و یاسمن کی بہاریں رہیں کنیر کے پھول اور کتا گھاس کو یقیناً حقیر ہی سمجھیں گے۔ چنانچہ ذوق کے یہ اشعار یقیناً پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے گئے ہوں گے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کسی قدیم تذکرہ میں ایسے اشعار نقل نہیں کیے گئے، لیکن ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کی ناپسندیدگی سے متاثر ہو کر اپنے مقصد کو پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔ چنانچہ آخر تک وہ اپنی اسی روش پر قائم رہے۔ ذوق سے انتہائی سختی برتنے کے باوجود ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں ایک انقلاب پیدا کر دیا یعنی یہ کہ ناسخ اور ان کے معتقدین کے کلام کو سن کر ذہن صنائع بدائع کی تلاش کرتا ہے اور ذوق کا شعر سن کر ہم اس کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، غزل کے مزاج میں یہ تبدیلی نہایت اہم ہے۔

شاہ نصیر اور ناسخ کا اثر یہ تھا کہ سامعین قافیہ پیمائی اور لفظی صنعت گری کے دلدادہ ہو رہے تھے چنانچہ اس دور کے مشاعروں کی طرحیں دیکھ لیجیے ایسی ہی ملیں گی مثلاً:

کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن تیغ کے

کیا غمزہ ترا سر بیداد غضب ہے

ہے صفائی سے سزاوار شکن کاکل غنچہ

اس میں شک نہیں کہ ذوق نے اخلاقی مضامین کو آسان زمینوں میں عام فہم تشبیہوں کے ذریعے نہایت سادگی کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن اگر وہ صرف یہی کرتے تو یقیناً ناکام ہوتے، انھوں نے زمانے کا ساتھ بھی دیا اور سخت سے سخت زمین میں بھی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھیں اور اس طرح اپنی قدرت کلام کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا، لیکن مقصد ہمیشہ پیش نظر رہا ابتدائی غزلوں میں ایک دو شعر ایسے ضرور کہتے تھے جو زندگی کے لیے مفید ہوں اور آخر عمر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ سامعین کے مزاج کو بتدریج متاثر کر کے ایک دوسرے نہج پر لے آنا بڑی بات تھی، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ وہی سامعین کبھی ایسی غزلوں کو پسند کرتے تھے کہ:

آفریں معنی باریک سے کیا خوب نسیم　　تو نے پیدا کیے ہیں ہر لب اشعار میں بال

ذوق کی آخری عمر تک ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اب ان شعروں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے لگے تھے اور یہی ان کی پسند ہو کر رہ گئی تھی کہ:

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو　　آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

پہلا شعر گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) چمن بے نظیر (۱۲۶۴ھ) وغیرہ میں اور دوسرا گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن شعراء (۱۲۹۱ھ) ترجمہ حدائق البلاغت (۱۲۵۶ھ) وغیرہ میں ملتا ہے اور ایسے ہی اشعار کو ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ مقبولیت کا حال یہ کہ ایک مدت تک لوگوں کی تحریر و تقریر میں بیشتر ذوق ہی کے اشعار نقل کیے جاتے تھے۔

(۴)

مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی تنگی کا شکوہ ایک موقع پر اس طرح کیا ہے:

"غرض اول تو کچھ نصیب ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہوا کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لیے درکار ہوتے

اس سے یہ زبان مفلس رہی کیوں کہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ و فلسفہ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لیے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن

یانوں کا چرچا تھا انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے۔" (آبِ حیات ص۴۲)

شمالی ہند میں سودا اور ان کے بعد انشا نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا تھا۔ گمان کے بعد شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ ذوق نے اس بدلے ہوئے ماحول میں پھر سودا اور انشا کی یاد تازہ کی۔ انھوں نے قصیدوں میں علمی مسائل کو نظم کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا اور غزل جیسی لطیف صنف کو بھی اس کے لیے استعمال کیا، ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی اکثر ملتے ہیں جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف کسی خاص مسئلہ کو نظم کرنے کے لیے یہ شعر کہہ دیا ہے مثلاً:

نخل گل مہندی نہ لو نسبت سبو میں اے نگار　　تو گھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا

شاعر کو نخل گل مہندی کی یہ تاثیر معلوم ہوگی کہ یہ بہار کا پھول ہے اس کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا ہے، پودے پودے کا عرق سوزش اعضا کے لیے مفید ہے خصوصاً جب وہ آگ یا گرم پانی سے جلنے کے سبب ہو۔

عدو سے نیش زن کے گھر سے میرا مہ جبیں نکلے　　الٰہی برج عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

برج عقرب دوازدہ بروج فلکی میں سے آٹھواں ہے، اس کی شکل بچھو سے مشابہ ہے، بہ لحاظ تاثیر آبی ہے، رنگ سیاہ ہے، اس برج میں قمر کا ہونا نحس ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے ــــ ان نکات کو ذہن میں رکھیے، یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر کا مقصد ان ہی کو نظم کرنا تھا اس قسم کی متعدد مثالیں دیوانِ ذوق میں ملیں گی۔

یہیں تصوف کے متعلق بھی کچھ کہہ دینا مناسب ہے کہ تصوف اردو شاعری کے حاوی رجحانات میں سے ایک ہے اور ذوق کے زمانے میں تو اس کا زور اور بھی زیادہ تھا خود مرزا غالب بھی "مسائل تصوف" بیان کر کے "ولی" بننا چاہتے تھے اس دور میں مسئلہ وحدت الوجود کو زیادہ اہمیت حاصل تھی خواجہ میر درد بھی اسی کے قائل تھے لیکن اقبال نے آخر اس کی تردید کی اور اس کے مضر اور مہلک اثرات کو ظاہر ثابت کیا، ذوق کے تصوف کے متعلق کوئی تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا اس لیے کوئی قطعی بات کہنا قبل از وقت ہے البتہ ایک شعر میں انھوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ پر نہایت عمدہ طنز کیا ہے:

لکھتا ہے شیخ مسئلہ وحدت الوجود　　لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

فلسفہ کی بحثوں کے متعلق بھی ذوق نے نہایت عمدہ بات کہی ہے:

کیا جانیں ہے زمانے کو حادث ہے یا قدیم　　کچھ ہو بلا سے اپنی کہیں خانیوں میں

مولوی نذیر احمد مرحوم نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے:

"اگر تم میری صلاح مانو تو علم الکلام کی کتاب تو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا ایک بڑا نقصان جو طلبگار دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے یہ ہے کہ اس کی طبیعت دینیات سے متشکی ہو جاتی ہے جس ترتیب سے میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا ہے اس کا لحاظ بھی ضرورت احتیاط سے کیجئے کیونکہ مقصد ہے جب انسان اس بات کو نصب العین کرے گا کہ میں فانی اور بے حقیقت مخلوق ہوں اور معلوم نہیں کہ بعد مرگ کیا پیش آئے میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے بعض باتوں سے تو وہ بایں خیال اعراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔" (ابن الوقت ص۱۴۵)

غرض یہ کہ ذوق نے مختلف علوم و فنون کے مسائل کو غزل میں داخل کر کے غزل کو ایک نئی وسعت دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی مختلف اختلافات اور منفی انداز فکر سے ذہنوں کو آزاد بھی کرنا چاہا ہے لیکن یہ کام ان کے زمانے میں ممکن نہ ہو سکا۔ آزاد، حالی اور نذیر احمد وغیرہ کے دور میں زمانے نے خود ذہنوں کو صحیح راہ پر لگا دیا۔

(۵)

ذوق کے ابتدائی اور آخری دور کے انداز فکر میں فرق کو سمجھنے کے لیے ہی ہم ایک غزل نقل کرتے ہیں، یہ غزل انھوں نے آغاز شباب میں کہی تھی، صرف یہی چند شعر اسی حالت میں عمدہ منتخبہ میں مل سکے۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا　　کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

— آتشِ دل سینہ میں مثلِ منقل   — داغ سے انبار رہے انگاروں کا
آرزو ہے کہ جو خورشیدِ قیامت —   سایہ اس کشتۂ ابرو پہ ہو تردارو ں کا
ہائے وہ عاشقِ جانباز کہ — تک   ہدفِ تیر رہا تجھ سے کمانداروں کا
کیا تعجب ہے پس از مرگ بھی رہوے تو وہ   دل میں پیکانوں کا اور سینہ میں سوفاروں کا
ذوق بے چیدہ کہاں زلف ہے اس کافر کی   ہے مگر نامۂ اعمال سیہ کاروں کا

آزاد لکھتے ہیں کہ عالمِ شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی سنہ ۱۲۶۱ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ (دیوان ذوق صفحہ ۶۴)
چنانچہ کسی قدیم تذکرے میں مطلع کے سوا کوئی شعر نہیں ملا، دیوان ذوق میں بھی اس مطلع کے سوا مذکورہ بالا کوئی شعر نہیں ملتا البتہ جو غزل دیوان ذوق میں ہے مطلع مذکور کے علاوہ اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا   دیجیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
اتنا تو سوزِ فغاں ہو کہ چمن میں بلبل   خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا
چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ   ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
ہوں رنگیں حلق بریدہ کی ہمارے خونبار   گر تماشا تجھے منظور ہو فوّاروں کا
ہیں کماندار ترے تیرِ مژہ تشنہ خوں   منھ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا
کیوں نہ ہر تار میں سو دل ہوں گرفتار کہ زلف   جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا
دیں گے جاں بوسۂ لعلِ نمکیں پہ ہم بھی   جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا
بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق   رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا (دیوان ذوق)

پہلی غزل کے مطلع میں واقعی ایک کیفیت ہے ایک والہانہ پن ہے، چنانچہ ذوق نے اسے قائم رکھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسے پسند کیا (دیکھیے عمدۂ منتخبہ، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، گلستانِ سخن، سخن شعرا وغیرہ) باقی تمام اشعار محض روایتی سوز و گداز پر مشتمل ہیں کوئی کیفیت نہیں چنانچہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ غزل دوبارہ پوری کرتے وقت شاعر نے ان کو قلمزد کر دیا تھا۔

تازہ غزل کے متعلق آزاد کا یہ قول کہ ۱۲۶۰ھ میں کہی گئی تحقیق طلب ہے البتہ آخر عمر کی تخلیق ضرور کہہ سکتے ہیں، اس کے مطلع پر غور کریں محتسب میخواروں کی دل آزاری ادائیگی فرض کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت یہ ہے کہ اسے بھی ایک جام مل جائے اس کا ثبوت دوسرے مصرعے سے فراہم کیا کہ اسے ایک جام دیدیجیے تو وہ یاروں کا یار ہوگا مضمون اس دور کی رسمِ رشوت خوری اور خیانتِ منصبی کی غمازی کرتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق کا اپنا مشاہدہ بلکہ متاثر ہوگا، ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے آجکل دسمبر ۶۲ء میں ذوق کی تحریروں کا جو عکس شایع کیا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

الہٰی مدعا نکلے یہ رشوت خوار اڑ جائے

یہ بھی اس دور کی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے شعر کو بھی ذوق کا ذاتی تاثر کہہ سکتے ہیں، دلی میں اس وقت جو انتشار عام تھا اس نے ہر فرد کو بیقرار کر رکھا تھا ذوق اسی بیقراری میں افادیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ فغاں میں اتنا سوز پیدا ہو جائے کہ خرمنِ گل کو بھی پھونک ڈالے (ذوق کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات ہمارے سامنے ہیں) غزل کے مقطع کو دیکھیے وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں اس میں بھی ایک پیغام ملتا ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب ذوق کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس میں ایک حد تک اصلیت کو بھی دخل ہے بیشک اس دور کی غزلوں میں بھی بعض شعر روایتی اور اشعار کی تعداد بوجھ ڈالنے والے ہیں لیکن اگر غور کریں تو ذوق کے یہاں ہمیں ایسے نکات معلوم ہوں گے جو واقعی مفید اور قابلِ قدر ہوں گے، ذوق کے کلام میں ہمیں قدیم انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کی جھلکیاں بھی مل سکتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

سن اُنّیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ ومزاحیہ ادب

احمد جمال پاشا

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ برہمن نے کبھی کسی سال کو خراب بھی بتایا ہو، دراصل یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر شیخ و برہمن ہمیشہ متفق پائے گئے لہٰذا میرے لئے بھی یہی بہتر ہوگا کہ میں بھی ان سے متفق ہو کر اس قرآن السعدین کو ساعتِ منحوس میں تبدیل ہونے سے بچالوں۔

سن انیس سو باسٹھ کے بہترین ادب کے محض ایک پہلو یعنی طنز و مزاح کے وسیع اور عریض احاطے میں صحافتی کالم، مضامین، افسانے، خاکے، ناول، ناولٹ، مستقل مزاحیہ کردار، ڈرامے، فیچر، پیروڈی، انشائیے، تراجم، ڈائری، رپورتاژ، سفرنامے، خطوط، باقیات الصالحات، ذکاہیات، لطیفے، کارٹون، غزلیں، تضمیں، آزاد نظمیں، مثنویاں، شہر آشوب، بنجارہ نامے، قصائد، ہجویات، واسوخت، مراثی، ریختی، قطعات اور رباعیات وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ نئے نئے رسالے، نئی کتابیں، نئے انتخابات، نئی آوازیں، نئے رجحانات نئی تحریکیں اور نئی روشیں سامنے آتی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ہمیں پیچھے مڑکر بھی دیکھنا ہے کہ کاروانِ طنز و ظرافت کا کوئی راہی ہم سے بچھڑ تو نہیں گیا، ہماری متاع عزیز کے گرانمایہ سرمایے میں سے کچھ کم تو نہیں ہوگیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی سال بھر میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سال بھر کے جائزے میں پہلی چیز سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ اس وقت ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں صحافت کا بول بالا ہے ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگار محنت و مشقت کے ذریعے حیات و کائنات کے آفاقی مسائل سلجھانے کے بجائے روزمرہ کے ہنگامی واقعات اور سطحی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

کالم نویسی کی روایت کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ لکھنؤ میں جنم دیا تھا، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اسے وزن و وقار بخشا اور مجید لاہوری نے اسے مقبول عام کیا۔

ہمارے موجودہ صحافتی مزاح نگاروں کے میرِ کارواں مولانا عبدالماجد دریابادی، شوکت تھانوی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، خوشتر گرامی اور عبدالمجیب سہالوی ہیں۔ ان سب کے یہاں گہرا سیاسی و سماجی شعور بالغ نظری، گہرائی و گیرائی ہے ان کے ہاتھوں میں وقت کی نبضیں ہیں، ان کی آوازوں میں مسائل کی گونج اور قلم میں تلواروں کی کاٹ ہے۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر بین الاقوامی مسائل تک کی ناہمواری پر شدید طنز کرکے ہماری زندگی میں توازن پیدا کرنے کے مقدس فرض کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

یہ عہد مولانا عبدالماجد دریابادی کا عہد ہے ضروری نہیں کہ آپ ان کے مسلک سے بھی متفق ہوں مگر ان کے طنز میں جو شدت اور زہرناکی ہے وہ آپ بھی تسلیم کرلیں گے۔ ہر ہفتے صدق جدید لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی سچی باتیں شایع ہوتی ہیں جن کو ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر اخبار اور رسالے بڑے فخر اور پابندی کے ساتھ اپنے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور عظمت ہمارے دلوں میں ظفر علی خاں، سالک اور حسرت کی یاد تازہ کردیتی ہے اس عہد کی امامت کا سہرا انہی کے سر ہے۔

ہندہ رندہ نمکدان کراچی میں "گرتو برا نہ مانے" سے "بت شکنی" کان پر رکھ کر قلم نکلے، پہلے مختار زمن لکھتے تھے اور اب نصر اللہ خاں لکھتے ہیں۔ نمکدان کے تیر اندازوں میں اودھ پنچ کے نوک جھونک کی سی تیزی، شوخی اور طراری ہے، ان کی دوربین نظروں سے کسی بھی سیاسی و سماجی اور معاشرتی بدعنوانی اور بے اعتدالی سے بچ نکلنا محال ہے طفیل احمد جمالی کی بت شکنی، صحافتی مزاح کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اور مقبول عام روزنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار طنز و مزاح پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس میں شوکت تھانوی کا "پہاڑ تلے" ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ" رئیس امروہوی کا "مزاحیہ کردار" نواب مرزا اچھے صاحب قبلہ کا خاکہ" اور طنزیہ قطعہ اور

انشائیہ کے نام سے جو مختلف انتخابات شایع ہوئے ہیں ان مجموعوں میں بھی ہم کو سوائے انشائیہ نگاری کے سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔ دراصل یہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کے شگفتہ انتخابات ہیں جن کو مضمون تو بآسانی قرار دیا جا سکتا ہے مگر انشائیہ ہرگز نہیں۔

اس سال تراجم کی رفتار بہت اطمینان بخش رہی۔ اسٹی فین لی کاک، مارک ٹوئن، وڈ ہاؤس، ہیزلٹ، سوئفٹ اور ولیم سرویان وغیرہ کے مضامین کے تراجم خاصی تعداد میں پیش کیے گئے۔ ترجمے کے باب میں ل احمد، شاہد احمد دہلوی، عثمان غنی، ابن انشا، ابراہیم رضوی، ضیاء الحسن موسوی، ممتاز، منافضل صدیقی، لطیف صدیقی، سہیل بزرکمار اور اسرار عارفی کی کوششیں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈائری، رپورتاژ اور خطوط دراصل پیروڈی کی صورت میں زیادہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی خاصے نمایاں رہے۔

نثر کے مقابلے میں دراصل شعر و شاعری کے میدان میں زیادہ گرمی، جوش اور چہل رہی۔ جوش، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، آل کوکن، شاد عارفی دلاور فگار، ابوالمجاہد زاہد، قاضی غلام محمد، اے ڈی اظہر، نذیر احمد شیخ، ماچس لکھنوی، مسٹر دہلوی، ش ق بہرائچی، ظریف جبلپوری، شہباز امروہوی، رئیس امروہوی، مرزا محمود سرحدی، اور علامہ پاکٹ مار وغیرہ برابر اچھی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ راجا مہدی علی خاں اور قاضی غلام محمد کے نئے مجموعۂ کلام کے علاوہ دلاور فگار کی ستم ظریفیاں، اے ڈی اظہر کی لذت آوارگی، ظریف جبلپوری کا فرمان ظرافت، ابوالمجاہد زاہد کا نگ و تاز، ناشاد کا کلام بے لگام، کلام لق لق (حاجی لق لق کے کلام کا نیا ایڈیشن) اس سال شایع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سودا، غالب، اکبر اور شاد عارفی وغیرہ کے شعری مجموعے پاکٹ بکس کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ پاکٹ بک والوں نے طنزیہ غزلیں اور نظمیں اور مزاحیہ غزلیں اور نظمیں کے عنوان سے دو انتخابی مجموعے بھی پیش کیے ہیں مگر ان دونوں مجموعوں میں ایک تو سنجیدہ نگارشات امروت کا دخل ہے دوسرے تاریخ اور معیار کا احساس ناپید ہے۔

طنز و مزاح پر ادھر تنقید و تحقیق کا خاصا کام ہوا ہے ڈاکٹر وحید قریشی (اکبر اور نئی علامات) ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ نگاری، پطرس اور حاجی لغلول) ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو ادب میں طنز و مزاح) اسلوب احمد انصاری (ہمنفسان رفتہ) مظفر علی سید (اردو مزاح میں ایک نئی آواز) ممتاز حسین (ایک نیا مزاح نگار) طفیل احمد جمالی، بشیر بدر، منظر سلیم، رام لعل (اندیشۂ شہر کی ظرافت، احمد جمال پاشا بہ حیثیت مزاح نگار۔ ایک نیا طنز نگار) ڈاکٹر اعجاز نقوی (اردو کی مزاحیہ صحافت، اردو کے مزاحیہ کردار، ایک نیا طنز و مزاح نگار) آفتاب اختر (اردو ظرافت کے خالص نمونے) کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ نے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر بہت جاندار مقالے لکھے ہیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین کی کمزوری ہے کہ وہ طنز و مزاح پر توجہ نہیں دیتے، چبائے ہوئے نوالے کھاتے اور کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہیں۔ دوسرے ان سب کے یہاں مطالعے کی کمی کا افسوس ناک حد تک شدید احساس ہوتا ہے۔

لطیفے ہمارے رسائل اور اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہے ان میں نئے لطائف کی پھلجڑیوں کے ساتھ پرانے اور گھسے پٹے لطائف بھی برابر دہرائے جاتے رہے۔ نمکدان، بھوپال پنچ، پھلجڑی، جائزہ، کھلونا، بھائی جان، کلیاں، داستان گو، سرپنچ، نصرت اور دوسرے رسائل میں اکثر اچھے اور معیاری لطائف بھی دل کو فرحت بخشتے رہے۔ ریڈیو سے ملا نصر الدین کے لطائف نشر کیے گئے ان کے علاوہ تبسم از تبسم، قہقہے اور نرم گرم جیسے مجموعے بھی شایع ہوئے اس درمیان انگریزی اور دوسری زبانوں کے اچھے لطیفے بھی بہ کثرت ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچے۔

کارٹون بنانے والے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر دنیا کے عظیم ترین مسائل کی ناہموار کو اس رخ سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کا مضحک پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسی ہنسی آتی ہے جو ہماری فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جمیل، حمید بہران، نجمہ، شنکر، س بصیر، عزیز احمد، پرکاش، محمود وہاب اور شہاب جیسے ممتاز کارٹون کاروں نے اپنے نرم گرم خطوط کے ذریعہ سیاست، ادب، فلم اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ قیامت کی پیشگوئی کرنے والے نجومیوں، بشیر ساربان، ٹیڈی ازم، سیاستداں، لیڈر، عشق، بے ٹکٹ مسافر، تیز رفتار سواریاں، عالمی، مرکزی، صوبائی اور مقامی ارباب حل و عقد، ادیب، شاعر، فلسفی، تعیش کے مارے ہوئے، قومی یکجہتی، امن عالم، اتحاد و انسانیت کے نعرے لگانیوالے، غذا میں آمیزش کرنے والے اور ٹیکس پر ٹیکس لگانے والوں کی

(باقی صفحہ ۱۱۴)

مخمور سعیدی

اجنبیت بہم اس درجہ کہاں تھی پہلے
تھی وہاں بھی تری صورت جو یہاں تھی پہلے

اب اک آنسو بھی نہیں ہے سرِ مژگاں لیکن
چشمِ تر تھی کہ جواہر کی دکاں تھی پہلے

وہ فسونِ نگہِ ناز، ارے کیا کہنا
ٹھہری ٹھہری یہی عمرِ گزراں تھی پہلے

بن گئی کلفتِ دل تلخیِ جاں کیا کہیے
جو نظر راحتِ دل عشرتِ جاں تھی پہلے

کر دیا آبلہ پایانِ جنوں نے سیراب
خاکِ ہر دشت و چمن، تشنہ دہاں تھی پہلے

یہ نتیجہ ہے ترے غم سے سبکدوشی کا
زندگی اتنی گرانبار کہاں تھی پہلے

اب بھنور بن کے ڈبونے کو جو بیتاب ہوئیں
کشتیِ دل انھیں موجوں پہ رواں تھی پہلے

زندگی بھر کے لیے روگ بنی جاتی ہے
اک خلش سی جو قریبِ رگِ جاں تھی پہلے

کتنی محجوب سی دنیا کی طرف اٹھتی ہے
وہ نظر جو تری جانب نگراں تھی پہلے

ہم اک امید پہ بڑھ آئے ہیں آگے مخمور
ورنہ دنیا وہیں اب تک ہے جہاں تھی پہلے

مولوی محمد افضلی

بیزار مجھ سے گرچہ رہا کیجیے گا آپ
میرا ہی ذکر سب سے سوا کیجیے گا آپ

مانا کہ دور دور رہا کیجیے گا آپ
لیکن نہ ضبط ہوگا تو کیا کیجیے گا آپ

آئینے میں نہ جانیے کیا دیکھ دیکھ کر
احساسِ غم کو طول دیا کیجیے گا آپ

ہوگا نہ اضطراب بظاہر مرے لیے
دل میں تو بے قرار رہا کیجیے گا آپ

بستر پہ بار بار بدلیے گا کروٹیں
راتوں کو چپکے چپکے دعا کیجیے گا آپ

کیجیے گا بار بار بھلانے کی کوششیں
ہم کو ہمیشہ یاد کیا کیجیے گا آپ

کوشش سے لائیے گا لبوں پر ہنسی مگر
دل ہی جو رو پڑے گا تو کیا کیجیے گا آپ

جب چارہ گر بتا نہ سکے گا مآلِ غم
بچنے کی میرے دل سے دعا کیجیے گا آپ

مجبور ہو کے عذر کی تسکین کے لیے
خود مجھ پہ یہ اعتراض کیا کیجیے گا آپ

تنہائیوں میں میری تصویر کے سامنے
رو رو کے پھر سے عہدِ وفا کیجیے گا آپ

لیجیے مرا سلام وہ دن بھی قریب ہے
جب میری بے رخی کا گلہ کیجیے گا آپ

یہ بد دعا نہیں ہے مگر افضلی کے بعد
بے وجہ سوگوار رہا کیجیے گا آپ

باب الانتقاد

جذباتِ نادر (ترقی اردو بورڈ ایڈیشن) پر ایک نظر

رشید حسن خاں

نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی اکتوبر ۱۹۱۲ء) اپنے زمانے کے معروف شاعر، اور نظم نگاری کی تحریکِ جدید کے قابلِ ذکر نمایندے تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، اور اُس طرز کی طبع زاد نظمیں بھی کہیں۔ ان کا ایک ترجمہ "گزرے ہوئے زمانے کی یاد" آج بھی تاثیر و دلکشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ خیال زیادہ سے زیادہ سادگی کے ساتھ پیش کرنا، بھاری بھرکم الفاظ اور پرشور اندازِ بیان سے دامن بچانا، اور لفظوں کے انتخاب میں، مرصع سازی کے بجائے محض ادائے خیال کی ضرورت کا خیال رکھنا، اُن کا خاص انداز تھا۔ اُن کی نظموں میں ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ شاعر کے پیشِ نظر، طرزِ ادا میں پیچ و خم پیدا کرنے، چونکا دینے والا اندازِ بیان اختیار کرنے، اور مرصع شعر گوئی کے بجائے، کسی خیال کو پر وضاحت انداز سے نظم کر دینے کا اصول رہا تھا۔ اُن کی کچھ نظمیں یقیناً ایسی ہیں، جن کو پڑھ کر آج کے بہت سے نوجوان نظم نگار (جو ابہام زدہ ولیدہ بیانی کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور اپنے ساتھ دوسروں کے صبر و ضبط کا بھی جا و بے جا امتحان لیتے رہتے ہیں) بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

حالی و آزاد کے بعد، جن لوگوں نے نظمِ جدید کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور اُردو نظم کو مغربی خیالات و اندازِ بیان سے آشنا کیا، اور اِس طرح اُس میں وسعت و تنوع کے مستقل عناصر کا اضافہ کیا اُن میں نادر کا نام بھی ہے۔ اُن کے ذکر کے بغیر اور اُن کے کلام کو پیشِ نظر رکھے بغیر، اردو نظم کا تاریخی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

نادر کی نظموں کا مجموعہ دو حصوں میں الگ الگ چھپا تھا۔ دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا، اس میں اُن کی مثنوی "لالہ رُخ" بھی شامل تھی۔ یہ مجموعے مدت سے کمیاب تھے۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے، ترقیِ اردو بورڈ کراچی کی اعانت سے، ۱۹۶۱ء میں اِن دونوں مجموعوں کو، ایک جا میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ نہایت خوب صورت ٹائپ میں چھپا ہے، مضبوط جلد، خوب صورت گرد پوش، عمدہ کاغذ، غرض آرایشِ بیرون در کے سارے لوازم سے آراستہ ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اِس کی ترتیب میں ساری ضروری باتوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

بہت سی اچھی کتابیں عموماً بار بار نہیں چھپتی ہیں، خصوصاً کسی پرانے شاعر کا مجموعۂ کلام۔ اب بظاہر دس پندرہ برس تک اس مجموعے کا دوبارہ شائع ہونا مشکل ہے۔ اِس لیے یہ بہت ضروری تھا کہ اِس اشاعت میں حسنِ طباعت کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جاتی کہ نادر کا جو کلام مختلف رسالوں میں منتشر ہے، اس کو بھی شاملِ مجموعہ کر لیا جائے۔ کلامِ نادر کا دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ نادر کا انتقال اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ دو ڈھائی برس کی اِس مدت میں، اُنھوں نے جو نظمیں کہیں، وہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ پرانے رسالوں کے فائل روز بروز کم یاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بات کا شدید احتمال ہے کہ نادر کی یہ نظمیں کچھ دنوں کے بعد فراموش ہو جائیں گی۔

کتابیں اس سے پہلے بھی چھپتی تھیں، آج بھی چھپتی ہیں۔ لیکن آج کل کسی کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کرنے کے کچھ اصول ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ نادر کا یہ مجموعہ ترقیِ اردو بورڈ جیسے معیاری ادارے کی اعانت سے شائع ہوا ہے، اس لیے اِس میں تو ترتیب کے اُن اصولوں کو بہر طور ملحوظ رہنا چاہیے تھا۔ پرانی کتاب کو اُسی طرح چھاپ دینا ایسا معمولی کام ہے، جس کو ہر معمولی سے معمولی پبلشر کر سکتا ہے، برابر اِس کے نمونے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اگر معقول ادارے بھی یہی کرنے لگے، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح امتیاز کیا جا سکے گا؟

اس سے بھی زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نقل مطابقِ اصل کا اصول، جس کا دعوا کئی جگہ کیا گیا ہے، پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ خاص طور سے صحتِ متن میں۔ متن جگہ جگہ غلط ہے۔ جس کے سبب سے یہ ضروری ہو گیا ہے، کہ جو لوگ صحیح متن کے طلب گار ہوں، وہ پہلے پرانا ایڈیشن ڈھونڈھیں

ے نئے اڈیشن کی تصحیح کریں، اور پھر پڑھیں۔ پرانا اڈیشن بقولِ مرتب، نایاب کی حد تک کم یاب ہے، اس لیے نتیجہ معلوم!!
اسی طرح جو لوگ یہ چاہتے ہیں، کہ ناطق کا مکمل کلام پڑھیں، وہ اس مجموعے کو خریدنے کے بعد مختلف لائبریریوں میں جاکر پرانے رسائل کی ورق گردانی کریں۔
ن نظموں کو نقل کریں، جو اس مجموعے میں نہیں ہیں۔ یہ کوئی میر و سودا کا کلیات تو تھا نہیں، جن کو ہر شخص مرتب نہیں کرسکتا۔ معمولی تلاش اور ضروری اہتمام
م کیا جاتا، تو مکمل مجموعہ بہ آسانی مرتب ہوسکتا تھا۔ اگر اتنی مشکل پسندی بھی بارِ خاطر ہو، تو اس بکھیڑے میں پڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے!! معمولی پبلشر یہ کارو با
رتے ہیں کہ کسی کتاب کو ردّی میں سے ڈھونڈھ نکالا، یا کسی لائبریری سے لے آئے۔ اور اس کو حوالۂ کاتب کردیا۔ نیا اڈیشن بہ آسانی تیار ہوگیا۔
ذیل میں کچھ فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ جو کتابیں شائع ہوں وہ ان آلودگی سے پاک رہیں، تاکہ ایسے اداروں
معیار و اعتبار پر حرف نہ آئے۔

"جذبات نادر" حصہ دوم کے قدیم اڈیشن میں، مقدمہ، منظومات کے بعد اور مثنوی سے پہلے، ایک صفحے کا "صحت نامہ" ہے، جس میں بارہ غلطیوں کی
ح کی گئی ہے۔ نئے اڈیشن میں وہ غائب ہے، اور غلطیوں کی تصحیح بھی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ اصولاً، اس اڈیشن میں ان غلطیوں کی تصحیح کرنا چاہیے تھی۔
نقل مطابق اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے، اُن غلطیوں کو بھی بعینہٖ رکھنا ضروری تھا، تو صحت نامے کو بھی نقل کرنا ضروری تھا۔ ذیل میں قدیم اڈیشن سے اس صحت نامے
ل کیا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے، صحت نامے میں بائیں طرف نئے اڈیشن کے صفحات اور سطروں کو بھی درج کردیا گیا ہے۔ نیز شروع میں نمبر شمار کا بھی اضافہ
یا ہے:

صحت نامۂ جذبات نادر					جدید اڈیشن میں	
شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
[illegible]	۲۱	۳	سکا تھا	جکا تھا	۱۲۶	۴
[illegible]	۲۴	۴	کوہ طور	فرطور	۱۳۴	۴
[illegible]	۳۱	۱۳	محنت	مشقت		
[illegible]	۳۵	۱۵	مند	بند		
[illegible]	۳۷	۱	اپنے مال	اپنے پال	۱۶۱	۶
[illegible]	۵۰	آخری	انتظار	انتظام	۱۸۵	۸
[illegible]	۵۱	؍؍	یہ بڑی	ہے تری	۱۸۷	۹
[illegible]	۵۴	؍؍	نام کی	قوم کی	۱۹۱	۱۳
۹	۷۹	نوٹ کی ۲ سطر	خوف	خون	۲۳۲	۰
۱۰	۹۱	۱۵	کس جال	کس حال	۲۶۰	۳
۱۱	۹۲	۹	یاد ہو	یاد ہیں	۲۶۲	۳
۱۲	۹۳	۱۳	بہادر	بہادر مرحوم	۲۶۴	۲

اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہ جدید اڈیشن میں، بعض غلطیاں درست کردی گئی ہیں، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا ہے، نیز
م اڈیشن کے، اس "صحت نامے" میں بھی، بعض غلطیوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ شمار کے
ے صحت نامے کے مطابق ہیں۔
(۱) جدید اڈیشن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

(۲) قدیم اڈیشن میں "کوہ نور" ہے۔ یہی جدید اڈیشن میں ہے۔ اور صحیح بھی یہی ہے۔ "صحت نامہ" میں اس کو غلط لکھا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں "کوہ طور" ہے، اور یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۳) یہ تصحیح بھی "صحت نامہ" میں غلط کی گئی ہے۔ قدیم و جدید میں یہاں "محنت" ہے اور ٹھیک ہے۔

(۴) "صحت نامہ" میں یہ تصحیح بھی بے محل ہے۔ شعر میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

(۵) جدید، میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۶) جدید، میں یہ غلطی موجود ہے۔ مرتب نے جگہ جگہ اس کا التزام کیا ہے کہ اگر کوئی لفظ غلط نظم کیا گیا ہے یا قافیہ کہیں غلط ہے، تو حاشیے میں نوٹ دے دیا ہے۔ لیکن یہاں قافیے میں "انتظام" کے بجائے، "انتظار" لکھا ہوا ہے (قدیم اڈیشن کے مطابق) اور اس کو علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۷) "صحت نامہ" کے لحاظ سے، قدیم اڈیشن میں، "یہ بڑی" ہونا چاہیے۔ لیکن متن میں "یہ تری آب و ہوا میں گونہ تاثیر نشاط" درج ہے۔ یہی جدید میں ہے۔ اس لحاظ سے "غلط" کے خانے میں "یہ بڑی" صحیح نہیں ہے۔ البتہ تصحیح ٹھیک کی گئی ہے۔ یعنی "ہے تری آب و ہوا میں" ہونا چاہیے۔ جدید میں۔ نقل مطابق اصل سے کام لیا گیا ہے۔

(۸) یہ غلطی جدید اڈیشن میں بعینہٖ موجود ہے۔ تعجب ہے کہ مرتب صاحب کو اس مصرع میں کوئی عیب نظر نہیں آیا ع نام کی خدمت سے اپنے کو بچا جاتا تھا میں۔

(۹) یہاں جدید میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۱۰) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۱۱) صحت نامے میں، "یا دہو" کے بجائے، "یادیں" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جدید اڈیشن میں، اس کی صحت نامے کے مطابق تو تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ تصحیح مزید سے کام لے کر، یہاں، "یا دہوں" لکھا گیا ہے۔

(۱۲) جدید میں تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے، کہ جدید اڈیشن میں جگہ جگہ متن غلط ہے۔ اور اس سلسلے میں بے حد بے احتیاطی یا بے پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے کچھ مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

جدید اڈیشن میں	قدیم اڈیشن میں
یہ جس میں ہو آب دار (ص ۲۴۰)	جس میں ہے
میں آپ کی لگائے ہوں (ص ۲۵۰)	میں آپ ہی
اب ضبط یا دہ گوئی دور و دراز (ص ۲۵۰)	یا دہ گردی دور و دراز
شب غم نیند بھی اول تو (ص ۲۵۵)	نیند ہی اول تو
آہ بھی تیر ہے گر آہ ہو تاخیر کے ساتھ (ص ۲۵۷)	گر آہ ہے
گویا ندیا بہتی جاتی ہے (ص ۱۸۲)	گویا دنیا (یہ نظم رسالۂ زمانہ مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دنیا کے بجائے کشتی ہے)
سارنگی کی تان وہ سریلی (ص ۲۹۱)	تان وہ سریلی
بگولوں میں ہوا کے اڑتی ہیں اور پھر پھڑاتی ہیں (۲۰۹)	پھر پھراتی ہیں۔
ابھی اک کھیپ آئی ہے ابھی اک آنے والی ہے (ص ۱۷۶)	ابھی اک کھیپ آئی اور ابھی اک آنے والی ہے
اور اک کھنڈر لائی کہ تھا وہ گنبد افراسیاب (ص ۲۴)	اور اک کھنڈل کہ تھا وہ

اتنا کہ اس میں سوز ہے (اور) اس میں ساز ہے (ص ۲۵۱)
قدیم میں لفظ اور موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو قوسین میں کیوں لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا قدیم میں اور نہیں تھا مرتب نے اضافہ کیا ہے۔

اچھا ہے بہت ہندو مسلماں کا نفاق
قدیم میں لفظ بہت نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اس کو قوسین میں لکھنا چاہیے تھا۔

ص ۲۴۹ پر حاشیے میں یہ عبارت بھی موجود ہے۔ "ء۲ حاشیہ از نادر، رنجی واسکت"۔ یہ عبارت قدیم اڈیشن میں نہیں ہے۔ البتہ ۲ کے تحت جو عبارت درج کی گئی ہے، وہ قدیم میں موجود ہے (یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ نظم جولائی ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پہلا حاشیہ بھی نہیں ہے۔)

مرتب نے یہ اہتمام کیا ہے، کہ جہاں کوئی لفظ غلط نظم ہوا ہے، یا اور کوئی فروگذاشت ہوئی ہے، اُس کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن متعدد مقامات ایسے ہیں، جہاں یہ التزام قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس سے عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ گویا مرتب کی رائے میں ان مقامات پر کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے! ایسے چند مقامات درج ذیل ہیں۔

ص ۳۴۲ پر رباعی کا ایک مصرع ہے۔ "ٹوٹی ہوئی شیشہ کی ورق ہے بھرکر"۔ قدیم میں "ٹوٹی ہوئی" لکھا ہے۔ نقل مطابق اصل کی دھن میں یہ نہیں دیکھا گیا، کہ یہاں "ٹوٹے ہوئے" کا محل ہے۔ اگر قدیم کتابت میں یہ تصرف ناپسند تھا، تو "کذا" ہی لکھ دیا جاتا۔

ص ۷۷ پر ایک شعر ہے ؎ غم ودنیا میں تلچھٹ کیا لہ اک آخور باقی ہے ٭ خرمنوں کے دل میں شوق ابھی بے طور باقی ہے۔ اس شعر میں لفظ بے طور پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے۔

"آخور میں واو مجہول ہے۔ دور طور میں معروف۔ مرتب"

مجھ کو اپنے قصور فہم کا اعتراف ہے کہ میں یہاں "بے طور" میں طور کو بہ فتح اول سمجھتا تھا اب معلوم ہوا کہ یہ بہ ضم اول ہے اور یہ واو معروف سبحان اللہ!! اس سے قطع نظر کر کے یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حاشیے کی عبارت مفہوم سے بے نیاز ہے۔

ص ۵۷ پر یہ مصرع ہے ؎ یہ رفتگانِ خاک جن کی تمام عمر۔ صریحاً خارج از وزن ہے۔ ورس پر کوئی نوٹ نہیں ہے۔

ص ۷۷ پر مندرجہ ذیل بند بھی ہے۔

کیا ہے بشر ایک خوشنما طائر ہے ٭ مجبور کبھی کبھی یہ زور آور ہے
نالاں ہے کبھی بار زمیں کے نیچے ٭ اور زمزمہ ساز یہ کبھی اس پر ہے

مرتب نے کئی جگہ حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ یہاں قافیہ صحیح نہیں ہے۔ حرکات بدل گئی ہیں، لیکن طائر، اور زور آور میں ان کو کوئی غلطی محسوس نہیں ہوئی۔

ص ۳۰۲ پر ایک مصرع ہے، ؎ افسوس اک بات ودّہی جزبات۔ مرتب نے لفظ جزبات سے متعلق حاشیے میں لکھا ہے "کذا"۔ گویا یہ لفظ جزبات ان کی رائے میں صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں "جزبات" جزوی بات کے مفہوم میں ہے اور صحیح ہے۔

اِسی صفحے پر ایک مصرع ہے ؎ ایک شکوہ ایک بے اصل بات —— اس پر مرتب نے نوٹ دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نادر نے یہاں قافیے میں لفظ اصل کو تلفظ عام کے مطابق نظم کیا ہے لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ابتدائے مصرع میں لفظ ایک نے مصرع کو ساقط الوزن بنا دیا ہے اک کا محل ہے۔

صحت املا اور یکسانیت املا کا حال سب سے زیادہ قابل رحم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں میں، اس کا بھی اہتمام نہیں کیا جا سکتا! چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

املا میں یکسانیت کی نام کی کوئی چیز نہیں ہے ایک لفظ جا بجا ایک طرح ہے، دس جگہ دوسری طرح، مثلاً۔

مجکو ص ۱۰۶، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۵ — مجھکو ص ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۳۳ — مجھ کو ص ۱۲۴، ۱۵۵

تجکو ص ۱۳۵ تجھکو ص ۱۲۷، ۱۳۳، تجھ کو ص ۹۱، ۱۴۵
اسکو ص ۲۲۰ اس کو ص ۲۳۳
ڈھونڈھنا ص ۱۲۶، ۱۲۸، ڈھونڈتا ص ۱۴۰

غلط املائی بھی کمی نہیں ہے۔ میں صرف ایسے الفاظ کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں، جن کے آخر میں ایک ھ زائد ہے۔

آنکھہ ص ۸۹، ۱۴۵ — دیکھہ ص ۹۰، ۱۳۰ — سانتھہ ص ۱۲۷ — تجھہ ص ۱۲۸، ۱۳۲
جھہ ص ۱۳۱، ۱۳۲ — بیٹھہ ص ۱۲۹ — کچھہ ص ۱۳۳ — تجھھی ص ۱۴۰ — ھاتھہ ص ۱۴۵

مندرجۂ بالا دونوں طرح کی مثالیں، محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اتنی ہی بہتات ہے، جتنی اناتت کے یہاں ... جگت کی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف ھ کے اضافے ہی تک یہ غلطی محدود ہے۔ ایسے بھی مقامات ہیں، جہاں ھ ہونا چاہیئے، اور غائب ہے مثلاً "بوڑھی ... وڑی بن گئی ہے (ص ۱۰۸) اور صرف ھ کی کمی زیادتی تک بھی یہ محدود نہیں ہے۔ وہ ساری غلطی ہائے املا موجود ہیں، جو معمولی معمولی ناشروں کی ... ع کی ہوئی کتابوں میں ہوتی ہیں۔

منشی فخرالدین سفیر کاکوروی، نادر کے ہم عصر بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ انھوں نے نادر کی وفات پر، رسالۂ زمانہ کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ایک ... ریتی مضمون لکھا تھا — اس مضمون کو جدید اڈیشن کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کئی بوالعجبیوں کے ساتھ۔ مضمون سے پہلے مرتب صاحب نے ... ور تعارف لکھا ہے:

"نادر کاکوروی کی وفات پر صفیر بلگرامی کا اظہار تعزیت"

ملاحظہ فرمایا! مرتب صاحب کی رائے میں سفیر[1] کاکوروی، اور صفیر[2] بلگرامی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہوا ہے" صفیر از کاکوری" ... مے کے آخر میں مرتب نے لکھا ہے:" اس مجموعے میں صفیر کاکوروی مرحوم کا ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے"۔ یہاں وہ "بلگرامی" تو نہیں بنے، ... بتہ صفیر (بہ صاد) بدستور بنے رہے۔

مرتب نے کسی جگہ دعوا کیا ہے، کہ نقل مطابقِ اصل کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ دعوا صحیح نہیں ہے۔ دو، تین مثالیں، محض اثبات ... ا کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

مثنوی لالہ رخ کے آغاز میں ص ۱۲۷ پر پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے (نقل سر ورق) گویا اس صفحے پر قدیم اڈیشن کے صفحۂ اول کی مکمل نقل ہے۔ ... شروع میں لکھا ہوا ہے:" مثنوی لائٹ آف دی حرم"۔ جب کہ قدیم میں صرف "مثنوی لائٹ آف حرم" ہے (۲) اسی طرح چھٹی سطر میں" مثنوی لالہ رخ" ... ھا ہوا ہے۔ قدیم میں صرف" لالہ رخ" ہے۔ (۳) اسی طرح ص ۲۷۲ پر مرتب نے آخری سطر میں لکھا ہے (منقول از نسخۂ اول بجز شمار صفحات) اگر ... نقل ... اصل کا پورا پورا حساب کتاب کیا جائے، تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قدیم فہرست میں عنوانات ۱۹ ہیں، جب کہ اس میں ۲۱ ہیں۔ بات یہ ہے کہ دو عنوان ... باب ملال" اور" نورمحل کی خوش الحانی" فہرست میں شامل نہیں تھے۔ اصل کتاب میں موجود تھے۔ اگر مرتب کی مراد یہ ہے کہ یہ صفحہ بالکل قدیم اڈیشن کے صفحے کی نقل

---

[1] سفیر کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۱۹۔

[2] صفیر بلگرامی کا انتقال ۱۳۰۶ھ میں ہوا ہے (۱۸۸۹ء) تاریخ لطیف (قلمی۔ کتاب خانہ رام پور) میں جلال کے صاحبزادے، میر مہدی کمال کا قطعۂ تاریخ ... فات موجود ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال ؎ لو ہوئے جا کے اب صفیر، روح الامین کے ہم صفیر

ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہاں یہ عنوانات اضافۂ مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ سطر اول میں "لائٹ آف دی حرم" میں لفظ "دی" زائد ہے۔ قدیم میں "لائٹ آف حرم" ہے۔

قدیم اڈیشن میں رباعی "خمخانہ میں میرے جشن احباب رہے" "نغمۂ تمہید" کے بعد ہے۔ جدید میں "نغمۂ تمہید" سے پہلے علاحدہ ایک صفحے پر درج ہے۔

جدید اڈیشن میں ص ۶، ۷ پر فہرست مضامین حصۂ دوم ہے۔ ص ۶ کے آخر میں قوسین میں لکھا ہوا ہے: (علاوہ شمارۂ صفحات اصل نسخے سے منقول) اس کا عالم یہ ہے کہ جدید اڈیشن میں شمارۂ ۳۳ کے آگے صرف "غزلیات" لکھا ہوا ہے، جب کہ قدیم میں "غزلیات عاشقانہ فارسی و اردو" لکھا ہوا ہے۔

شمارہ ۴۳ کے آگے، جدید اڈیشن میں "متفرقات" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں، اس کے بجائے یہ عبارت ہے: "تاریخ دیوان ملک الشعرا امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ مرحوم"

قدیم رسائل کی ورق گردانی کی جاتی، تو نادر کی منتشر نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تصریحات یا اُن سے متعلق باتیں بھی مل جاتیں، جن کو مقدمے یا حواشی میں اگر پیش کیا جاتا، تو بعض اعتبارات سے افادیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔ ایسے چند حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نادر کی نظم "دو تصویریں" قدیم جدید اڈیشن میں موجود ہے۔ یہ نظم زمانہ بابت اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر نادر کا یہ نوٹ تھا جو مجموعے میں نہیں ہے۔ کلام نادر کا حصۂ دوم، اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے دانستہ اس نوٹ کو چھوڑ دیا، یا غلطی سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اور نظموں پر ایسے نوٹ موجود ہیں۔ یہ نوٹ درج ذیل ہے:۔

"انسان بطنِ قدرت سے ایک خوبصورت معصوم اور پاک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر آلایشات دنیا سے ملوث ہوتا، اور ترقی معکوس کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائے عمر کو پہنچ کر وہ انتہا درجہ کا بدصورت، گناہگار اور ناپاک ہو جاتا ہے، اور ہرگز اس قابل نہیں رہتا، کہ ایک منٹ کے لیے دنیا میں زندہ چھوڑ دیا جائے۔

یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذہب اس قانون قدرت کو رد کرنے میں کہاں تک قادر اور کہاں تک مجبور ہے۔ اور کہاں تک اس منطقی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن ایک انگریزی شاعر نے اس ہیبت ناک تصویر کے دو رخ جس سادگی سے دکھائے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین کو ایک نظر دکھائے جائیں۔ اور ان کو اس مسئلے پر غور کرنے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ (نادر)

سنہ ۲۸ء میں زمانہ کا جبلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں منشی دیانرائن نگم نے "یاد رفتگاں" کے عنوان کے تحت متعدد لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں نادر بھی ہیں، متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے:۔

"جن صاحب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستان ربیع" "نادر بہار" "دعوت گل" "شعاع امید" "نغمۂ شاعری" ملاحظہ فرمائی ہیں، ان کے دلوں سے اس محب وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے۔ افسوس نادر کاکوروی صرف ۴۵ برس کی عمر میں اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء[1] میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرز جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے، جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں۔ جب سے زمانہ کا سلسلۂ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہہ کر اپنے زور طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خرد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی، تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا، جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔"

---

[1] زمانہ میں یہاں سنہ ۱۹۱۳ء لکھا ہوا ہے، جو غلطی کتابت ہے۔ نادر کی وفات پر سفیر کاکوروی کا تعزیتی خط اکتوبر سنہ ۱۲ء کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا بھی ایک نوٹ تھا، جس کا پہلا جملہ یہ ہے: "پریس جاتے وقت ہم کو یہ افسوس ناک خط ملا۔"

رسالۂ الناظر (لکھنؤ) کے شمارۂ فروری ۱۹۱۳ء میں تین "قطعات تاریخ وفات نادر" شائع ہوئے تھے جن کے تاریخی مصرعے درج ذیل ہیں:

شاعرِ بے مثل و دمساز بہاں (موسیٰ حسین اختر جلال آبادی)

اب سدھارے سوئے جنت نادر کاکوروی ۱۳۳۰ھ (الٰہی بخش ناثر)

رو رو کے لکھ رہے ہیں تاریخ موت نادر ۱۳۳۰ھ (محمد صدیق خاں رعد جونپوری)

ص ۲۷۱ پر ایک نظم ہے بہ عنوان "آہ یہ ہوگا" ۱۹۱۲ء۔ یہ نظم مخزن کے شمارۂ اگست ۱۹۰۷ء میں "فنا" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

نادر کے کلام کا دوسرا حصہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا، اُن کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے، دو ڈھائی سال کی مدت میں انھوں نے جو نظمیں کہیں وہ مختلف رسالوں میں محفوظ ہیں۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اس جدید اڈیشن میں اُن کو شامل کر لیا جاتا کیونکہ قدیم رسالوں کے فائل اب ہر جگہ بہ آسانی نہیں ملتے ہیں۔ ا کچھ دنوں کے بعد، یہ بہ مشکل بھی نہیں ملیں گے۔ ذیل میں ایسی نظموں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے، جو میری نظر سے مختلف رسائل میں گزری ہیں۔ میں یہ تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ ان نظموں کے علاوہ ان کی کوئی نظم اور نہیں ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بالاستیعاب رسائل کا جائزہ لے، تو ایک دو نظموں سے زیادہ کا اضافہ شاید نہیں ہو سکے گا۔ میری نظر میں بہرحال ان نظموں کے علاوہ، اُن کی کوئی نظم نہیں ہے۔

(۱) صحیفۂ فطرت — زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء
(۲) سوزِ عشق — زمانہ، شمارۂ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۲ء
(۳) سیرِ دریا — ادیب، جنوری ۱۹۱۱ء
(۴) سہ مصرعی — مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء
(۵) امام باڑۂ لکھنؤ — زمانہ، جولائی ۱۹۱۲ء
(۶) پروانۂ جاں سوز — زمانہ، جون ۱۹۱۵ء
(۷) سوزِ پروانہ — زمانہ، جولائی ۱۹۱۵ء
(۸) جلوۂ امید — زمانہ، اگست ۱۹۱۲ء
(۹) نپولین اور کمسن جہازی — زمانہ، جنوری ۱۹۱۲ء
(۱۰) غزل — زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۲ء
(۱۱) سالِ گذشتہ — زمانہ، جنوری ۱۹۱۲ء
(۱۲) غزل — الناظر، مئی ۱۹۱۱ء
(۱۳) سہرا — زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء
(۱۴) یاد دہانی بہ طرزِ احسن — زمانہ، اپریل ۱۹۱۱ء
(۱۵) تحفۂ تہنیت — زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء
(۱۶) قصیدۂ تہنیت در بارشاہی — زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء
(۱۷) دلی دربار — ادیب، دسمبر ۱۹۱۱ء

اس خیال سے کہ یہ نظمیں یک جا ہو کر محفوظ ہو جائیں اور اگر کوئی شخص نادر کے مکمل کلام کو دیکھنا چاہے، تو اس کو دقت نہ ہو۔ یہ نظمیں دی جاتی ہیں۔ اُن کی عمر آخر کی ان نظموں میں بعض نظمیں چستیِ بندش اور حسنِ اظہار کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں مثلاً صحیفۂ فطرت کے یہ شعر

یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری — چپے چپے پہ یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں
مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے

ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار
واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے

ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج
ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

صحیفۂ فطرت

"برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

یہ جو حسن و عشق کے طومار ہیں لکھے ہوئے
کیا یہ سب مہمل ہیں، سب بیکار ہیں لکھے ہوئے

یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری
چپے چپے پر یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے

شاعری ہے وہ مطلعِ کلیاتِ کائنات
جس پہ اہل اللہ کے اقرار ہیں لکھے ہوئے

دفترِ عالم کی نظم آرائیوں پر کر نظر
صاف حسن و عشق کے اسرار ہیں لکھے ہوئے

دیکھ چشمِ غور سے نقش و نگارِ کاہ کاہ
برگِ گل مثلِ خطِ گلزار ہیں لکھے ہوئے

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں
مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے

آسماں کی لوح پر خطِ شعاعِ شمس سے
کیسے کیسے مطلعِ انوار ہیں لکھے ہوئے

ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار
واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے

یہ گھٹائیں اودی کالی کیا ہیں سائن بورڈ ہیں
سو پئے ترغیبِ بادہ خوار ہیں لکھے ہوئے

ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج
ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بہ جا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

(زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء)

سوزِ عشق

او اے عشق، اے محبت کے شرارِ بے قرار
آتشِ پنہاں کے اُف اے شعلۂ سیماب وار

اے خدنگِ عشق او رے نشترِ سینہ فگار
تیری کاوش سے گل افشاں دیدۂ خونابہ بار

کشتہ کر کے زندۂ جاوید تو نے کر دیا
ذرۂ پامال کو خورشید تو نے کر دیا

ہستیٔ فانی مری، میرا وجودِ دردمند
تھے اسی قابل کہ ہوں میرے جدا سب بند بند

شکر ہے یہ التجائے معنوی آئی پسند
باعثِ راحت ہے مجھ کو تیرے ہاتھوں سے گزند

یعنی قطعاتِ تاریخِ وفات (نادر)

آہ اے بزمِ جہاں کے شمعِ شب افروزِ عشق
اے شرارِ برقِ تاب اے شعلۂ جاں سوزِ عشق

اک مرقع ہے عدم کا جلوۂ ہستی مرا — مٹ گیا جب اپنی اصلیت سے جاکر مل گیا
یعنی جب تکمیل کو پہنچا تو میں کچھ بھی نہ تھا — میری ہستی اک دھواں ہے شعلۂ جوالہ کا

نغمہ زا ہے اب صدا میرے شکستِ رنگ کی
وسعتِ ہستی ہے وسعت میرے قلبِ تنگ کی

(زمانہ، شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء)

سیرِ دریا

سیرِ دریا، لطفِ کشتی اور گھٹا چھائی ہوئی — بڑھ چلی حدت، جوانی جوش پہ آئی ہوئی
دستہ ہائے گل سے کشتی کو بنا کر رشکِ گل — لے چلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہدِ گل

عاشق و معشوق باہم سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

کیا سرور افزا نشاط انگیز پانی ہے [illegible] — [illegible] پڑی ہے پیار سے چھاتی ہے گھٹا
بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم — پنکھیاں پھولوں کے گویا منہ پہ جھلتی ہے نسیم
لیتی ہے نظارہ ہر برگ میں لذت نگاہ — جا ٹکتی ہے سبزۂ شاداب پہ امرت نگاہ
جس طرح دریا میں موجوں سے کوئی کشتی نشیں — کھیلتا ہو ڈال کر پانی میں دستِ نازنیں
کشتیِ چشمِ طراوت آشنا سے کود کر — تیرتی ہے سبزۂ مواجِ ساحل پر نظر

دور کوسوں دور جاتی ہے فضائے آب میں
ڈبکیاں کھاتی ہوئی امواج اور گرداب میں

تیرتی ہیں وہ بطیں گرتی ہوئی مرغابیاں — اور وہ کشتی میں بیٹھا جا رہا ہے اک جواں
خوب اک ماہ پارۂ ناز خیز بھی پہلو میں ہے — آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے
ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ — وہ گلابی آنکھ، وہ نشے میں متوالی نگاہ
بے خودی میں زانوئے عاشق دبا کر پیار سے — اور وہ سینے پہ آ کے سر جھکانا پیار سے

عالمِ خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطفِ سیر و لذتِ وصل و لطفِ ناؤ نوش ہے

اے ہوس آلودہ، اے لذت کشِ آغوشِ یار — چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار
چین ہے کیا! درحقیقت چین اسی کا نام ہے!! — کیا دنیا ہے چند روزہ کا یہی اک کام ہے!!
عیش کہتا ہے اسے!! سمجھا ہے تو مفہوم [illegible] — تیرتی ہے بحرِ غم پر کشتیِ موہومِ عیش
تیری کشتی گرچہ او کشتی نشیں جاتی ہے تیز — کشتیِ عمرِ رواں، اس سے کہیں جاتی ہے تیز
بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک — ٹھہر کشتی پھیر، ہتھے چھوڑ، اپنے ہاتھ روک

زورِ طوفاں ہے، کہیں گرداب میں تو آ نہ جائے | دیکھ ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے
ہے حبابِ بحر کے مانند انجامِ حیات | ایک ٹھوکر کھاتے ہی لبریز ہے جامِ حیات
اے حبابِ بحر، اے پروردۂ آغوشِ موج | تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بردوشِ موج

لذت گہوارہ ہے جس کی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ اکھڑا ڈوب کر اس بحر میں

دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر | اور جھونکے آمدِ طوفاں کی دیتے ہیں خبر
روک ہتے، پھیر رخ کشتی کا، ناداں لوٹ آ | جان دینے کو نہ جا، اے دشمنِ جاں لوٹ آ
دیکھ تیرے ساتھ خطرے میں ہے تیرا ہم نشیں | آ، تو اس نازنیں کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں
تو نہیں سنتا کسی کی، خیر، جاتا ہے تو جا | اپنی بربادی کی کرنے سیر جاتا ہے تو جا

جا، پر اس آغازِ الفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو، ساحل پہ تجھ کو شام ہو

(ادیب، جنوری ۱۹۱۱ء)

سہ مصرعی[1]

خوشی سے خوشی کا نہ ہونا ہی اچھا | جہاں جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رلانا ہی اچھا ہے، رونا ہی اچھا

یہ قصر اور یہ گھر ہے سب چار دن کا | یہ فرشِ معطر ہے سب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا

بھری تلخیوں سے ہے یہ جانِ شیریں | سم آلودہ ہے یار نانِ شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا

تماشے جہاں کے کبھی کم نہ ہوں گے | زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہوں گے
نہ ہوں ہم، ہمارا نہ ہونا ہی اچھا

کہے جا اسی طرح اشعارِ نادر | نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تار نادر
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

(مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء)

---

[1] سب اڈیٹر مخزن (لاہور) غلام محمد طور نے، نادر کی موت پر ایک مضمون مخزن شمارہ نومبر ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا۔ اس کے آخر میں سطریں بھی ہیں:-
"دنیا کے مصائب اور زمانے کے حوادث سے، جو پے در پے آپ کو پیش آئے، آپ کی طبیعت زندگی سے اچاٹ ہو گئی تھی چنانچہ حالتِ بیماری میں ایک سہ مصرعی نظم، جو نمبر کے پرچہ میں "کلامِ نادر" کے عنوان کے نیچے درج ہو چکی ہے، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔" اس کے بعد مندرجۂ بالا سہ مصرعی نقل کی گئی ہے۔

بڑا امام باڑہ لکھنؤ

اے صنا دیدِ اودھ، اے یادگارِ لکھنؤ　　　اے گلِ پژمردۂ رفتہ بہارِ لکھنؤ
تیرے گنبد کا کلس ہے طرّۂ تاجِ اودھ　　　اور ترا گنبد ہے چترِ زرنگارِ لکھنؤ

ہر عمارت کو اودھ کی تجھ سے لڑا کر توڑ دے　　　ہر محل کو تیری اک ہلکی سی ٹکّر توڑ دے
فاتحِ اقلیمِ تعمیرات ہے لاریب تو　　　ایک آئینہ ترا سدِّ سکندر توڑ دے

رومی دروازے کی رفعت پر یہ ہے حیرت میں عقل　　　سر اُٹھا کر جس نے دیکھا، اس کو چکّر آ گیا
اس طرح ہے سر اٹھائے تیری مسجد کا کلس　　　آسماں کا چتر ہے گویا تجھی پر گھومتا

آہ یہ طوطے نہیں، روحیں ہیں بہرِ بازدید　　　آئی ہیں جنّت سے پہنے حلّہ ہائے سبز فام
اور طے کر کے مسافت عالمِ ارواح کی　　　تیرے میناروں پہ دم لینے کو کرتی ہیں قیام

آ کے گرتے ہیں ترے گنبد پہ جب غولِ طیور　　　اور جب وہ چہچہاتے ہیں ترے مینار پر
آہ! کس حسرت سے گھنٹوں دیکھتا ہوں میں انھیں　　　اور مجھے اس محویت میں تب یہ آتا ہے نظر

صحنِ مے خانہ میں کی آراستہ ساقی نے میز　　　جن کے کچھ کنٹر سنہرے اور کچھ جامِ بلور
ناگہاں پریاں فضائے نیلگوں سے آ گریں　　　اور ہو کر مست، نغمہ زن ہوئیں مثلِ طیور

پھر شفق نے پھوٹ کر برسا دیا جب سرخ رنگ　　　لے کے بیٹھا گود میں پھولوں کی کشتی آسماں
چاندنی میں پھول مہکے اور تارے کھل گئے　　　پھر پھڑ پھڑا کر آ گریں لاکھوں سنہری تتلیاں

صبح دم کی نشاہِ جاپاں نے جو روشن ماہتاب　　　اور دنیا جگمگا کر بن گئی ارژنگِ چیں!
میں نے دیکھی پھوٹتے گردوں پہ فواروں کی طرح　　　ہر کلس سے تیرے برجوں کے شعاعِ آتشیں

دن کو کچھ ہے لطف تیرا، شام کو کچھ، شب کو کچھ　　　تیرے ہر انداز میں آہ اک ادائے تازہ ہے
کیا تری آرایش، اپنے آپ مشّاطہ ہے تو　　　صبح گلگونہ ہے تیرا، شام تیرا غازہ ہے

اے اودھ کی جان اے روحِ روانِ لکھنؤ　　　یادگارِ آصفِ خلد آشیانِ لکھنؤ
سو بناؤ کا مرقّع کش ہے اک تیرا بگاڑ　　　ہے تری اک بے نشانی سو نشانِ لکھنؤ

آہ کب تک حسرتِ نظارۂ چشمِ غیور　　کاش اک شب ایسی ہم کو بھی دکھائے آسماں
میری آنکھوں کی سپیدی پھیل جائے اور تجھے　　لے بغل میں، مثلِ آغوشِ فضائے آسماں
(زمانہ جولائی ۱۹۱۲ء)

پروانۂ جاں سوز

شعلہ زن ہے میرے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ　　اور ہے اس آگ کو اِس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اُس کی دولھن کا سہاگ　　جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ
بجھ گیا دل میرا شمعِ دل فروزِ عشق سے
آشیانہ جل اٹھا بلبل کا سوزِ عشق سے

خلق کہتی ہے مجھے، بے ہوش ہے بیگانہ ہے　　عقل سے خارج ہے یہ، بے ہودہ ہے، دیوانہ ہے
جانتا ہے مجھ کو لیکن خوب جو فرزانہ ہے　　میری ہستی آہ عکسِ جلوۂ جانانہ ہے
رنگ چہرے سے اڑا جب نکہتِ گل ہو گیا
دم جو نکلا، نالۂ منقارِ بلبل ہو گیا

بھولنا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی　　یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے اُفتاد کی
حُسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی　　بے خودی منت کشِ غمِ عالمِ ایجاد کی
نالۂ قمری ہے وہ برہندۂ تیغِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے روحِ بلبل کا فشار

جس طرح اک قطرہ، گرد اُس کے محیطِ شش جہات　　جس طرح ساغر میں جھلکے قطرۂ آبِ حیات
گرد میرے حلقہ زن ہے کائنات (کذا)　　عشق کیا ہے اک متاعِ کلیاتِ بے ثبات
قطرۂ پرجوشِ طوفاں خیز، می ریزد ز عشق
شعلۂ خاموشِ عالم سوز، می خیزد ز عشق

میرے سر میں کیا ہے، بس اک شعلۂ عشقِ جنوں　　میرے دل میں کیا ہے، جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
میری ہستی کیا ہے، اک ریزۂ خرمنِ آتش دروں　　میں اناالحق گو ہوں، میں منصور ہوں، میں نور ہوں
ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن میرے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن میرے لیے

جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ　　جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوئے باغ
تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ　　ڈھونڈتی ہے میری مضطر روح پروازِ فراغ
سبزہ و گل بن کے کاش اِس خاکداں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پہ پھیل جاؤں
(زمانہ جون ۱۹۱۵ء)

سوزِ پروانہ[1]

سر میں پروانے کے ہے اک شعلۂ جوشِ جنوں اُس کے دل میں کیا ہے جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
اُس کی ہستی ہے متاعِ صد طلسماتِ فسوں پھونک دے خرمن، یہ وہ خس ریزہ ہے آتش دروں
اُس کے بال و پر ہیں مثلِ شمع جلنے کے لیے
اور کلیجہ اُس کا شعلوں پہ پگھلنے کے لیے

شعلہ زن ہے اُس کے دل میں لذتِ پنہاں کی آگ اور ہے اُس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلہن کا سہاگ جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ
عشق جل بجھتا ہے خود سارا زمانہ پھونک کر
خاک ہو جاتی ہے بلبل آشیانہ پھونک کر

بھولنا اپنے کو صورت ہے کسی کی یاد کی یعنی یہ معراجِ کلی اک شکل ہے اُفتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ، موت ہے فرہاد کی ہے نہ دشتی منت کشِ غم عالمِ ایجاد کی
نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ تیغِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے، روحِ بلبل کا فشار

زیست کا کیا تذکرہ، پروانہ اس سے سادہ ہے موت کا عاشق ہے، ہر دم مرگ کا دلدادہ ہے
مرنے کو یوں ہی کمر باندھے ہوئے استادہ ہے المدد اے آرزوئے مرگ! وہ آمادہ ہے
ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن اس کے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن اس کے لیے

نادر آخر تا کجا یہ صدمۂ سوزِ نہاں بس کہیں جل بجھ چکے بھی میرا جسمِ ناتواں
سوزِ حسرت سے مرے دل سے نکلتا ہے دھواں ہر نفس میرا صلائے صاف دیتا ہے کہ ہاں!
پھونک دے اے عشق تو اس ہستیِ خاشاک کو
اور اُڑا دے ہاتھ اٹھا کر میری مشتِ خاک کو

ڈھونڈتی ہے روحِ مضطر میری پروازِ فراغ تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوئے باغ
سبزہ و گل بن کے کاشانِ خاکداں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پر پھیل جاؤں

(زمانہ، جولائی ۱۹۱۵ء)

---

[1] اس نظم کے تین بند، دوسرا، تیسرا، اور آخری "[illegible]" میں بھی موجود ہیں۔ اس اختلاف کے ساتھ، کہ دوسرے بند کے آخری دو مصرع بدلے ہوئے ہیں، اور آخری بند میں مصرعوں کی ترتیب مختلف ہے۔
یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا، کہ نادر کی نظم "[illegible]" کا پہلا بند "مثنوی لالہ رخ" کے "نغمۂ تمہید" میں پہلے بند کی جگہ موجود ہے۔ "نغمۂ تمہید" رسالہ زمانہ بابت فروری ۱۹۱۰ء میں "سوزِ عشق" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس اختلاف کے ساتھ کہ "نغمۂ تمہید" کا چھٹا بند، اس میں نہیں تھا۔

ہر روز پا کے موقع، اُس غار میں وہ جاتا
اور شام کو نکلتا، کیا جانے کیا بناتا

اس مشغلے میں اُس کو گذرے کئی مہینے
لیکن نہ بھید اُس کا پایا کبھی کسی نے

آخر کو ہو گیا فاش اک صبح راز اُس کا
جب بن بنا کے نکلا باہر جہاز اُس کا

تیری پناہ یا رب، جانوں کی خیر کرنا
واللہ ڈوب مرنا تھا جس پہ سیر کرنا

کیسا جہاز جس کا اسلوب تھا نہ کینڈا
پتوار تھی نہ جس میں، کمپاس تھا نہ پیندا

جس میں نہ بادباں کا مستول کا پتا تھا
مردہ بہانے کی تھی ٹکٹی، جہاز کیا تھا

قسمت میں کیا لکھا ہے یہ کون جانتا تھا
واں اس ذلیل بیڑے کا ناخدا، خدا تھا

اِس شان سے بہادر آمادۂ سفر تھا
اک پانو تھا زمیں پر اور اک جہاز پر تھا

آ نکلا پہرے والا ناگہ کوئی اُدھر سے
اور دیکھتے ہی کھینچا اس کو جہاز پر سے

رسّی سے باندھ کر اور اچھی طرح جکڑ کر
آگے نپولین کے لایا اسے پکڑ کر

اور ہاتھ جوڑ کر کی عرض، اے حضورِ عالم
جبروت تیرا شاہنشاہوں کے دل پہ قائم

رکھا تھا اس کو تو نے آزاد از غلامی
اِس کے عوض میں اس نے کی یہ نمک حرامی

بے انتظارِ حکمِ شہ اور اذنِ شاہی
یہ بے تمیز اپنے گھر کو ہوا تھا راہی

گر میں پہنچ نہ جاتا، تو یہ نکل چکا تھا
اس کا جہاز بولن کی سمت چل چکا تھا

سُن کر نپولین نے حیرت میں آ کے پوچھا
"اِس کا جہاز میرے ساحل پہ کیسے آیا

میں پوچھتا ہوں پہرے والے کدھر گئے تھے
کیا اک سرے سے سب کے سب آج مر گئے تھے

ہر چند کام کرتے اِس وقت تھک گیا ہوں
لیکن چلو بتاؤ، میں چل کے دیکھتا ہوں"

بولا سپاہی جی ہاں اس کو ضرور دیکھیں
وہ دیکھنے کے قابل بھی ہے، ضرور دیکھیں

یہ واقعہ حقیقت میں اک عجیب ہی تھا
خود پا پیادہ آیا، ساحل قریب ہی تھا

نزدیک آ کے پوچھا لنگر کہاں ہے اُس کا
وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا، وہ بادباں ہے اس کا

چیتھڑا سا اک ہوا کے جھونکوں میں ہل رہا تھا
اور نیلگوں فضا میں تارا سا کھل رہا تھا

اچھی طرح سے دیکھا اس کو قریب جا کر
اور نوجوان مجرم سے بولا مسکرا کر

"بے وجہ کی نہیں ہے اس درجہ بے قراری
وطن میں کوئی بے شک معشوقہ ہے تمہاری

آمادہ خود کشی پر تم کو کیا نہ گھر نے
تم چاہ میں اُسی کی جاتے تھے ڈوب مرنے"

بولا وہ لڑکا شرما کر اور سر جھکا کر
میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری بندہ پرور

معشوقہ ہے نہ میری کوئی نہ یار میرا
مجھ کو نہ کر رہا ہے مضطر دیار میرا

جو اک عزیز اور اک پیارا مرا وہاں ہے
وہ میری ایک بوڑھی بے کس ضعیف ماں ہے

میں اس کے دیکھنے کو بے چین ہو رہا ہوں
مردہ بدستِ زندہ، اِس ملک میں پڑا ہوں

سُن کر نپولین کا دل رحم سے بھر آیا
اور اُس کی راست بازی کا اُس کو باور آیا

دل میں کہا کہ کتنا ہے یہ بھی نیک لڑکا
ہو ہر شریف ماں کے ایسا ہی ایک لڑکا

خوب اس کی پیٹھ ٹھونکی، خوب اس کو شاباشی دی — گھر جانے کی اجازت اس کو بعد خوشی دی
کچھ نقد اس کو دے کر، اور اک نشان دے کر — پہنچا دیا خود اپنی ہی کشتی پر اُسے گھر
کہتے ہیں اکثر اس کو فاقے ہوئے، پر اُس نے — بیچے نہ مرتے دم تک سکّے نپولین کے

اس واقعے کو گو اک مدت گزر چکی ہے — یورپ میں اس کی اب تک ویسی ہی تازگی ہے
اس یاد سے ہے لندن کا دل گداز اب تک — پیرس کے میوزیم میں ہے وہ جہاز اب تک

(زمانہ، جنوری سنہ ۱۹۱۱ء)

غزل

شکایت کر کے غم اور ان کا تیز کرنا ہے — ابھی تو گفتگو ئے مصلحت آمیز کرنا ہے
ترے اعمال نامے پر کہاں ہیں دستخط تیرے — وہاں ثابت تجھے جعلی یہ دستاویز کرنا ہے
یہ دنیا جائے آسایش نہیں ہے، آزمایش ہے — یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ہے
غزلخوانی کو تو آیا نہیں اس بزم میں نادر — تجھے یاں وعظ کہنا، پند سود آمیز کرنا ہے

بیٹھتا ہوں سر کو میں دنیا میں رسوا کیوں ہوا — میں نے ایسا کیوں کیا، افسوس ایسا کیوں ہوا

میں سمجھا تھا مرے حق میں دعائے خیر کرتے ہو — مجھے تم کوستے ہو، ہمدمو! اندھیر کرتے ہو

(زمانہ، اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء)

سالِ گذشتہ

آہ بوڑھے، سن رسیدہ اور قریب المرگ سال — اب تو ہوتا جاتا ہے ابتر ترا ہر روز حال
اور اب نزدیک ترہے تیرا وقتِ واپسیں — آہ تجھ کو ہم سے اب کچھ کہنا سننا بھی نہیں
مختصر سی کچھ وصیت، کچھ نصیحت ہی سہی — اور اگر دل میں ترے شکوے ہوں تو وہ بھی سہی
کچھ تو کہہ حال اپنا او بیمار، لب اپنے تو کھول — مرنے والے تیرے دل میں کیا ہے کچھ منہ سے تو بول
آہ کیا اس عالمِ ظلمات اور انوار میں — اس جہانِ پُر طلسمات اور پُر اسرار میں
اپنی پُر غم زشتیِ تقدیر کا اک حرف بھی — ہم سے کہنا ہی نہیں منظور تجھ کو داغی
کیا تری غم گیں صدا یہ کان سن سکتے نہیں — کیا یہ مژگاں اشکِ حسرت تیرے چن سکتے نہیں

مرنے والے سال! وہ بھی کتنا نازک وقت تھا — جبکہ لیلائے ازل تھی دردِ زہ میں مبتلا
قسمت و تقدیر سے محروم تھی کل کائنات — اور ہر اک چیز بے اندازہ، بے پیمانہ تھی اور بے ثبات
جب نے چرخانے میں پیدایش زمانہ کی ہوئی — کیا وہ حالت بھی تری او سال ہے دیکھی ہوئی

کیا ترے کانوں میں پہنچی تھی زچہ کی پہلی چیخ   یاد ہے تجھ کو کہ تھی کتنی بھیانک وہ بھی چیخ
تو نہ سمجھا ہستیوں کی ابتدا تغلیف ہے   اور ہر اک زندگی کی انتہا تکلیف ہے

سال، بوڑھے سال، او مرحوم ہونے والے سال   بلکہ وہ اک روز میں معدوم ہونے والے سال
جب چلی تھی بحرِ ناپیدا کنارِ دہر میں   ایک پہلی لہر، تو کیا بات تھی اُس لہر میں
پہلے وہ آغوشِ مادر کیوں بنی تیرے لیے   پھر وہاں قبر وہ کیوں بن گئی تیرے لیے
مادرِ قدرت نے کیوں شیر کفِ موجِ فنا   لے کے لفظِ موت پیشانی پہ تیری لکھ دیا

مرنے والے سال! اچھا ہم کو اتنا تو بتا   آخری سورج ترا، کیا بات تھی جو زرد تھا
عشق و الفت کا ترے اس پر اثر تھا ہو نہ ہو   رحم کر کے تجھ پہ، وہ باچشمِ تر تھا ہو نہ ہو
پر نہیں، تھا وہ تو بے مہری سے آگے کو رواں   دل لوں، جھیلوں پہ، باغوں، وادیوں پر ضو فشاں
اور نہ دیکھا اُس نے مڑ کر بھی تجھے دم توڑتے   ایک آنسو بھی نہ ٹپکا آہ اس کی آنکھ سے

او ہمیشہ کے لیے معدوم اور مرحوم سال   کوس رحلت کر رہا ہے تجھ پہ اظہارِ ملال
مختصر افسانۂ غم ہو چکا تیرا تمام   اور تیری زندگی کا ہو چکا اب ختم کام
مر چکا تو، اور اٹھا کر تیری نعشِ بے کفن   وقت نے کی غرقِ تاریکیِ دریائے محن
مرنے والے کی لحد ہے، اور نہ ہے شمعِ مزار   نوحہ خواں کوئی ہے اُس پر اور نہ کوئی اشکبار

آہ او سالِ گذشتہ، او او مرحوم سال   او غریقِ بحر، او معدوم فی المعدوم سال
کس قدر تو پہلے خوش آیند اور خوش لہجہ تھا   جس قدر اب چُپ نظر آتا ہے ایسا تو نہ تھا
تیری چمکیلی امیدیں کب چمک جاتی نہ تھیں   دور سے دکھلاتی تھیں جھلکی قریب آتی نہ تھیں
آہ تیرے ساتھ اب، او سال! وہ سب گئیں   اور نئی امیدیں میرے دل میں آ کر بھر گئیں

(زمانہ جنوری ۱۹۱۲ء)

جی بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھ کر   رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھ کر
رحم آ جائے گا ان کو شکل میری دیکھ کر   میری حالت دیکھ کر میری غریبی دیکھ کر
ساحلِ جولانگہِ امواج پر شکلِ حباب   دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھ کر
مفت بھی خواہاں نہیں وہ دل کہ کیونکر آدمی   بے ضرورت چیز لے لیتا ہے سستی دیکھ کر
اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق   پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھ کر
دشتِ غربت سے چلا ناحق میں بستی کی طرف   کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھ کر
لاکھ میں اُن کو بھلاتا، ضبط کرتا ہوں مگر   دل بھر آتا ہے پہلو اپنا خالی دیکھ کر

کھینچ گیا نقشہ نظر میں ہستیِ موہوم کا — بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھ کر
عشق کا نادرؔ کہاں سے تو نے لگایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھ کر (الناظر، مئی ۱۹۱۱ء)

سہرا ٥

ہے جلوۂ برقِ طور سہرا، ہے ساعدِ صافِ حور سہرا — ہے موجِ دریائے نور سہرا، ہے جوشِ جامِ بلور سہرا
فلک پہ تارے کھلے ہوئے ہیں، شفق میں بجلی چمک رہی ہے — افق میں سورج نکل رہا ہے، ہے مطلعِ صبحِ نور سہرا
نسیمِ جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہے یہ باقی — بہارِ فردوس ہنس پڑی تھی، اُسی ہنسی کا ظہور سہرا
ہوا ہے نوشہ پہ سایہ گستر، اسی نے پھیلائے ہیں یہ پر — ہے ورنہ عنقائے قافِ اقبال کا نشیمن ضرور سہرا
فلک نچھاور کہیں نہ کرتا ہو سر پہ نوشہ کے عقدِ پرویں — اسی کا پرتو نہ ہو سمجھتے ہیں جس کو اہلِ شعور سہرا
پری نے پیچھے سے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہے اپنا آنچل — جو یہ نہیں ہے تو میں کہوں گا ہے طرۂ زلفِ حور سہرا
عروس نے اپنے نازنیں ہاتھ چشمِ نوشہ پہ رکھ دیے ہیں — اسی کے یہ پنجۂ نگار(یں) سے بن گیا منہ کا نور سہرا
فلک پہ رحمت برس رہی ہے، زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے — ہے رحمتوں کا نزول سہرا، ہے برکتوں کا وفور سہرا
بہار کی دیوی سر پہ نوشہ کے پھول برسا رہی ہے گویا — کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے لچھمی، یہ ہے مبارک ضرور سہرا
سرودِ عشرت کے تار لڑیاں ہیں اور زمزمے ہیں پھول مطرب — ہے مطربِ جشنِ عیشِ نوشہ، ہے سازِ بزمِ سرور سہرا
گلِ مضامینِ فکرِ نادرؔ ٥ سے، ورقِ کاغذ ہے کشتیِ گل
کہ نذرِ نوشہ کے شوق میں بن گئی ہیں سلکِ سطور سہرا (زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

یاددہانی بطرزِ احسن

کسی کافر کا وعدہ کرکے ممکن ہے پلٹ جانا — پلٹ جانا کسی طناز کا ممکن ہے پیماں سے
یہ ممکن ہے کہ گھر آئیں گھٹائیں جھوم کر لیکن — نہ ٹپکے ایک بھی قطرہ محیطِ ابرِ باراں سے
بہار آئے، چمن پھولے پھلے، لیکن یہ ممکن ہے — کہ اک دانہ نہ ہو حاصل امیدِ کشتِ دہقاں سے
یہ ہو سکتا ہے چل جائے ہوا کچھ ایسی عالم میں — کہ رنگ اڑ جائے پھولوں سے چمک لعلِ بدخشاں سے
یہ ممکن ہے کہ ہو جائے دعا کی سلب خاصیت — نکل کر پھر پلٹ آنا ہے ممکن تیر پیکاں سے (کذا)
یہ سب ممکن ہے لیکن وعدہ کرنا اور مکر جانا — نہیں ممکن ہے ہرگز راجۂ شعباں علی خاں سے
دھنی ہیں قول کے اور اپنے وعدے کے وہ سچے ہیں — میں سچ کہتا ہوں پھر راجہ ہیں اور راجہ کے بیٹے ہیں (زمانہ، اپریل ۱۹۱۳ء)

---

٥ اس سہرے کے آغاز میں، یہ نوٹ لکھا ہوا ہے: "ایڈیٹر زمانہ کے برادرِ عزیز منشی رام سرن نگم۔ بی۔ ایس۔ سی، کی شادی خانہ آبادی کی یادگار میں لکھا گیا۔"
٥ بسکونِ حرفِ ثانی، نادر کا تصرف ہے۔

کیا ترے کانوں میں پہنچی تھی زچہ کی پہلی چیخ — یاد ہے تجھ کو کہ تھی کتنی بھیانک وہ بھی چیخ
تو نہ سمجھا ہستیوں کی ابتدا تکلیف ہے — اور ہر اک زندگی کی انتہا تکلیف ہے

سال، بوڑھے سال، اور مرحوم ہونے والے سال — بلکہ وہ اک روز میں معدوم ہونے والے سال
جب چلی تھی بحرِ ناپیداکنارِ دہر میں — ایک پہلی لہر، تو کیا بات تھی اُس لہر میں
پہلے وہ آغوشِ مادر کیوں بنی تیرے لیے — پھر دہانِ قبر وہ کیوں بن گئی تیرے لیے
مادرِ قدرت نے کیوں شیرکِ موجِ فنا — لے کے لفظِ موت پیشانی پہ تیری لکھ دیا

مرنے والے سال! اچھا ہم کو اتنا تو بتا — آخری سورج ترا، کیا بات تھی جو زرد تھا
عشق و الفت کا ترے اس پر اثر تھا ہو نہ ہو — رحم کر کے تجھ پہ، وہ باچشمِ تر تھا ہو نہ ہو
پر نہیں تھا وہ تو بے مہری سے آگے کو رواں — دل لوں، جھیلوں پہ، باغوں، وادیں پہ نوفشاں
اور نہ دیکھا اُس نے مڑ کر بھی تجھے دم توڑتے — ایک آنسو کبھی نہ ٹپکا آہ اس کی آنکھ سے

او ہمیشہ کے لیے معدوم اور مرحوم سال — کوئی رحلت کر رہا ہے تجھ پہ اظہارِ ملال
مختصر افسانۂ غم ہو چکا تیرا تمام — اور تیری زندگی کا ہو چکا اب ختم کام
مر چکا تو، اور اٹھا کر تیری نعشِ بےکفن — دفنت نے کی غرقِ تاریکیِ دریائے محن
مرنے والے کی لحد ہے، اور نہ ہے شمعِ مزار — نوحہ خواں کوئی ہے اُس پر اور نہ کوئی اشکبار

آہ او سالِ گذشتہ، اور او مرحوم سال — او غریقِ بحر، او معدوم فی المعدوم سال
کس قدر تو پہلے خوش آیند اور خوش لہجہ تھا — جس قدر اب چُپ نظر آتا ہے ایسا تو نہ تھا
تیری چمکیلی امیدیں کب چمک جاتی نہ تھیں — دور سے دکھلاتی تھیں جھلکی قریب آتی نہ تھیں
آہ تیرے ساتھ اب، او سال! وہ سب مر گئیں — اور نئی امیدیں میرے دل میں آ کر بھر گئیں

(زمانہ جنوری ۱۹۱۲ء)

جی بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھ کر — رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھ کر
رحم آ جائے گا ان کو شکل میری دیکھ کر — میری حالت دیکھ کر میری غریبی دیکھ کر
ساحلِ جولانگہِ امواج پر شکلِ حباب — دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھ کر
مفت بھی خواہاں نہیں وہ دل کے، کیونکر آدمی — بے ضرورت چیز لے لیتا ہے سستی دیکھ کر
اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق — پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھ کر
دشتِ غربت سے چلا ناحق میں بستی کی طرف — کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھ کر
لاکھ میں اُن کو بھلاتا، ضبط کرتا ہوں مگر — دل بھر آتا ہے پہلو اپنا خالی دیکھ کر

کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستیِ موہوم کا　　بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھ کر
عشق کا نادر کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھ کر　　(الناظر، مئی ۱۹۱۱ء)

سہرا[1]

ہے جلوۂ برقِ طور سہرا، ہے ساعدِ صافِ حور سہرا　　ہے موجِ دریائے نور سہرا، ہے جوشِ جامِ بلور سہرا
فلک پہ تارے کھلے ہوئے ہیں، شفق میں بجلی چمک رہی ہے　　افق میں سورج نکل رہا ہے، ہے مطلعِ صبحِ نور سہرا
نسیمِ جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہے یہ باقی　　بہارِ فردوس ہنس پڑی تھی، اُسی ہنسی کا ظہور سہرا
ہوا ہے نوشہ پہ سایہ گستر، اسی نے پھیلا دیے ہیں شہپر　　ہے ورنہ عنقائے قافِ اقبال کا نشیمن ضرور سہرا
فلک نچھاور کہیں نہ کرتا ہو سر پہ نوشہ کے عقدِ ثریا　　اسی کا پرتو نہ ہو سمجھتے ہیں جس کو اہلِ شعور سہرا
پری نے چھپ کے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہے اپنا آنچل　　جو یہ نہیں ہے تو میں کہوں گا ہے طرۂ زلفِ حور سہرا
عروس نے اپنے نازنیں ہاتھ چشمِ نوشہ پہ رکھ دیے ہیں　　اسی کے یہ پنجۂ نگا(ریں) سے بن گیا منہ کا نور سہرا
فلک پہ رحمت برس رہی ہے، زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے　　ہے رحمتوں کا نزول سہرا، ہے برکتوں کا وفور سہرا
بہار کی دیوی سر پہ نوشہ کے پھول برسا رہی ہے گویا　　کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے لچھمی، یہ ہے مبارک ضرور سہرا
سرودِ عشرت کے تار لڑیاں ہیں اور نرالے ہیں پھول مطرب　　ہے مطربِ جشنِ عیشِ نوشہ، ہے سازِ بزمِ سرور سہرا

گلِ مضامینِ فکرِ نادر سے، ورق[2] کاغذ ہے کشتیِ گل
کہ نذرِ نوشہ کے شوق میں بن گئی ہیں سلکِ سطور سہرا　　(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

یاددہانی بطرزِ احسن

کسی کافر کا وعدہ کرکے ممکن ہے پلٹ جانا　　پلٹ جانا کسی طنّاز کا ممکن ہے پیماں سے
یہ ممکن ہے کہ گھر آئیں گھٹائیں جھوم کر لیکن　　نہ ٹپکے ایک بھی قطرہ محیطِ ابرِ باراں سے
بہار آئے، چمن پھولے پھلے، لیکن یہ ممکن ہے　　کہ اک دانہ نہ ہو حاصل امیدِ کشتِ دہقاں سے
یہ ہو سکتا ہے چل جائے ہوا کچھ ایسی عالم میں　　کہ رنگ اڑ جائے پھولوں سے چمک لعلِ بدخشاں سے
یہ ممکن ہے کہ ہو جائے دعا کی سلب خاصیت　　نکل کر پھر پلٹ آنا ہے ممکن تیر پیکاں سے (کذا)
یہ سب ممکن ہے لیکن وعدہ کرنا اور مکر جانا　　نہیں ممکن ہے ہرگز راجۂ شعباں علی خاں سے
دھنی ہیں قول کے اور اپنے وعدے کے وہ پکے ہیں　　میں سچ کہتا ہوں پھر راجہ ہیں اور راجہ کے بیٹے ہیں
(زمانہ، اپریل ۱۹۱۳ء)

---

[1] اس سہرے کے آغاز میں، یہ نوٹ لکھا ہوا ہے۔ "ایڈیٹر زمانہ کے برادرِ عزیز منشی رام سرن نگم۔ بی۔ ایس۔ سی، کی شادی خانہ آبادی کی یادگار میں لکھا گیا۔"
[2] بسکونِ حرفِ ثانی، نادر کا تصرف ہے۔

تحفۂ تہنیت

(راجہ سید شعبان علی خاں صاحب بہادر تعلقہ دار سلیم پور کو خطاب کے سی، آئی، ای، عطا ہونے پر لکھا گیا)

بڑھا دے دے رہا ہوں اپنی طبع گرم جولاں کو
مبارک باد دینے جائے گی شعبان علی خاں کو

کر تجدید سادگی ہائے جہاں کو تزئینِ آرائش
تری رامشگری سے دلفریبی بزم امکاں کو

گھٹا کی طرح اُٹھ اور چل نسیم صبحدم بن کر
چل اور لہکا دے باغوں کھیتوں کو اور بستاں کو

ہلا دے شاخ گل کو اور اُڑا دے تو عنادل کو
ہنسا دے غم زدوں کو چھیڑ دے زلف پریشاں کو

یہی موقع ہے شوخی کا یہی موقع مسرت کا
لٹا دے تلملا دے ہر سخنور، ہر سخنداں کو

چلی جا شوخیوں سے اور پہنچ جا آستانے پر
ادب سے دے مبارکباد اُس ممدوح ذی شاں کو

مگر میری زباں بھی کیوں نہ اپنے ساتھ لیتی جا
ادا کیا کر سکے گی تو مرے جذبات پنہاں کو

مرا دل بھی لیے جا تو، یہ وہ شے ہے کہ کہتا ہوں
خدا دل دے تو دے میرا ہی ایسا ہر مسلماں کو

مگر اس دل میں کیا ہے صرف سچی بے ریا الفت
رفیق سُرخ جو شیریں کرے تلخیٔ دوراں کو

لیے جا ہاں وہ بے پایاں خوشی بھی میری خاطر سے
جو اس تقریب پر حاصل ہوئی اس تہنیت خواں کو

جب اس ساماں سے اس ٹھاٹھ سے عرض ستائش ہو
تو کیوں مقبولیت حاصل نہ ہو فکر سخنداں کو

کسی کی ذات میں جب اس قدر ہوں خوبیاں یکجا
کہ ہو مد نظر اعزاز اُس کا شاہ شاہاں کو

کسی ذرّے میں جب یہ کیفیت کسب ضیا کی ہو
کہ وہ اپنی طرف کھینچے شعاع مہر تاباں کو

تو یہ کہنا برا کیا ہے کہ شاہنشاہ لندن سے
خطاب آئے سے تحفے دینے کے لیے شعبان علیخاں کو

حقیقت میں یہ عزت باعث صد فخر و نازش ہے
یہ عزت مایۂ صد ناز ہے امثال و اقراں کو

تمامی خوبیاں یکجا ہوں جس انساں میں خالق نے
دکھایا اپنی قدرت کو، بنا کر ایسے انساں کو

الٰہی اُن کو عمر خضر دے، جاہ سکندر دے
کہ پہنچے مدتوں تک فیض خدام و عزیزاں کو

اٹھائیں فائدہ جس سے ہزاروں بے سر و ساماں
خدا وسعت دے ایسی زندگی عیش ساماں کو

خطاب، کے، سی، آئی، ای، ملا دربار دلّی سے
مبارک ہو یہ عزت راجۂ شعباں علی خاں کو

(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

قصیدۂ تہنیت دربارِ شاہنشاہی

پھر کھلا صبحدم دریچۂ نور
ظلمتِ شام غم ہوئی کافور

پھر چلا لے کے جام آتش رنگ
ساقیِ سرخ فام نشے میں چور

بن گیا پھر سوادِ ہندستاں
اک محیطِ فضائے عالم نور

وندھیاچل کی اونچی چوٹیاں پھر
ہوئیں چشمک زنِ تجلّیِ طور

یعنی بھارت کی راجدھانی میں
پھر دسہرے کے جشن کا ہے ظہور

یعنی شاہنشہِ معظمِ ہند — جارجِ پنجم و میریِ غیور
تاجِ ہندوستان و انگلستان — رشکِ خاقان و قیصر و فغفور
آنکھیں جن کے جمال سے روشن — دل ہے جن کے خیال سے مسرور
عہد میں جن کے ہے رعیت شاد — دور میں جن کے ملک ہے معمور
جلوہ آرا ہیں خود بہ نفسِ نفیس — زیبِ دربار ہیں نظامِ حضور
لشکریانِ صف شکن بہ جلو — راجگان و شاہزادگان بہ حضور
یعنی سب والیانِ ہندستان — جموں، کشمیر، اور اودے پور
شاہِ آسام و لامۂ تبت — راجگانِ بڑودہ و میسور
والیِ مسقط اور خانِ قلات — راجۂ گوالیار اور اندور
سب سورج بنسی اور چندر بنسی — راجۂ جودھپور اور جے پور
جس کے دربار میں ہیں یوں روشن — جیسے سورج سے ذرّے ہوں پرنور
یادگارانِ پرتھی و جے چند — جانشینانِ تغلق و تیمور
وارثانِ سپاہِ درّانی — سربرآوردگانِ غزنی و غور
سورمایانِ راجپوت و سکھ — غازیانِ قبائلِ مشہور
غولِ دیوانِ رادن و اندر — فوجِ بھیلانِ والیِ چتّور
تیغ باندھے کمر میں خونِ آشام — تیر کھینچے لگائے زخموں میں چور
حملۂ شیرانِ بیشۂ پیکار! — سب نہنگانِ بحرِ خوں مغرور
جس کے آگے ادب سے حاضر ہیں — جس کی تعمیلِ حکم پر مجبور
عہد کی جس کے برکتیں بے حد — عقلِ اوّل شمار سے مجبور
جس کے الطاف لاتعدّ و شمار — اور جس کے فیوض لا محصور
ہند میں اس طرح کا جشنِ عظیم — ایسا دربار، دیدۂ بدکور
کسی تاریخ سے نہیں ثابت — اور کسی عہد میں نہیں مشہور
خاکِ دلّی ترے نصیب کہ تو — بادشاہوں سے پھر ہوئی معمور
کامرانی کی ہر طرف ہے بہار — شادمانی کا ہر جگہ ہے وفور
کیا نصیبہ ہے ہند کا چمکا — کہ عیش سے ہیں سب مخمور
اے شہنشاہِ آسمان اورنگ — اے جہاندار معدلت دستور
تیرے خادم خدیو اور خاقان — تیرے محکوم قیصر و فغفور
سلطنت تیری غرب سے تا شرق — ملک آباد شاد اور معمور
ہوئے اجزائے مذہب و ملّت — تیرے آئین اور ترے دستور
بادشاہوں پہ واجب التعمیل — تیرے احکام اور ترے منشور
تیری افواج بے حساب و شمار — تیرا اقبال فتح و منصور

توسلامت رہے ہزار برس — ہر برس اک صدی بنے بھرپور
اور رہے دور کچھ تسلسل کا — یوں ہی کرتا رہے زمانہ مرور
میرا منہ تیری مدح خوانی کا — بس دعا گوئی تھی مجھے منظور
اس سے زائد تری ستائش میں
نطق بے کار ناطقہ معذور

(زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء)

دلّی دربار

فاتحِ اعظم سکندر رومی کے بعد، یہ پہلا موقع ہے کہ ممالکِ یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات سمندر پار سے آکر، سرزمینِ ہند پر قدم رکھا ہے۔ یعنی حضور پرنور ملک معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ بیگم ملکۂ میری، ادام اللہ ملکہم و اجلالہم کے قدومِ میمنت لزوم سے خاکِ ہندوستان کو شرفِ افتخار حاصل ہوا۔ اس مسرت خیز موقع پر وفا شعار رعایائے ہند کو جس قدر خوشی و مسرت ہو، کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان اس کی کثیر التعداد اقوام کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ پروری سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی شاعر، مسٹر جے، این، مکرجی نے انگریزی نظم میں دہلی کو مخاطب کرکے، جس حسن سے اظہارِ مسرت کیا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نظم بطور خلاصہ، ۳۱ اکتوبر کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔ ترجمہ نذرِ ناظرین ہے۔

اے پرانی دلّی، اے آثارِ دیرینہ شکوہ — اے ہزاروں[1] بادشاہ ....
تو کبھی گہوارہ تھا، مذہب کا اور تہذیب کا — اب شباب اور ....

پانڈوں نے تجھ کو جب دیکھا نگاہِ شوق سے — پڑ گئی آنکھوں میں ان کی، بس چکا جو ندھا ایک بار
خوب گایا ہے مہا بھارت نے ہریالہ ترا — باندھ کر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کا ہار

تیرے چپے چپے پر انبار ہیں اورنگ و تاج — حوصلوں کے، ولولوں کے، جوش کے، جذبات کے
لوگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا — چال سے، تدبیر سے، تلوار سے، اور توپ سے

تو عماراتِ نفیسہ کا ہے دارالسلطنت — سات تعمیرات میں دنیا کی ہے تیرا شمار
آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جن کو دیکھ کر — وجد کر اٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن ایک بار

لے مبارک! بعدِ مدت ہنستی ہے قسمت تری — آ رہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا
کالے کوسوں دور سے، ساتوں سمندر پار سے — چھوڑ کر تیرے لیے جزیرہ اپنا انگلستان کا

ہاں مبارک عظمتِ دیرینہ کے سنگِ نشاں — ڈال دے گا اپنے ہاتھوں سے ترا اب شہریار
ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر — یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

---

[1] پیشِ نظر رسالے میں، یہاں پر کاغذ غائب ہے۔ مجھے فی الوقت یہ شمارہ دوسری جگہ نہیں ملا ہے۔

ہو رہی ہے دیکھ وہ صبحِ تجلی کی نمود — اُٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت واقبال کا
فرش سے تا عرش آرائش ہے، آتا ہے نظر — پھر زمانہ راجۂ اشوک کے اجلال کا

آج تک مطلع ترا ہر چند تھا تاریک و تار — لیکن اب موجودہ شاہی کر رہی ہے نُور بار
اور یہ امید ہے فیضِ قدومِ شاہ سے — اور بھی ہو جائے گا وہ صاف تر شفاف تر

مجھ سے سن، تو درحقیقت فخرِ ہندوستان ہے — منتخب ہونے پہ تیرے ہے زمانہ بھر گواہ
اور رہیں گے تیرے مینار و مساجد مدتوں — تیری عظمت اور تیری شان و شوکت پہ گواہ

ملک تیرا آسماں کی طرح ناپیدا کنار — خطۂ کشمیر سے، وسعت میں بحرِ ہند تک
اور تیرا عرض بھی ہے طول سے کچھ کم نہیں — برہما کے ملک سے گجرات اور سرہند تک

اس سے پہلے ہند کو بھی اس قدر وسعت کہاں — یعنی اب جتنا ہمالہ کے ادھر ہے ہند ہے
قلّۂ ایورسٹ کے مانند کوئی سلطنت — گردشِ ایام سے محفوظ اگر ہے ہند ہے

امن و آسائش مسرت کا سبب ہے، گو، مگر — ہر نا توپوں اور تفنگوں کی گرج میں فتح مند
واقعی ہے تیری قدرت اور شوکت کی دلیل — آتش افشاں کوہ کے دامن میں رہنا بے گزند

سرزمینِ پانی پت کے آج خاک و خون پر — ہیں جلیل القدر مہماں کے نصب شاہی خیام
ہوں مبارک تجھ کو دلّی تاجپوشی کے رسوم — تیرے شاہنشاہوں کی فہرست میں اک اور نام

یعنی جھرمٹ میں رعایا کے نظر آئیں گے اب — شاہ و شاہنشاہ بیگم با لباسِ زر نگار
جلوۂ دربار و فرمانِ شہنشاہی سے ہوں — آنکھیں روشن، کان مشتاق اور دل شاد ایک بار

ہم بھی اس موقع پہ، اک پرجوش طوفاں کی طرح — ہیں فلک سر پہ اٹھا شور مبارک باد سے
اور لے کر ساتھ سچی مشرقی تمکین کو — ہم نوا ہو جائیں ہم برطانیہ آزاد سے

(ادیب۔ دسمبر ۱۹۱۱ء)
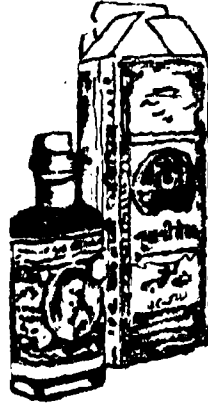
نورانی تیل

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے، اور درد چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے۔

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی

REGD. NO. A-466 42ND YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. MAY 196
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

APPROVED REMEDIES for QUICK RELIEF

for
COUGHS & COLDS
CHESTON
SYRUP

for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS

TONIC FOR
STUDENTS & BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON

for
FEVER & FLU
QINARSOL

for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI

PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES
Cipla
BOMBAY 8

AVAILABLE AT ALL CHEMISTS

قیمت

فی پرچہ - ۷۵ نئے پیسے

سالانہ — دس روپے

نگار

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دورِ ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے، اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر، خطبات، پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارہ نگار بھی کوشش کرے گا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

● پیغامات ● خطوط ● تقاریر، اور ● خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمایئے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

ضروری اعلان

پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار ۶۱۷ این سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) | فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ (۶)

ملاحظات

ابھی تک ہمیں تحقیقی کام کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا ہے اس کی بنیادی اور سچی وجہ یہ ہے کہ تحقیق جس لگن محنت اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وہ خود بڑی حد تک حوصلہ شکن ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی راستے کی سختی اور دشوار گزاری کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے منزل کی تحقیر پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو تحقیق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے جو لوگ اس میدان میں اپنے کچھ جوہر دکھا سکتے تھے وہ اس سے خائف ہو گئے اور قدم بڑھانے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔

اردو کے نقادوں میں کم ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور جب کبھی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے اس طرف گئے ہیں کہ تحقیق بڑا سہل اور آسان ادبی مشغلہ ہے تو اس کا نتیجہ کلیات میر کے پاکستانی ایڈیشن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس میں مرتب نے جو انہیں بہت کچھ دیئے ہیں ان سے کام کم لیا ہے۔

تحقیق کا اولین مقصد یہ ہے کہ ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے ہمارے اہل قلم ابھی تک تفہیم و تنقید سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے بھرپور علم ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح بے بنیاد عمارت کی تعمیر ہوا میں ہوتی ہے۔

اردو والوں کے یہاں کا کلاسیکل ادب ہنوز زیر بحث رہے۔ بے بحث اس لیے کہ اس تک پہنچ ہی کس کی ہوئی ہے۔ دو چار شاعروں کے دیوان نولکشور پریس کے طفیل میں سامنے آ گئے ہیں۔ مگر اس پر بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اب ان میں سے اکثر کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نولکشور نے لاتعداد کتابیں اردو فارسی کی چھاپ ڈالیں مگر اس عہد میں ترتیب و اشاعت کا وہ فنی شعور کہاں تھا جو آج صاحب نظر تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایڈیشن نہ اغلاط سے پاک ہیں اور نہ تنقیدی (CRITCAL) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اور تو سب کچھ چھوڑیے صرف یہ سوچیے کہ جب تک یہ ذخیرہ دریافت نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہم اردو زبان کی لغت کی تدوین بھی نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے پاس اپنی لغت تک نہ ہو اس کی کس مپرسی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نولکشوری عہد کے بعد جو نصف صدی ہم نے گزاری اس نے ہمارے ذہن کو فنی پختگی نام کی کوئی چیز نہیں دی۔ اور ہم بیکار رہ گئے۔ اب تو جو کچھ بھی پکی روشنائی سے لکھا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہونا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ اس کی نسبت کسی

ملتا شخص سے نہیں کی جا رہی ہے۔ اور اس قسم کی غلطی کا امکان گویا نہ رہے۔ جیسے ایک مشہور نقاد نے میر کے تجزیے میں نواب یار محمد خاں امیر رامپوری کے شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کو بنیاد بنا کر بہت کچھ بے بنیاد باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہ غلطیاں بار بار ہوتی رہیں گی۔ ہمارے نقاد مفروضوں پر گزر اوقات کرتے رہیں گے اس وقت تک جب تک انھیں اپنے ورثے کو برتنے کا سلیقہ نہ آ جائے گا۔

آپ کسی ادارے سے بات کیجیے صاحب! میں نے قائم کا دیوان اڈیٹ کیا ہے اور متعدد اہم نسخے سامنے رکھ کر کوشش کی ہے کہ اس کا صحیح متن پیش کر سکوں۔ آپ کا ادارہ اسے چھاپ سکے گا؟ تو پہلے تو یہی امکان کم ہے کہ جواب اثبات میں ہو اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اہلِ تحقیق کے گروپ کو خوش رکھنے کے لیے آمادہ بھی ہوا تو آپ کی اس محنت کا صلہ کیا ملے گا۔ ۸ فیصد۔ دس فیصد اور اگر فی صفحہ کی بات ہو تو روپیہ فی صفحہ۔ آپ نے مہینوں پسینہ بہایا تھا۔ آنکھیں گھلا کر کرمخوردہ پرانے نسخوں کو مصیبت جھیل کر پڑھا تھا اور ادھر ادھر آنے جانے میں اپنا روپیہ صرف کیا تھا مگر آپ کو کیا ملا کل تین سو روپے یہ ہماری قدر شناسی اور کاموں کی اہمیت کا احساس ہے۔ جو بنیادی کام ہیں، اور جن کے ذریعے آئندہ اغلاط کے دروازے بند ہو جاتے ہیں زبان و بیان کا ارتقا سامنے آتا ہے عہد بعہد زبان کی رفتار کا علم ہوتا ہے ادب کی تاریخ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قیمت ہم نے کل تین سو روپے لگائی۔ لیکن اگر یہی کتاب، آٹھ لکھے سیدھے مضامین کا مجموعہ ہوتی محض کتر بیونت ہم کے مضامین کا تو ان کا معاوضہ مصنف کو ۸ روپے فی صفحہ ملتا۔ جب ترجیح اور کم نظری ہمارے ایک عرصے تک ترجموں کے معاملوں میں برتی رہی اب ہم تحقیق کے ساتھ برت رہے ہیں۔ شاید ادبی دنیا میں اب کام کرنیوالوں کا امتحان لینے والی چیز تحقیق ہی ہے۔ جو لوگ اس سے متعلق ہیں ان کی بے جگری اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے — بڑے کام اپنے کرنیوالوں کی ذاتی تسکین کا ذریعہ کہاں تک بن سکتے ہیں اور تسکین میں بھی تو ایک حد تک دوسروں کی ستائش شامل ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر اور نقاد اور ان کے علاوہ دوسرے ادبی مشاغل والے اکثر داد اور کچھ داد کا شکار ہوتے ہیں۔ ہاں تحقیق کرنے والا گروپ ستائش اور حوصلے سے بے پروا تو ہوتا ہی ہے مگر عام طور پر اس کا مستحق بھی نہیں جانا جاتا۔ جس محنت اور لگن کی زندگی یہ لوگ گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے معراج العاشقین کو اڈیٹ کیا ہے۔ یہ کتاب برسوں سے ہماری مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل اور اپنے لاتعداد بے معنی جملوں کے ساتھ رائج ہے۔ استاد ہر جملے کی تشریح و توضیح کرتے وقت گل افشانیٔ گفتار سے کام لیتا ہے حالانکہ وہ خود پریشان ہوتا ہے اس کتاب کی بے ربطی سے۔ لیکن آخر کرے تو کیا کرے کلاس میں اس کتاب پر اعتراض کے معنی اپنی کم سوادی پر فضیحت ہوتے ہیں اور حلقۂ شاگرداں میں بات خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے متن کو صحیح ترین شکل میں پیش کر کے جا بجا اہم تشریحی حاشی لکھے ہیں اور تقریباً تمام ناقابلِ فہم مقامات کو سہل بنا دیا ہے۔ مگر کون ہے جو ان کے کام کی اہمیت کو سمجھے اور پھر اس دماغ سوزی کی داد دے جو انھیں اس کام کے دوران میں کرنی پڑی ہے۔ کیا صرف قاضی عبدالودود صاحب جیسے دو چار احباب کی تحسین و تصویب ہی پر گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان اربابِ تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں جو اپنی جانیں کھپاتے ہیں اور میر و مرزا غالب اور مومن و میراثن اور سرور کی تخلیقات کی صحیح شکل پیش کر کے ہمیں اس لائق بناتے ہیں کہ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے شاہدِ معنی کے حسن سے لطف اٹھایا جا سکے۔

جدید ایران اور جدید عرب دونوں نے اپنے خزانوں کو زیادہ سے زیادہ مہذب بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جدید کی بنیاد قدیم پر رکھی جاتی ہے جو آج جدید ہے وہ بھی کل قدیم کے درجے میں آ جائے گا اپنے ورثے کی طرف سے غفلت برت کر ہم اپنے مستقبل کے خود لٹیرے بن جاتے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تحقیق کے میدان میں آنے والوں کی ہمت افزائی ہر رخ پر ہو۔

ناشر کی طرف سے باعزت معاوضے کی شکل میں اور کتاب کو حسنِ صورت دے کر۔

قاری کی طرف سے محنت کو سراہ کر اور خریداری کے ذریعے کتاب کو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا کر۔

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کو زندہ رکھنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ فلمی رسالوں کو نہ اشتہاروں کی کمی ہے نہ خریداروں کی۔ ادبی پرچوں کے لیے دوہری مار ہے۔ نہ خریدار نہ اشتہار۔ خریدار پیدا کرنے کے لیے صبر آزما وقت درکار ہوتا ہے۔ حلقہ بنتے بنتے بنتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں مسلسل اشاعت کے بعد بھی بنیادیں کمزور رہتی ہیں اور خریداروں کا فقدان چھایا رہتا ہے۔ تو اب صرف ایک صورت اشتہاروں

ی باقی رہ جاتی ہے، اردو کے ادبی پرچوں کو اشتہار صرف اردو سے تعلق کی وجہ سے مل سکتے ہیں۔ اور ایسے کتنے مشتہرین ہیں جو اردو سے لگاؤ رکھتے ہوں بحرف گنتی کے!
ان میں سرِ فہرست ہمدرد دواخانہ ہے، پھر سیلا ممبئی اور شیروانی الہ آباد آتے ہیں۔ ان تینوں کے مالکان اردو دوست بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی۔

یوں تو ان کے اشتہارات اردو پرچوں میں جاتے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اردو کی کس مپرسی میں یہ سنجیدہ ادب کی ترویج و ترقی کے لحاظ زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں۔ اور اردو کے ان چند گنتی کے رسائل پر خصوصی توجہ دیں جو زندگی اور موت کے درمیان جھولتے ہیں لیکن پھر بھی سستے اور گھٹیا ادب کی اشاعت سے دامن بچائے رہتے ہیں۔ ایسے رسالے ۲۰ - ۲۵ سے زیادہ ہرگز نہ ہونگے۔ لاکھوں روپے کے بجٹ میں سے ایک حقیر رقم ان رسالوں میں نئی روح پھونک سکتی ہے جناب عبدالحمید خواجہ۔ جناب حکیم عبدالحمید دہلوی اور جناب احمد رشید شیروانی سے، یہ ہماری توقع ہے کہ وہ اس معاملے پر غور فرمائیں گے اور اپنے اڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو خصوصی ہدایات دیں گے۔ تاکہ اردو کے خادم اطمینان سے مصروف عمل رہیں۔

اس شمارے سے نگار میں ایک اہم کتاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کا موضوع بے حد دلچسپ مفید اور ضروری ہے ـــــ ہر شخص جانتا ہے اسلامی تاریخ کا سرورق یعنی سیرۃ رسول اللہؐ اس حیثیت سے ایک معمہ بنی ہوئی ہے کہ اس کے واقعات تاریخ و ایام کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ اور کبھی کبھی تو ان میں ایسا شدید تضاد پایا جاتا ہے کہ پوری سیرۃ کے راوی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ قدیم سیرۃ کی کتابوں میں لگ بھگ سو سوا سو واقعات کی تاریخیں اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ اسلامی مورخوں کا حیرت خیز کارنامہ ہے۔ لیکن موجودہ دور کے صاحب قلم اس شجر ممنوعہ تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں اور موجودہ کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی تاریخ سے ایام مطابقت نہیں کرتے کبھی روایات سے موسم غیر مطابق ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک ہی واقعے کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کی علم ہیئت تکذیب کرتا ہے غرض یہ وادی پرخار ایسی ہے جس سے دامن بچا کر گزر جانے ہی میں عافیت ہے۔

یہ موضوع خالص انسانی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کی ایک نمائندہ امت کی تاریخ کو صحیح صحیح سمجھنا خود اپنی جگہ ایک ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس زنجیر سے ایک کڑی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ نیلسن (**Nielsen**) ونکلر (**Winkler**) پرسیول (**Persival**) میور (**Muir**) جیسے مستشرقین اور حمید اللہ جیسے صاحب نظر نے ایسے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش تو کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

اس موضوع کے لیے جس وسعت مطالعہ محنت اور خلوص کی ضرورت تھی مسرت کا مقام ہے کہ اس کا پورا پورا حق صاحب تصنیف نے ادا کیا ہے۔ اور ایک وسیع کینوس پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ موصوف کا یہ کارنامہ علمی دنیا پر ایک احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

یوں تو نگار کی محفل میں اسحاق النبی خاں صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ مگر ایک طرح ان کا رشتہ اس سالے سے بہت پرانا ہے ۱۹۲۷ء کی بات ہے مولانا نیاز فتحپوری نے ڈاکٹر ٹسڈل کے ان اعتراضات کا ترجمہ شایع کیا تھا، جو قرآن مجید پر کیے گئے تھے، صاحب تصنیف ہی وہ پہلے مرد مومن تھے جنھوں نے عالمانہ انداز میں اس کے کچھ حصوں کا جواب لکھا تھا اور جو "بہاں دہلی میں" ہارون اور گوسالۂ طلائی" کے عنوان سے شایع بھی ہوا تھا۔ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں نے اس کا خیر مقدم پورے جوش و خروش سے کیا تھا اور اب بھی بہت سے حضرات کو یہ افسوس ہے کہ وہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

موجودہ کتاب میں بظاہر ایک خشک موضوع کو جیسی تر زبانی صاحب تحریر نے عطا کی ہے وہ اس کے بہت سے بوجھل حصوں کو بھی گوارا بنا دیتی ہے۔
نگار کو یہ فخر ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی ضرورت کا احساس تو سب کو تھا مگر لب اظہار اور جرأت گفتار کی کمی نے اُسے احاطۂ تحریر میں نہیں آنے دیا۔

حلُ التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

اسحاق النبی خاں

مقالۂ اوّل

فصل اوّل

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادگار رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب و غریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی جسکے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب و تعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے، عرف عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آفاقی مقبولیت نے ثابت کردیا کہ یہ وقت کی آواز تھی جو کہیں سے بھی اٹھتی ضرور سنی جاتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرق وسطی پر چھا گئی جہاں سے اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے، کہ جزیرہ نما سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت خیز کام انجام دیئے اور آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعث کشش اور جاذب توجہ ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدا پیغمبر اسلام کی سیرۃ ۔ یا با الفاظ دیگر آپ کے ان احکام و اقوال سے ہوتی ہے، جو اس تحریک کو منظم کرنے، چلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے تاریخ اسلام کا یہ ابتدائی حصہ حد درجہ اہم ہے، اور اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل تحریک کو سمجھنے کے لیے اس حصے کا بغائر نظر مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی تعلیمات اور زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جدوجہد کی، اور جو جو طریقے اختیار کیے، خود ان کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک بجا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط، اور تلاش و تنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابل داد ہے۔ اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح و تنقید کے کچھ اور اصول بھی دریافت ہو گئے ہیں، لیکن یہ پرانے اصول ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی:

۱۔ عہد ماقبل نبوت
۲۔ مکی عہد
۳۔ مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطہ سے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور پرامن تھی، شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپکی نظریاتی تعلیم کا، کیونکہ یہ آپکی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ تنظیمی، اور سیاسی ترتیبات نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرے اور سیاسی طاقت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ انتظامی قابلیت، اور پھر رہنمائی کا جوہر کا یکجا ہونا قدرت میں سب سے زیادہ

تعدالوقوع عجوبہ ہے، اس نظریے سے دیکھیے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسول عربی کی ذات میں قدرت نے ودیعت کیے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی، اور اخلاقی نظریات و تصورات پیش کر کے دنیا سے منوا لیے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی عظیم اور باوسائل و باترقی سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل و تاسیس بھی کی جس نے اگلے آٹھ دس سال کے اندر ہی براعظم ایشیا و افریقہ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیوں کو نیست کر ڈالا۔[1]

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اٹھی ہوئی عارضی آندھی نہ تھی جو فوراً اتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں فارس منزہ سے لیکر بحر ارل (ARAL) تک اور ارل سے لیکر اٹلانٹک (ATLANTIC) تک ایک ہی پرچم کو سربلند کر دیا، جو بڑی مدت تک اسی شان و شوکت سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتداء ان چھوٹی چھوٹی مہموں، اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں غزوات و سرایا کہا جاتا ہے، اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخ ریاست کا پہلا باب، انہیں سے شروع ہوتا ہے۔ سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات و سرایا کے جو دلچسپ حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقام جنگ، اس کا مدینے یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیر جیش یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکاء کی پوری تعداد، مع اسماء مشاہیر باہمی صراحت کہ مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے، کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفاء اور دوستوں کی نشاندہی، موافقین و مخالفین کے سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام نیز یہ کہ کون شخص کس کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا ہے، اور کس آلہ سے؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفین کی جنگی طاقت، اسیران جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا دن تاریخ اور مہینہ تک متعین کیا گیا ہے۔ اور کسی وجہ سے تاریخ و یوم کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا؛

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کو فوراً ہی قلمبند نہ کر لیا جائے، بالخصوص تاریخ ماہ و دن کی نشاندہی بلا لکھے ممکن نہیں؛ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں، اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں بلکہ تاریخی ہے، تو ابتدائی مدونین سیرۃ "یا ان کے" رواۃ" کے سامنے براہ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں، جن کا تعلق عہد رسالت بلکہ غزوات ہی سے تھا؛

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں روایات سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے، اور اصولی طور پر ہماری نظریں کتب سیرۃ کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اٹھتی ہیں؛ کیونکہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے۔

اس سلسلے میں عمومی تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبط تحریر میں نہیں آ سکی تھیں[2] چنانچہ اکثر علمائے تاریخ کا خیال یہ

---

[1] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:-

" In any case, whatever view we may take of the claims of Mahommad no one can deny that he was a great man. — a man who can put an end in less than 10 years to two formidable kingdoms, the kingdom of the old Achemenides represented by the classic Sassanide and that of Roman Ceasers of Eastern countries by means of some camel drivers of Arabia, must be at any rate taken into consideration. A controller of conscience and soul to so many millions and in the plainlight of civilization, is indeed greater than Alexander and Bonapart known only to day in historical books."

(A. Mingana leaves P XXIV)

[2] خطبات احمدیہ/ ۳۱۵

ہے کہ ابن اسحٰق (المتوفی ۱۵۱ھ) اسلام کے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی سیرۃ کو سب سے پہلے لکھا، اور ان منتشر لسانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں متداول تھیں، گویا اسلام کی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جب کہ ظہور اسلام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال بیت چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا ابتدائی حصہ محض مشکوک اور منتشر زبانی روایات کا مجموعہ ثابت ہوتا ہے جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت رہتی ہے نہ تاریخی افادیت، یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گزر جانے کے بعد بھی واقعاتی تفصیلات جوں کی توں اور اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں، یا یہ کہ ان کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے، جس کے خلا کو پُر کرنے کے لیے رائج الوقت روایات، عقائد اور تصورات ان میں شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی بجائے ایک عجیب ہیئت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ واقعاتی تسلسل تک نظر نہیں آتا۔ اور عباسی عہد کے عقائد، مزعومات اور عصبیت تک بعض روایتوں میں جھلکتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ اس دور سے پہلے ضبط تحریر میں آ چکا تھا!

اس صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر دو ائمہ، ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے رواۃ کو بعض قدیم نوشتے مکتوبی صورت میں پہنچے تھے، جن کا تعلق عہد رسالت یا عہد صحابہ سے تھا، تو اس مفروضے کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ابتدائی عہد میں ایسے امکانات موجود تھے کہ اس طرح کی یادداشتیں یا دستاویزیں ضبط تحریر میں آ سکتی تھیں؟

اس سوال کا جواب بہر صورت نفی میں دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف مستشرقین بلکہ علمائے اسلام کی اکثریت اس بات کی مدعی ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرہ فی الجملہ جاہل اور ان پڑھ تھا۔ اور ان میں علمی صلاحیتیں یا تو بالکل مفقود تھیں یا اتنی کم تھیں کہ قرآن مجید میں اس دور کے لوگوں کو "امی" یعنی ناخواندہ کہا گیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے، ورنہ عام طور پر پورے ملک میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ اس بنا پر یہ قیاس ممکن نہیں کہ اس ابتدائی دور میں یہ یادداشتیں ضبط تحریر میں آ سکیں، ہر شے ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ جب لکھے پڑھے لوگ ہی نہ تھے تو پھر کوئی لکھتا بھی تو کیوں؟ اور کس کے لیے؟

ڈاکٹر نیکلسن نے تاریخ ادبیات عرب (Literary History of the Arabs) میں جاہل عربوں کو گویا ناخواندہ اور جاہل تصور کیا ہے[۲]

مسلمانوں میں سر سید سے زیادہ آزاد فکر کون ہوگا مگر ان کی مہر بھی اس فتویٰ پر ثبت ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آنحضرتؐ کے زمانہ سے پیشتر اور نیز آنحضرتؐ کے زمانہ میں کوئی معین باقاعدہ "طریقۂ تعلیم" کا جاری نہیں تھا، عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی تمدنی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب، ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسے میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی، وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے، اسی وجہ سے اس زمانے میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی، پہلے یعنی وہ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ پچھلوں کے مقابلے میں "اُمّی" کہلاتے تھے، اگرچہ ان دونوں قسم کے لوگوں میں بہت کم فرق تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرتؐ کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے، اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اور اسی حیثیت سے آنحضرتؐ کا لقب "اُمّی" تھا"[۳]

حقیقتاً اس تصور جہالت کو مستشرقین نے اتنی ہوا نہیں دی ہے، جتنی خود مسلمانوں نے۔ جس کی بنا پر بڑی وجہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے، کہ خود پیغمبر اسلام ناخواندہ تھے، جیسا کہ سر سید تک کا خیال ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرتؐ کے لیے صاف طور پر لفظ "امی" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عام طور پر ناخواندہ لیے جاتے ہیں، اور چونکہ یہی لفظ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر پوری عرب قوم کے لیے بھی آیا ہے[۴] اس بنا پر مسلمانوں کا عمومی تصور یا عقیدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آنحضرتؐ اور آنحضرتؐ کے ساتھ اس پوری "امت امیہ" کو "خواندہ" یا پڑھا لکھا تسلیم کر سکیں جس میں آپ پیدا ہوئے یا پرورش پائی اور بالآخر مبعوث ہوئے۔ کیونکہ اصولاً یہ بات ممکن نہیں کہ ایک مقام پر اس لفظ کے معنی ناخواندہ لیے جائیں اور دوسری جگہ کچھ اور مفہوم لیا جائے۔

میں یہاں حضرت "نبی امی" کے خواندہ یا ناخواندہ ہونے کی بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں، نہ اس عام عقیدے کی صحت یا عدم صحت پر کچھ کہنا ہے،

---

[۱] MUIR ./PL XXVI　[۲] Literary History of the Arabs　[۳] خطبات احمدیہ/۲۱۶

ہاں، اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال شاید متبادل مفہوم میں نہیں ہوا ہے اور غالباً ہر جگہ "غیر بنی اسرائیل" (GENTILE) یا غیر کتابی لوگوں کے استعمال ہوا ہے، بلکہ بعض تاریخی شہادتوں کی بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شاید اس کا مروجہ مفہوم "موجود ہی نہ تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس نے ( ) کی تشریح کرتے ہوئے لفظ امیوں کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں: "قومٌ لم یصدقوا رسولاً ارسله الله ولا كتاباً انزله"[1] (یعنی وہ قوم جس نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول اور کسی نازل کردہ کتاب کی تصدیق نہیں کی) بلکہ اس ذیل میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان لوگوں کے پاس خود نوشتہ صحیفے ہوتے ہیں جن کو یہ اپنے ہاتھوں سے لکھ لیتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔[2]

عبداللہ بن عباس کے شاگرد خاص عکرمہ کے نزدیک بھی ہر غیر کتابی "امی" تھا؛ چنانچہ انھوں نے یہودیوں کے مقابلے میں مجوسیوں کو محض اس بنا پر امی قرار دیا ہے کہ وہ غیر کتابی تھے۔[3] دوسری صدی کے نصف اول میں ابن اسحٰق نے بھی "امی" کے معنی "ان پڑھ" یا ناخواندہ نہیں لیے بلکہ اس کا تقریباً وہی مفہوم سمجھا جو ابن عباس نے بیان کیا تھا، یعنی غیر بنی اسرائیل (Gentile) یا غیر کتابی چنانچہ "قل للذين اوتوا الكتب والامیین" کی تشریح کرتے ہوئے "امیین" کے معنی "الذين لا كتاب لهم" بیان کیے ہیں[4] یعنی وہ قوم جس میں کوئی آسمانی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ خود قرآن مجید کے سیاق سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ تقریباً ہر جگہ یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے[5] حتیٰ کہ آنحضرت کے لیے بھی جب اس کا استعمال ہوا تو اس صراحت کے ساتھ کہ آپ کی یہ صفت توریت اور انجیل میں موجود ہے۔[6] حیرت ہے کہ علمائے اسلام اس آیت کی موجودگی میں لفظ امی کے معنی "ان پڑھ" کس طرح کر لیتے ہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل کی تمام پیشگوئیاں ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس میں کسی "ناخواندہ" نبی کی آمد کی خبر دی گئی ہو!

علاوہ ازیں مضبوط ترین حقائق اور تاریخی شہادتیں بھی اس عقیدے کے خلاف ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت پورا عربی سماج ناخواندہ یا ان پڑھ تھا؛ یہ سچ ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا کے تعلیمی نقشے میں وہ رنگ نظر نہیں آتے، جو آج موجود ہیں، اس لیے کہ اس عہد میں انسانی معاش بیشتر قلم کی وابستگی سے آزاد تھی، لیکن پھر بھی چیدہ چیدہ دینی، سیاسی اور تجارتی ضرورتوں کے لیے اکثر لوگ تحصیل علم پر مجبور تھے۔ جن کی تعداد اگرچہ ہر ملک میں محدود ہوتی، لیکن ہوتی ضرور تھی۔ اور اسی نسبت سے عربوں میں بھی تعلیم کی افراط خارج از قیاس ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ظہور اسلام کے وقت، باشندگان عرب اپنے پڑوسی ملکوں یا قوموں کے مقابلے میں ان پڑھ تھے تاریخی واقعات کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیوں کہ اوراق تاریخ میں اس کے خلاف مبہم شہادتیں ملتی ہیں جن کو میں فصل دوم میں پیش کروں گا۔

فصل دوم

ظہور اسلام کے وقت عربوں کی تعلیمی حالت کا پورے طور پر جائزہ (Survey) لینا نہ تو اس کتاب کا موضوع ہے، اور نہ اس چھوٹی سی فصل میں ممکن ہے، اس لیے میں یہاں صرف چند ایسی تاریخی شہادتیں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ عہد رسالت میں جاہلی معاشرے کو قلم سے کیا لگاؤ تھا، اور اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کی کس قدر صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی شہادت جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس زمانے کی مروجہ عربی زبان کی ہے جو میری رائے میں سب سے اہم ہے:

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کسی زبان کی تعمیر اور وسعت میں اس کے بولنے والوں کی ضروریات اور تقاضائے ذہنی کو دخل ہوتا ہے اور ان ضروریات کی طرف اس زبان کے الفاظ اور ان کی قلت و کثرت رہنمائی کر سکتی ہے، تو خود عربی زبان اس بات کی شاہد ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں تعلیمی فقدان نہ تھا، اور یہ "امت امیہ" اپنے پڑوسی ملکوں سے میدان تعلیم میں پیچھے نہ تھی۔ صرف "عربی مبین" یعنی حجازی زبان میں (جس میں قرآن نازل ہوا) نوشت و خواند اور اس کے متعلقات کے لیے اس کثرت سے الفاظ ملتے ہیں جن سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی ضروریات میں تعلیم کو کافی دخل حاصل ہو چکا تھا۔ میں یہاں صرف قرآن مجید سے کچھ ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو مختلف مدارج کی کتابوں اور مکتوبات کے لیے استعمال ہوتے تھے، مثلاً:

"کتاب[7]۔ اساطیر (اسطورہ)[8]، زبر (زبور)[9]۔ اسفار (سفر)[10] کتاب ہزدوم[11]۔ نسخہ[12]۔ صحف (صحیفہ)[13]۔ سجل[14]۔ قط[15]"

گویا نو الفاظ! ان میں سے تین آخر الذکر لفظ (یعنی صحف[16]، سجل[17]، قط[18]) کے علاوہ جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں، باقی تمام الفاظ عربی ہیں، اور ان سب کے الفاظ اور مصادر عربی میں رائج تھے، یعنی:

---

[1] الدر منثور/ [2] درمنثور/ [3] دیکھیے طبری تفسیر ۳/۳۴۳ [4] طبری تاریخ ۲/۱۴۲ [5] ابن ہشام ۲/۲۲۷ [6] دیکھیے قرآن/۳: ۲۰
[7] قرآن/۷: ۱۵۸ ... [8] قرآن ۶: ۲۵ ، ۸: ۳۱ ، ۱۶: ۲۴ ، ۲۳: ۸۳ ، ۲۵: ۵ ، ۲۷: ۶۸ ، ۴۶: ۱۷ ، ۶۸: ۱۵ ، ۸۳: ۱۳ وغیرہ
[9] ۲۶: ۱۹۶ ، ۳: ۱۸۴ ، ۳۵: ۲۵ ، ۵۴: ۴۳ ، ۵۲ [10] ۵۲ : ۲/۳۴۵ : ۱۹ نیز دیکھیے ۸۰: ۱۵ [11]

مکتب[1]، سطر[2]، زبر[3]، سفر[4]، رقم[5]، نسخ[6]، ان پر دو لفظوں کا اور اضافہ کیجیے یعنی "خط"[7] اور "املا"[8] کا جو قرآن مجید میں جداگانہ استعمال ہوئے ہیں، گویا ظہور اسلام کے وقت صرف "لکھنے" یا "کتابت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان میں کم سے کم آٹھ لفظ ایسے تھے جن کا حوالہ قرآن میں ملتا ہے؛ یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کم تر زبانیں اس کا مقابلہ کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ الفاظ اس وقت تک "حصہ زبان" نہیں بن سکتے۔ جب تک بولنے والوں کو ان کی شدید ضرورت نہ ہو، اور پیہم استعمال نہ ہوتے رہیں؛ میں نے یہ الفاظ صرف قرآن مجید سے انتخاب کیے ہیں، تاکہ عہد رسالت میں ان کا استعمال اور رواج شکوک و شبہات سے بالا رہے، ورنہ اسی عہد کے چند اور الفاظ بھی پیش کیے جا سکتے تھے؛

کیا یہ تصور واقعی حیرت خیز نہیں کہ جس زبان میں نوشت و خواند کے لیے اتنے زیادہ الفاظ مروج ہوں، اُسی زبان کے بولنے والے فن کتابت سے بے بہرہ فرض کر لیے جائیں، اور بایں معنی "امی" سمجھے جائیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیتوں سے محروم تھے؟

قطع نظر اس سے کہ خود قرآن مجید کے انداز بیان اور خاص طور پر طرز استدلال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ظہور اسلام کے وقت عربی سماج "ان پڑھ" تھا، یا قرآن کے سامعین اولین اور مخاطب وقت جاہل تھے، اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ متداولہ کتابوں کے حوالے نظر آتے ہیں، عبارتیں نظر آتی ہیں جن کے خلاصے بطور سند پیش کیے گئے ہیں، پھر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ پست نہیں بلکہ بلند ہیں، جن سے سامعین کے طویل ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے، سماجی اور اخلاقی نکات کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ آج کی دنیا شعوری اور غیر شعوری طور پر انھیں آہستہ آہستہ قبول کرتی جا رہی ہے، مگر بہت سے پسماندہ سماجوں کے لیے ہنوز ناقابل فہم و عمل ہیں۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی عبارت جو نازل ہوئی اس کی ابتدا "اقرأ" سے ہوتی ہے اور انتہا "علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم"[3] پر۔ نزول قرآن کے بعد جب اس کتاب پر اعتراضات کی بوچھاڑیں ہونے لگیں، جرح و تنقید شروع ہو گئی، مطعون کیا جانے لگا، اور طرح طرح کے بہتان لگائے گئے تو ان میں سب سے زیادہ عام اعتراض یہ تھا کہ یہ پچھلی کتابوں یعنی "اساطیر الاولین"[4] سے ماخوذ ہے، گویا سرقہ مضامین کا طعنہ جو اکثر ادیب و نقاد دیا کرتے ہیں جن کی نظریں پچھلی کتابوں پر ہوتی ہیں، یہ الزام بھی کسی جاہل معاشرے کی طرف سے ممکن نہیں، چنانچہ قرآن نے جب اس کی تردید کی تو ان الفاظ میں "فاتوا بکتب من عند اللہ هو اهدی"[5] --- "فاتوا بسورة من مثله"[6] --- "فاتوا بعشر سور مثله"[7] گویا تمام مصنفین عرب کو چیلنج کیا گیا کہ اگر قرآن آسمانی کتاب نہیں، تو اس کی مثل، کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ایک ایسا طبقہ موجود تھا جس کو "دعوت تصنیف" دی جا سکتی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ان پڑھ سماج کے لیے یہ تمام تر مطالبات بے معنی ہیں، کم سے کم میرے لیے یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ قرآن کی یہ دعوت تصنیف ایک ایسے جاہل اور ان پڑھ معاشرے کے لیے تھی، جو اس کے جواب میں چند سطریں لکھنے سے بھی معذور تھا، قرآن میں یہ چیلنج ایک دو جگہ نہیں پورے چھ مقامات پر نظر آتا ہے[8]۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ اتفاقی نہ تھا بلکہ مخالفین بار بار کوشش[9] کرتے اور بار بار ناکام ہوتے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ رسول اللہؐ نے ان چیلنجوں میں یا تو قرآن جیسی "کتاب" کا مطالبہ کیا ہے یا "جز و کتاب"[9] یعنی سورۃ کا۔ ظاہر ہے کہ "سورۃ" کسی کاوش لسانی کا نام نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں جبکہ قرآن کو نزول تسنیم سے ریگستان عرب کی آبیاری کرنا چاہتا تھا، ایک مکی عالم، نضر بن حارث نے یہاں "آہورا مزدا" کی مقدس آگ سلگانا چاہی تھی، اور مجوسیت قبول کر کے[10] اس کی تبلیغ شروع کر دی تھی، چنانچہ اس کی مشہور کتاب کا تذکرہ جس کو قرآن نے "لهو الحدیث"[10] کا خطاب دیا تھا، اوراق تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، اس کتاب میں "نضر نے رستم و اسفندیار کے دلچسپ قصے بیان کیے تھے، اور اس کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن سے کسی طرح کم نہیں"[11]، نضر صرف فارسی زبان ہی سے واقف نہ تھا، بلکہ شاید یونانی بھی جانتا تھا[12]۔

---

[1] ۲۹ : ۴۷ [2] [3] قرآن ۹۶ : ۴

[4] ۶ : ۲۵، ۸ - ۳۱ : ۸، ۲۳ - ۸۴ : ۲۳، ۲۷ - ۶۸ : ۲۵، ۵ - ۴۶ : ۱۷، ۶۸ - ۱۵ : ۶۸

[5] ۲۸ : ۴۹ [6] ۲ : ۲۳، نیز دیکھیے ۱۰ : ۳۸ [7] ۱۱ : ۱۳ [8]

[9] Arthur Jeffery-Foreign Vocabulry of the Quran p.p.182

[10] نضر بن حارث نے زندقہ یعنی مجوسی مذہب اختیار کر لیا تھا دیکھیے ابن حبیب المحبر/۱۶۱ [11] قرآن ۳۱ : ۶

[12] ابن اسحق کا بیان ہے "فحدثهم عن رستم السندید وعن اسفندیار و ملوک فارس، ثم یقول: واللہ ما محمد باحسن حدیثا منی وما حدیثه الا اساطیر الاولین اکتتبها کما اکتتبتها" --- ابن ہشام [13] 268

قرآن مجید کے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اور اہل قلم تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، جن کی کتابیں، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں[1]، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا رواج صرف قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلہ میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ رواج عام تھا[2]۔

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمۂ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے[3] مشہور واقعہ ہے، اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری تورات یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا[4]۔ یہ ترجمہ غالباً حضرت عمر کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلہ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے، جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا، یہ ترجمہ آنحضرت نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا[5]۔

آنحضرت کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمر کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو بیشتر ادبی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفہ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا[6] اگر یہ روایت صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضروری رہتی، چنانچہ خود حضرت نبی امی نے زید بن ثابت کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی، زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کرلی، کہ پھر اس قسم کی جملہ خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے بموجب یہ یونانی بھی جانتے تھے[8]، زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ ۶ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ جملہ سفیران ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے[9]۔

بلند پایہ کتابوں کو مُطلا، اور مُذہب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10]، یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آرہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت ابی نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے[12]۔

ظہور اسلام کے وقت عرب: دیہات میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں: بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد

---

[1] ۲: ۷۹، خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیھم" اور "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں "مررت مع طاوس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/۳۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب)

[4] مسند ۳/۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/۸۹ طبری ۲/۲۳۳، سوید نے جب اس کو آنحضرت کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ان ھذا الکلام حسن"۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ...... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول اللہ ان اتعلم لہ کلمات من کتاب یہود، ...... فلما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیھم، واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابھم ...... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول اللہ ان اتعلم السریانیۃ (ترمذی، باب فی تعلیم السریانی)

[8] حمید اللہ /

[9] ابن سعد ۲/

[10] حمید اللہ / ابن سعد ۲/

[11] ...... جئی ابن مسعود بمصحف قد زین بالذھب فقال ان احسن ما زین بہ المصحف تلاوتہ (منتخب کنز العمال ۱/

[12] منتخب کنز العمال ۱/۴۰۰

تھے، مدارس موجود تھے، چنانچہ اس قبیلے کی ایک ضرب المثل فاحشۃ "ظلمہ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی۔ اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج عام تھا۔ یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ عہد رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں ان اطراف کے جملہ بچی مدارس کا ناظم تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابو حارثہ تھا۔

مخلوط تعلیم

دیہاتی مدارس

یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں سے معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویزوں کا مرتبہ ایک دفتری معمول سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی۔

دیہاتی مدارس کی

ظہور اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں، سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔

اساتذہ و معلمین

نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے، کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطیٰ ناواقف تھا۔ مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جس کو پیپائرس Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے، قرطاس کے علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی جھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابل نوشت بنایا جاتا تھا، عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عربوں کے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہ راست ہوتی، چنانچہ ایک مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے، غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔

قرطاس یا کتابت

کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا، جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی حریر سے ہے، حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے، جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو ۹ھ میں لکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید قرطاس اور رق سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف روسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عام ضروریات کے لیے دیسی ساخت کی اشیاء کتابت بافراط نظر آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقعہ، عسب وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کرکے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں مختلف اشیا کی تختیاں یا لوحیں بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "لخفہ"، "سبورہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ لخفہ اور سبورہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں گویا یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کی شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چھو کر کاٹ لیا جاتا، یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے عہد میں جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیاء کتابت کی اس گوناگونی سے مختلف طبقات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنس گراں سے سہارے اور مذہب کی اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر غریب، غلام، آقا، مرد، عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امرا اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو اس لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں جو غریب، کم مایہ اور خواتین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔

تعلیم عام تھی

کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ اسیران بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ یہ معاوضہ یا فدیہ بطور تاوان جنگ ادا کردیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے، اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے، ایسے لوگوں

غریب تعلیم یافتہ

قرآن مجید کے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اہل قلم تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، جن کی کتابیں، ہاتھوں ہاتھ[1] فروخت ہو رہی تھیں، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا رواج صرف کتابوں قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلہ میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ رواج[2] عام تھا۔

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمۂ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے[3] مشہور واقعہ ہے؛ اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری تورات یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا،[4] یہ ترجمہ غالباً حضرت عمرؓ کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلۂ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے، جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا، یہ ترجمہ آنحضرتؐ نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا[5]۔

آنحضرتؐ کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمرؓ کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو جمشید اوی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفۂ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا،[6] اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضروری رہتی، چنانچہ خود حضرت نبی امیؐ نے زید بن ثابتؓ کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی، زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ پھر اس قسم کی جملہ خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے بموجب یہ یونانی بھی جانتے تھے[8]، زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ سنہ ۶ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ جملہ سفیران ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے[9]۔

بلند پایہ کتابوں کو مطلّا اور مذہب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10]، یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلّا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آرہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلّا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت علیؓ نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے[12]۔

ظہور اسلام کے وقت عربی: یہاں میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں: بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد[13]

---

[1] ۲ : ۷۹، ــــ خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیھم" اور "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں "مررت مع طاؤس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/۳۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب)

[4] مسند ۳/۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/۸۶ طبری ۲/۲۳۳، سوید نے جب اس کو آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا: ان ھذا الکلام حسن۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ...... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول اللہ ان اتعلم لہ کلمات من کتاب یہود، ...... فلما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیھم، واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابھم ..... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول اللہ ان اتعلم السریانیۃ (ترمذی ۲ باب فی تعلیم السریانی) [8] حمید اللہ/ [9] ابن سعد ۲/ ابن سعد ۲/

[10] حمید اللہ

[11] ...... جیٔ ابن مسعود بمصحف قد زین بالذھب فقال ان احسن ما زین بہ المصحف تلاوتہ (منتخب کنز العمال ۲/۴۲)

[12] ، منتخب کنز العمال ۱/۴۰۰

تھے، مدارس موجود تھے، چنانچہ اس قبیلے کی ایک ضرب المثل فاحشہ ظلر شے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی،[1] اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں غالباً تعلیم کا رواج عام تھا، یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ عہد رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں، ان اطراف کے جملہ بچی مدارس کا ناظم تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابو حارثہ تھا۔[2]

یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں سے معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویزات کا مرتبہ ایک دفتری معنی سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی!

ظہور اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں، سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔[3]

نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے، کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطی ناواقف نہ تھا، مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جس کو بیپائرس Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے، قرطاس کے علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی جھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابل نوشت بنایا جاتا تھا، عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا، یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں،[4] جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عربوں کے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہ راست ہوتی، چنانچہ ایک مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔[5] غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔

کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا، جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی "حریر" سے ہے، حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے، جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو ۹ھ میں لکھا تھا۔[6] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شا قرطاس اور رق سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف روسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں عام ضروریات کے لیے دیسی ساخت کی اشیا بکثرت نظر آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقع، عسب، وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کر کے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں مختلف اشیا کی تختیاں یا لوحیں بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "لخفہ"، "سبورہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ لخفہ اور سبورہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں گویا یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کے شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چوکور کاٹ لیا جاتا، یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے عہد میں۔ جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیائے کتابت کی اس گوناگونی سے مختلف طبقات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنس گراں سے ہمارے اندر اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر، غریب، غلام، آقا، مرد، عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امرا اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو اس لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں جو غریب، کم مایہ اور خواتین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔

کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اسیران بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ مقررہ فدیہ بطور تاوان جنگ ادا کر دیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے۔ اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے، ایسے لوگوں

قرآن مجید سے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اہل قلم تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، جن کی کتابیں، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں[1]، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا یہ رواج صرف قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلے میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ رواج عام تھا[2]۔

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمۂ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے[3] مشہور واقعہ ہے؛ اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری توریت یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا[4]۔ یہ ترجمہ غالباً حضرت عمر کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلۂ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ آنحضرت نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا[5]۔

آنحضرت کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمر کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو پیشدادی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفہ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا[6] اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضرورتیں رہتیں، چنانچہ خود حضرت نبی امی نے زید بن ثابت کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی، زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ پھر اس قسم کی جملہ خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے بموجب یہ یونانی بھی جانتے تھے[8]

زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ سنہ ۶ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ جملہ سفیران ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے[9]

بلند پایہ کتابوں کو مطلا، اور مذہب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10]۔ یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آ رہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت ابی نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے[12]

ظہور اسلام کے وقت عربی دیہات میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں: بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد

---

[1] ۲: ۷۹ — خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیھم" اور "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں "مررت مع طاؤس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/ ۲۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب)

[4] مسند ۳/ ۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/ ۸۶ طبری ۲/ ۲۳۳، سوید نے جب اس کو آنحضرت کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ان ھذا الکلام حسن"۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ..... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول اللہ ان اتعلم لہ کلمات من کتاب یہود، ...... فلما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیھم، واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابھم ..... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول اللہ ان اتعلم السریانیۃ (ترمذی، باب فی تعلیم السریانی) حمید اللہ

[8] ابن سعد ۲/

[9] حمید اللہ

[10] حمید اللہ

[11] ..... جئی ابن مسعود بمصحف قد زین بالذہب فقال ان احسن ما زین بہ المصحف تلاوتہ، منتخب کنز العمال ۱/ ۴۰۲

[12] منتخب کنز العمال ۱/ ۴۰۰

تھے، مدارس موجود تھے، چنانچہ اس قبیلے کی ایک ضرب المثل فاحشہ "ظلمہ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی تھی[1] اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں مکتوبی تعلیم کا رواج عام تھا، یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ عہد رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں ان اطراف کے جملہ یمنی مدارس کا ناظم تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابوحارثہ تھا۔[2]

یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں سے معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویزوں کا مرتبہ ایک دفتری معمہ سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی!

ظہور اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں، سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔[3]

نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے، کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطیٰ نا واقف تھا۔ مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جس کو پیپائرس Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے قرطاس کے علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی جھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابل نوشت بنایا جاتا تھا، عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا، یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عربوں کے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہ راست ہوتی، چنانچہ ایک مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔[4] غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔

کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی حریر سے ہے، حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو سفرہ میں لکھا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریشم قرطاس اور رق سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف رؤسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں عام ضروریات کے لیے دیسی ساخت کی اشیاء کتابت بہ افراط نظر آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقعہ، عسب وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کر کے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں مختلف اشیا کی تختیاں یا لوحیں بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "لخفہ"، "سبورہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ لخفہ اور سبورہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں گویا یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کی شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چھو کر کاٹ لیا جاتا، یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے عہد میں جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیاء کتابت کی اس گوناگونی سے مختلف صفات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنس گراں سے سرمائے اور مذہب کی اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر، غریب، غلام، آقا، مرد، عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امراء اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو اس لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں جو غریب، کم مایہ اور خواتین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔

کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسیران بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے، جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ یہ مقررہ فدیہ بطور تاوان جنگ ادا کر دیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے، اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے، ایسے لوگوں کے لیے یہ تاوان مقرر کیا گیا تھا، کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔[5] غلاموں میں، اگرچہ متعدد لکھے پڑھے نظر آتے ہیں مگر یہاں عامر بن فہیرہ کی مثال کافی ہوگی جو حضرت ابوبکر کے غلام تھے، اور ہجرت میں آنحضرت کے ہمرکاب تھے۔ دوران ہجرت میں سراقہ کو جو تحریر دی گئی وہ انہیں کے قلم کی تھی۔[6] خواتین میں بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں، خاص طور پر حضرت عمر کی بہن فاطمہ بنت خطاب کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جو حضرت عمر کے اسلام لانے کا باعث بنی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حضرت عمر ان کے گھر پہنچے تو فاطمہ سورۂ طٰہٰ کی پ

---

[1] ...... قالوا كانت ظلمة التي يضرب بها المثل في قيادة صبية في الكتّاب فكانت تضرب دوى الصبيان واقلام هم ... عيون الاخبار ابن قتيبة الدينوري ۲/۱۰۳،۱۰۲ [2] ابن الاثیر نے بڑی تفصیل سے ابوحارثہ کے علم و فضل کو سراہا ہے، اور آخر میں یہ الفاظ لکھے ہیں وصاحب مدارسهم" ابن ہشام ۲/۲۲۲ - [3] ابن حبیب / ۴۷۵ - [4] قرطاس کے لیے دیکھیے قرآن، اور "رق" کے لیے،

یہ بچیاں نہیں، اور معلم سے درس قرآن جاری تھا[۱]۔ حضرت حفصہ کو شفا بنت عبداللہ نے جو پڑھی لکھی تھیں، لکھنے پڑھنے کی تعلیم دی تھی[۲]۔ اس واقعہ سے استانیوں کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں ابتدائی تعلیم کی عمر اگرچہ بچپن کا زمانہ تھا[۳]، اور بالعموم چھوٹی عمر کے بچے مدارس یا مکاتب میں اساتذہ کے حوالے کیے جاتے، لیکن حیرت ہے کہ اسی زمانے میں تعلیم بالغان (Adult Education) اور مدارس شبینہ (Night School) کا تصور بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصحاب صفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دن بھر کام کرتے اور رات کو جب واپس آتے تو معلموں سے لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم حاصل کرتے[۴]۔

مدینے میں دستور تھا کہ ضروری تعلیم کے ساتھ فنون سپہ گری بھی سکھائے جاتے۔ چنانچہ ان کے یہاں صرف اس شخص کو "کامل" کہا جاتا تھا، جو لکھنے پڑھنے کے ساتھ تیر اندازی اور تیراکی بھی جانتا ہو۔ ظہور اسلام کے وقت یہ "سند کاملیت" کئی لوگوں کے پاس موجود تھی، مثلاً سعد بن عبادہؓ، اسید بن حضیرؓ، عبداللہ بن ابی، اوس بن خولیؓ، سوید بن صامت وغیرہ[۵]۔

امدادی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد رسالت میں لین دین کے تمسکات اور بیع وشری کی دستاویزیں بھی لکھی جاتیں، چنانچہ حضرت ابو طالب کا ایک تمسک تحریری زمانہ تک محفوظ رہا۔ ابن ندیم نے بھی دیکھا تھا[۶]۔ خود قرآن مجید میں بھی اس قسم کے تمسکات کو لکھ لینے کا حکم موجود ہے، جس پر دو گواہیاں ضروری ہیں[۷]۔ اس حکم سے نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ عہد رسالت میں ان کی کتابت میں کوئی خاص دشواری نہ تھی۔ بلکہ لکھے پڑھے لوگ ہر جگہ مل جاتے۔ کاروبار میں ہنڈیوں اور چیکوں کا رواج تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ حساب کی تعلیم کا رواج بھی عام معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو جو قانون وراثت دیا گیا، وہ از اول تا آخر کسری حسابات پر مشتمل ہے جو حسابات آسان نہیں، اور بعد میں مناسخہ کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کو آج بھی ایک اعلیٰ حساب داں حل کر سکتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے قبل اعلیٰ حسابی قابلیت رکھنے والے لوگ موجود تھے، ورنہ یہ قانون اس زمانہ میں ناقابل عمل ثابت ہوتا۔

ان واقعاتی شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ظاہر ہے کہ عہد رسالت کے سماج کو جاہل یا ان پڑھ تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایک اچھا خاصا تعلیم یافتہ معاشرہ معلوم ہوتا ہے، جس کی تمام ترضروریات میں تعلیم کو پورا پورا دخل حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سے ایسے امور جو ایک ناخواندہ سماج میں محض زبانی طور پر تکمیل کو پہنچ سکتے تھے، تحریری صورت میں نظر آتے ہیں، مثلاً:۔

(۱) قریش نے جب بنی ہاشم کا سوشل بائیکاٹ (SOCIAL BYCOTT) کیا تو ایک ناخواندہ بستی میں اس کو زبانی طے کرنا کافی تھا، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک صحیفہ لکھا گیا اور اعلان عام کے لیے دیوار کعبہ پر لٹکا دیا گیا[۹]۔

(۲) ہجرت کے بعد جب قریش اور اہل مدینہ میں ان بن ہوگئی تو نہ صرف اظہار ناپسندیدگی کے طور پر بلکہ مسلمانوں کو مدینے سے نکال دینے کے لیے ایک تحریری الٹی میٹم ( ) بھیجا گیا[۱۰]، حالانکہ یہ کام بھی ایک معمولی سفارت کے ذریعے زبانی ممکن تھا۔

(۳) آنحضرت جب مدینے تشریف لے گئے اور مدینے کے سربرآوردہ قبائل نے اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیا، تو نئی حکومت کی طرف سے ایک دستور نافذ کیا گیا جو تحریری صورت میں تھا[۱۱]۔ عام حالتوں میں اس تحریری منشور کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی، اور صرف زبانی اعلان کافی تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ یہ تحریری دستور اس عہد کی پہلی مثال معلوم ہوتی ہے۔

(۴) قریش سے آویزش کے بعد اہل مدینہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایام حج میں اپنی زرعی پیداوار کو مکے لاکر فروخت کریں، اور یہاں سے حسب دستور صنعتی ضروریات حاصل کر سکیں، اس بناپر رابغ اور ینبوع کی بندرگاہوں سے تعلقات استوار کرنا ناگزیر تھا۔ جس کے راستے میں ضمرہ، جہینہ، اسلم اور غفار وغیرہ کی بستیاں پڑتی تھیں، اس بناپر ان قبائل سے معاہدے ضروری تھے، یہ معاہدے سب کے سب تحریری تھے حالانکہ ان قبائل کے اکابر سے جملہ معاملات زبانی طے ہو سکتے تھے۔

(۵) آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے شاید کسی بھی ایک کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ اس کے جملہ ممبروں کے نام باقاعدہ درج رجسٹر کیے جائیں، مگر تاریخ

۱۔ Muir-lip p ۲۔ ابوداؤد کتاب الطب باب الرقی نیز دیکھیے فتوح البلدان/۳، ۴۔ ۳۔ جامع بیان العلم/ ۴۰

۴۔ مسند ۳/ ۱۳۷، اسد الغابہ لابن اثیر ۳/ ۱۷۵، استیعاب ۲/ ۳۹۳ ۔ ۵۔ ابن ہشام / ۶۔ ابن ندیم فہرست / ۸

بتاتی ہے کہ عہد رسالت میں ایسے رجسٹر موجود تھے، اور ایک بار جب یہ مردم شماری ہوئی تو پندرہ سو لوگوں کے نام درج کیے گئے۔[1]

(۶) معمولی جنگی ہدایات اور احکام کے لیے تحریرات کی کوئی ضرورت نہیں، معلوم ہوتی، مگر نخلہ کو روانگی کے وقت عبداللہ بن جحشؓ کو جو ہدایت نامہ دیا گیا تھا وہ تحریری تھا۔[2]

(۷) محاذ جنگ پر جانے والے سپاہیوں کی فہرست سازی اور تحریری نامزدگی ایک جاہل معاشرہ میں بالکل ناممکن ہے، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فوج جب کہیں روانہ ہوتی، تو اس کے افراد کو پہلے سے نامزد کر دیا جاتا۔ اور ان کے نام باقاعدہ لکھ لیے جاتے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک بار آنحضرتؐ کے پاس ایک سپاہی آیا اور اس نے عرض کیا کہ میرا نام فلاں فلاں غزووں کے لیے لکھ لیا گیا ہے، مگر میری بیوی حج کو جانا چاہتی ہے، تو آپؐ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور حج کی اجازت دیدی۔[3]

(۸) فوجی کارروائیوں کے سلسلہ میں خفیہ اطلاعات زبانی بھی ممکن تھیں لیکن جنگ بدر کے لیے جب قریش نکلے تو حضرت عباسؓ نے اس کی اطلاع تحریری بھیجی تھی، اسی طرح جب مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے، تو ایک مسلمان ہی نے اس کی خفیہ اطلاع قریش کو کرنا چاہی لیکن یہ تحریر پکڑ لی گئی۔[5]

(۹) تقسیم غنائم اور عطیات کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو ایک ان پڑھ سماج میں تحریری صورت میں لایا جا سکتا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں مال غنیمت کی جب تقسیم ہوتی تو بذریعہ تحریر ہوتی۔ چنانچہ خیبر کے اموال کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جن کی تحریر مرتب ہونے کا ثبوت موجود ہے۔[6]

(۱۰) اس سلسلے میں آخری بات مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر واقعی عہد رسالت کا معاشرہ ان پڑھ ہوتا، تو خود قرآن مجید کی کتابت اتنے شروع زمانے سے بالکل ناممکن تھی۔

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مثالیں کتب سیرۃ و احادیث میں موجود ہیں جن سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت، پورا ماحول مائل بہ تعلیم ہو چکا تھا جس کو اسلام نے اور فروغ دیا، نئے نئے مدارس و مکاتب کھولے، اساتذہ اور معلمین میں قابل ترین لوگوں کا انتخاب کیا گیا، تعلیم بالغان کو فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدارس شبینہ کا اہتمام کیا گیا، جن کے نصاب میں لکھنے پڑھنے کے ساتھ دینی تعلیم کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا، اس بنا پر یہ بات خارج از امکان نہیں کہ غزوات و سرایا کی ان تفصیلات کا اصل ماخذ کچھ ایسی دستاویزیں ہوں جو عہد غزوات میں مرتب ہوئی تھیں، اور ان کو ابتدائی سیرۃ نگاروں یا ان کے راویوں نے بچشم خود دیکھا تھا۔ ان مثالوں سے صرف یہی نتائج نہیں نکلتے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد جیسے اسلامی ریاست کی تشکیل ہوئی، اور مسلمان سیاسیات میں داخل ہوئے، تو ان کی تنظیم، اور ریاستی نظم و انصرام کیلئے ایک دفتری نظام بھی وجود میں آیا۔ اس نظام کو خواہ کتنا ہی ابتدائی نوعیت کا تصور کیا جائے لیکن بہر صورت اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے، کہ تاسیس ریاست کے بعد جو دستور مدینے میں رائج کیا گیا تھا (دیکھیے مثال ۳) یا ان معاہدات کی اصل کا بیان جن کی ابتدا ۲ھ ہی سے ہو گئی تھی (دیکھیے مثال ۴) محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اسی طرح یہ امر بھی قرین قیاس نہیں کہ وہ چھوٹے بڑے رجسٹر جو غزوات و سرایا کے ذیل میں یا اسلامی تنظیم کی غرض سے مرتب ہوتے رہے تھے (دیکھیے مثال ۵، ۷) فوراً ہی ضائع کر دیئے جاتے ہوں۔ مثال نمبر ۵ میں جس رجسٹر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافی ضخیم معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ڈیڑھ ہزار افراد کی اسم نویسی کے لیے سیکڑوں صفحے درکار ہیں۔ اس رجسٹر کی ابتدائی غرض، اندازہ قوت، تحصیل زکوٰۃ، اور انتخاب عساکر کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں غزوۂ سرایا کے ذیل میں جو نامزدگیاں ہوتی تھیں (دیکھیے مثال ۷) تو فوجیوں کے نام (باقی صفحہ ۲۱ پر)

---

[1] دیکھیے بخاری باب عن حذیفۃ قال قال النبیؐ اکتبوا الی من یلفظ بالاسلام من الناس فکتبنا لہ الفا وخمسمائۃ رجل بخاری ۱/۴۳۰ ـــ [2] طبری ۲/۲۶۴ ـــ [3] دیکھیے بخاری ۱/۴۳۰ عن ابن عباس قال رجل الی النبیؐ، فقال یا رسول اللہ انی کتبت فی غزوۃ کذا وکذا وامراتی حاجۃ قال ارجع فحج مع امراتک (بخاری)

[4] [5] ابن ہشام ۴/۴۱ طبری ۳/۱۱۳ [6]

فنِ داستان نگاری اور باغ و بہار

سید ابوالخیر کشفی

"غزل" اور "داستان" یہی وہ دو اصنافِ ادب ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ادب کو عالمی ادب کے مقابلے میں ٹھگنا اور پستہ قد محسوس نہیں کر سکتے۔

داستان گوئی اور داستان سرائی ہمارے بزرگوں کے لیے محض ادبی صنف نہیں تھی بلکہ اُن کے اندازِ زیست کا ایک جز تھی۔ داستانوں کی مختلف تہیں ہماری صدیوں کی زندگی اور کلچر کی مختلف سطحوں کی امین رہی ہیں۔ داستانوں میں شعر گوئی کے اس ذوق کی تسکین کا سامان بھی تھا جو جنم جنم سے انسان کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ اور داستانوں میں حقیقتوں کو سمجھنے اور بہ اندازِ دگر ان کے اظہار کا سامان بھی تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر داستانیں ذوق بخشی و نشاط انگیزی کا وسیلہ تھیں۔ ذوق بخشی کے بغیر تہذیبِ انسانی کا تصور محال ہے اور نشاط انگیزی توفیقِ آدم ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

"ہر چند خرد مند بیدار مغز تواریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے۔ لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے۔"

یہ ذوق بخشی و نشاط انگیزی افیون نہ تھی بلکہ خرد مندی اور بیدار مغزی کی دلیل تھی۔ وہ خرد مندی اور بیدار مغزی جس میں انسان کے کتنے ہی خواب اور ان کی تعبیروں کی تلاش مضمر تھی۔

داستانوں کے مطلع سے ہمارے تخیل اور تصور کا سورج ہی طلوع نہ ہوا۔ بلکہ ہماری داستانیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان داستان نگاروں میں خواب دیکھنے کی کیسی غیر معمولی سکت تھی۔ وہ سکت جس کے فقدان نے ہمارے جدید ادب کے بہت بڑے حصہ کو قانونی دستاویزوں کی طرح بے رنگ بنا رکھا ہے اور داستان نگاروں کے خواب کو عہدِ حاضر کی تسخیری قوت نے حقیقت میں بدل دیا ہے۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے سینے سے فلک خراش عمارتیں ابھر آتی ہیں طلسمی قالینوں نے جیٹ ہوائی جہازوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور چاند کی بڑھیا ابنِ آدم کے انتظار میں ہے۔

داستانوں میں ہمیں مشرق اور برصغیر کی خارجی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کا ذہن اور اس کی پیچیدگیاں بھی نظر آتی ہیں۔ داستانوں کی علامتوں میں زندگی کی حقیقتیں بڑی کلبلاتی ہیں۔ ان داستانوں نے "عالمِ مخلوقات" سے ہمارا رشتہ استوار کیا ہے۔ ان داستانوں سے زندگی کی محرومیوں کی تلافی کی صورت نکلتی ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ داستانیں نیند لانے کا نسخہ بھی تھیں اور عرفانِ کائنات کا وسیلہ بھی۔

میری ناچیز رائے میں داستانیں ہمارے معاشرے اور سوسائٹی سے ادب کے رشتے کی سب سے مضبوط کڑی کا درجہ رکھتی تھیں۔ داستان نگاری بعد میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے داستان سرائی کے سہارے انجمن آرائی ہوتی تھی۔ اور شاید ہمارے ادب میں ڈرامے کے فقدان کا ایک سبب داستان کی مقبولیت بھی تھی۔ داستان سرا کی ذات اپنی جگہ خود ایک اسٹیج، پردوں اور اداکاروں کے مجموعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کبھی وہ اپنی چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی حرکات سے ہمیں میدانِ رزم میں پہنچا دیتا اور کبھی پریوں کے دیس میں۔ اب اس کی جگہ سینما (اور ترقی یافتہ ممالک میں اسٹیج) نے لے لی ہے۔ لیکن ہمارا تصور آج بھی کسی داستان سرا کو تلاش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ داستان سرائی دلی میں میر باقر علی داستان گو کے ساتھ مر گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ فن آج بھی اُن علاقوں میں زندہ ہے جہاں خاندان اب بھی بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں آج بھی نانی اماں کے پوپلے منہ سے ہر رات کہانی شروع ہوتی ہے "ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ"...... اور یہ کہانی ختم ہونے کو نہیں آتی اور سننے والے جوان ہو کر کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں۔ کالجوں میں پڑھانے لگتے ہیں۔ سیاہ لباس پہن کر کچہریوں میں "مائی لارڈ" کو مخاطب کرنے لگتے ہیں۔

میں نے اپنے لڑکپن میں داستان سرائی کی محفلیں دیکھی ہیں۔ نظیر آباد لکھنؤ میں ایک چائے خانہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ چائے والا چائے میں پوست

انھیں ان ملا دیتا ہے خدا جانے یہ بات سچ تھی یا جھوٹ۔ مگر یہ بات ضرور سچ تھی کہ جو ایک بار وہاں چائے پی لیتا۔ اس کے قدم بار بار اس چائے خانے کی طرف اٹھتے تھے۔ اور اسی چائے خانے میں چند آدمیوں کے درمیان۔ ایک آدمی دو تین موٹی موٹی کتابیں لیے بیٹھا رہتا۔ اور داستان سناتا رہتا۔ میں نے اسے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ کتاب کا مقصد شاید توجہ کو مرکوز رکھنا تھا۔ اور اس محفل کا یہ عالم ہوتا تھا۔ جیسے ہوش و گمان دونوں اس دنیا سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ وہاں حقیقتوں کے پیمانے بدل جاتے۔ جب امیر حمزہ صاحبقراں کسی طلسمی قید میں پھنستے تو تمام حاضرین محفل ہاتھ اٹھا کر ان کی رہائی کے لیے خلوص دل سے دعا مانگتے اور جب اسم اعظم کی تاثیر سے امیر حمزہ طلسم کو درہم برہم کر دیتے تو نگاہوں میں چمک آجاتی۔ سننے والوں میں سے کوئی اٹھتا قریب کی دکان سے مٹھائی لاتا اور سب میں تقسیم کی جاتی۔ یہ جلیبیاں کبھی کبھی ہمارے حصے میں بھی آجاتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان جلیبیوں کی مٹھاس نے میرے لیے ادب میں نشاط انگیزی پیدا کر دی۔ اسے فیضان کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کروں؟

پتہ نہیں میں اپنے لڑکپن کی باتیں آپ سے کیوں کرنے لگا۔ شاید یہ بھی داستانوں کا اثر ہے جہاں "افسانہ از افسانہ می خیزد" ـــــ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آج جن داستانوں کے متعلق ہمارے بہت سے نقاد یہ کہتے ہیں کہ ان کا ماحول غیر فطری ہے ان کے کردار عجیب ہیں۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر ہیں یہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں .... آج سے کچھ پہلے انہیں داستانوں میں سننے اور پڑھنے والوں کے لیے حکمت بھی تھی اور بصیرت بھی، ذوق جستجو بھی اور نشاط انگیزی بھی۔ ماہ و سال کی کروٹوں نے ہمیں دوبارہ اسی منزل سے قریب کر دیا ہے اور اب ہم زیادہ گہرے شعور کے ساتھ داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارا کافر ذہن ان پیمانوں سے داستانوں کو ناپنا چاہتا ہے۔ جو داستانوں کے لیے وضع ہی نہیں کیے گئے۔ مغرب کی روشنی میں آپ ناول افسانہ اور جدید نظم کا مطالعہ شوق سے کیجیے لیکن اس مانگے ہوئے اجالے کی مدد سے اگر آپ داستانوں کے خط و خال کو دیکھنا چاہیں گے تو ہر راہ تاریک ہو جائے گی اور کوئی جگنو بھی آپ کی رہنمائی نہ کرے گا پھر اس چشمۂ ظلمات سے شاید آپ لوٹ بھی نہ سکیں۔ اور اگر لوٹ بھی آئے تو آپ کی آنکھیں اپنے تہذیبی ماضی کو کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

ادب کو زندگی کی تعبیر و تفسیر اتنی بار کہا گیا ہے کہ اب اس جملے کو لکھتے یا بولتے وقت ابکائی سی آنے لگتی ہے۔ ادب صرف حقیقت (مروجہ اصطلاح میں) نہیں بلکہ خواب بھی ہے۔ اور خواب بھی تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ داستان اپنا عالم آپ ہے۔ اسی لیے اس کے ماحول کو غیر فطری اور اس کے کرداروں کو عجیب کہنے والے سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

ع　　سخن شناس نہ دلبرا! خطا اینجا ست

اور داستان سرائی کے بارے میں مرزا غالب یہ فیصلہ پہلے ہی دے چکے ہیں کہ "داستان سرائی منجملۂ فنونِ سخن ہے"۔ آپ میں اگر ہمت ہو تو غالب کے اس فیصلے کو نہ مانیے۔

مگر ع　　یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

تخیل داستان کی بنیاد ہے۔ اسی لیے داستان کی دنیا مثالی دنیا ہوتی ہے۔ جسے مناسب لفظ کی تلاش کے بغیر یاروں نے "عجیب" کا نام دے دیا ہے۔ بعض بڑے فن پاروں کی دنیا بھی تخیلی دنیا ہے۔ مگر تخیل کی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے اندازِ نظر کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور پھر اس دنیا کی ہر چیز حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر شکسپیر کے ڈرامے "خوابِ شبِ نیم گرما" کو پیش کیا جا سکتا ہے ادب کی اس سے بڑی قوت اور کیا ہو گی کہ وہ ہمیں نئی دنیاؤں میں پہنچا دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ دنیا مثالی ہے تو جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالی دنیا داستانوں میں نہ ہو گی تو کیا ہمارے اس ذلیل معاشرے میں ہو گی؟ ـــ داستانوں میں ہمیشہ خیر کی فتح ہوتی ہے۔ حسن ابدی ہوتا ہے۔ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ "پھول عورت بن جاتا ہے اور عورت پھول" ۔ یہ فریب سہی، مگر یہ فریب بھی کتنا سچا ہے۔ یہ فریب ہمیں انسانیت کے تصور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اور رہا حسن ...... آپ جانتے ہی ہیں کہ کبھی یہ لالہ و گل بن جاتا ہے۔ کبھی خندۂ برق و شرر .... عورت ہو یا زندگی یا حقیقت .... ان نغموں کو قالب بدلنے میں بلکہ

حاصل ہے .... اور ع عاشق ہو تو معشوق کو ہر رنگ میں پہچان

اس بات کو جاننے کے بعد کہ داستان اپنی دنیا آپ ہے، یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔ یہ "احساسِ تناسب" ہمارے ذہن میں ہمارے ادبی اصناف کی تنقید نے پیدا کیا ہے اور یہ اصطلاح اتنی مختصر ہے کہ داستانوں کے جسم پر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ داستانوں میں اُلو، طوطے اور گیدڑ کی باتیں تو ہم پڑھ لیتے ہیں۔ مگر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اُلو فلسفی بھی ہے اور ہمارے اس وجود کا غماز بھی جو خواب دیکھتا ہے .... جو طرزِ تپاک اہلِ دنیا سے جل کر وہاں جانے کی تمنا کرتا ہے "جہاں کوئی نہ ہو"۔ "طوطا" ناصح بھی ہے اور مرشد بھی۔ جو کبھی ہیرو کو شہزادی سے ملا دیتا ہے۔ اور کبھی حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے۔ گیدڑ کے بارے میں اس دور میں کیا عرض کروں .... یوں سمجھیے کہ یہ جانور اور یہ علامتیں رموزِ مملکت کو بھی بے نقاب کرتی ہیں اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو بھی۔

عدیم المثال کرداروں اور غیر معمولی چیزوں مثلاً چراغ الہ دین وغیرہ کے بارے میں چند اشارے پہلے کیے جا چکے ہیں۔ ایک بات اور کہتا چلوں (کچھ باتیں آگے آئیں گی) وہ یہ ہے کہ ایسے تصورات اس عہد سے مخصوص ہوتے ہیں جب آدمی لڑکپن سے گزر کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس دور میں جاگتے کے خواب " دیکھتا ہے۔ کیا کبھی آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا نہیں ہوئی کہ اگر آپ کے پاس کوئی طلسمی انگوٹھی ہوتی تو آپ اس کی قوت سے بہت بڑے "ہاؤلر" بن جاتے ہیں اور پھر ہندوستان انگلستان کی ٹیم کو عبرت ناک شکست دیتا۔ یا چراغ الہ دین کی مدد سے ایفل ٹاور فرانس سے اٹھا کر اپنے دیس لے آیا جاتا۔ یہی حال تہذیبوں کا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کو تہذیبوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ کہہ لیجیے۔ ہماری داستانیں قرونِ وسطیٰ کی یادگاریں ہیں۔ اور دنیا کے ہر ادب کے قرونِ وسطیٰ کے کارناموں میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا "باغ و بہار" سے کیا تعلق ہے ؟ میں نے اس کا جواب سوچ لیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے یہ باتیں کہنی ہی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ باغ و بہار بھی ایک داستان ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں داستانوں کی تفہیم کے مرحلے سے گزرنا ہی ہوگا۔ ویسے اس بات پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ہم خلاؤں کو فتح کر رہے ہیں اور دوسری طرف داستانوں کی دنیا کو اپنے لیے اجنبی پاتے ہیں۔ حسرت کی طبیعت ہی "طرفہ تماشا" نہ تھی ہماری طبیعت بھی طرفہ تماشا ہے۔ باغ و بہار میں داستان گوئی و داستان نگاری کے فن کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مگر درمیان میں "میر امن" کی ذات بھی ہے۔ ہر خصوصیت اسی "فلٹر" سے گزر کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اسی لیے باغ و بہار ہماری داستانوں کی روایت کا حصہ بھی ہے۔ اور ان سے مختلف بھی۔

اردو کی اولین داستانوں میں تمثیلی رنگ غالب ہے۔ انھیں مثالیہ قصّے کہنا مناسب ہوگا۔ ایسے قصّوں کی نمائندگی کے لیے "سب رس" موزوں رہے گی یہ انداز مشرقی داستانوں کا ایک مخصوص انداز ہے۔ مگر باغ و بہار یا بعد کی داستانوں میں اولیت مثالیہ یا تمثیلی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ قصّے کو حاصل ہے اسی لیے باغ و بہار کے چاروں درویشوں کی سیر محض روحانی تجربے کا اظہار نہیں ہے، جیسا کہ ایک مادہ پرست نقاد نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ارضی کہانیاں ہیں۔ روح اس سرزمین پر بھی ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ اس لیے ان کہانیوں میں روحانی تجربوں کی جھلک بھی ہے۔ مگر اولیت قصے ہی کو حاصل ہے۔ باغ و بہار میں "باطنی حقیقت" کا اظہار تو ہے۔ مگر یہ باطنی حقیقت "مقصود بالذّات" نہیں ہے۔

"تلاش و جستجو" "سب رس" میں بھی ہے اور "باغ و بہار" میں بھی۔ سب رس میں تلاش ابدی حقیقتوں کی ہے اور "باغ و بہار" میں "شہزادیاں" اور گمشدہ محبوبائیں گوشت پوست بھی رکھتی ہیں ـــ یہ الگ بات ہے کہ ان کی پیش کش پر روحانی تجربے کا گمان بھی گزرتا ہے۔ "تلاش و جستجو کے یہ افسانے صرف ہماری زبان تک محدود نہیں بلکہ ان کا عالمگیر سلسلہ ہندوستان اور ایران سے لے کر "آئرستان" تک پھیلا ہوا تھا۔" سب رس کے سلسلے میں افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھا ہے۔

" یہ سلسلہ تلاش و تجسس کے افسانوں کا سلسلہ ہے۔ کبھی یہ تلاش کسی پھول کی ہوتی ہے۔ جو پھول بھی ہے اور دنیا کی حسین ترین عورت بھی .... اس پھول کی تلاش رازِ حیات کی تلاش ہے اور یہ گل و بلبل کے قصوں سے زیادہ پرانی ہے۔ کبھی تلاش کے قصّوں میں ہیرو کا مقصود کوئی ظرفِ مقدس یا نایاب ہیرا ہوتا ہے۔ جو اعلیٰ ترین شوکت و شانِ شاہانہ کا رمز ہے .... تلاش کے قصوں کا تیسرا گروہ وہ ہے جس میں "چشمۂ آبِ حیات" کی تلاش ہے .... مگر در اصل یہ تینوں گروہ ایک ہیں

بگاؤلی پھول بھی ہے۔ چشمہ بھی اور عورت بھی ۔"　　(ترقی پسند ادب صفحہ ۲۳ تا ۲۲۲)

ایسی تمام داستانوں میں ہمیں "دورانِ محض" سے واسطہ پڑتا ہے " زماں " وقت سے نہیں ۔ " مکان " کے سلسلے میں مشکل یہ آپڑتی ہے کہ تلاش کے عمل کے لیے " مکان " ضروری ہے۔ " باغ و بہار " میں دورانِ محض نہیں بلکہ وقت ہے۔ اسی لیے میں اس داستان کو محض روحانی تجربہ نہیں سمجھتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مثالیہ قصوں میں تلاش کے عمل سے " مکان " اور " اشکال " وابستہ ہیں۔ مگر باغ و بہار میں " وقت " ہے۔ اور اسی لیے اس میں " اشکال " نہیں بلکہ " کردار " ہیں۔ وقت اور اس کے تقاضوں کے مطابق یہ بدلتے ہوئے کردار اس بات کا ثبوت ہیں کہ باغ و بہار محض مثالیہ قصہ نہیں ہے ۔

" باغ و بہار " کے کردار متحرک ہیں اور ہماری آپ کی طرح زندہ۔ پہلی کہانی کا درویش بھلا آدمی تھا مگر " آدمی کا شیطان آدمی ہے " ہر وقت کے کہنے سننے سے اس کا " مزاج بہک " گیا۔ اور اگر اس کا مزاج نہ بہکتا اور وہ " آدمیت " کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا تو کہانی آگے نہ بڑھتی ۔ اسے سفر سے واسطہ نہ پڑتا۔ اور نہ بھی اپنے باپ " خواجہ احمد " کی طرح یمن کا " ملک التجار " بنکر چین کی بانسری بجاتا اور گھوڑے بیچ کر سوتا ۔

میرامن کے فسانے میں صرف شہزادے ۔ شہزادیاں ۔ بادشاہ ۔ وزیر اور امراء نہیں ہیں ۔ ان کے کرداروں میں سوداگر ۔ عام آدمی اور کنیاں بھی ہیں (آپ کا دل چاہے تو انھیں " صوفیانہ " شکلیں اور معنی دیدیں) دوسرے ۔ تیسرے اور چوتھے درویش شہزادے ہیں۔ مگر پہلا درویش جس کی سیر میں سب سے زیادہ تکمیل موجود ہے ۔ وہ سوداگر اور خواجہ زادہ ہی ہے۔ خواجہ ۔ سگ پرست کی کہانی میں انسانی فطرت کے کئی پہلو موجود ہیں ۔ بہزاد خاں کی شجاعت ۔ تیسرے درویش کی کہانی میں کٹنی کی مکاری ۔ اور پہلے درویش کی " بہن کی مامتا " اور جذبے کی گہرائی ہمارے ذہن پر گہرے نقش چھوڑجاتی ہے ۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ باغ و بہار کے بہترین عناصر پہ شہزادوں اور شہزادیوں کی حکمرانی نہیں بلکہ عام آدمی کا پھریرا لہراتا ہے ۔

آدمی اور زمین سے میرامن کی بے پایاں محبت نے باغ و بہار کو اردو کی دوسری داستانوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے ۔ باغ و بہار داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہے اور ایسا دریچہ بھی جس سے پہلی بار ہم آدمی کے دل میں جھانکتے ہیں ۔ باغ و بہار میں بھی مافوق الفطرت عناصر ہیں ۔ مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے قصوں کی " ارتقی " ہے ۔ مگر بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے لیے میرامن کو " ملک شہپال " کا سہارا لینا پڑا ۔ جن اور پری اس کہانی کی بنیاد نہیں ہیں ۔ ان کا سایہ بہت دور سے باغ و بہار پر پڑا ہوا نظر آتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولیے کہ باغ و بہار ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو قرون وسطیٰ کا ذہن رکھتا تھا اسی لئے مافوق الفطرت عناصر سے نہ بھاگ سکتا تھا جنوں اور پریوں کا ذکر اور مافوق الفطرت عناصر تو عہد وسطیٰ کے ادب کی خصوصیات ہیں اور میرامن بھی اسی دور کے آدمی ہیں ۔ ان کے دور کا عام آدمی ان عناصر پر ذہنی طور پر اعتقاد رکھتا تھا آج بھی آپ کی نانی جان یا دادی جان (اگر وہ زندہ ہوں تو خدا ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے) ان باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں ۔ بچہ مضمحل ہوتا ہے تو اسے نظر بد سے تعبیر کرتی ہیں ۔ محلے کی کسی کنواری لڑکی پر " ہسٹریا " کے دورے پڑتے ہیں تو " عامل " کو بلانے پر اصرار کرتی ہیں ۔ میرامن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی دیر تک انسانی زندگی سے دور نہیں رہتے وہ " دیدۂ دل " کے ساتھ اس عہد کی زندگی اور اس کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ اسی لیے " باغ و بہار " میں ان کے عہد کا معاشرہ اور زندگی سمٹ کر آگئی ہے ۔ (نہ جانے یہ کس کا کمال ہے ۔ میرامن کا ۔ یا فارسی قصہ چہار درویش کے نامعلوم مصنف کا)

" باغ و بہار " قصہ گوئی کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے جو قدرت نے میرامن کو ودیعت کی تھی ۔ " باغ و بہار " میں " بوستان خیال " اور " طلسم ہوشربا " کی سی وسعت اور طلسم بندی تو نہیں ہے لیکن میرامن کہانیوں کا سلسلہ یوں ملاتے ہیں کہ پڑھنے والا کہانیوں کی فضا میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور کہی کہانی کہنے کا فن ہے ۔ داستان کا ایک اہم عنصر دلچسپی ہے) ان کی کہانیوں کی رفتار میں حرکت بھی ہے اور توازن بھی " باغ و بہار " پر جدید نقادوں کا یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ " داستانوں میں احساس تناسب نہیں ہے " ان کی کہانیوں میں بعض پراسرار واقعات بھی ہیں جو شروع میں بمشکل قابل فہم معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے ۔ گرہیں کھلتی جاتی ہیں ۔ اور واقعات سمجھ میں آنے لگتے ہیں ۔ مثلاً پہلے درویش کی کہانی میں شہزادی کا عجیب و غریب رویہ ۔ ان کہانیوں میں " ارضیت " صرف کہانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں میرامن کے اسلوب کا بھی دخل ہے ۔

میرامن کے یہاں رکاوٹ اور ٹھہراؤ نہیں ۔ نہ اسلوب میں ۔ نہ کرداروں میں ۔ رجب علی بیگ سرور کے کردار بڑی حد تک بے جان ہیں اس کے برعکس میرامن کے کرداروں میں ہمیں زندگی ملتی ہے اور تند و تیز انسانی جذبات بھی ۔ یہاں " اسم اعظم " بھی جنسی جذبہ " کو مغلوب نہیں کرسکتا ۔ پہلے درویش کی
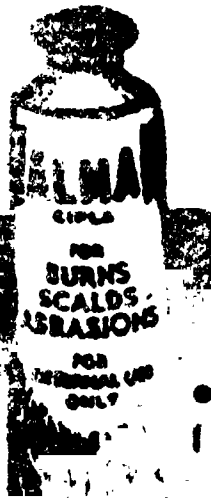
سیر میں شہزادی کی نفرت کتنی انسانی اور کتنی شدید ہے۔ یہ نفرت اس "بے وفا" اور اس "بدوڑ" کے خون سے بھی اپنی پیاس نہیں بجھا سکتی اور درویش سے دوری کی تہہ میں ان "دونوں" کی نفرت ہے۔ آخر اس نے اپنے آپ کو ان کا شریک محفل اور شریک جام کیوں بنایا؟

میرامن کے کردار تخیلی یا ان کے "ہمزلو" نہیں ہیں۔ وہ اپنی شخصیت رکھتے ہیں اور داستان گو کو جہاں چاہتے ہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ داستان گو مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ کرداروں کے ساتھ سیر کرنے پر مجبور ہے مگر اپنے "بیانیہ" میں وہ اپنی مختاری کا اظہار کرتا ہے مشرق بیطلی کے ایک دیس میں اسے جون پور کا پلیا دآتا ہے۔ بصرے کی شہزادی سے وہ ہندی کے دوہے پڑھوا دیتا ہے۔ کسی تبکدے میں وہ لات و منات کو بٹھا دیتا ہے۔ (اس اعتبار سے میرامن اور انیس کے درمیان مجھے ہمیشہ مشابہت کا احساس ہوا ہے۔)

توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ

سید مبارز الدین رفعت

نذیر احمد نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ کس طرح شروع کیا، اس کی داستان بہت دلچسپ ہے محض حسن اتفاق سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور ایسے مبارک وقت اس کا آغاز ہوا کہ اس سے نذیر احمد کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اور اردو زبان کو ایک ایسا عظیم المرتبت مصنف ہاتھ آیا جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

یہ حسن اتفاق کیسے پیش آیا، اس کی تفصیل خود مولانا نے اپنے ایک لکچر میں بڑے دل چسپ اور ڈرامائی انداز میں بیان کی ہے اور انھیں کی زبانی سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں:

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈا، تلاش کیا، لیکن پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھائی شروع کی نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار یا پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی، وہ آدھے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ ورق کے لیے مستعجل تھا جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں کتابوں کا پہلا گمان پورا ہوا۔"

"اتنے میں کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر، ورتی کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر ٹانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا۔ صاحب کو دیکھ کر ٹانگن پر سے اتر کر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو!

بشیر: چند پند

صاحب: یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔

بشیر: یہ کتاب میرے والد نے میرے لئے بنا دی ہے۔

صاحب: کتاب کا مضمون کیا ہے؟

بشیر: بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔

صاحب: مجھ کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

بشیر: میں ابھی جا کر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ تالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔

(تھوڑی دیر سے لوٹ کر)

میں آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔

صاحب: ضرور سب لاؤ۔

"بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا۔"

"شام کو میں جو کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا کیا

موزوں نکلتا ہے۔ میں تم سب کو ان سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔"

"اگلے دن میں جو کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شاید ان کتابوں کو دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی پہنچا دو۔ یہاں میرے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اجیر تھے خوش خط۔ اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آگئے۔ چلتی ہوئی جلدیں بنا کر، صاحب تو پرسوں تک کو کہہ گئے تھے، میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ یہ اپنے طرز معقول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہزار روپے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کر دوں گا۔ وہی سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی گھڑی ٹائم پیس میرا نام کندہ کرا کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب اور اپنے ریویو کو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔

"وہ جو کہتے ہیں کہ مزد و خوش دل کارِ بیش کند، میں نے بھی تصنیف کا ڈربہ کھول دیا اور اب بھی کھلا ہی سا ہے۔ ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پٹے بکھیڑ دیئے ہیں، بند نہیں کیئے۔"[1]

یہ ۱۸۶۹ء کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے مولانا الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر فائز تھے۔ محض ایک حسن اتفاق سے ان کی رسائی سر ولیم میور تک ہو گئی تھی جو اس زمانے میں صوبہ متحدہ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ سر ولیم میور کے حکم پر انھوں نے انکم ٹیکس کے قانون اور اس کے بعد قانون تعزیرات ہند کا اردو میں بہترین ترجمہ کیا تھا۔ اسی بنا پر وہ محکمۂ تعلیم سے محکمۂ مال میں عہدۂ بندوبست کی حیثیت سے لے لیے گئے تھے۔ محکمۂ تعلیم سے ان کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہ محض دوسرا حسن اتفاق تھا اور اردو زبان کی خوش بختی تھی کہ اس صوبے کے انگریز ناظم تعلیمات میتھیو کیمپسن دورے پر اس مقام پر گئے جہاں مولانا نذیر احمد متعین تھے۔ بالکل ہی اتفاقی طور پر ان کی مڈبھیڑ مولانا کے صاحبزادے میاں بشیر الدین احمد سے ہو گئی اور وہ کتابیں جو محض خانگی استعمال کے لیے لکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ آگئیں۔ یہ کیمپسن کی جوہر شناسی تھی کہ انھوں نے بیک نظر ان کتابوں کی اہمیت اور ان کی خوبی کو پرکھ لیا۔ انھیں گورنمنٹ میں پیش کر کے ان پر انعام دلایا۔ اس ہمت افزائی نے مولانا نذیر احمد کے حوصلے بلند کر دیئے اور انھوں نے انتھک محنت سے ایک سے ایک اچھی کتاب لکھی اور اردو کے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے ان کا مرتبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے مولانا نذیر احمد کی دریافت کا سہرا اسی اور کے نہیں مسٹر میتھیو کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے سر بندھتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے تفصیلی حالات مجھے نہ مل سکے۔ مولانا کے اسی محولہ بالا لکچر کے ایک حاشیہ میں بشیر الدین احمد، مرتب "لکچروں کا مجموعہ" نے لکھا ہے کہ کیمپسن صاحب ایم اے تھے[2]

انگلستان کی کس جامعہ کے ایم اے تھے، یہ واضح نہ ہو سکا۔ اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے دوران میں جو بھی انگریز عہدہ دار ہندوستان بھیجے جاتے تھے ان میں بیشتر عہدہ دار عربی، فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کافی درک رکھتے تھے۔ غالباً کیمپسن عربی اور فارسی سے واقف تھے۔ اور مولانا نذیر احمد سے جو معاملہ پیش آیا اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے انھیں اردو بہت اچھی آتی تھی۔ مولانا کے اولیں قدردان سر ولیم میور کے داماد بھی تھے۔ چنانچہ بشیر الدین احمد نے اسی حاشیہ میں لکھا ہے:

"سر ولیم میور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے۔ خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے داماد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے انھوں نے ہی مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔"[3]

مولانا نذیر احمد نے مراۃ العروس اپنی بچیوں کے لیے لکھی تھی اور اسے دریافت کر کے گورنمنٹ میں پیش کر کے انعام دلانے اور عوام تک

---

[1] نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، چالیسواں لکچر ص ۴۳۶ — ۴۳۸ — مرتبہ بشیر الدین احمد مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، ۱۹۱۸ء

[2] ایضاً، حاشیہ ص ۴۳۹

[3] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۴۳۹

پہچاننے کی سعادت کیمپسن صاحب کے حصہ میں آئی تھی، لیکن اس کتاب کے لکھنے کے چند سال بعد ۱۸۷۳ء میں مولانا نے عامۃ المسلمین کو پیش نظر رکھ کر توبۃ النصوح لکھی تو اس کتاب کو بھی گورنمنٹ میں پیش کرنے کا افتخار کیمپسن صاحب کو حاصل ہوا۔ اسی لکچر میں مولانا نذیر احمد فرماتے ہیں:

"اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڈھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو میری تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹرالٹی کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے سلسلے میں لے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کو لیتے ہی بن آئی اور کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے۔ اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اول درجے کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے کورس میں داخل کی گئی۔" [1]

مسٹر میتھیو کیمپسن مولانا نذیر احمد کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کتابوں کو انھوں نے خود ہی گورنمنٹ میں پیش کیا، اپنے شخصی اثر سے کام لے کر ان پر مولانا کو انعام دلایا، ان کو نصاب میں شامل کرایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک کی شرح بھی لکھی۔ انعام کے لیے توبۃ النصوح کو گورنمنٹ میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں اس کتاب کو مولانا کی اس وقت تک کی لکھی ہوئی تمام کتابوں سے افضل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"میں اس کتاب کو مصنف کی مراۃ العروس اور بنات النعش سے افضل سمجھتا ہوں۔ اس میں طرز عبارت اور قوت بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔" [2]

راقم نے مراۃ العروس کا انگریزی ترجمہ اور توبۃ النصوح کی شرح نہیں دیکھی لیکن توبۃ النصوح کا ترجمہ دیکھا ہے، اس مضمون میں اسی انگریزی ترجمہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مسٹر میتھیو کیمپسن نے توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ مولانا نذیر احمد کی اجازت سے اس وقت کیا ہے جب کہ مولانا ریاست حیدرآباد دکن کے بیدار مغز وزیر اعظم نواب سالار جنگ اول کی طلب پر حیدرآباد چلے گئے تھے اور اس ریاست میں ناظم محکمۂ مال کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مسٹر کیمپسن کا یہ ترجمہ "THE REPENTANCE OF NASSOH" کے نام سے انگلستان کے ایک ایسے مشہور ناشر ادارے نے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا جو اس زمانے میں مشرق اور مشرقی علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شایع کر رہا تھا اس ادارے کا نام ہے:

" W.H.Allen & Co, 8, Waterloo Place, London, 1884 "

ترجمہ کی ابتدا میں مترجم کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

مترجم کا دیباچہ

یہ ہندوستانی قصہ جس کا آزاد ترجمہ اس چھوٹی سی کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ہندوستان میں ملازمت کے دوران میں میرے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس کے مصنف خان بہادر مولوی حاجی حافظ نذیر احمد، ناظم محکمۂ مال ریاست حضور نظام، حیدرآباد دکن نے اسے شایع کر دیا۔ اگرچہ کہ اس کتاب کا علم اہل یورپ کو بہت کم ہے۔ لیکن آگرہ اور لکھنؤ کے مقامی مطبعوں سے اس کے کئی اڈیشن

---

[1] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۲۴۰

[2] توبۃ النصوح کی "تقریظ" کے ایک حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے: "واضح ہو کہ اصل کتاب کے حاشیہ پر عند الملاحظہ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے دست خاص سے اکثر جگہ کچھ کچھ عبارت خط پنسل سے لکھ دی تھی۔ چنانچہ مصنف نے چھپنے سے پہلے کتاب پر نظر ثانی کر کے جہاں تک ممکن ہوا ایما و اشارہ کے مطابق کتاب میں ترمیم کر دی۔"

[3] "چٹھی جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم، تقریظ توبۃ النصوح۔

شایع ہو چکے ہیں۔

میں نے تین وجوہ کی بنا پر اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنی ہم جنس ہندوستانی رعایا کی حالت اور ان کی ترقی سے جتنی دل چسپی ہے، اگر وہ یہ کتاب پڑھیں تو مجھے یقین ہے انھیں اس کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کتاب میں ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ میں اصل کتاب کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ مستعمل زبان میں اب تک کی چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ یہی زبان اس زبان کے وطن دہلی میں بولی جاتی ہے جہاں کا یہ قصہ ہے۔

توبۃ النصوح اور اس کے ساتھ ہی دوسرا قصہ مراۃ العروس دونوں ہی پہلے پہل مصنف کے افراد خاندان کے خانگی استعمال کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں زندگی اور عادات و اطوار کی جیسی تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس ملک کا باشندہ ہی پیش کر سکتا تھا۔

اس کتاب کے مصنف ایک بڑے عالم ہیں اور مشرقی مکتب فکر کے علم کلام کے ماہر ہیں وہ عرصۂ دراز تک انگریزی حکومت کے تحت ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں۔ ادھر چند سال پہلے سر سالار جنگ مرحوم نے انھیں حیدرآباد کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک اہم عہدے کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس عہدے پر وہ اب تک فائز ہیں۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ ان کی اجازت سے کیا ہے۔

سٹیفیو کیمپسن ۔ اسکوٹ ۱۸۸۴ء

اس کے بعد مترجم کے خسر سر ولیم میور کا مقدمہ درج ہے جو چار صفحوں میں آیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، سر ولیم میور، مولانا نذیر احمد کے اولیں قدر شناسوں میں تھے۔ مولانا کو جو شہرت، جو عزت اور جو مرتبہ حاصل ہوا اس میں سر ولیم میور نے صوبۂ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ ادا کیا ہے۔

ولیم میور سنہ ۱۸۱۹ء میں بمقام گلاسگو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاسگو کے ایک تاجر تھے۔ اپنے والد کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی جان میور سنسکرت کے بڑے عالم رہے ہیں۔

ولیم میور سنہ ۱۸۳۷ء میں پہلی بار ہندوستان آئے۔ مال گزاری کے تعین کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی خدمت پر کانپور بندھیل کھنڈ اور فتح پور میں دس سال تک مقیم رہے سنہ ۱۸۴۷ء میں شمال مغربی صوبے کے گورنر معتمد مقرر ہوئے سنہ ۱۸۵۶ء میں وہ اسی صوبے کی مجلس مال کے معتمد بنائے گئے سنہ ۱۸۶۸ء میں انھیں شمال مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنری کے عہدۂ جلیلہ میں ترقی دی گئی اور سنہ ۱۸۷۴ء تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ سنہ ۱۸۷۶ء تک وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی کونسل کے رکن فینانس رہے اور اسی خدمت سے وظیفۂ حسن خدمت پر حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

وظیفۂ حسن خدمت حاصل کر کے وہ انگلستان پہنچے تو لارڈ سالسبری نے انھیں کونسل آف انڈیا کا رکن نامزد کیا۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں کونسل آف انڈیا کی رکنیت سے استعفا دے کر انھوں نے اڈنبرا یونیورسٹی کی چانسلری قبول کر لی اور مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے اس یونیورسٹی کی بڑی خدمت کی اسی یونیورسٹی سے انھوں نے مولانا نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دلائی۔

سر ولیم میور کو عربی اور اردو خوب آتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انھیں کے مشورے سے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا تھا۔ ملکہ کو اردو زبان سیکھنے میں بھی سر ولیم میور نے مدد دی تھی۔ الٰہ آباد کا میور کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی دونوں انھیں کی گورنری کے عہد میں قائم ہوئے۔ تاریخ اسلام سے انھیں شروع ہی سے دل چسپی رہی۔ ہندوستان میں قیام کے دنوں میں وہ "کلکتہ ریویو" میں مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ان ہی مضامین کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "حیات محمد" (LIFE OF MOHAMMAD) چار جلدوں میں سنہ ۱۸۵۸ء سے سنہ ۱۸۶۱ء تک شایع کی۔ اس کتاب کا لب و لہجہ اور اس کے بعض مضامین ہندوستانی مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرے۔ اسی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے سر سید مرحوم نے اپنا اثاثہ بیچ کر انگلستان کا سفر کیا اور "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب کے سوا سر ولیم میور نے مسلمانوں سے متعلق اور بھی کتابیں لکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ابتدائی خلافت اور اسلام کا عروج سنہ ۱۸۸۳ء (۲) سلاطین مملوک ۔ مصر کا غلام خاندان سنہ ۱۸۹۶ء (۳) قرآن، اس کی ترکیب و تعلیم سنہ ۱۸۷۸ء (۴) قرآن مجید کے اقتباسات انگریزی ترجمہ کے ساتھ سنہ ۱۸۸۰ء (۵) الکندی کی کتاب الاعتذار کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۷ء ــــ ۱۸۸۱ء۔ (۶) مسلمانوں

تمثیلیہ کے ساتھ در باب ان امور کے جن کا ذکر ، خالق کی جناب میں اس پر فرض تھا وہ بالکل مقتضائے طبعی اور رقت قلبی سے بھرے ہوئے ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی مذہب کا آدمی اس کو پڑھے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو۔

اس صورت میں جناب سر ولیم میور صاحب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ اس کتاب کا داخل منشائے اشتہار مذکور کر لینا مناسب ہے۔ اس کو داخل کر کے جناب ممدوح بخوشی تمام پورا انعام ایک ہزار روپیہ کا عطا فرماتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان کے علم و ادب میں ایک عمدہ تصنیف ہے اور اہل اسلام کو بہت پسندیدہ ہوگی اور دیگر اقوام میں بھی بہت رواج پکڑے گی۔[1]

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی ادب کی اس وقت جو حالت ہے، اس کے پیش نظر انگریز طالب علموں کو بہترین اردو بولنا اور لکھنا سیکھنے کے لیے ہمارے مصنف کی مذکورہ دو کتابوں توبۃ النصوح اور مراۃ العروس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی ان کا روزمرہ وہ خالص زبان ہے جو دہلی میں بولی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی کہانیاں مسلمانوں کی مخصوص حالات اور ان کے عادات و اطوار کی مفید مثالوں سے بھری پڑی ہیں اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں خاص طور پر ان (انگریز) خواتین کے لیے مفید ثابت ہوں گی جنھیں شمالی ہند کے زنان خانوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مسٹر کیمپسن نے اس کتاب کا ترجمہ ایمان داری اور دیانت کے ساتھ کیا ہے انھوں نے اصل طرز ادا اور مقامی محاوروں کو بڑی خوبی کے ساتھ انگریزی کے سانچے میں ڈھالا ہے اور مشرقی تصورات اور خیالات کو یورپی قاری کے لیے آسانی کے ساتھ قابل فہم بنا کر پیش کیا ہے، یہ کام اکثر اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ بعض ابواب اور مکالمے بجا طور پر مختصر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ابواب اور مکالمے اصل میں غیر ضروری طور پر بہت طویل ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام کے بہتر رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے یہ رجحانات ہیں خیر کی ہمت افزائی اور شر کے دبانے کے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے قصے کا مذہبی رنگ اپنی آپ مثال ہے اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی جو کتابیں میں نے پڑھی ہیں یہ کتاب ان سے اسی لحاظ سے بالکل مختلف ہے مسلمانوں میں جو مذہبی کتابیں مقبول ہیں وہ محض طور پر خالصتاً رسمی ہیں اور ان میں صرف فرائض و واجبات اور دینی احکام ہی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ خیال کہ مذہب کو ایک ہمہ گیر اثر ہونا چاہیے اور خاندان کو اسی کی رہنمائی میں اپنی گھریلو زندگی بسر کرنا چاہیے کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب کے لیے ایک نیا موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس قسم کی کتاب لکھنے کا خیال صرف ایسے ہی ملک میں آسکتا ہے جو عیسائیت کے مذہبی تصورات سے متاثر ہوا ہو۔ ایسے ملکوں میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں یہ اثرات مسرت کے ساتھ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہندوستان میں ہماری مذہبی تبلیغ کا ایک ہمت افزا اثر سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعہ اور بھی قابل لحاظ ہے کہ نذیر احمد صاحب نے جب یہ کتاب لکھی ہے تو وہ انگریزی ادب سے قریب قریب ناواقف ہی تھے اسی طرح انھوں نے انگریزی ادب کا اثر بالکلیہ بالواسطہ قبول کیا ہے۔ بعض لحاظ سے یہ اثر اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ بالواسطہ قبول کیا گیا ہے کتاب کا قصہ کسی انگریزی کتاب کا چربہ نہیں۔ لیکن اس کے انگریزی خیالات اور تصورات کے حقیقی پیداوار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نہایت اطمینان کے ساتھ مسٹر کیمپسن کے ترجمہ کو ان تمام حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھیں ہندوستان سے دلچسپی ہے۔ میں ان کے اس خیال کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ ہندوستانی سیکھنے اور ہندوستانی میں مہارت کے امتحانوں کے لیے اصل کتاب بطور نصابی کتاب کے استعمال کی جانی چاہیے۔

---

[1] مسٹر متھیو کیمپسن نے کتاب توبۃ النصوح پر انعام عطا کرنے کے لیے جو مراسلہ حکومت کو لکھا تھا اور حکومت نے اس کا جو جواب دیا تھا مولانا نذیر احمد نے ان دونوں مراسلوں کا ترجمہ کر کے توبۃ النصوح کے بعد کے اڈیشنوں کے ساتھ تقریظ کا عنوان دے کر چھاپ دیا تھا۔ مولانا کا یہ ترجمہ منشی نولکشور لکھنؤ کے چھاپے ہوئے توبۃ النصوح کے بارھویں اڈیشن بابت ۱۹۱۴ء سے یہاں نقل کیا گیا ہے۔

ولیم میور ۱۸۸۴ء

اب جناب میتھیو کیمپسن صاحب کے کیے ہوئے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمے کی طرف آیئے۔ یہ ترجمہ چھوٹی تختی کے کل ایک سو اٹھارہ صفحات میں آیا ہے مترجم نے اس کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بڑی حد تک یہ آزاد ترجمہ ہے اگر آزاد ترجمہ نہ ہوتا تو یقیناً اتنے کم صفحات میں یہ ضخیم کتاب نہ سماتی۔ مولانا نذیر احمد نے اس کتاب میں وقت بے وقت نصیحتوں کا جو طومار لکھا ہے وہ بجائے خود بالکل درست و بجا ہوتے ہوئے بھی اکثر مقامات پر قصہ کی دل چسپی میں بہت حائل و مانع ہوتا ہے۔ یہ مواعظ کافی اکتا دینے والے ہیں۔ کیمپسن نے ان مواعظ کو اکثر جگہ حذف کر دیا ہے یا بہت مختصر الفاظ میں ان کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس سے قصہ کی روانی میں اضافہ ہو گیا ہے اور قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ناول کی حیثیت سے کتاب زیادہ پر لطف ہو گئی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ۱۲ باب قائم کیے تھے اور ان پر بڑے لمبے لمبے عنوان لگائے تھے۔ کیمپسن نے اپنے انگریزی ترجمے میں قصہ کے ابواب کی تقسیم میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے اور بارہ کی جگہ تیرہ باب قائم کیے ہیں۔ ابواب کے طول طویل عنوانوں کی جگہ بہت مختصر عنوان دیئے ہیں۔ کہیں کہیں ہندوستانی رسوم سے متعلق مختصر حواشی بھی ثبت کیے ہیں۔

آج کل اردو ادب کے شاہکاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ توبۃ النصوح کا یہ انگریزی ترجمہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے اور اس قابل ہے کہ تھوڑی سی نظر ثانی کے بعد اسے دوبارہ شایع کیا جائے۔ جب کبھی بھی توبۃ النصوح یا مولانا کی دوسری کتابوں کو انگریزی یا دوسری زبانوں میں پیش کرنے کی نوبت آئے کیمپسن صاحب کا آج سے لگ بھگ اسّی سال پہلے کا کیا ہوا یہ انگریزی ترجمہ یقیناً ایک رہنما کا کام دے گا۔

"حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" (بقیہ ص ۱۳)

اسی رجسٹر سے انتخاب کیے جاتے تھے۔

غالباً اس رجسٹر کی ضخامت چند ہی سال میں ہزاروں صفحات پر پہنچ گئی ہوگی، کیونکہ اسلام کی روز افزوں تحریک نے بہت جلد بادہ و پیمانہ شروع کر دیئے تھے۔ اور قبائل جوق جوق داخل اسلام ہو رہے تھے گمان غالب یہ ہے کہ اس دیوان سے صرف ان قدر افراد کے نام قلمزد کیے جاتے ہوں گے، جو مر جاتے یا مرتد ہوتے؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعداد نو مسلمین کے مقابلے میں کتنی ہی کیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اس عمومی رجسٹر کے مقابلے میں وہ چھوٹے رجسٹر زیادہ اہم اور مفید تاریخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو غزوات و سرایا کے ذیل میں مرتب ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ان سے شرکائے جنگ اور مقتولین و مجروحین کی ٹھیک ٹھیک تعداد کا اندازہ ممکن تھا؛ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں قسم کے رجسٹر عہد رسالت کے بعد بھی کچھ عرصہ محفوظ رہے تو ظاہر ہے تاریخ کا یہ بہت بڑا سرمایہ تھے جو ابتدائی مدونین اور رواۃ سیرۃ کی نظر سے گزر سکتا تھا۔

میں آئندہ فصل میں اس کی افادیت کو دوبارہ پیش کروں گا۔

نامۂ مومن

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

فارسی ادب میں ایک مدت تک سہ نثر ظہوری۔ مینا بازار اور پنج رقعہ کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اور اسی انداز کو معیاری مقام حاصل تھا۔ مومن کے فارسی انشا کا بھی یہی انداز رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا وہ مرتبہ نہیں جو ظہوری کا ہے مگر ان کے انداز بیان نے ظہوری سے قربت ضرور حاصل کرلی ہے۔ اس وقت مومن کے فارسی انشا سے بحث مقصود نہیں۔ صرف چند باتیں اس خط کے متعلق عرض کرنا ہیں تاکہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکے۔ ادبیات کے حسن و قبح کا فیصلہ ذوق و وجدان پر ہوتا ہے۔ مگر اس دور میں فارسی کا سمجھنا چہ جائیکہ مومن کی فارسی کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھے مومن کے خطوط کا ترجمہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ خط اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

خط مذکور انشائے مومن کا ستائیسواں خط ہے۔[۱] جو انھوں نے ایک مطربہ کے نازیبا جا کی شکایت میں لکھا ہے۔ اس خط کا جو عنوان حکیم احسن اللہ خاں (مرتب انشائے مومن) نے تحریر کیا ہے وہ یہ ہے: "نامۂ لبریز گلۂ نازیبا جا۔ بنام مطربہ ماہ جبینے زہرا نوا" یہ خط کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے۔

۱۔ یہ خط مومن کی حیات معاشقہ سے متعلق ہے اور ان کی جوانی کی رنگ رلیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس "ماہ جبیں" کا نام کیا تھا۔

۲۔ اس میں ایک حسین ڈومنی کے نازیبا جا کی شکایت کی ہے اور بڑے مزے کی چٹکیاں لی ہیں جس میں مومن کا طنز اپنے پورے نکھار پر نظر آتا ہے۔

۳۔ تحریر میں بے حد رنگینی ہے اور اس رنگینی کے باوجود بے ساختگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ مقفیٰ عبارتوں، برجستہ اشعار اور دلچسپ تشبیہات نے اور بھی زور پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ حسب عادت مومن نے اپنے اس خط میں بھی "انا" اور "خودداری" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

مومن کی حیات معاشقہ کے سلسلے میں صرف "صاحب جی" کا نام ملتا ہے اگرچہ مومن نے اپنے چھ عشقوں کی داستان اپنی مثنویات میں لکھی ہیں۔ اور ان مثنویوں کو پڑھنے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کا مکتوب الیہ ان محبوباؤں میں کون ہے۔ محض "صاحب جی" کا نام معلوم ہونے کی صورت میں ہر مثنوی اور ہر عشقیہ خط کو ان سے منسوب کر دینا مضحکہ خیز ہے۔ اس خط میں محبوبہ کے نازیبا جا کی شکایت ہے اور اس کی جفاؤں کا شکوہ، جو ان کی تقریباً ہر مثنوی کا بھی موضوع ہے۔ افسوس ہے اس خط کی تاریخ کا تعین بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کاش حکیم احسن اللہ خاں نے جہاں اس کی ترتیب کا احسان کیا ہے وہاں تاریخ یا سنین کا بھی حوالہ دیتے۔

مومن کی جوانی عشق اور حسینوں کی چھیڑ چھاڑ میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی یہی انداز موجود ہے اور ان کے خطوط میں بھی لہجہ یہ رومانی کیفیت ان پر اس قدر حاوی رہتی ہے کہ جب وہ اپنے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ کو بھی خط لکھتے ہیں تو اس میں رنگین اور رومانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں غرض جہاں ان کا موضوع سخن حسینوں سے ہوگا وہاں شوخی بھی ہوگی اور طنز بھی۔ یہ طنز خواہ مقصد براری کے لیے ہو یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شوخی اور طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ چند فقرے قابل غور ہیں۔

"ایسی جلاد کہ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے۔"

"ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔"

"ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو سطحی ڈھکوسلے کی محنت قرار دیتی ہے۔"[۲]

۱۔ ملاحظہ ہو انشائے مومن مخزونہ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔

۲۔ جلادے کہ دست بخون بے گناہ آلاید و حنا پندارد و صیادے کہ اگر طائر بام حرم بدامش آید بے کشتن نگزارد، سخت گیرے کہ قصہ فرہاد و بے ستون بازی گل برگرفتن گیرد۔

مومن کی نثر میں شوخی کے ساتھ وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جو نثرِ مرصع کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ چوں کہ یہ انداز ان کا اپنا مزاج ہے اس لیے اس میں کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس خط میں بیشتر رعایتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں نہ صرف قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ اس میں صنعتِ تجنیس اور ایہام تناسب کی مثالیں بھی موجود ہیں[1]۔ نئی نئی تشبیہات سے خط کو اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔

آخر میں ایک امر کی طرف خاص طور سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ خط انھوں نے ایک محبوبہ کے نام لکھا ہے اور بارگاہِ حسن میں اپنی خودداری کا اظہار تو بڑی چیز ہے اپنے وجود کا تصور بھی محال ہے۔ اس خط میں جذبۂ خود نگہداری بھی موجود ہے۔ حوالہ جات ذیل سے نہ صرف ان کی بیسعت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ذہنی تجزیہ کرنے میں بھی سہولت ہوگی۔

"میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج"

"اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ دیتا ہوں"

"عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند"

"میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی"[2]

موجودہ طبایع ممکن ہے کہ اس انداز کو نہ پسند کریں اور اس کے مقابلے میں سادگی اور اختصار کو ترجیح دیں مگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے ماحول میں دیکھیں۔

ایک مطربہ کے نام

(نازِ بے جا کی شکایت میں)

اے خامۂ فریاد نوا، بلبل کی طرح نالے کر کہ ایک گُل گوش، غنچہ دہن تیری آواز پر کان لگائے ہے۔ اے نامۂ خونیں تحریر لالے کی خوشی سے پھول جا کہ ایک رنگین ادا کے دستِ نگاریں میں تیری جگہ ہے۔ اے دلِ بے قرار مدد کر کہ ایک تغافل شعار نے میرا حال پوچھا ہے۔ اے دردِ جاں فرسا رحم کر کہ ایک عیسیٰ لب میری بے چارگی کے علاج پر متوجہ ہوا ہے۔ اے نازک معانی یہ نوازش کا وقت ہے کہ ایک نازک دماغ نے پرسشِ حال کی ہے مگر میں اس کے دردِ سر سے ڈرتا ہوں۔ اے مضامینِ لطیف دل سے زبان تک آنے کا موقع ہے کہ لطیف مزاج میرے ملال کی چارہ جوئی پر آمادہ ہے مگر سخت کلامی کی سزا جانتا ہوں۔ اے میرے شب کی تیرگی میری سیاہی کے کام آ میں ایک ماہ رخسار کو دو حرف لکھنے والا ہوں اور اے میرے نصیب کی ظلمت مجھ سیہ کار کے خط کی تحریر میں مدد دے کہ میں ایک مہر لقا سے شامِ ہجر کی شکایت کرنے والا ہوں۔ اے دیدۂ خوں بار اشکوں میں جگر کے ٹکڑے گرا اس واسطے کہ میں لوحِ خط کی سرخی کے لیے حیران ہوں۔ اے زردیٔ رخسار میرے آنسوؤں میں شامل ہو جا اس واسطے کہ مکتوب کی زر افشانی کی اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ اے دودِ جگر میرے نامہ کی سطروں کا پیچ و خم بن جا، زلفِ پرخم کی حسرت حوصلہ فرسا ہے۔ اے شعلۂ پر شرر مدد کر، مضامینِ غم کی گرمیٔ ہنگامہ کا وقت ہے۔

---

[1] اے خامۂ تظلم صریر بلبل آسا نبال، گُل گوش غنچہ دہانے بر صدائے تست و اے نامۂ خونیں تحریر چوں شقایق بر خود ببال بہ نگاریں دستِ رنگیں ادا جائے تو۔ "صریر" اور "تحریر"، "خامہ" اور "نامہ"، "ببال" اور "بنال" یہ الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ اس کے علاوہ "خامہ"، "نامہ"، "بنال اور ببال" میں صنعتِ تجنیس ہے۔ آگے بڑھ کر مومن نے ایہام تناسب سے کام لیا ہے۔ "بلبل" کی رعایت سے "صریر" کا لفظ لانا کہیں کہیں چار چار فقرے آئے ہیں، اور ہر فقرہ اپنے متقابل فقرے کے قافیہ سے ہم آہنگ ہے۔

[2] عاشق معشوقانہ مزاجم و باصد نیاز مندیہا بے احتیاج۔ مدعایم اگر دل بہ بے حاصلی نہد آں مدعا ہی گزارم .... عاشق و فاشعارم اما غیرت مند .... بلبلم در ہر گلشن نغمہ نسراید و طوطیم بر ہر شکر لبے منقار نکشاید۔

رباعیات :-

اے لب ! افسانۂ تمنا کی کچھ بات سنا
اے نالے ! شوق حوصلہ فرسا کا کچھ ذکر کر
اے شخص ! اس نے آج وفا کی حکایت پوچھی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری داستان کا کچھ ذکر سننا چاہتا ہے ۔

میں دیوانہ ہوں اور اس کے ساتھ اپنی دور اندیشی پر خوش ہوں ۔
ایسے دیوانہ پر سو عقلیں قربان
اپنے خط کو کبھی چومتا ہوں، کبھی دل پر رکھتا ہوں ۔
جانتا ہوں کہ یہ محبوب کے ہاتھ میں جائے گا ۔
اے زبان ہرزہ درا ، بے ہودہ نالے نہ کر کیوں کہ ایک شوخ جفا شعار مخاطب ہے ۔ اے نطق پریشاں نوا بے باکانہ فریاد نہ کر کیوں کہ ایک سخن ناشنو ظالم سے کام پڑا ہے ۔

رباعی :-

ایسا شوخ جس نے کسی سے وفا نہ کی اور نہ کرے
جس نے کسی کی مشکل گرہ نہ کھولی ہے اور نہ کھولے
بے کار نالے کرنا کس لیے ۔ میں جانتا ہوں
کہ ہمارے حال پر اس نے رحم نہ کیا اور نہ کرے

اے اثر ! میری نارسی کہ میں ایک ظالم کے ہاتھ سے گرم فریاد ہوں ۔ اے آسمان میری مراد کے مطابق گردش کر کہ میں ایک زہرہ جبیں کے سر کے گرد پھرنے سے محروم ہوں ۔ اے آہ نارسا ! یہ بے سر اپن کیوں ہے ۔ اے شور ثریا ! کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرا روئے سخن کس کی طرف ہے (اس کی طرف ہے) جس کی ناہید نوائی دلوں پر اثر کرنے والی اور سرود سرائی محل افتخار ۔ بار بد کا ترانہ اس کی شیریں ادائی پر قربان اور حضرت داؤد کا نغمہ اس کے انداز کا دعا گو ۔ اس کے کلام شیریں کی حسرت میں طوطی شیریں گفتار تلخ کام ہے اور اس کے سخن رنگین کے رشک میں باغ کا افسانہ بلبل کے لب سے ناتمام ہے ۔ اس کی گوش آشنا آواز کی نرمی کے مقابل پھولوں کے کھلنے کی آواز خزاں (یدہ) پتوں کے شور سے مشابہ ہے اور اس کی طرب فزا گفتار کی نزاکت کے سامنے بانسری کا نغمہ کسی ماتم رسیدہ کے گلے کی فریاد کی مانند ہے ۔

مثنوی :

اس کا لعل لب موتی برسانے میں
رخ معانی کے لیے آب و رنگ کا حکم رکھتا ہے
اس کے رنگین ہونٹ یاقوت کی تحریر ہیں
اس کے انفاس سحر ہا روت کا کام کرتے ہیں ۔
اس کے انفاس کا افسانہ اعجاز سے کم نہیں
حضرت مسیح بھی اس کے غم میں جان دیتے ہیں
اس کے مژگاں کی تلوار مشتاقوں کی آہ کی طرح کاری ہے
اس کی چشم سیاہ عاشقوں کے نصیب کی طرح کالی ہے
اس کی نگاہیں دلبری میں سحر کرتی ہیں
اس نے جادوگری کو نغمۂ ماضی بنا دیا ہے

اس کی پیشانی آئینہ تمثال ہے
صبح کی پیشانی اس کے روبرو سر بسجود ہے
اس کا رخسار اپنے دل افروز جمال سے
آفتاب کے جگر کا داغ باعث رشک ہوا ہے
قیامت اس کے قامت کے گرد پھرتی ہے
سو طرح کی بلائیں اس کے قد پر قربان ہوتی ہیں
جب وہ جلوہ دکھاتی ہے تو ستم ڈھاتی ہے
جب وہ اٹھتی ہے تو فتنے اٹھاتی ہے
اس کی جلوہ گاہ کا غبار سراپا آشوب ہے
صحرائے قیامت اس کی گرد راہ ہے
اس کے زلف کی حکایت بہت دراز ہے
یہ سمجھو کہ وہ میری شب ہجر کی ترجمان ہے
اس کے گیسوؤں کا ہر بال اپنے پیچ و خم سے
دانا اور ناداں سب کے دلوں کے لئے جال کا کام دیتا ہے
نزاکت کے باوجود اس کی طبیعت
سنگ دل کا بار اٹھاتی ہے
اس عادت میں سمن زار کی سی لطافت ہے
اس کی گلی میں چمن زار کی سی طراوت ہے
اس کا ہر غمزہ عاشقوں پر نظر رکھتا ہے
اس کا ہر عشوہ مشتاقوں کا آرزو مند ہے
اس کا شیوہ دل ستانی
لوگوں کو لطف و مہربانی کے ساتھ زندگی بخشتا ہے

ارے میں نے کیا کہا۔ طریقہ دل ستانی اور شیوہ مہربانی کا کیا ذکر وہ تو ایسی بے مہر ہے کہ دل بھی جیسے چھینتی ہے۔ جفا اس کی طبیعت سے اتنی قریب ہے کہ فریاد بھی زبان مظلوم سے اس قدر قریب نہ ہوگی اور رحم اس کے دل سے اتنا دور ہے کہ ہنسی بھی غم رسیدہ کے منہ سے اس قدر دور نہ ہوگی۔ وہ ایسی خونخوار ہے کہ میری چشم خوں فشاں کی طرح عاشقوں کا خون گراتی ہے اور ایسی ظالم جس کی گلی سے فتنۂ عرصۂ محشر کا غبار لے کر اٹھتا ہے۔ ایسی جلاد کہ بیگناہوں کے خون سے ہاتھ سے رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے۔ ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔ ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کوہ کنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے اور ایسی بدعہد کہ شیریں اور شیریں کے وعدے کو وفا شعاروں کی درستی عہد ٹھہراتی ہے۔ ایسی بے درد کہ مظلوموں کے نالوں پر ہنستی ہے۔ ایسی بے رحم کہ پروانہ کی بالیں پر شمع کا رونا پسند نہیں کرتی۔ ایسی غلط اندیش کہ محتسب کو قتل کرنے کے لیے مستی کا بہانہ بناتی ہے اور ایسی بد کیش کہ بادہ گلگوں کا مزا لے کر مومن کا خون پیتی ہے۔ ایسی زود خشم کہ (کسی کو سزا دیتے وقت) اتمام حجت کی تاخیر اس کو درازی روز جزا نظر آتی ہے۔ ایسی سیاہ چشم کہ شب ہائے فراق کی سیاہی اس کی نگاہ میں نہیں جچتی۔ ایسی بے وفا کہ عہد باندھتے ہی کو ایفائے عہد سمجھتی ہے اور ایسی صبر آزما کہ عاشق کے دم واپسیں کو آغاز امتحان ٹھہراتی ہے:۔

رباعی :

ایسی شوخ جس کی جفائیں نہیں اٹھائی جا سکتیں
ایک دن بھی اس سے مرادِ دل حاصل نہیں ہو سکتی
اگر اس نے میرا سرتن سے قطع کیا تو مشکل نہیں
مشکل تو یہ ہے کہ اس سے قطعِ محبت نہیں کر سکتے۔

اے کافر بے وفا۔ اے غیروں سے محبت کرنے والی۔ اے ناشکر، اے فسادی دشمن، اے حق ناشناس، سخن ناشنو، اے درشتی پسند سست عہد۔ اے وفا نہ ہونے والے وعدوں پر بھی پشیمان، اے ستم شعار، آسمان کو ستم سکھانے والی۔ اے گردشِ روزگار کی استاد۔ اے سنگدل پرور، رقیب نواز۔ اے لطفِ خدا سے بے نیاز سے بے نیاز۔ اے نامرادوں کے خرمن کو جلانے والی برق۔ اے دلوں کے جگر کو پگھلانے والے شعلے، اے قیامت کی پرسش سے بے پروا رہنے والی۔ اے قتلِ مومن بے گناہ پر کمر باندھنے والی۔ اے اہلِ عزت کی ذلت چاہنے والی۔ اے بے تمیزوں کے دام میں اسیر۔ اے غرور سے تیوری چڑھائے ہوئے۔ اے بے پروائی سے میرے حال تباہ سے بے توجہی کئے ہوئے۔ اے وہ جس نے عمر بھر ظلم سے میرا امتحان لیا۔ اے وہ جس نے مدتوں میری مہر و وفا کو آزمایا۔ اے مہربانیوں پر نامہربانی کرنے والی اے وہ کہ سوز و ملال کے باوجود میرے سر میں تیرا سودا ہے اور میری ناتواں نیم جاں تجھ پر فدا ہے۔ آخر کب تک میں آتشِ فراق میں جلوں اور دردِ تنہائی سے تباہ کروں۔

فرد :

تیری جفا اور میری وفا دونوں حد سے گذر گئیں
تجھ کو اپنے سے اور مجھے خود سے شرم آنی چاہیے

وصال کی شب نے جو ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے یہ دن دکھایا۔ .... جب سے تو نے میرا ہاتھ تھاما، کبھی میں اس کو آنکھوں پر رکھتا ہوں، اور کبھی سر پر اور جب سے تو نے اپنی انگوٹھی ہاتھ سے میری انگلی میں پہنائی، کبھی انگلی کو بوسہ دیتا ہوں، اور کبھی انگوٹھی کو۔ وہ محبت کی باتیں کیا ہوئیں اور وہ وفا کا ذکر کہاں گیا۔ راستی پر جھوٹی قسمیں چھوڑ اور وعدہ ہائے تسلی آمیز یاد رکھو۔ آخر روزِ جزا آنے والا ہے۔ خداوندِ ہمتا کا سامنا ہونے والا ہے۔ خدا اس دن سے بچائے کہ میں تیرا دامن پکڑوں اور دل کے ٹکڑے داورِ محشر کے سامنے پیش کروں۔ اپنے نالہ ہائے قیامت گداز سے ایک نئی قیامت برپا کروں اور شعلہ ہائے عالم سوز سے اہلِ جنت کو دوزخ میں ڈال دوں۔ میری آہوں کے شعلے فرشتوں کے بال و پر تک جلا دیں اور سدرۂ طوبیٰ کی شاخیں آتش پرستوں کے ہاتھ پاؤں کی طرح بھڑک اٹھیں۔ میں ایسی فریاد کروں جن کے شعلوں کی گرمی کوثر کو آب گرم اور خلد بریں کو جہنم بنا دے۔ سچ ہے۔

شعر :

اگر ایک دن جدائی کی آگ دوزخ پر مسلط ہو
تو یقیناً اس کے شعلے پگھل کر رہ جائیں

نہیں نہیں کہاں میں اور کہاں یہ بے مروتی۔ لیکن "یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر"[1] کے مفہوم سے ڈرتا ہوں اور دل میں "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"[2] کی فکر سے دو نیم ہے۔

بیت :

میں نامراد تیرے مظالم سے کیوں کر نبھاؤں
میں نہیں کہتا کہ تو نے کیا کیا تو ہی بتا کہ میں کیا کروں

میرا غبارِ خاطر تیرے قدموں کے آوازکی ہوا سے اڑ جائے گا۔ میرے دل کی کدورت تیرے قدم صفا لزوم سے پامال ہو جائے گی۔ اگرچہ میں شیشۂ شراب کی طرح صاف طبیعت ہوں لیکن ساقی کی دستگیری کے بغیر سر جھکانے والا نہیں۔ میں صیقل شدہ شمشیر ہوں اور چلّے تک کھنچا ہوا تیر، جب تک تو مجھے سر پر نہ رکھے گی، میں اپنے ناخن کو تیری عقدہ کشائی کی زحمت دوں گا۔ اور اگر تو مجھے چٹکی سے چھوڑ دے گی تو پھر تیرے ہاتھ نہ آؤں گا۔ میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج۔ اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہوں اور اگر میری تمنا حاصل نہیں ہوتی تو اس تمنا ہی سے دست بردار

---

[1] جس دن لوگوں کے دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ مددگار
[2] جو کوئی ذرہ کے برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا۔

جاتا ہوں۔ میں عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند اور بندہ حق گذار ہوں لیکن خود دار پسند میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میرا طوطی ہر شکایت کے سامنے منقار نہیں کھولتی۔ میرا پروانہ ہر شمع رخسار کے گرد نہیں گھومتا اور میرا دیوانہ ہر پری جمال کا مجنوں نہیں ہوتا۔ طور کو جلانے والی آگ سے میں بے خود ہو کر گرتا ہوں بال و پر کے جلنے کا عذاب نہ دیکھوں .... میرا یوسف زلیخا کا غلام نہیں ہوتا کہ وہ اس کو زندان بلا میں ڈال دے اور میرا فرہاد عشق شیریں کی تلخی نہیں تاکہ وہ (شیریں) اپنے لب شیریں پرویز کے لیے وقف کر دے۔ میں حلقہ زنجیر ہوں جس کے پاؤں پر پڑا وہ اٹھا میرا گرفتار (گرفتار محبت) ہو گیا۔ میں رنگ حنا ہوں جس کے ہاتھ کو میں نے بوسہ دیا اس نے دوسروں کے قتل پر تلوار کھینچی۔ میں پایہ منبر ہوں جس کے پاؤں پر سر رکھوں۔ اپنی جبین نیاز میرے قدموں سے گھسے اور میں خط پرکار ہوں اسی کے گرد پھروں جو میرے آغوش میں آئے۔

رباعیات:

مومن مجھے تو بت پرستی سے روکتا ہے
مگر خود خدا کی بندگی کیوں نہیں چھوڑتا
یوسف نے زلیخا کی خدمت کا حق نہ پہچانا
میں اس کا غلام ہوں جو مجھے اپنا آقا سمجھے

وہ شوخ جو خدائی کے دعوے کرتا ہے
اور کبریائی کی سینکڑوں شیخیاں مارتا ہے
مومن کی محرومی گوارا نہ کرے گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں
کہ خدا عقدہ کشائی کی شان رکھتا ہے

جب تک فتنہ روز قیامت نہ اٹھے تیرا قد محشر خرام جلوہ نمائی کرتا رہے۔ اور جب تک شور محشر ہنگامہ برپا نہ کرے تیری رفتار فتنہ انگیز ہنگامہ آرائی کرتی رہے۔

قطعہ:

جب تک عاشق کی شب ہجر کی درازی کے افسانے رہیں
تیری عمر تیری زلف مشکیں کی طرح دراز ہو
تو گرم صحبت رہے اور شمع محفل کی طرح
حاسد کی جان آتش غم سے پگھلتی رہے
میں تیرے ساتھ ہم کلام ہوں اور رقیب حسد سے گرم فریاد
میں تیرا ہم نشیں ہوں اور دشمن مارا مارا پھرے
میں کامیاب وصل ہو جاؤں اور غیر ناکامی کے باعث
مرنے کا امیدوار ہو
میں خدائے کارساز کی مہربانی کا شکر یہ ادا کروں
اور وہ رقیب چرخ حیلہ ساز کی طرح شکایت کرتا رہے

غلام ربانی تاباں

کسے دوام کی فرصت یہاں خضر کی طرح — تپش کی زیست یہی ایک پل شرر کی طرح

طلب کی راہ سے گزرے ہیں یوں بھی دیوانے — زمانہ ساتھ چلا گرد رہ گزر کی طرح

گلوں کو چاک گریبانیاں مبارک ہوں — نسیم آئی بہاروں کے نامہ بر کی طرح

کبھی گزر بھی گیا شوق حد تمکیں سے — کبھی چھلک بھی گیا جام چشم تر کی طرح

ہزار سادگی و صد ہزار پرکاری — نہ کوئی دوست نہ دشمن تری نظر کی طرح

جنوں وہ خام جو بن جائے انجمن کا چراغ — ہوا کی زد پہ رہو شمع رہ گزر کی طرح

وہ گفتگو کا سلیقہ بھی چاہیے تاباںؔ — کہ بات دل میں اتر جائے نیشتر کی طرح

امتیاز علی عرشی

شباب عمر دو روزہ کا اعتبار ہی کیا — چمک کے ساتھ جو بجھ جائے وہ شرار ہی کیا

نہ کر تو آمد فردا کا انتظار نہ کر — جو جا کے آ نہ سکے اس کا انتظار ہی کیا

اٹھا اور نگاہ کی خارا شگافیاں دکھلا — کہ جو علم نہ ہو وہ تیغ آبدار ہی کیا

تلاش آہوئے رم خوردہ اے خوشا لذت! — جو آپ دام میں آجائے وہ شکار ہی کیا

بہار دامن گلرنگ اے لباس زینت! — جو خون دل نہ بہائے وہ دلفگار ہی کیا

سحر رامپوری

یاد آیا جہاں بھولے سے تمہارا دامن — وہیں بیساختہ آنکھوں نے پکارا دامن

ایسے کم ظرف کو مٹی ہی میں مل جانا تھا — اشک حسرت کو نہ دینا تھا سہارا دامن

میری وحشت سے کچھ اچھی نہیں چھیڑیں یعنی — ہے اسی چاک گریباں سے تمہارا دامن

لوٹ ہی لی تھیں گلستاں کی بہاریں میں نے — کہاں آکر دل کج فہم پکارا دامن

فیصلہ ہوش و جنوں کا ہے بہار آنے دو — دیکھنا ہے کہ کسے ہوتا ہے پیارا دامن

مسکراتی ہیں جو کلیاں تو اسی دامن میں — اور کانٹوں کے لیے ہے تو ہمارا دامن

اپنا افسانۂ غم اب نہ سنائے گا سحرؔ — اپنی آنکھوں سے ہٹائیں وہ خدارا دامن

غلام ربانی تاباں

تھکے ہیں لاکھ مسافر، سفر ہے کیا کیجے
ابھی وہی کششِ رہ گزر ہے کیا کیجے

جنوں پہ قیدِ طلب بھی بہت گراں ہے مگر
جبیں نواز ترا سنگِ در ہے کیا کیجے

چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے
بہار موسمِ رقصِ شرر ہے کیا کیجے

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے
غبارِ راہ سہی، ہمسفر ہے کیا کیجے

تمام عمر شکستوں سے دل کا کام رہا
خلوص شوق رقیبِ اثر ہے کیا کیجے

شکایتِ ستم روزگار کا حاصل
غمِ حیات سے کس کو مفر ہے کیا کیجے

ہنسے تھا عقل کی دیوانگی پہ کل تاباں
مگر وہ خود بھی تو آشفتہ سر ہے کیا کیجے

صبا اکبرآبادی

آگ بجھ گئی غم کی ہم ہنوز جلتے ہیں
دن بدل گئے لیکن دل نہیں بدلتے ہیں

وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں

وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں
زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں

وہ عبور کر لیں گے قلزمِ مصائب کو ؟
روز جن سفینوں کے ناخدا بدلتے ہیں

ایک دن یہی شاید اس گلی میں لے جائے
دل جدھر چلے ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وحشیوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل ہو
پھول بھی کچلتے ہیں، خار بھی کچلتے ہیں

اتنی تیز رفتاری کیوں ہے سوئے میخانہ
اے صبا ذرا ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

انجم قریشی رامپوری

عالم تمام مطلعِ انوار ہو تو ہو
جلوہ بقدرِ وسعتِ ذوقِ نظر نہیں

محروم ہوں نشاطِ محبت سے کیا کہوں
ظالم کو پاسِ سوزشِ زخمِ جگر نہیں

انجم نے پھول اپنے نشیمن میں رکھ لیے
افسوس بجلیوں کو ابھی تک خبر نہیں

غالبیہ ـــــــــ تیسرا باب

اکبر علیخاں

اس عنوان کے تحت اس بار ایسی خبریں شریک کی جا رہی ہیں جو غالب کی زندگی میں معاصر اخبارات کے صفحات پر جگہ پا چکی ہیں۔ سوائے اردوے معلّٰی اور عودِ ہندی کے اشتہارات کے جو غالب کی وفات کے صرف دو ماہ بعد شایع ہوئے تھے۔ زیرِ نظر خبروں کی تعداد یقیناً کم ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ بہت سی خبریں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔

مثال کے طور پر خود غالب نے اخبار لودھیانہ میں ایک خبر کی اشاعت کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے درباری اعزاز کی تخفیف و ترمیم کی اطلاع چھپی تھی۔

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا اہتمام

مگر اخبار لودھیانہ کے مذکورہ نمبر کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر ہمارے پاس اُس عہد کے اخبارات و رسائل کی قابلِ لحاظ تعداد محفوظ ہوتی تو غالب اور معاصرین غالب کے بارے میں بڑے اچھے ذخیرے سے استفادہ کیا جا سکتا۔

بہرحال غالب کے معاصر اخباروں کے صفحات پر جو کچھ ملا ہے اسے ایک سلسلے میں پرو لیا گیا ہے۔

غالب کا اردو فارسی کلام بھی اخبارات میں چھپا کرتا تھا مراسلات بھی شایع ہوتے تھے اور غالب کی نثر غالب سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔ خبروں میں قاطع برہان کے ہنگامے، قماربازی کے ذیل میں سزائے قید، سند کا ذکر، انگریز حکومت سے تعلق اور مشاعروں میں شرکت کا حال موجود ہے۔ جو غالب کی مقبولیت کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ یہ غالب کے مورخ کے لیے حسب مراد اور اطمینان بخش نہ سہی مفید اور کار آمد مواد کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

دہلی اردو اخبار ——— (۲۲ اگست ۱۸۴۱ء)

قمار بازاں

سنا گیا کہ ان دونوں گذر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دور تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے .... یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانیدار کی حد اخیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۷۳)

اخبار مہر منیر کلکتہ ——— (۲ ستمبر ۱۸۴۱ء)

از اخبار دہلی واضح شد کہ از مکان میرزا نوشہ، شاعر نامدار دہلی، یکی از عزیزان نواب شمس الدین خاں مرحوم، تنی چند مقامران نابکار کہ دلیل و نہار بجز قمار دیگر کار نداشتند، در حالت مقامرت بسعی تھانیدار اسیر و گرفتار شدند و بر حکم حاکم حاضر گردیدند۔ حاکم نصفت شعار از شاعر یک صد روپیہ داد و دیگران سی سی روپیہ جرمانہ گرفتہ آزاد فرمود۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۵۵)

احسن الاخبار بمبئی ——— (۲۰ دسمبر ۱۸۴۴ء)

بتاریخ ۱۴ ماہ اکتوبر میجر جان جاکوب۔ اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی وارد ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے رفاقت قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا۔ اور نواب ضیاء الدین خاں کے مکان میں جہاں پہلے ہی مہمانداری کا انتظام کیا گیا تھا ٹھیرایا دو دن کے بعد میجر صاحب بہادر نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ (دہلی کا آخری سانس ص ۵)

احسن الاخبار بمبئی ——— (۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء)

ماہ گزشتہ کی پندرہ اور سترہ تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ عمائدین رؤسا شرفا اور خاص خاص اصحاب شریک تھے۔ تمام اہل دربار کو ان کے مرتبے کے موافق انعام و اکرام دیا گیا .... ۱۷ تاریخ کے دربار کی رپورٹ اور تقسیم انعام کی تفصیل حسب ذیل ہے: دربار عام ہوا اور دور سے انگریزوں کو بلایا گیا بڑے بڑے صاحبان عالی شان تشریف فرما تھے۔ مجمع بہت بارونق تھا دو گھنٹے تک ملکی معاملات پر تقریریں ہوئیں اس کے بعد وہ نئے آدمیوں نے نواب گورنر جنرل بہادر سے تعارف حاصل کیا۔ محفل میں ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ حاضرین میں سے ہر ایک کے بالخصوص حاکموں اور افسروں کے چہروں پر خوشی اور کامیابی کی سرخی جھلک رہی تھی اس کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔

...... (۱۳) مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر ...... (۱۷) مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت پارچہ اور ایک گھنٹہ .... اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو اپنے دست مبارک سے ایک ایک شال مرحمت فرمایا۔ (۶) سید فیض الحسن صاحب کوتوال شہر ...... اس موقع پر نذریں بھی پیش کی گئیں جو شکریے کے ساتھ قبول ہوئیں مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر نے کہا آپ لوگوں کی دیانتداری انصاف پسندی نیک نامی اور علم و فراست سے صاحب بہت مسرور اور رضامند ہیں .... ۸ ار تاریخ کو بدر الدین مہر کن نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا نذر کے

طور پر پیش کیا۔ ان کو خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔

جس صورت سے موجودہ گورنر کے عہد میں ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق وعنایات کا برتاؤ کیا گیا اس سے پہلے ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رعایا میں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ان کے عدل و داد کے تذکرے ہیں ان کے عہد کی یہ خصوصیت ہے کہ انشا پرداز ول، تحصیلدار و ل تک کو خلعت تقسیم کیا گیا (بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۴۰-۴۱)

اخبار فوائد الناظرین۔ کلکتہ ——— (۳۱ رمئی ۱۸۴۷ء)

۲۵ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قماربازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پاکر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو معہ چند قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔

(قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں۔ امتیاز علی عرشی۔ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء)

احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲۵ جون ۱۸۴۷ء)

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کی باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی (یہ چٹھی بادشاہ نے لکھی تھی اس لیے کہ انھیں کی مصروفیات ۱۰ رجمادی الثانی کے تحت یہ خبر آئی ہے) کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معزز شہری ہیں یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔　　(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۱)

احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲ جولائی ۱۸۴۷ء)

میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو یہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۴ — ۱۷۵)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء)

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب۔ جو اپریل میں قیمت بھیجدے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروان راہ سخن　　پایہ سنجان دستگاہ سخن
طے کرو راہ شوق زود زود　　آن پہنچی ہے منزل مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر　　دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی　　چشم بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا　　جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہ دہلی ہے　　مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ　　گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار — بار ور جس سے ہو گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں — [illegible] ب عالم میں
اس سے انداز شوکت تحریر — اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا طرز نغز گفتاری — حبذا رسم و راہ نثاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم — ہے مقرر جواب پئے تسلیم
اُس کے نقروں میں کون آتا ہے — کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلا — ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلا
ورزش قصہ کہن کب تک — داستان شہ دکن کب تک
تا کجا دور نثر ہائے کہن — تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
لکھتے ظہوری و عرفی و طالب — اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے — اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے درست — "ہر کہ آید بروز نو برخاست"
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے — شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دان معنیٰ ہے — بادشاہ جہان معنیٰ ہے
نثر اُس کی ہے کارنامۂ راز — نظم اس کی نگار نامۂ راز
دیکھو اس دفتر معانی کو — سیکھو آئین نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا — سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست — تین پیسے سپارہ لے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے ہوویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہائے ریاض مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں درپئے حصول شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر — کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے — ابتدائے ورق شماری ہے

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا۔

(آثار غالب صفحات ۷۰۸ و ۷۵۹)

اسعد الاخبار آگرہ ———— (۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء)

ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر

جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تاریخ ایسی دلچسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہوگا۔

(ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۸۸)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۲ ستمبر ۱۸۵۰ء)

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور بادشاہ دہلی بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روئے اخبارات کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن و ظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں حضرت شاہ والا درگاہ نے بکمال اعزاز و اکرام اپنے حضور بلوا کر بہ عطائے خطاب خلعت معزز فرمایا اور کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا جناب شفتہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را　　عطا باقی کہ ہر سر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک نجم الدولہ و یک جزو دیگر ہم　　نظام اول بود، زاں بعد لفظ جنگ اے سرور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید بر خلعت　　زدہ جیغہ و سر پیچ و مالای دُر و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی　　سخن فہم و سخن گو پرور و دانا و دانشور
پی تحریر تاریخ خطاب خلعت شاہی　　بہ دریای تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامی کہ شد در غوطہ یابش بر زمین قایم　　بہ گوش شفتہ ہاتف گفت کای زند زبان آور

بگو گر سال این پیش آمد اقبال می خواہی
یکی سامان، دوم حشمت، سوم اعزاز، چارم فر

(نشانِ نگار لاہور ص ۳۸ اپریل ۳۵ء)

سراج الاخبار دہلی ——— (یوم سہ شنبہ چہاردہم محرم (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۵۰ء)

چون بہ نسبت نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب تخلص، ہیچ کس غمازہ...... سمت لامذہبی و مذہب امامی وانمودہ بود، میچی چند لطیف رباعی بکمال متانت و نوش ادائی پیش بندگان قدسی ادا نمودند از جبلی پسندانہ شادگی ایمای طبع فرمودند۔

رباعیات نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ

جن کو ہے مجھ سے عداوت گہری　　کہتے ہیں وہ مجکو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی　　شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری

ایضاً

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں　　سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے ان کو اپنا ہمدم　　ہے ہے نہ کہو کسے برا کہتے ہیں

ایضاً

یاران رسول یعنی اصحاب کبار　　ہیں گرچہ بہت خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار　　غالب وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایضاً

یاران نبی میں تھی بڑائی کس میں　　العنت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں
وہ صدق وہ عدل وہ حیا وہ علم　　بتلاؤ کہ تھی کہ تھی برائی کس میں

ایضاً

یاران نبی سے رکھو تو لا باللہ　　ہر یک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم ان کے دشمن　　لاحول و لا قوۃ الا باللہ

(ہماری زبان ۱۵ اپریل ۱۹۶۱)

دہلی اردو اخبار ——— (۳۰ مارچ ۱۸۵۱ء)

قصیدہ جو کہ نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب نے مدح بندگان حضور والا میں نوروز کے دن پڑھا تھا اس ہفتے میں ہمارے پاس آ گیا تھا۔ سو واسطے تفریح ناظرین اخبار کے درج ہوتا ہے:

خورشید بہ بیت الشرف خویش در آمد　　زانسان کہ شہنشاہ بہ اورنگ بر آمد

(نوائے ادب بمبئی۔ اپریل ۱۹۵۸ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۱۱ مئی ۱۸۵۱ء)

اس ہفتہ میں ایک غزل جناب نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب کی ہمارے ہاتھ آئی سو درج اخبار ہوئی،

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے　　یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

(نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۶۳)

دہلی اردو اخبار ——— (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء)

حسب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہ، جو جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب اور جناب خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق نے بتقریب شادی مرزا جواں بخت بہادر مرشد زادہ آفاق کے کچھ اشعار بسبیل مبارک بادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں سر دربار گزرانے تھے، مع چند اشعار علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے۔ واسطے حظ اور کیفیت اپنے ناظرین اہل بصر و بصیرت و ماہرین دوا قفین فصاحت و بلاغت کے بموجب ترتیب درپیش ہونے کے ہم درج اخبار کرتے ہیں۔　(نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۲۸ اگست ۱۸۵۲ء)

اس ہفتے میں جو مشاعرہ مرزا نورالدین بہادر دام اقبالہ المتخلص بہ شاہی نبیرہ جناب مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم نے کیا جو کہ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں غزلہای شاعران کثیر پڑھی گئیں۔ اور شاہ زادہ والا تبار اکثر رونق افروز محفل مشاعرہ تھے۔ ایک غزل جناب مرزای ممدوح یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں بہادر المتخلص بغالب کی، راقم اخبار کے پاس پہنچی۔ سو درج اخبار ہوئی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۴۷)

دہلی اردو اخبار ——— (۱۳ فروری ۱۸۵۳ء)

ایک مخمس جناب صاحب عالم مرشد زادہ بہادر مرزا نورالدین المتخلص بہ شاہی، جن کے محامد و صاف اخبارات گزشتہ میں لکھے تھے، تحقیق سنا گیا کہ بفرمودہ بندگان حضور والا جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب سحر بیان نے ایک غزل اس ہفتے میں لکھی تھی، اور اس مقصود سے وہ غزل کہوائی

گئی تھی کہ مصرع لگانا جس میں دشوار بلکہ ناممکن ہو۔ صاحب عالم بہادر ممدوح نے ادنیٰ غور و تامل میں کمال عجلت سے مخمس طیار کر کے پڑھ دیا۔ حضور والا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے، اور سب لوگوں کو کمال تعریف و توصیف سے تر زبان پایا۔ جز اے سبحان اللہ سبحان اللہ کے سوا کوئی لب نہ ہلاتا تھا۔ (نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۴۸)

دہلی اردو اخبار تتمہ ——— (۲۲ مئی ۱۸۵۳ء)

منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے۔ حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے۔ جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شاہزادگان والاتبار بعد باریابی مجرا حسب الحکم قضا توام شرف نشست سے حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ پر ایک بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما رہے۔
(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۶۷ — ۳۶۸)

اودھ اخبار[1] لکھنؤ ——— (یکم جنوری ۱۸۶۲ء)

"اشتہار طبع کلیات نظم" جناب میرزا غالب دہلوی۔

اک بشارت نئی سنو ہم سے		گوہر آبدار لو ہم سے

ایسا مژدہ سنانے میں کہ کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں۔ مرحبا کہیے شاہد شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سر بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دوچار ہوں گے نقد تمنا سے حظ دار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھائیے۔ آویزہ گوش جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دلارام، رنگین ادا کا شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد دلکش ہے، عالی مضامین قصائد لاجواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جائیے، نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربعۂ عناصر کہیے، آبدار قطعات کو بے تمند قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہد ماہ سیما نے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں، کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کے صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر لفظ ان کے قلم کا اختر اوج کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کس خوش نصیب کی یہ امید بر آئی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے سے[?] کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے ۵ مقرر ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے۔ چھپنے تو دو ہاتھوں ہاتھ اٹھائے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے، صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کا اطمینان بکسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مدنظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلب گار ہوں کم قیمت کے حصہ دار ہوں۔ فقط

(ص ۱-۲)

---

[1] اودھ اخبار کے حوالے سے مندرجہ تحریر درج کرنے کے لیے میں محترمی ڈاکٹر ایچ بی نورانی صاحب کے لطف و کرم کا شکر گزار ہوں یہ موصوف ہی کا عطیہ ہیں (اکبر)

اودھ اخبار لکھنؤ ــــــــ (۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء)

نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں اُن کا عدیل نہیں، فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں۔ فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطہ کو افتراع معانی بنایا۔ زور فکر اُن کا جہاں میں مشہور رہے۔ نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور رہے۔ جناب جہانیاں مآب ملکہ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اُس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظر انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے جب فیضیاب سماعت ہوا۔ منظور نگاہ رحمت ہوا۔ جنت و نزال کی طرف ہمت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی۔ ولایت سے ڈاک پر بھیجکر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے عنقریب خط اٹھاؤ گے۔ بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ سے اُس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کل متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بیگناہ یوں زیر آسیائے گردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر مترصد بھی ناکام ہوا۔

نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔ ع "جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا"۔ عجب نہیں کہ پرورش سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالت یاس میں لطف خسروانی سے امید بر آئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر اور سنیے کہ ان دنوں جب تعزیت شاہزادۂ عالی پایۂ عالیگہر تھی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیشگاہ حکام سے متاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھدیا۔ نواب صاحب (غالب) نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں مدح سرائے حضرت ملکۂ زمن ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی:

شاہ عالی گہر و گوہر پاکش صد حیف　　دیگہ ناچار سپردند بخاکش صد حیف　　(ص ۱۸۵)

اودھ اخبار لکھنؤ ــــــــ (۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء)

ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا روزنامچہ مدت دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ صحائف اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال گزر گئے سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے بانڈ صنو باندھے۔ تو طیے اٹھاتے۔ محض اپنے گمان پر سیکڑوں قیاس لگاتے۔ اے بے فکرو، خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے۔ خصوصاً وقائع نگار ان انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے۔ کیا کریں جب عموماً صحیفوں کو ایسے اخبارات سے مملو پاتے ہیں تو ہم بھی حسب ضرورت کچھ انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں چھپوا لیتے ہیں،

آج کل دانائے روزگار، سرمۂ اولوالابصار، ارسطو فطرت، افلاطون فطنت، جناب رفیع الاشان، عالی مناقب، مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے، استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے۔ نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے مضمون خیالی سے توارد ہوا ایسی تقریر فرمائی۔ ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کش ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔

نثر

یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ فساد سے خوش اور امن و امان

کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ سینکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اُس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو از بسکہ توجہ طرف رفاہ رعایا کے ہے۔ اُدھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔ الغرض بحال اگر اُس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے۔ جائے انصاف ہے جن ہوئیں للہ حاکمں نے اپنی فوج باغی لشکر اپنے حسن تدبیر و ضرب شمشیر سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوج جرار و لشکر بے شمار ساتھ ہے مخالفت کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔ ہندو مسلمان جاہل ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں۔ وہ اپنی سلامت و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ سستا اناج زراعت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تار بجلی میں پیام کے پہونچنے کی سرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں، حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں، ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے، بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے، وہ احمق ہے وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخشنود رہے، حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہر صورت ہے؛ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اُس شخص کی خوبیٔ قسمت ہے آدمی زحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے، امن و اماں کا طالب بخت و قسمت کا شاکی۔ غالب۔ فقط (ص ۲۸۱)

اودھ اخبار، لکھنؤ ——— (۱۴ر مئی ۱۸۶۲ء)

خیال خیر مآلِ رعنا

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۳ر اپریل سنہ رواں صفحہ ۲۸ میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم حضرت استادی جناب ذو المناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی دام افضالہم کی در باب تہدید و تنبیہ عوام و کج فہماں عہد میری نظر سے گزری، جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں با افغاناں میں عام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں،،

بہ تبعیت مضمون خیر اندیشی جناب مرشد ناہ استادنا حضرت غالب دام فضلہم بمادہ تنبیہ ابلہان نسبت شہرت جنگ اہل ایران، با افغانان ازانجا کہ تحریر جناب ممدوح کی حق بجانب اور عین خیر اندیشی حاکم و محکوم ہے، اس لیے اس کو نتیجہ نتائج خیر و عافیت عام خیال کر کے اس مطلب مافی الضمیر کو میں حتی الوسع بسیط کرنا سعادت جان کر واسطے مزید تنبیہ ہر خاص و عام عرض کر کے عارض ہوں کہ آپ بوسیلۂ اندراج اخبار گوہر بار خود بندگان خدا کو اس سے متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمایئے گا

اودھ اخبار لکھنؤ ——— (۲۴ر ستمبر ۱۸۶۲ء)

جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۷ر ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر الور میں مندرج ہے کہ مہاراجہ الور کے جنگل سے ایک شیر کو ٹٹی میں قید کر کر کئی روز گرسنہ کر کے جب وہ شور و شر سے باز رہا پنجرۂ آہنی میں گرفتار کر لائے

اے صاحب مہاراجہ صاحب تو والی ملک اور صاحب اقبال ہیں وہ تو شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کرا منگا دیں۔ ان کے رعب و عدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں پھر اُن کو شیر کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر تعجب خیز اور فسانہ حیرت انگیز گرفتاری زندہ شیر کا بے سر و سامانی

مطبوعات موصولہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کچھ پرانے خط: جواہر لال نہرو کے نام آئے ہوئے مشاہیر سیاست و ادب کے خطوط کا ایک انتخاب ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا تھا۔ جس میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے خطوط شامل تھے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اسے خود پنڈت جی نے مرتب کیا ہے۔ ان خطوط میں سے بیشتر خط مرتب ہی کے نام ہیں مگر کہیں کہیں استثنا بھی ہو گیا ہے یعنی کچھ خطوط موتی لال نہرو کے نام اور کچھ موتی لال کے دوسروں کے نام بھی شریک ہیں۔ اسی طرح مرتب نے چند اپنے خطوط بھی شامل کر لیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی شمولیت دوسرے خطوط کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگی۔

یہ مجموعہ نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کے خط شامل ہیں، بلکہ اس اہمیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان کے مکتوب الیہ کی شخصیت جدوجہد آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں ترین حیثیت کی ہے۔ نیز اس مجموعے کی قدر و قیمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ خطوط جس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی پیچ در پیچ سیاست کو اتنی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کوئی اور مواد پیش نہیں کر سکتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی نے اپنی روایات کے مطابق یہ تحفہ اردو ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور ہر حصے کی قیمت ۸ روپے ہے۔ جو کتاب کی باطنی خوبیوں کے علاوہ سفید لفظیں کاغذ صاف ستھری طباعت اور مجلد ہونے کی وجہ سے بہت معقول ہے

اس کے مترجم مولانا عبدالمجید حریری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بہت رواں اور شستہ اردو میں خطوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ آخر میں انڈکس بھی ہوتا تاکہ اسے حوالے کے طور پر استعمال کرنے والوں کو مطالب کی تلاش میں دشواری پیش نہ آتی۔

اردو ڈائجسٹ: لاہور اردو میں یوں تو کئی ادبی ڈائجسٹ شایع ہوتے ہیں اور سب دل چسپ اور کامیاب ہیں مگر خالص معلوماتی نقطۂ نظر سے ایک ڈائجسٹ کی کمی ہو برابر محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کا رسالہ مرتبین سے جس لگن محنت اور سلیقہ مندی کا مطالبہ کرتا ہے وہ بجائے خود حوصلہ شکن ہے لیکن اب لاہور سے چند نوجوانوں نے ریڈرز ڈائجسٹ کو نمونہ بنا کر اردو ڈائجسٹ جاری کیا ہے۔ اس رسالے کی کامیابی کا یہی ایک ثبوت کیا کم ہے کہ دو سال کے مختصر وقفے میں اس کے عام شماروں کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ گزشتہ نومبر میں اردو ڈائجسٹ نے اپنی دوسری سالگرہ پر ایک خاص نمبر شایع کیا تھا جو خاصا متنوع اور دلچسپ رہا۔ ہماری طرف سے اس ماہنامے کے مطالعے کی پر زور سفارش کی جاتی ہے اس لیے کہ اردو رسائل میں حسن صورت و سیرت دونوں کم نظر آتے ہیں اور یہ اردو ڈائجسٹ اُن گنتی کے رسائل میں ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔

بچوں کے لیے نظمیں: ننھے منوں کے لیے جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں جناب شفیع الدین نیر کا نام بہت ممتاز ہے۔ نیر صاحب نے بچوں ہی کی ہلکی پھلکی زبان میں شاعری کی ہے اور موضوعات کے انتخاب میں بھی بچوں کی نرم و نازک طبیعت اور معصومانہ دلچسپیوں کو سامنے رکھا ہے۔ وہ بچوں کو جو کچھ دیتے ہیں اس میں بچپن کی شوخیاں سمٹ آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ نیر صاحب بچوں کے مقبول اور محبوب شاعر ہیں اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ہماری نعت۔ وطنی نظمیں۔ منی کا تحفہ اور بچوں کا کھلونا۔

ہر ایسے گھر میں جہاں بچے ہوں ان کتابوں کو بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کتابوں میں وقتی تفریح ہی نہیں اصلاح اخلاق و عمل کا مقصد بھی کارفرما ہے۔

ملنے کا پتہ: نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی

نذر وطن: ہندوستان کی قومی تحریکات میں اردو ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ جنگ آزادی کا سب سے اہم نعرہ "انقلاب زندہ باد" اردو ہی کی دین ہے جس نے مخالف طاقتوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور آج بھی جوش و ولولے کا عظیم نشان ہے۔ چین کی حالیہ جارحانہ یورش نے ہر ہندوستانی کو متاثر کیا۔ اس ہنگامی موضوع پر کہی گئی اردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتبہ وہاب آفریدی علوی بک ڈپو بمبئی نے شایع کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرتب نے مدِ جارہ کو چھوڑ کر ساری اہم نظمیں شریک کر لی ہیں۔ ضرورت تھی کہ انتخاب کچھ اور سختی سے ہوتی جاتی تاکہ بعض کمزور نظمیں درج نہ ہو پاتیں۔ پھر بھی اس انداز کی کتابوں کو خریدنا چاہیے اس طرح قومی خیالات کی ترویج و ترقی ہوتی ہے جو کسی بھی ملک کی ترقی کی اور اس کی مضبوطی کی ضمانت ہے۔
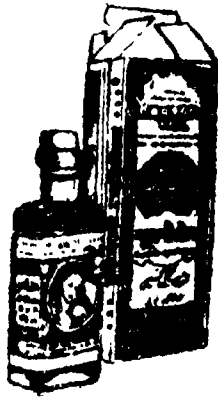
اڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار رکھیر گنج رام پور، یو پی سے شایع کیا۔

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نسخۂ عرشی: غالب کے اردو دیوان کا یہ ایڈیشن اپنی تاریخی ترتیب مقدمے اور حواشی کے لحاظ سے ایک مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ جس نے تحقیق و ترتیب کے فن میں اردو کا سر بلند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی نے اسے ۱۹۶۰ء کی اہم ترین اردو کتاب قرار دیتے ہوئے ایوارڈ دیا۔ (طباعت ٹائپ۔ قیمت ـــ ۲۰ روپے (مجلد)

نادرات شاہی: شاہ عالم ثانی کا اردو اور ہندی کلام جو [illegible] کے مدونین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ مغل بادشاہوں کی خدمت زبان کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا عرشی کے تفصیلی [illegible] نے اس کتاب کی اہمیت اور اُس دور کی تاریخ کو جس عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ (طباعت ٹائپ [illegible] ـــ ۸ روپے (مجلد

وقائع عالم شاہی: کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ جس [illegible] عہد کی نوادر معلومات درج ہیں۔ افراتفری کے دور کی ایک اہم تاریخ ہے۔ مولانا عرشی کے مقدمے اور حواشی نے مزید [illegible] کی نقاب کشائی کی ہے۔ تاریخ ہندوستان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ـــ ۸ روپے (مجلد)

سلکِ گوہر: انشا کی بے نقط کہانی جو [illegible] انشا کی صلاحیتوں [illegible] بہترین نمونہ ہے۔ اردو نثر کے کلاسکی نمونوں میں اس کتاب کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کا تعارف بھی مولانا عرشی [illegible] سے ہے اور اسے بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح ظاہر و باطن کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے (طباعت ٹائپ [illegible] روپے (مجلد)

متفرقات غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ اس کتاب میں ادیب صاحب نے غالب کی بہت سی نظم و نثر کی ایسی تحریریں جمع کر دی ہیں جو اس سے پہلے کبھی اور شایع نہیں ہوئیں۔ غالب سے متعلق لٹریچر اس کتاب کے بغیر نامکمل رہیگا۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ـــ ۵ روپے (مجلد)

اوراق گل: مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، ریاست رامپور کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے کا انتخاب جو بہترین آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ شاعر کی تصویر، تحریر اور حالاتِ زندگی نے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جوش، جگر، دانش، اختر شیرانی جیسے دو درجن سے زائد شعرا اس میں شریک ہیں۔ یہ تذکرۂ شعرا اپنے اہتمام طباعت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مثالی ہے۔ قیمت ـــ ۱۵ روپے (مجلد)

رامپور انتھالوجی: یہ کتاب مشرقی شعرا کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے جسے انگریزی کے مشہور شاعر جے اے چیپ مین نے ترتیب دیا ہے۔ حافظ، سعدی، غالب، خیام اور عرشی کے کلام کو جس خوبی سے انگریزی نظم میں منتقل کیا گیا ہے وہ لائق داد ہے اس لیے کہ اس میں کہیں بھی نزاکت بیان مجروح نہیں ہونے پائی۔ قیمت ـــ دس روپے (مجلد)

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یو۔پی

REGD. NO. A—466 42ND YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. JUNE 1
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

اکتوبر ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

سالانہ چندہ
دس روپے

قیمت فی پرچہ
پچہتر پیسے

GRUNDIG
جس کی دنیا بھر میں سنی جانے والی آواز ....
۱۳۸ ممالک میں لاکھوں کے لئے وجہ طرب و انبساط ہے
گرنڈگ
آل ٹرانسسٹر ریڈیو ماڈل ٹرانسونیٹ (۷۹)
سید بھائیز لمیٹڈ

ڈیو
ٹائلٹ صابن
حسن و رعنائی کا سرچشمہ
جلد کو تروتازہ رکھنے اور رنگ و روپ کو نکھارنے
کے لئے ڈیو صابن سب سے بہترین ہے
اس کے نفیس ملائم اور چکنے جھاگ تازگی اور فرحت
بخشتے ہیں ہمیشہ سب سے اعلیٰ اور دیرپا
ڈیو ٹائلٹ صابن استعمال کیجیے!
DEW
TOILET SOAP
DEW
قیمت ۶۰ پیسے
ڈیو صابن کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے
اسے چمکدار پنی میں مہر بند کیا گیا ہے!
فیروز سنز
لیباریٹریز لمیٹڈ
نوشہرہ، مغربی پاکستان

چہرے کی شگفتگی کے لئے

آرام سے سوتا ہے...
ہنسی خوشی کھیلتا ہے!

جی ہاں، گلیکسو پینے والے بچے تندرست، مطمئن اور ہنس مکھ ہوتے ہیں۔ آپ بھی اپنے بچے کو گلیکسو دیجئے۔ گلیکسو ایک مانع اطمینان بخش اور آزمودہ دودھ ہے جو پشت ہا پشت سے بڑے ہی اعتماد کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ اس میں وٹامن ڈی اور فولاد شامل ہیں تاکہ بچوں کی ہڈیاں اور دانت مضبوط ہوں اور وہ خون کی کمی (انیمیا) سے محفوظ رہ سکیں۔ اگر آپ صحیح طور پر اپنے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتیں تو گلیکسو پر اعتماد کیجئے۔ آپ خوش ہوں گی کہ آپ نے گلیکسو تجویز کرکے ایک صحیح خوراک کا انتخاب کیا۔

گلیکسو

بچوں کے لئے کتنا عمدہ دودھ ہے

گلیکسو لیبارٹریز (پاکستان) لیمٹڈ۔ کراچی۔ لاہور۔ چاٹگام۔ ڈھاکہ

CRAWFORDS

رجسٹرڈ نمبر ایس ۔ ۲۴۷۲

اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ

نیاز فتح پوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری — عارف نیازی

زر سالانہ — قیمت فی کاپی

دس روپے — ۷۵ پیسے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ ۔ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/ایف یو پی — بی ۳۶۶۹ — ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر، پبلشر:- ایم عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا (کتبہ صادق)

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ
آپ کا چندہ اس شمارہ کے ساتھ ختم ہوگیا

نگارِ پاکستان

مدیر اعلیٰ ـــــ نیاز فتحپوری

۴۲ واں سال	فہرست اکتوبر ۱۹۶۳ء	شمارہ ۱۰

ملاحظات

ملیر کا جامعۂ تعلیم ملّی

(ایک تاثر)

نیاز فتحپوری

ہر چند کراچی کے آنے کے بعد میں عزلت نشین سا ہو گیا ہوں اور یہاں کی علمی و ادبی تحریکات سے بھی بے تعلق ہوں۔ لیکن ذہنی حیثیت سے یہاں کی زندگی، یہاں کے رجحانات، یہاں کی ہلچل محسوس کرنے پر ضرور مجبور ہوں، دیکھتا ہوں، سمجھتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کیا کہوں بلکہ صرف اس لئے کہ کیوں کہوں۔

یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے اپنے بچّوں کی تعلیم کا سوال میرے سامنے آیا جو بالکل ناگزیر سی بات تھی اور بہت کوشش کی کہ یہاں کے نظام تعلیم کو سمجھ سکوں لیکن اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اگر اساتذہ و طلبہ کے حقیقی تعاون و توافق کے بغیر نظامِ تعلیم کو ناممکن سمجھا جائے تو یہاں کے اربابِ تعلیم نے اس کو ممکن کرکے دکھا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں طلبہ کے مطالبات ان کے ہنگاموں اور ان کے احتجاج سے میں اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا محکمہ تعلیم کی خوئے اعتراف سے۔ جسے آپ رواداری بھی کہہ سکتے ہیں اور مجبوری بھی۔

خیر یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہوتی ہی رہیں گی۔ دنیا کی رونق انھیں ہنگاموں پر قایم ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ سوال میرے سامنے آتا ہے کہ اگر پاکستان کی موجودہ نسل کا نشو و نما اسی اضطرار و اضطراب اور اسی سمجھ میں نہ آنے والی فضا میں ہوا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غیر معمولی انسان بننے کی کوشش میں معمولی انسان کے درجے سے بھی نیچے گر جائے (ممکن ہے آیندہ superman کا مفہوم بدل کر کچھ ایسا ہی ہو جائے) ہو سکتا ہے کہ میرا یہ خیال درست نہ ہو لیکن تعلیم کا جو تصوّر میرے ذہن میں ہے اس کے پیش نظر جب میں اس عہد کے طلبہ، اس عہد کے اصول تعلیم پر غور کرتا ہوں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے لیکن اس کے سوا کہ

دل را در آتش افگنم و بوئے او کنم

اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔

اب سے ساٹھ ستر سال پہلے میرے عہد طفلی میں جو اسلوب تعلیم رائج تھا اس کا تو خیر اب تصوّر کرنا بھی نادانی ہے اور اس میں شک نہیں کہ پچھلی نصف صدی میں انسان نے غیر معمولی ذہنی ترقی حاصل کر لی ہے لیکن یہ سوال کہ تعلیم کا

حقیقی مقصود کیا ہے۔ شاید اب زیادہ غور طلب ہوگیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تعلیم و تربیت دو علیحدہ چیزیں نہ تھیں اور دونوں کو باہم دگر لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ میرے کانوں نے ہمیشہ یہی سنا کہ تعلیم کا مقصود ہی تربیت ہے۔

لیکن اب صورت کچھ اور ہے یعنی نہ صرف یہ کہ تعلیم و تربیت کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا ہے بلکہ خود تعلیم کا مفہوم بھی بہت کچھ بدل گیا ہے اور تربیت کا تو خیر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ کہنا غلط تصور کیا جائے اور میری تردید میں اس تربیت کو پیش کیا جائے جس نے اس وقت انسان کو حدود افلاک تک پہونچا دیا ہے۔

لیکن معاف کیجئے میں اس کو میکانکی و مادی تربیت کی ترقی تو ضرور کہہ سکتا ہوں لیکن اخلاقی تربیت نہیں، حالانکہ انسان کا حقیقی شرف میکرتر دیک فرشتہ ہو جاتا نہیں بلکہ انسان ہی رہنا ہے۔ اور انسان بنانا ہی تعلیم کا حقیقی مقصد ہونا چاہیئے۔ لیکن خیر یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کی تفصیل میں جانے کا فی الحال موقع نہیں تاہم مختصراً اس کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے مجھے یہاں کے نظام تعلیم ہی پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور افسوس ہے کہ میں کسی اطمینان بخش نتیجہ پر نہ پہونچ سکا۔

مجھے پاکستان کے دوسرے شہروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن کراچی کی ۲۲ لاکھ کی آبادی کو دیکھتے ہوئے تعلیمی مدارس کی کمی یہاں بین طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ اور اسی لئے نئی نئی درسگاہیں قائم کرنا یہاں لوگوں کا پیشہ ہوگیا ہے جس کا مقصود تعلیم دینا نہیں بلکہ تعلیم کا سودا کرنا ہے۔ یہاں کی سرکاری درس گاہوں کا کیا حال ہے مجھے اس کی پوری واقفیت حاصل نہیں، لیکن ان درس گاہوں کے طلبہ کی بے راہ روی کو دیکھ کر بے اختیار میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ان کے اساتذہ سے گفتگو کروں (حالانکہ یہ بھی ایک بے نتیجہ سی بات ہو گی)

الغرض اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ ایک بار میرے سامنے کسی نے جامعہ ملیہ ملیر کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس دانشگاہ کا اسلوب کار دوسری دانشگاہوں سے مختلف ہے اس لئے مجھے اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس کو دیکھ کر میرے دل کا زنگ بہت کچھ دور ہو گیا۔

کسی پبلک ادارہ کا ذکر کرتے ہوئے کوئی ذاتی تذکرہ چھیڑ دینا مناسب نہیں، لیکن بعض صورتوں میں جبکہ پس منظر، منظر سے زیادہ اہم ہو یہ امر ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اس ادارہ کے بانی و موسس "ڈاکٹر محمود حسین" پاکستان کے ان چند مخصوص افراد میں سے ہیں جن کے ذکر میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا شمار ان نفوس میں سے ہے جن کے ذکر میں اگر قطعاً کسی قسم کے مبالغہ سے کام نہ لیا جائے تو بھی قحط انسانیت کے اس دور میں اسے مبالغہ یا قصیدہ نگاری ہی سمجھا جائے گا ....

.... اس لئے میں ان کی ذات سے قطع نظر صرف اُن شواہد و علائم کا ذکر کرونگا جو ڈاکٹر صاحب کی خصوصیات کامنہ کی وہ صور ظاہرہ اور وہ تعینات مادی ہیں جنکو آنکھ بند کرکے بھی محسوس کیا جاسکتا ہے

اب سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ پاکستان اپنے عہد شیر خوارگی سے گزر رہا تھا اور اس کی سرپرستی کے خفدار بھی متعدد پیدا ہو گئے تھے لیکن صرف اس حد تک کہ ان کا حق تو ریت ختم نہ ہو۔ اس طفل نوزائیدہ کے نشوونما اور اس کی صحیح تربیت کی کسی کو فکر نہ تھی۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں مجھے بھی یہاں آنے کا موقع ملا اور پاکستان کے مستقبل کے باب میں غلام محمد مرحوم سے

(جو میرے قدیم کرم فرما اور اس وقت یہاں کے حاکمِ کُل تھے) دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل صحیح نقشہ تھا اس وقت کے پاکستان کا۔ انھوں نے کہا:۔

"پاکستان کی حالت اس وقت ایک ایسی لاش کی سی ہے جسے چاروں طرف سے گِدھ نوچ رہے ہیں اور کوئی ان "گِدھوں" کو بھگانے والا نہیں"

میں نے کہا کہ

"خود آپ کیوں اس فرض کو ادا نہیں کرتے"

تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک بڑی معقول بات کہی، فرمایا کہ:۔

"یہ فرض صرف قوم کا لیڈر ہی انجام دے سکتا ہے اور مجھے قومی لیڈر ہونے کا شرف حاصل نہیں"

اس واقعہ کا ذکر میں نے صرف اس لئے کیا کہ ۵۲ء کے پاکستان کا مَوقف آپ کے سامنے آجائے۔ ظاہر ہے کہ اِس آپادھاپی میں بچّوں کی اصلاحِ اخلاق یا تعلیم و تربیت کا خیال کس کو پیدا ہو سکتا تھا لیکن چونکہ موجِ پستی کی انتہا پر پہونچنے کے بعد ہی بلندی کی طرف مایل ہوتی ہیں اسلئے یہاں بھی اسی عالم حضیض میں بعض افرادِ صحیح بلند فطرت و فراست رکھنے والے نمودار ہوئے جن میں سے ایک ڈاکٹر محمود حسین بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت محکمۂ تعلیم کے بہت اونچے درجہ پر ممتاز تھے اور جس حد تک دنیاوی فراغ و آسائش کا تعلق ہے وہ اس سے پوری طرح بہرہ ور تھے۔ وہ وزیر تعلیم بھی رہے۔ وائس چانسلر کی اہم خدمات بھی انھوں نے انجام دیں (اور اب بھی وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے صدر ہیں) لیکن ان میں سے کوئی اعزاز ان کی ذہنی ناآسودگی و قلبی اضطراب کو دُور نہ کر سکا اور تعلیم و تربیت کے اس صحیح تصوّر کو بروئے کار لانے کے لئے جس کی کوئی ہیئت اس وقت موجود نہ تھی انھوں نے اس درسگاہ کی بِنا ڈالی جو اس وقت جامعہ تعلیم ملّی کے نام سے موسوم ہے لیکن شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ جامعہ دفعتاً وجود میں نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس الہ دین کا چراغ نہ تھا کہ وہ اس کی مدد سے کراچی سے اٹھارہ میل دور ایک ویرانہ کو آن واحد میں آباد کر دیتے۔ بلکہ اس کے نشو و نما میں انھوں نے اسی تدریجی اصول کو سامنے رکھا جو ہر کام کی استواری کے لئے ضروری ہے۔

یوں تو مجلس تعلیم ملّی کا قیام یہاں تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہو گیا تھا اور اس کے صدر ڈاکٹر صاحب موصوف ہی تھے لیکن اس نے عملی صورت اختیار کی ۱۹۵۲ء میں جب کراچی سے ۱۸ فرسخ دور ملیر کی ایک مختصر سی شکستہ و بوسیدہ عمارت میں ابتدائی یا پرائمری اسکول کا افتتاح ہوا۔ پھر کسی ابتدائی مدرسہ کو جاری کر دینا تو کوئی نئی یا بڑی بات نہ تھی لیکن جس مقصد کے تحت یہ اقدام کیا گیا وہ یقیناً نیا اور بہت بڑا تھا۔ یعنی اس درسگاہ کے قیام کا مقصد صرف موجودہ علوم و فنون کا درس دینا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی ان اخلاقی روایات کو بھی قائم کرنا تھا جن کو عموماً نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور جن کا علم نہ ہونے سے ایک شخص تعلیم یافتہ تو بن سکتا ہے لیکن انسان نہیں بنتا۔

ظاہر ہے یہ کام محض تعلیم علوم و فنون کا نہ تھا، بلکہ تعمیر انسانیت کا تھا اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو جن دشواریوں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کو ڈاکٹر صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا ہم تو اس کا صحیح تصوّر بھی نہیں کر سکتے لیکن انھوں نے جس خاموش عزم کے ساتھ اس خارزار کو طے کیا اس کی دوسری مثالیں ہم کو کم ہی مل سکتی ہیں۔

دنیا میں جتنے انقلابات ظہور میں آئے ہیں وہ پند و مواعظ یا صحایف مقدسہ سے ظہور میں نہیں آئے بلکہ وہ نتیجہ تھے

محض شخصیتوں کے جوشِ عمل کے اور اگر میں یہ کہوں کہ اس جامعہ کا قیام اور اس کی ترقی بھی صرف شخص واحد" ڈاکٹر محمود حسین"
کی عظیم شخصیت کا نتیجہ ہے تو میرا یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا۔

کون کہہ سکتا تھا یا اس کا تصور بھی کرسکتا تھا کہ ملیر کی یہ درس گاہ ابجد دس سال کی قلیل مدت میں اتنا عظیم الشان دانش کدہ بن جائے گی کہ اس کو دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ نہیں سوچتا کہ یہاں کیا کیا ہے بلکہ یہ کہ " کیا نہیں ہے " اور جب میں نے ۱۵ ستمبر کو وہاں جاکر اس کی مختلف علوم وفنون کی تجربہ گاہوں کو دیکھا تو میں نے بھی یہی سوچا کہ " یہاں کیا نہیں ہے " اور دیر تک یہی سوچتا رہا۔ حیرت تھی کہ اتنی قلیل فرصت میں اتنا کثیر کام کیونکر ہوسکا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اور اساتذۂ جامعہ کی معیت میں، میں نے ہر ہر چیز کا بغور متحیرانہ مطالعہ کیا اور جب وہاں سے لوٹا تو اسی تحیّر کو ساتھ لیکر لوٹا جو آج تک دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

میں نے یہاں کی تمام سائنسی علوم کی تجربہ گاہوں کو دیکھا جن میں طبیعات، حیاتیات، نباتیات، جوانیات، اقتصادیات، سیاسیات وتشریحات، اور خدا جانے کیا کیا شامل ہے اور ان کے نظم وترتیب سے اتنا متاثر ہوا کہ دل و دماغ پر بوجھ سا محسوس کرنے لگا اور یہ بوجھ شعبۂ نقاشی میں پہونچ کر کم ہونا شروع ہوا اور وہ اسطرح کہ جب یہاں ایک نیم عریاں رقاصہ کے مجسمہ کو دیکھا جسے میں وہ رقص پر جانے سے پہلے اپنے پاؤں میں گھنگرو باندھ رہی ہے تو معًا حافظ کی " حدیث از مطرب و مے گو " والی فضا سامنے آگئی اور میں سب کچھ بھول گیا۔ اس وقت مجھے تو اس کی کمر کا بل، اس کی گردن کا خم اور اس کی کانٹے پر تلنے والی جوانی دیکھ کر کلیوپیٹرا یاد آرہی تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب اسے دیکھ کر یادِ خدا میں مصروف ہو گئے ہوں کہ احساس حسن وجمال کا انتہائی تاثر صوفیہ کے یہاں اس جذبہ پر ختم ہوتا ہے۔

جب میں نے دریافت کیا کہ یہ مجسمہ کس کی تخلیق ہے تو سامنے کی دیوار پر ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا گیا جو اس شعبہ کے اُستاد کی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس " ریش افلاطون " رکھنے والے انسان سے ملوں اور پوچھوں کہ یہ مجسمہ بناکر انھوں نے اپنے کن" ناکردہ گناہوں "کا انتقام قدرت سے لیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ علیل تھے اور بعد میں جب انکو دیکھا بھی تو بالکل سرسری طور پر اور دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ زندہ رہا تو اس " فتنہ " کا حال مزوران سے پوچھوں گا۔

میں جب اس صنم کدہ سے باہر آیا تو مغرب کا وقت تھا، طلبہ نماز میں مصروف تھے اور یہ (Con ...)
بڑا لطف دے گیا۔

اتفاق سے اسی دن مسجد جامعہ میں پرائمری اسکول کے طلبہ کی طرف سے مجلس میلاد النبی بھی منعقد ہونے والی تھی جس میں میں نے بھی شرکت کی اور سب سے پہلے یہیں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کتنی بلند و پاکیزہ شخصیت رکھنے والے انسان ہیں اس سے قبل وہ میرے ساتھ میری ہی طرح برہنہ سر چل پھر رہے تھے۔ لیکن جب مسجد میں پہونچے تو انھوں نے ٹوپی اپنے سر پر رکھ لی اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ ذکر نبوی سننے میں محو ہو گئے۔ میں اس وقت کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میرے کپڑے کسی نے اتار لئے ہیں اور ساری دنیا مجھ پر ہنس رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اپنی ذلت کا احساس لئے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ کر گھر واپس آگیا اور یہ یقین لیکر واپس آیا کہ اگر علومِ جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے جو اسلام کا نصب العین ہے تو اس وقت کراچی

تمام درسگاہوں میں صرف جامعۂ ملیہ ملیر ہی ایک ایسی درسگاہ ہے جو اس ضرورت کو پورا کر رہی ہے۔

خدا ڈاکٹر صاحب کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے اور جامعہ کے ارکان و اساتذہ و طلبہ کو انھیں کے کردار و پاکیزگیٔ اخلاق تقلید کی توفیق عطا کرے۔

اگر کبھی "کشا کش غم پنہاں" نے فرصت دی تو ایک بار پھر وہاں جاؤں گا تا کہ کچھ دیر یہاں کی پُرسکون فضا میں سانس بر دل و دماغ کا زنگ دُور کر سکوں۔

اخیر میں ایک بات اور عرض کرنا ہے وہ یہ کہ میں نے جامعہ کو اس وقت دیکھا جب وہاں تعطیل تھی اور مجھے یہاں کے سوب تعلیم اور اساتذہ و طلبہ کے ڈسپلن دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جو بنیادی چیز ہے۔ آئندہ میں اس کے معلوم کرنے کی بھی شش کروں گا اور اگر اس باب میں کوئی صحیح مشورہ دے سکا تو وہ بھی عرض کروں گا۔

○

دُنیا کا ہولناک مستقبل

موجودہ سیاستِ عالم جسے بین الاقوامی سیاست بھی کہتے ہیں آجکل بظاہر بڑی پیچیدہ نظر آتی ہے۔ لیکن میں ھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بعض حقائق ایسے بھی سامنے آرہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر سیاستِ عالم کے مستقبل پر حکم لگانا زیادہ شوار نہیں رہ جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی سیاست کا محور اب بھی ایک حد تک روس و امریکہ ہی ہیں۔ لیکن موجودہ صورتِ حال ا مختلف ہے۔ پہلے تو یہ دونوں ایسے خطوط متوازی پر چل رہے تھے جن کے ملنے کا امکان ہی نہ تھا لیکن اب ان میں کچھ انحنار ہ جھکاؤ پیدا ہوتا نظر آتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت یہ دونوں خط ایک دوسرے سے مل جائیں اور اگر ایسا ہوا تو سمجھتا ہوں کہ یہ وقت دنیا کی تمام دوسری قوموں کے لئے بڑی آزمائش و ابتلا کا وقت ہوگا۔

اس سے پہلے امریکہ و روس سرمایہ و عمل کی دو متضاد قوتوں کا نام تھا اور ان کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار حائل ی جسنے ان دونوں کے اشتراک عمل کو ناممکن بنا دیا تھا لیکن اب اس دیوار کی بلندی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے اور اگر وئی اچھی بات ہے تو اس کا امتیاز امریکہ نہیں روس کو حاصل ہے۔

آپ روس کی تاریخ اشتراکیت کا مطالعہ کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ بالشویت کے نقوش اولین آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ا اور لینن کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک کے رجحانات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو بڑا فرق نظر آئے گا۔ لینن اشتراکیت یڈر تھا۔ اسٹالن اس کا مستبد حکمراں اور خروشچیف نہ یہ ہے نہ وہ بلکہ ایک زمانہ پرست انسان جو صرف دولت و امارت خواہاں ہے اور اشتمالیت و ڈیماکریسی دونوں کا حامی بھی اور مخالف بھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے سائنسی علوم میں بڑی ترقی کر لی ہے اور اس باب میں امریکہ سے کسی طرح کم نہیں لیکن خروشچیف ھتا ہے کہ اصل چیز ثقافتی ترقی ہے اور اس باب میں وہ امریکہ کے مقابل نہیں ہے۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اقتدار صرف جنگ سے

حاصل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ لڑائی میں کوئی حریف برابر کا نہ ہو تو وہ اپنی آیٹمی قوت سے اس وقت تک ساری دنیا پر قابض ہو چکا ہوتا۔ لیکن چونکہ اس باب میں وہ امریکہ سے خایف ہے اس لئے اپنے حصول اقتدار کے لئے اب وہ دوسرے ذرائع اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ڈیماکریسی کے حدود تک پہونچکر وہ روس و امریکہ کے درمیانی فاصلہ کو کم کرتا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت روئے زمین کو دو حصّوں میں بانٹ کر ایک حصہ امریکہ کے پاس رہنے دینے پر راضی ہو جائے اور دوسرے پر خود تسلط قایم کرنے کے لئے امریکہ کو راضی کر لے۔

خروشچیف کی اس پالیسی پر ہلکی سی روشنی اس وقت پڑی جب کیوبا سے وہ اُلٹے پاؤں واپس آیا اور پھر اس کے بعد آیٹمی تجربات کی تنسیخ پر جتنا زور دیتا رہا اتنی ہی یہ روشنی واضح ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بھارت و چین کی حالیہ آویزش اور چین سے قطع تعلق کرنے کے بعد وہ بالکل بے نقاب ہو گیا۔ پھر آج بھارت و پاکستان اور دنیا کے تمام کیمونسٹ جو چاہیں کہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ کیمونزم اب دم توڑ رہی ہے اور اس کی جگہ حد درجہ خطرناک و خوفناک چیز ایک اور پیدا ہو رہی ہے جس کی اصطلاح تو اب تک وضع نہیں ہوئی لیکن اگر کبھی ہوئی تو وہ یقیناً بربریت وسبعیت ہی کی مترادف ہوگی۔ اور اس میں روس و امریکہ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ چین سرحدی نزاع کے سلسلہ میں بھارت پر پیشقدمی کیا پیش قدمی کی صرف نمائش کرتا ہے اور باوجود کامیابی کے واپس لوٹ جاتا ہے لیکن امریکہ اسے دنیا کا عظیم ترین سانحہ قرار دیکر بھارت کے لئے اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے اپنے تمام ہولناک آلاتِ حرب و ذرائع جنگ اس کے لئے وقف کر دیتا ہے اور بھارت بے تامل اسے قبول کر لیتا ہے اور اسے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ سودا ہے اس کی عزت و خود داری کا اور امریکہ کا یہ "نوازش بے پایاں" دراصل تمہید ہے بھارت کو *stepping stone* بنا کر تمام ایشیا پر چھا جانے کی جس میں بھارت بھی شامل ہے۔ پھر اس کے ساتھ آپ روس کی پیش کش اور چین سے بگاڑ کر لینے کی نوعیت پر غور کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس و امریکہ دونوں اس پرانی دنیا کو توڑ پھوڑ کر دوسری دنیا بنانے اور اس کو آپس میں بانٹ لینے کی فکر میں سرگرداں ہیں ورنہ سچ پوچھئے تو نہ چین میں یہ دم کہ وہ بھارت پر حملہ کرے نہ امریکہ کو اس بات کا یقین کہ وہ کبھی اس کی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن بات تو صرف موقع سے فائدہ اٹھانے کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ امریکہ اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے اور بھارت نے ناک کٹ جانے کی حد تک اسے گوارا کر لیا۔

ان حالات میں قدرتاً امریکہ کے سامنے پاکستان و کشمیر کا سوال بھی آنا چاہیئے تھا سو آیا اور امریکہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر بہت کوشش کی کہ وہ اپنے خلوص کا یقین پاکستان کو دلا سکے لیکن چونکہ امریکہ پہلے ہی بھارت کو بے اندازہ سامانِ حرب دے کر پاکستان کے ساتھ اپنے خلوص کی تکذیب کر چکا تھا اس لئے جیتی مکھی نگلنا پاکستان کے لئے ممکن نہ تھا اور اس نے مجبوراً توازن قائم رکھنے کے لئے چین سے رشتۂ اتحاد قایم کیا۔

بہر حال دنیا کی سیاست اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ اور امریکہ و روس دونوں بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ اگر کہیں سے پٹاخہ کی آواز بھی آ جائے تو وہ بھارت و پاکستان کیا سارے ایشیا کو بھون کر رکھ دیں اور پھر یہاں ایک نئی دنیا آباد کر کے دونوں آپس میں بانٹ لیں۔

میرا نظریۂ شعر اور میری شاعری

جمیل مظہری

یورپ میں ارسطو سے ایلیٹ تک اور ایشیا میں ابن قدامہ سے کلیم الدین احمد تک شاعری کے جو بیشمار نظریئے اور تصورات ہیں اور اکثر ان میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں لیکن ان تمام مباحث کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اتنی بات سب میں مشترک ملے گی کہ شاعری نام ہے جذبات کی ترجمانی کا، منظوم ترجمانی کا۔ منظوم کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ایک خطیب، ایک ادیب بلکہ ایک مؤرخ بھی کبھی کبھی جذبات انسانی کی کامیاب ترجمانی کر جاتا ہے مگر اس کے جملے ادبی حسن کا بہترین شاہکار ہونے کے باوجود شعر نہیں کہے جاتے کیونکہ شعر تو اسی کو کہا جائے گا جو عروض کی زنجیر کا پابند ہو۔ اور عروض کی یہ پابستگی کیا ہے؟ اصوات کا باہمی توازن اور الفاظ کی موسیقارانہ تنظیم جو بجائے خود اس بات کی شہادت ہے کہ شاعری ہی وہ اکلوتی بیٹی تھی جو موسیقی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اصوات کے توازن اور آوازوں کے آہنگ میں نطق انسانی نے جب معانی کا تعین کیا تو شاعری نے موسیقی کی آغوش میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا اب آیئے مقصود اصلی کی طرف۔ ارباب فکر و نظر کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ شاعری نام ہے جذبات کی منظوم ترجمانی کا لیکن کیا جذبات کی اس منظوم ترجمانی نے انسان کے سینے میں پیدا ہونے والے تمام جذبوں کا احاطہ کیا ہے؟ شاید نہیں کیونکہ تمدن کے کھیت میں ادب کی جو پہلی کونپل پھوٹی اس وقت سے لیکر آج تک ہمارے تمام فنون لطیفہ ہمارا ادب اور خصوصیت کے ساتھ ہماری شاعری ایک لفظ محبت کی تشریح و توضیح میں اپنی ساری توانائی صرف کرتی آ رہی ہے اور بدقسمتی سے ہو یہ رہا ہے کہ:-

زمانہ جس قدر شرح محبت کرتا جاتا ہے
محبت اور مبہم اور مبہم ہوتی جاتی ہے

حالانکہ محبت کے علاوہ انسان کے سینکڑوں جذبے ایسے تھے جو آج بھی اس کے سینے میں گھٹ رہے ہیں، ہونٹوں میں پھڑک رہے ہیں، آنکھوں میں سسک رہے ہیں لیکن شاعر کو اپنے جذبۂ جنسی کی خاطر داری سے اتنی فرصت نہیں کہ ان کی طرف متوجہ ہو۔ کتنے ہی جذبے ایسے ہیں جن کا وجود ہی شاعر پر گم ہے اور شاعر کا شعور جنکا سراغ لگانے سے آج تک قاصر رہا ہے لیکن سینکڑوں جذبے ایسے بھی تھے جو اس کی آنکھوں کے سامنے چیخ چیخ کر اسکو بلاتے رہے اور اس نے آج تک ان کی فریاد نہ سنی اور سنی بھی تو اس جذبے کی فریاد

جس کا رابطہ براہ راست اس کے جنسی شعور سے تھا جس کا نام اس نے محبت رکھا اور محبت بھی کیسی خالص جسے مشکل ہی سے محبت کہا جا سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جنسی کشش کے تحت جو تعلق خاطر پیدا ہوتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک جنسی مطالبہ ایک جنسی گھٹن اور ایک جنسی ناآسودگی ہوتی ہے جسے تمنائی اپنی سادگی سے محبت سمجھ لیتا ہے اور غالب کے منہ سے یہ طعنہ سنتا ہے کہ :-

" خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار "

بہرحال یہ جنسی کشش محبت ہی سہی لیکن محبت کی اور بھی تو قسمیں تھیں جو اس تشنگی سے زیادہ ہمدردی کی مستحق تھیں۔ شاعری نے ان کا فرض کہاں تک ادا کیا۔ ماں بیٹے کی محبت، بھائی بہن کی محبت۔ بھائی بھائی کی محبت، آقا و غلام کی محبت، استاد و شاگرد کی محبت، وہ محبت جو گھوڑوں اور کتوں کو اپنے مالکوں سے اور مالکوں کو ان سے ہوتی ہے وہ محبت جو کسان کو اپنے کھیت سے ہوتی ہے۔ گھوڑا جو اپنے مالک کو دیکھ کر ہنہناتا ہے یا کسان کے دل میں اپنے کھیت کی لہلہاتی ہوئی بالیوں کو دیکھ کر جو تموج پیدا ہوتا ہے کیا شاعری کے لئے مصوری کے لئے جذبات کی ترجمانی کے لئے مناسب موضوع نہیں بن سکتے تھے؟ لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے فنکار ابتدائے تمدن ہی سے اپنی جنسی گھٹن کے ماتم دار رہے۔ اور لفظ و معانی کی دنیا میں اسی ماتم داری کا نام شاعری پڑ گیا ع

" غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ "

دنیا کے ادبیات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس دفتر ابتر کے نوے فیصدی صفحات اسی جذبے کے خون سے منقوش نظر آئیں گے۔ آپ نے اس مختصر تمہید سے بڑی حد تک میرے نظریہ شاعری کا اندازہ کر لیا ہوگا اب رہی اس کے گوشوں کی مزید وضاحت تو چند لفظوں میں یہ بھی سن لیجئے کہ جہاں تک میرا محدود مطالعہ ہے مجھے دنیا کے انھیں شاعروں سے عقیدت رہی جنہوں نے جنسی جذبے کے علاوہ اور بھی جذبوں کی ترجمانی کو اپنی شاعری کا مقصود بنایا شکسپیر کو میں تمام مغربی شاعروں کا سرتاج اس لئے سمجھتا ہوں کہ اس نے مختلف جذبات کی ترجمانی کی اور صرف ترجمانی ہی نہیں بلکہ ان گمشدہ جذبوں کا سراغ بھی لگایا جو ہم میں موجود رہ کر ہمارے لئے گم تھے۔ ہندوستانی شعرا میں کبیر اور تلسی داس اور ایرانی شعراء میں فردوسی اور سعدی کے سامنے عقیدت کی پیشانی میں اس لئے جھکا ہوں کہ انھوں نے ہمارے سینکڑوں جذبوں کا پتہ ہمیں بتایا اور سینکڑوں جذبوں سے ہماری ملاقات کرائی بنا سکے لئے سعدی کا یہ شعر جو اپنے ناصحانہ لب و لہجہ کی بنا پر مکاتب کی دنیا سے باہر نہیں نکلا۔

یا مکن با پیل بانان دوستی
یا بنا کن خانۂ بر پائے پیل

جب یہ شعر میرے سامنے پڑھا جاتا ہے تو مجھے اپنے معاشرہ کے اس مفلوک الحال اور غیور انسان کی خجالت سے جھکی ہوئی پلکیں یاد آتی ہیں جو اپنے ایک ذی حیثیت مہمان کی میزبانی کے فرائض اس کے شایان شان ادا نہ کر کے اپنے دل کا خون اپنی نگاہوں سے پیتا رہا۔ اسی طرح عرفی کا یہ شعر جب کسی زبان سے سن لیتا ہوں :-

بہ رنج بازوئے پر تیغ کاسبان ضعیف

بچین ابروئے بے وجہ خواجگان کبار

تو مجھے اس چین ابروئے بے وجہ میں حاکم و محکوم اور خادم و مخدوم کے تعلقات باہمی کی کتنی ہی ناخوشگواریاں
نیاں بیک وقت عرفی کی زبان سے تمدن اور سماج پر تنقید کرتی نظر آتی ہے۔ بندگی اور بیچارگی کے جذبے کی یہی
لومیت جو اقبال کی زبان سے خدا اور اس کی خدائی پر بھی اس طرح تبصرہ کرتی ہے۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے — خداوندا خدائی درد سر ہے

ولیکن بندگی استغفر اللہ — یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

مذکورہ بالا قطعہ میں ہمیں اقبال کے نظریۂ شاعری کی وہ معنوی وسعت نظر آتی ہے جس نے انھیں اپنے عہد
نیا کا سب سے بڑا شاعر بنایا۔ خیر آگے بڑھیے "زہر عشق" جیسی بدنام مثنوی میں ہیروئن کی خودکشی پر اس کی
کے بیشتر اشعار جب کوئی گنگناتا ہے تو مجھ پر ایک ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے جسے میں لفظوں میں
نہیں کرسکتا۔

باغ عالم سے نامراد چلیں — دے کے اماں کو اپنی یاد چلیں

ایسی اماں سے ہوگئیں بیزار — لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار

زہر عشق کے آخری صفحات میں جن جذبوں کی ترجمانی کی گئی ہے ان کی تقدیس کی گواہی مولانا عبدالماجد دریابادی
زاہد خشک تک نے دی ہے یہ نصیحت کے پیرائے میں یہی وہ جذبات نگاری تھی جس نے نواب مرزا شوق
عرائے درجۂ دوم کے زمرے سے نکال کر دفعتہً شعرائے درجۂ اول کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اپنے ذوق شعری کی
ت کہاں تک کروں آتش کے یہ مصرعے مجھ میں روحانی شعور پیدا کرتے ہیں۔

ع چار دیواریں اکٹھی ہو کے زنداں ہوگئیں

ع سبز پتے اس جہاں سے زرد صورت لے گئے

ع بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ایک مکتبی نظم گائے کا یہ شعر جب بھی میرے سامنے آیا تو اس نے تھوڑی دیر
لئے ایک محویت سی مجھ پر طاری کردی۔

پانی لہریں مار رہا ہے

چرواہا چمکار رہا ہے

اُردو کے تمام شعراء میں نظیر اور انیس مجھے سب سے زیادہ محبوب اس لئے ہیں کہ انھوں نے اپنے
وحال کے مختلف انسانوں کے مختلف جذبات کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ نظیر کے یہ مصرعے

(۱) سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلیگا بنجارا

(۲) کوڑی نہیں تو کوڑی کے سب تین تین ہیں

یا انیس کے یہ مصرعے

نا خدا جاتا ہے گھر جانے اور اب تم جانو
بھائی بڑا ہے سر پہ نو سایہ ہے باپ کا

جن جذبوں کی شدت کے ترجمان ہیں وہ بھی ہماری زندگی میں بڑا دخل رکھتے ہیں۔ یہ شاعر کی کم نظری تھی کہ اس نے تمام جذبوں کی طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی جذبہ کو ترجمانی کا حقدار سمجھا جو ایک مرد کے لئے عورت کے دل میں اور ایک عورت کے لئے مرد کے دل میں پیدا ہو کر اپنی محرومی اور نارسائی کی نوحہ خوانی کرتا ہے۔ یہی وہ قصور ہے جس نے ہماری شاعری کے معنوی دائرہ کو محدود سے محدود تر کر رکھا ہے اور یہی وہ شعور ہے جس نے رشید احمد صدیقی کی زبان سے انشتین کے اشعار کو اردو کی آبرو کہلوایا۔

مبصرین ادب نے شاعری کی دو قسمیں معین کی ہیں ایک خارجی اور دوسری داخلی۔ داخلی وہ ہے جس میں شاعر اپنے قلبی احساسات کی ترجمانی کرتا ہے اور خارجی وہ جس میں وہ گرد و پیش کے حالات و تاثرات کا جائزہ لیتا ہے لیکن میرے خیال میں خارجیت اور داخلیت کی یہ تقسیم ہی بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ خارجیت اور داخلیت میں جو نفسیاتی رشتہ ہے وہ کسی حال میں ایک کو دوسرے سے بے نیاز نہیں ہونے دیتا۔ میں کسی شاعر کے لئے جائز نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے دل کی داخلی دنیا میں اپنے کو نظر بند کرے۔ یہی وہ اس کا نفسیاتی قصور ہے جس پر غالب اپنے مخصوص انداز میں طنز کرتے ہیں

حسد سے دل اگر افسردہ گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

اور غالب ہی کے ایک مقلد حنیف علی رعب غالب کے اس پیام کی تشریح کرتے ہوئے ہمیں اپنے تعین ذات کی چودھری کو گرا دینے کا مشورہ دیتے ہیں

اُڑا لے قیس اپنی خاک اور محو تماشا ہو
تعجب کیا ہے دیوانے اسی پردے میں لیلا ہو

اور غالب کے فلسفۂ حیات کا شارح اقبال بھی اس کم بینی پر اس طرح معترض ہے :-

نظر بہ خویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

لیکن جیوں جیوں میرا شعور شاعری پیدا ہوتا گیا میں یہ محسوس کرتا گیا کہ شاعری صرف اپنے دل کی دھڑکنوں کے گننے کا نام نہیں ہے۔ شاعر وہی ہے جو دوسروں کے دل کی دھڑکنوں کو بھی اپنے اشعار میں سمو سکے کیونکہ شاعری اگر نام ہے داخلی جذبوں کی ترجمانی کا تو اس داخلیت کی گنجائش خارجی دنیا میں زیادہ ملیگی قدم قدم پر ملے گی۔ نت نئے بھیس میں ملے گی۔ نت نئی نقابیں اوڑھے اور نت نئی کیچلیاں پہنے ملیگی۔ ان کیچلیوں کو ادھیڑنا اور ان نقابوں کو نوچنا اور نوچکر ان کے اندر سے جذباتی حقیقتوں کو نکالنا اور نکال کر دیکھنا اور دکھانا ہی تو شاعری کا مقصود اصلی ہے۔

کائنات کی اس پہنائی میں صرف انسان ہی نہیں بستا۔ اس لامحدود وسعت میں مہر و ماہ و انجم

بھی تو ہیں۔ نباتات و جمادات بھی تو ہیں ایک بڑے شاعر کا سامعہ تو انکے دل کی دھڑکنیں بھی سن سکتا ہے اور دیکھئے اقبال کس طرح سن رہا ہے۔

آئے جو قران میں دو ستارے کہنے لگے ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجام خرام ہو تو کیا خوب

اور عرفی کو دیکھئے کہ اس پھیلی ہوئی کائنات پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کیا کچھ دیکھ رہا ہے

بہ تنگ نائے گریبان بہ وسعت دامن
بہ خاکساری کفش و بہ نخوت دستار
بہ انبساطِ مکان و بہ امتیازِ جہت
بہ اختلاطِ میان و بہ احترازِ کنار

دیکھا آپ نے کس طرح ایک بڑے شاعر نے دستار کی بلندی میں نخوت اور کفش کی لپستی میں خاکساری وسعت کی میان میں اختلاط کی کیفیت اور کناروں کی علیحدگی میں احتراز کا جذبہ دیکھ لیا۔ شاعرانہ بصیرت کی اس گیرائی کے مقابلہ میں ان شاعروں کی تنگ نظری بھی قابل غور ہے جن کی نظر کائنات کی اس وسعت میں اپنی محبوبہ کے خط و خال سے آگے نہیں بڑھتی اور اپنی اس یک بینی پر ناز بھی کرتی ہے ع

چہ کنم کہ چشم یک بیں نہ کند بہ کس نگاہے

جب ہی تو غالب نے اپنے ان دوستوں کی اس یک بینی کا احساس کرتے ہوئے بڑی شدت سے یہ اعلان کیا کہ

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سربسر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

خیال طرۂ لیلیٰ کوئی گناہ نہیں ہے۔ گناہ یہ ہے کہ طرۂ لیلیٰ اپنے تمام نیرنگیوں کے ساتھ شاعر کے ساتھ شاعر کے ذہن پر اس طرح چھا جائے کہ رنگ و نور کی دنیا میں کوئی رنگ اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے اور نور و ظہور کی کوئی کرن اس سیہ خانے میں کسی روزن سے داخل نہ ہونے پائے۔ کائنات کے اس محشر آب و گل میں جہاں زندگی ہر طرف کراہ رہی ہے۔ ہنگامے چیخ رہے ہیں خاموشی سسک رہی ہے۔ ایک شاعر کے لئے رخسار جاناں کے تصوّر میں اپنے دل کے کان بند کئے رہنا کہاں تک جائز ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک عظیم شاعر اپنی آپ بیتی کو بھی جگ بیتی بنا دیتا ہے جیسے میر نے بنا دیا۔

شام سے ہی بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
ہوش کس میں کہ حال میر سنے حال ہی ہے کچھ اور مجلس کا

بلاشبہ ایک جذباتی شاعر جیسے حالات نے بقول غالب تنگنائے غزل میں بند کر رکھا ہو کبھی کبھی اس تنگنائے غزل میں بیرونی دنیا کی کیفیتوں کو بھی سمیٹ لیتا ہے یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اس کا تغزل ذاتیات کی چار دیواری سے نکل کر آفاقی اور کائناتی ہو جاتا ہے۔ اردو میں اس کی مثالیں غالب کے علاوہ درد، میر

رشاد کے یہاں بہ کثرت اور سودا، مصحفی اور آتش کے یہاں خال خال ملتی ہیں:

میرزا سودا فرماتے ہیں:-

ساقی ہے اک تبسمِ گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

مصحفی کہتے ہیں:-

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

آتش:-

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

کوئی تو دوش سے بارِ سفر اتارے گا
ہزار راہزن امیدوار راہ میں ہے

ان بزرگوں کے علاوہ ہمارے اور اساتذہ بھی اپنے ذوق کی تنگی کے باوجود بعض اوقات تغزل کے پیرایے میں زندگی اور کائنات کے عظیم حقائق کی طرف واضح اشارے کر جاتے ہیں حتیٰ کہ انشا کے بسا اول جلول شاعر بھی جب بیابان کے حسن ویرانی کو سبزہ و گل کی بے محل نمائش کے ہاتھوں لٹتا ہوا دیکھتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے

کہ کوہ و دشت کو شادابیوں نے لوٹ لیا

یا جب وہ آندھیوں کے سہارے حقیر تنکوں کی پرواز کا منظر دیکھتا ہے تو ہمیں اس حقیقت کبریٰ سے روشناس کرتا ہے۔

یہ گرد و باد بھی اک شے ہے جس کے دامن سے
بہت سے ہیں خس و خاشاک مضمحل پتے

انشا ہی پر منحصر نہیں ذوق اور ناسخ جیسے لفاظ شعرا بھی کبھی کبھی معنی آفرینی میں حقیقت نگاری حق اس طرح ادا کرتے ہیں:-

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے
(ذوق)

میری آنکھوں کا کیا کہنا کہ قطرہ آبِ نیساں کا
درِ شہوار بن سکتا ہے آنسو بن نہیں سکتا (ناسخ)

انتہا یہ ہے کہ واغ جس کی معاملہ بندی خلوت تا نہ و نیاز سے باہر نہیں نکلتی کبھی کبھی اپنے گرد وپیش کے حالات سے یوں بھی متاثر ہوتا ہے۔

لذت سیر دگر چشم تماشا لے گی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی
ترے جور نہاں کو کیا کوئی جانے فقط آسماں آسماں ہو رہا ہے

دور حاضر کے اساتذہ میں ریاض، اصغر، اور جگر کے یہاں زندگی کے یہ حقائق تغزل کے پیرائے میں جا بجا ملتے ہیں:۔

جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
(ریاض)

زند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر ہو جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مےخانہ بنے
(اصغر)

اللہ رے اس گلشن ایجاد کا عالم
جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

ناانصافی ہو گی اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ ہمارے موجودہ دور کے نوجوان شعراء میں یہ شعور خصوصیت کے ساتھ پروان چڑھ رہا ہے مثال میں ہم اپنے صوبے ہی کے چند نوجوان اور سربرآوردہ شعراء کے یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

ایک دیوانہ بنا فصلِ بہاری میں اگر
سینکڑوں بن گئے زنجیر بنانے والے
(کلیم عاجز)

رفوگران قبائے بہار میں ہم لوگ
تمام عمر کٹی دل کا چاک سینے میں
(رمز)

یہ سایہ نشینان گذرگاہِ تمنا
کچھ عشق کے کچھ عقل کے بہکائے ہوئے ہیں
(وفا ملکپوری)

ہر پھول کی قسمت میں کہاں نازِ عروساں
کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لئے بھی (ہوش عظیم آبادی)

مذکورہ بالا اشعار میں زندگی کے جن حقائق اور حوادث کی طرف اشارے کئے گئے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر مفکر کم وبیش اسی طرح سوچتا ہے لیکن شاعر کی زبان سے یہی تلخ حقیقتیں ایک پیرایہ لطیف اختیار کر کے جب ہمارے کانوں میں رس نچوڑتی ہیں تو ہمارا ناطقہ بے ساختہ چٹخارہ لینے لگتا ہے۔ قبول خاطر و لطف سخن اسی کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ لطف سخن کہاں تک طبع زاد ہے اور کہاں تک خداداد ہے یہ ایک بحث ہے جسے چھیڑنے سے پہلے ہمیں شاعر کی ذہنیت کا نفسیاتی مطالعہ کرنا چاہئے۔ شاعر کا ذہن اپنی نفسیاتی کیفیات کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک نبی کے ذہن سے مماثلت رکھتا ہے گو یہ مماثلت خفیف سہی پھر بھی مولانا روم نے اسی مماثلت کا احساس کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ؏

"شاعری جزو لیست از پیغمبری"

مذہب کی اصطلاح میں جس وجدانی حالت کو وحی و الہام کہتے ہیں اسی کی ایک ادنیٰ کیفیت کو ہم شاعری کی اصطلاح میں قوتِ متخیلہ کہتے ہیں۔ شاعر اسی قوتِ متخیلہ کے سہارے پردے کے اس پار رہ کر بھی اُس پار کی باتیں کرتا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کے ذریعہ وہ بہت سی ان دیکھی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور پھر اپنی قوتِ ناطقہ کی اعانت سے ہمیں بھی دکھلا دیتا ہے۔ فارسی میں حافظ اور اُردو میں غالب اسی قوت کے فیضان سے لسان الغیب اور خلاق معانی ہیں۔ یہی معانی کی خلاقی اور یہی لسان الغیبی جب ہمیں پردے کے اس پار کی خبر دیتی ہے تو ہمیں سمجھانے کے لئے پردے کے اس پار کی ان چیزوں کا سہارا بھی لیتی ہے جو ہماری جانی بوجھی اور دیکھی ہوں اسی سہارے کا نام تشبیہ ہے اور اسی ضرورت کو کہتے ہیں استعارہ جس کی حقیقت کا پردہ غالب یوں فاش کرتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے دیکھا نہیں ہے ان چیزوں کو اگر ہمیں دکھلایا جائے تو سوائے اسکے اور چارہ ہی کیا ہے کہ ہماری دیکھی اور پہچانی ہوئی چیزیں جو ہمیں مرغوب اور پسندیدہ ہوں انھیں کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے جب ہمیں مسرور کرنا ہو تو انھیں چیزوں کا حسن مستعار لیا جائے جو ہمیں محبوب ہوتی ہیں اور جب مرعوب کرنا ہو تو انھیں چیزوں کے رعب وجلال سے استعارہ کیا جائے جن سے ہم ڈرتے ہیں۔ مذہب نے بھی یہی کیا اور شاعری بھی یہی کرتی ہے جس کی مثال حافظ کے اس مشاہدۂ حق کے تعارف سے روشن ہوگی۔

در ازل پرتو حسنت بہ تجلی دم زد
عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد
عقل میخواست کز اں شعلہ چراں افروزد
برق غیرت بدرخشید و جہاں برہم زد

شعلہ و برق سے چونکہ ہم مرعوب ہیں اور متاثر اسلئے ایک برہم زدگی کی شدت کو ہمیں سمجھانے کی غرض سے حافظ نے شعلہ کا التہاب اور برق کی تپش مستعار لی۔ لیکن تشبیہیں ہوں یا استعارے حقیقت کی

توضیح و تعریف کا ذریعہ ہیں مقصود نہیں۔ جہاں یہ ذریعہ نہیں مقصود بن جائیں وہیں سے شاعری شاعری نہیں صنعت گری بن جاتی ہے۔ اور روح سخن کا زوال بتدریج یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ تشبیہات و استعارات کے سلسلہ میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے کہ جو چیزیں جتنی زیادہ ہمارے ذہن پر مسلط ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ ہم تمثیلات میں ان سے کام لیتے ہیں جن کے اعصاب پر بقول اقبال عورت سوار رہتی ہے انھیں ستونوں کی گولائی اور محرابوں کے خم میں بھی محبوبہ کے بھرے بھرے بازو اور کھنچی کھنچی بھویں نظر آتی ہیں اور کبھی کبھی اس مشاہدے کا ہیجانی اظہار شعریت کو بدمذاقی کے حدود میں لے آتا ہے جیسے ایک مذہبی نظم میں ہمارے شاعر انقلاب کا یہ مصرع کہ

کولھے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات

الغرض تشبیہیں ہوں یا استعارے شاعری میں فکر و تخیل کا وہ پل صراط ہیں جس میں پھونک پھونک کے قدم رکھنے کی ضرورت ہے اس میں ذری سی بے احتیاطی بھی شعر کو اسفل السافلین تک پہونچا کر رہتی ہے۔

تخیلی شاعری کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر قوت متخیلہ ہمیشہ آسمانوں ہی کا سفر کرتی رہے گی۔ تو اس زمین پر بکھری ہوئی حقیقتیں اس کے لئے اجنبی ہو جائیں گی اور یہی اجنبیت اس کے مدعائے گفتگو کو عنقا بنا کر بقول غالب ہمارے دام آگہی سے آنے میں روکیں گی تخیلات اور مشاہدات کا توازن اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ ہماری یہ قوت ہمیں عرش کی بلندیوں کے ساتھ زمین کی پستیوں اور دلوں کی گہرائیوں میں بھی لے جائے تخیل اور تشبیہ کی بے اعتدالیاں ہمیں رفتہ رفتہ مفروضات کا خوگر بنا دیتی ہیں۔ ہم ایک بات کو پہلے فرض کرتے ہیں اور پھر اس مفروضے سے تخیل کی شاخیں نکالنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کا ذہن مفروضات و تشبیہات کے اس طلسم میں گم ہو کر حقیقت کے اس مشاہدے سے محروم ہو جاتا ہے جو گفتگو کا موضوع ہے۔ مفروضات کے چکر میں پڑ کر تشبیہ کی بے اعتدالی کس پستی تک پہونچ سکتی ہے اس کا اندازہ میرزا دبیر جیسے عظیم فنکار کی اس تخیل آفرینی سے کیا جا سکتا ہے جس میں وہ اپنے ہیرو کی تلوار کی عالم آشوبی دکھلاتے ہوئے مفروضات کا ایک سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ تلوار کی باڑھ میں جو چمک ہوتی ہے پہلے اس کو پانی فرض کرتے ہیں اور جب اثنائے جنگ میں وہ پانی بہ کثرت تلوار سے زمین پر گرتا ہے تو پھر دوسرا مفروضہ بقول ان کے یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی طرح

"ہوا رطوبت اطراف سے زمیں کو زکام"

اور ظاہر ہے کہ جب زکام ہوا تو چھینکوں کا آنا لازمی ہے اور جب زمین کو چھینکیں آنے لگیں تو کیا نتیجہ برآمد ہوا اسکو میرزا صاحب ہی کی زبان سے سنیئے

دماغ خاک پہ نزلہ بصد فتور گیا
کیا جو عطسہ تو قاروں اچھل کے دور گرا　　(باقی)

اُردو غزل کا اولین معمار ـــــ وؔلی

(گذشتہ سے پیوستہ)

ولی نے سعد اللہ گلشن کے یہ مشورے قبول کئے۔ ان کے کلام سے دکنی اور گجراتی کا غلبہ کم ہونے لگا اور فارسی کی خوبصورت ترکیبوں اور متصوفانہ لب ولہجہ کا اثر بڑھنے لگا۔ ولؔی کے توسط سے دلّی کے فارسی شعراء پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس وقت دلّی میں فارسی شاعروں کا چرچا تھا، اُردو کو کم رتبہ یا حقیر خیال کیا جاتا تھا۔ ولؔی کے کلام نے اہل دہلی کے اس نقطۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا کی اور ولؔی کے اثر سے شمالی ہند اور دکن دونوں میں اردو شاعری میں خصوصاً غزل کا رواج ہوگیا۔ ولی کے اشعار عام وخاص دونوں حلقوں تک رسائی حاصل کرلی اور ان کی غزلیں قوالوں کی محفل سے لیکر اہل علم وفن کی سنجیدہ محفلوں تک میں نہایت ذوق وشوق سے پڑھی جانے لگیں۔ حاتؔم، شاکرؔ، مضموؔن اور سراج الدین علی خاں آرزؔو وغیرہ فارسی کے ساتھ مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی اُردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن دکّی کی غزلوں نے ان پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ اس طرف خصوصاً متوجہ ہوئے۔ انھوں نے ولی کی تقلید کو اپنے لئے فخر خیال کیا۔ اور اکثر نے ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ یہ سلسلہ حاتؔم سے لے کر میر درؔد کے زمانے تک برابر قائم رہا۔ چند مثالیں دیکھئے:-

رُوح بخشی ہے کام تجھ لب کا
دمِ عیسےٰ ہے نام تجھ لب کا		(ولؔی)

مست دل ہے مدام تجھ لب کا
جامِ صہبا ہے نام تجھ لب کا		(آبرؔو)

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں
اک نگہ میں غلام کرتے ہیں		(ولؔی)

جب سجیلے خرام کرتے ہیں
ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں		(ناجؔی)

مکھ ترا آفتاب محشر ہے
شور اس کا جہاں میں گھر گھر ہے (ولی)

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے
شوخ ظالم ہے اور ستم گر ہے حاتم

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب
تجھ حسن کی اگن کا ہے یک انگرآفتاب (ولی)

مُنھ دھونے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
کھاوے گا آفتاب کوئی خودسر آفتاب (میر)

اس قسم کی طرحی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولی کی اُردو شاعری کا اثر دلی کے سارے شعراء نے کم وبیش قبول کیا تھا۔ اس نے اُردو شاعری کے لب ولہجہ کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ اُردو زبان میں ایک طرف فارسی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں سے وسعت پیدا ہوئی دوسری طرف مقامی رنگ سے ہم آہنگ ہونے لگی، ایہام گوئی کی وہ لعنت دُور ہوگئی جس نے شاعری کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا تھا۔

اُس زمانے میں دلی کے سبھی شاعر ایہام گوئی کو کمال فن خیال کرتے تھے۔ ہندی یا بھاشا کے اثر سے فارسی اور اردو شعرا دونوں کے یہاں ایہام گوئی کا رنگ گہرا ہو رہا تھا۔ امیرخسرو کا مشہور دوسخنہ:۔

سب کوئی اس کو جانے ہے
پر ایک نہیں پہچانے ہے
اٹھ دھڑی میں لیکھا ہے
من کیا ان کو دیکھا ہے

ایہام گوئی کی قدیم ترین اور واضح ترین مثال ہے گویا شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہی ایہام گوئی سے ہوا اور ولی کے عہد تک یہ صنعت اپنے شباب کو پہونچ گئی۔

ذیل کے چند اشعار دیکھئے، ان میں صرف الفاظ کی شعبدہ گری ہے اور محض ذومعنویت سے اشعار بنانے کی کوشش کی گئی ہے:۔

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے (شاکرناجی)

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے (مضمون)

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجائے (آرزو)

پھر گیا ہم سے ہائے وہ مہ رو
سرد مہری سبھی ہوا کی طرح (یکرنگ)

لیکن ولی کے اثر سے یہ ایہام گوئی کم ہونے لگی اور بعد کو حاتم اور مظہر جانِ جاناں کی شعوری کوشش سے اس کا اثر بڑی حد تک ختم ہو گیا۔ ولی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اردو شاعری خاص طور پر غزل کو سیدھے سادے الفاظ میں جذبات وخیالات کے اظہار کا ایک خوبصورت اسلوب ہاتھ آگیا۔ دراصل ولی ہی کی بدولت آج اُردو شاعری کی تاریخ میں غزل کا ایسا بیش بہا سرمایہ موجود ہے جو اردو شاعری کو وقیع اور عظیم شاعری کی حدود میں داخل کرتا ہے۔

لیکن جہاں ولی نے دلی اور اہلِ دلی کو بہت کچھ دیا ہے وہاں انھیں دلی سے بہت کچھ ملا بھی ہے دراصل دلی پہونچنے کے بعد ہی ولی کی غزلوں میں وہ رنگ چڑھتا ہے جس کی بنا پر آگے چل کر میر جیسا بڑا غزل گو انھیں اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ ولی کے اثر سے صرف یہی نہیں ہوا کہ ولی نے اپنے کلام میں گجراتی و دکنی زبان کے بجائے عربی فارسی تراکیب ومحاورات کا دخل زیادہ کر لیا بلکہ انھوں نے فارسی شعراء کے کلام کی طرف بھی خاص توجہ کی اور ان کے اسلوب لب ولہجے سے استفادہ کیا جس طرح اہلِ دہلی نے ان کی غزلوں پر غزلیں کہی تھیں اسی طرح انھوں نے فارسی کے مشہور غزل گو شعراء خسرو اور نظیری کی غزلوں پر غزلیں لکھیں

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز (خسرو)

تو ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز
تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز (ولی)

چہ خوش است از دو یک دل سرِ حرف باز کردن
سخنِ نہفتہ گفتن گلہ دراز کردن (نظیری)

ہے نازنیں صنم کا زلفاں دراز کرنا
فتنہ کا عاشقاں پر دروازہ باز کرنا (ولی)

غرض کہ ولی کے کلام کا معتدبہ حصہ ایسا ہے جس پر دلی کی فارسی فضا اور فارسی شعراء کے مطالعے کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ کون سی غزلیں دلی سے آنے سے قبل کی ہیں، کون سی دلی آنے کے چند دن بعد کی ہیں اور کون سی دلی کے اثر کی پختگی کے بعد لکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے ان کے کلام کو تین خاص حصوں میں تقسیم کر دیا ہے [1]

پہلے قسم کے وہ اشعار ہیں جن پر گجراتی اور دکنی کا اثر غالب ہے اور صاف پتہ دیتے ہیں کہ سعد اللہ گلشن کی ملاقات سے پہلے لکھے گئے ہیں مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے :۔

تیرے بن مجھ کو اے ساجن یہ گھر اور بار کرنا کیا
اگر تو نہ اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کرنا کیا

دوسری قسم کے وہ اشعار جن سے دکنی اور دہلوی کی آمیزش کا رنگ جھلکتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دلی آنے کے کچھ دن بعد کہے گئے ہیں مثلاً :۔

نہ ہووے چرخ کی گردش سوں اسکے حال میں گردش
بجا ہے قطب کے مانند استقلال عاشق کا

تیسری قسم کے وہ اشعار جن کی زبان پر آج کی زبان کا گمان ہوتا ہے اور جو یقیناً ولی کی آخری عمر میں کہے گئے ہیں مثلاً :۔

زندگی جامِ عیش ہے لیکن فائدہ کیا اگر مدام نہیں
راہ مضمونِ تازہ بند نہیں تاقیامت کھلا ہے باب سخن

ولی کے کلام کا ایک ثلث حصہ اسی آخری رنگ میں ہے اور اسی رنگ کی بدولت دراصل ولی کو اردو غزل کے تاج کا پہلا ہیرا قرار دیا جاتا ہے۔ خود دکنی ادیبوں اور ناقدوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کا آخری کلام دہلوی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اردو غزل کے سرمایہ میں یہی حصہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں بعض بعض پوری کی پوری غزلیں دہلوی رنگ میں ہیں بطور نمونہ اس جگہ صرف ایک غزل دیکھئے :۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی کا کیا مجازی کا
ہر زباں پر مثال شانہ مدام ذکر اس زلف کی درازی کا
ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی جب سوں دیکھا سوار تازی کا
آج تیرے بھواں کی مسجد میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
اے ولی سرو قد کو دیکھوں گا وقت آیا ہے سرفرازی کا

---

[1] جلوۂ خضر۔ از صفیر بلگرامی

اس قسم کے غزلوں کی زبان درد، میر، سودا اور مصحفی کی غزلوں کی زبان سے بہت مشابہ ہے۔ اور صفائی پاکیزگی اور روانی کے اعتبار سے آج کی اردو سے لگا کھاتی ہے بقول مولانا احسن مارہروی :-

" ولی کی ٹکسال میں ایسے کھرے اور کامل المعیار سکے ڈھالے گئے
جن کے سانچوں میں وقت و عہد اور سن و سال کے سوا کوئی
کھوٹ کہیں نہیں ہے" ؎۵

فی الواقع ولی کی زبان و بیان میں مقامی زبانوں کے ساتھ فارسی و عربی کا اثر بہت نمایاں ہے۔ ولی پہلے شخص ہیں جنہوں نے مقامی زبان کے ساتھ فارسی و عربی کا خوبصورت پیوند لگایا اور اس مرکب کو ایسا خوبصورت معیار عطا کیا کہ تھوڑے عرصے میں میر، درد اور سودا جیسے نامور شعرا سامنے آگئے۔ کہا جاتا ہے کہ غالب و اقبال نے فارسی ترکیبیں کثرت سے استعمال کی ہیں اور اس طرح انھوں نے اردو زبان کے دامن کو وسیع تر کرنے میں مدد کی ہے یہ بات درست ہے لیکن اس سلسلہ میں ولی کا کارنامہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ولی نے اردو میں فارسی تراکیب و محاورات کو بکثرت اور بڑی خوش اسلوبی سے کھپایا ہے۔ ان کا شاعرانہ مرتبہ غالب و اقبال کے ہم پلہ نہ سہی لیکن اردو کے دامن کو وسیع تر کرنے اور زبان و بیان کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں ان کی خدمات اقبال و غالب سے کم تر درجے کی نہیں ہیں۔ ان کے کلام میں اگرچہ عربی و فارسی تراکیب کی بڑی کثرت ہے لیکن ایک جگہ بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ فارسی ترکیبوں سے خواہ مخواہ اردو کو بوجھل بنایا جا رہا ہے۔ غزل کے لب و لہجہ میں کہیں بھی ثقالت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں اشعار یا غزل کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے آنکھ بند کرکے ولی کا کلیات کھول لیجئے ہر غزل میں فارسی ترکیبوں کا رچاؤ ملے گا بطور مثال دیوانِ ولی کی پہلی ہی غزل کو لے لیجئے اس میں حسب ذیل فارسی ترکیبیں آئی ہیں:-

دیدۂ حیراں، آتشِ عشق، رخصتِ گلگشتِ چمن، چمن زارِ حیات، خیالِ روشن، گلِ باغِ وفا، گوشۂ داماں، موجِ بے تابئ دل، زلفِ صنم، طبعِ پریشاں، دفترِ درد، پنجۂ عشق، چاکِ دل، چاکِ گریباں، سبزۂ خط، لبِ لعلیں، رنگِ یاقوت، خطِ ریحان، پردۂ تجرید، طالبِ عشق، صورتِ انساں، صیدِ مراد، شہِ ملکِ جنوں، حاکمِ وقت، رقیبِ بدخو، ملکِ سلیمان، چشمۂ آبِ بقا، چاہِ زنخداں، ستونِ احساں، مجلسِ زنداں، پرتوِ حسن،

یہ ترکیبیں ایسی خوبصورتی سے استعمال ہوئی ہیں کہ کہیں ایک جگہ بھی آورد یا تصنع کا گمان نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے اردو کو فارسی کی مقلد بنانے یا ناسخ کی طرح زبان کو قواعد میں جکڑتے یا اسے ہندی الفاظ و تراکیب سے پاک کرنے اور فارسی کا گہرا رنگ شعوری طور پر چڑھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھوں نے فارسی ترکیبوں کے ساتھ مقامی زبانوں کی ترکیبوں اور محاوروں کا بے تکلف اور بکثرت استعمال کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بعض لوگ انھیں نظیر اکبر آبادی کے برابر جگہ دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نظیر کی طرح ان کے یہاں بھی ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ بکثرت ملتے ہیں اور تنوع کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہاں متعلقات حسن و عشق کے لئے متعدد ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوئے ہیں جیسے درشن، سُندر، نین، نینا، پریم، پریت، رین، سجن، ساجن، موہن، موہنی، پی، پیو، پیا، سرجن، لالن وغیرہ، اسی

؎۵ دیباچہ کلیاتِ ولی مرتبہ مولانا احسن مارہروی

طرح ان کے یہاں اکثر دو ہندی الفاظ فارسی طریقے پر مرکب کر دیئے گئے ہیں اور ایسے خوش اسلوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ نہ تو فصاحت و بلاغت میں حارج ہوتے ہیں اور نہ سماعت پر گراں گزرتے ہیں مثلاً نقشِ چرن نور نین، غنچۂ مکھ اور بیڑہ پان وغیرہ۔ غرضکہ ولی کے یہاں فارسی تراکیب کے ساتھ مقامی زبانوں کا اثر بھی نہایت گہرا ہے دراصل فارسی اور مقامی زبانوں کی یہی پیوندکاری ہے جو اردو کو ایک علمی و ادبی معیاری زبان بنانے میں مدد دیتی ہے دوسری طرف غزل میں رس اور رچاؤ پیدا کرکے ولی کو اردو غزل کا اولین بڑا شاعر منواتی ہے

ولی کی غزل بہ حیثیت مجموعی حسن وعشق اور تصوف کی انھیں روایات سے تعلق رکھتی ہے جو فارسی غزل کا طرۂ امتیاز خیال کی جاتی تھیں اور جن کا سلسلہ کسی نہ کسی طور پر میر و مصحفی سے لیکر حسرت و جگر تک برابر قائم رہا ہے۔ ولی کی ابتدائی تعلیم و تربیت صوفی بزرگوں کے زیرِ عاطفت ہوئی تھی۔ ان کا خاندانی ماحول بھی وہی تھا جس میں شروع سے بچے کو روحانیت اور عشق حقیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سعد اللہ سے ملنے کے لئے ولی کا دلی جانا، علی رضا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا اور سید ابوالمعالی سے عارفانہ محبت کا اظہار کرنا ایسی باتیں ہیں جو ولی کے متصوفانہ اور عاشقانہ مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ خود صوفی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن تصوف کی تعلیم انھیں بچپن ہی سے ملی تھی میر کی طرح انھیں بھی شروع سے عشق حقیقی تک پہونچنے کے نکات سمجھائے گئے تھے اور عشق و حسن کے تعلقات ان کی تلاش و جستجو اور اس تلاش و جستجو میں خود کو گم کر دینے کی تعلیم انھیں بچپن ہی سے دی گئی تھی لیکن عشق حقیقی کی منزلیں چونکہ مجاز کے راستے ہی طے کرنی پڑتی ہیں اسلئے عشق حقیقی کے متوالوں کو بھی بہرحال ظاہر کے جلوہائے رنگ رنگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ ولی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پیرو مرشد سے عقیدت و ارادت اور اس کے ذریعے ذات کامل کے وصال اور تو جاں سپاری من تن شدم کا ذوق و شوق ان کے یہاں ملتا ہے لیکن چونکہ یہ منزل ظاہر کی مدد سے طے کرنی پڑتی ہے اس لئے مجاز سے دل لگانے کی ہلکی ہلکی وارداتیں اور چوٹیں بھی انکے یہاں ابھر آتی ہیں۔ ان چوٹوں یا وارداتوں میں میر کی سی کسک اور شدت تو نہیں ہے لیکن حقیقت تک پہونچنے کے سلسلے میں مجاز کی رنگینیوں پر جان چھڑکنے کا ایک رومانی ماحول ان کے یہاں ضرور ملتا ہے۔ یہی رومانی ماحول ولی کے عاشقانہ مزاج کی غمازی کرتا ہے اور اسی کے شاعرانہ اظہار میں ان کی غزل کی دلکشی کا راز پوشیدہ ہے۔ یوں جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ان کے یہاں ایسے اشعار بھی کثرت سے مل جاتے ہیں جن میں ماسوا کو نظر انداز کرکے صرف محبوبِ حقیقی سے لو لگانے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:-

نقش دنیا کا کھینچ مت دل پر دشمنِ ہوش ہے محبتِ زر

ہر ذرہ عالم میں ہے خورشیدِ حقیقی یوں جان کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا طلب گارِ نگاہِ باصفا ہوں

گرچہ پابندِ لفظ ہوں لیکن دل مرا عاشقِ معانی ہے

اس قسم کے متصوفانہ خیالات کو اکثر جگہ انھوں نے خوب صورت شاعرانہ لب و لہجہ دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں حسن و اثر کی وہ شدت پیدا نہیں ہوسکی جو بعض دوسرے غزل گو شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے "طلبگار نگارِ باصفا" اور "عاشق معانی" رہنے کے باوجود نرگس کا تماشہ کبھی ترک نہیں کیا بلکہ مجاز کی رنگینیوں سے دل لگانا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ یہ مشغلہ چونکہ ان کی رومانی طبیعت سے گہرا ربط بھی رکھتا ہے اس لئے شعر کا جامہ پہن کر دل کش و نظر گیر بن گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ولی کے تیر نیم کش وہی ہیں جن میں حقیقی نہیں بلکہ مجازی عشق کی واردات و کیفیات کا والہانہ اظہار کیا گیا ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار دیکھیے:-

عجب کچھ لطف دیتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سوں سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو کرتی ہے نظر جس تن نازک پہ گرانی

جس وقت اے برہمن تو بے نقاب ہوگا ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

عاشقاں عاشقی کے دعوے پر آہ و زاری کو دو گواہ کرو

آرزوئے چشمۂ حیواں نہیں تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

مجازی محبت کا یہ رنگ ولی کے کلام پر چھایا ہوا ہے اور اسی رنگ کو خوش اسلوبی سے برتنے میں ان کی غزل میں وہ خصوصیات پیدا ہوئی ہیں جو گوشت پوست والے انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

میر کی غزل کی بھی بڑی خصوصیت یہی ہے لیکن جو لوگ میر کو ولی کے آئینے میں دیکھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں میر نے ایک وسیع النظر اور فراخ دل فنکار کی حیثیت سے ولی کی غزل گوئی کی اہمیت کو........ تسلیم کیا ہے ان کی غزلوں سے رہنمائی حاصل کی ہے اور اسی بنا پر ولی کو اپنا معشوق بتایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان دونوں کا عشقیہ لب و لہجہ ایک ہے۔ میر کا رنگ ولی سے بہت مختلف ہے۔ خارجی طور پر ان میں کچھ باتیں مشترک ضرور ہیں مثلاً دونوں نے اپنے اظہار خیال کے لئے غزل کا انتخاب کیا ہے۔ دونوں اپنے اپنے پیش روؤں کے تقلیدی رنگ سے محفوظ ہیں۔ دونوں کی غزل کا موضوع حسن و عشق اور ان کے متعلقات و لوازم سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں نے قصیدہ گوئی کو پسند نہیں کیا۔ دونوں نے زیادہ تر غزل کے لئے چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے۔ اس مماثلت کے باوجود دونوں کا عشقیہ لب و لہجہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔" ولی کے یہاں

عشق کی کیفیات کا بیان کم اور حسن کی رنگینیوں کا بیان زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف میر کی شاعری عشق کی متنوع تجربات وکیفیات کی عکاس ہے۔ میر نے حسن کو اپنی عاشقانہ طبیعت میں اس طرح جذب کر لیا ہے کہ ان کے یہاں کسی خارجی حسن کی تصویر بہت کم ابھرتی ہے۔ ان کی شاعری دراصل ایک "آہ" کی ترجمان ہے۔ اس آہ میں ہمت بھی ہے، حوصلہ بھی، لیکن حظ اٹھانے کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ ولی کی شاعری سودا کی طرح "واہ" تو نہیں لیکن ایسی شگفتہ مزاجی اور رنگینی کا عنصر غالب ہے۔ ان کی عشقیہ کہانی میر کی طرح دکھ بھری کہانی نہیں ہے بلکہ بقول شخصے ان کی کہانی ایک کامگار عاشق کی کہانی ہے جس سے آسودگی، طمانیت اور نشاط خیزی چھلکی پڑتی ہے۔ ان کے یہاں زیادہ تر حسن اور صفاتِ حسن کا بیان ہے۔ اس کے برعکس میر نے اکثر جگہ غم، غم کے محرکات، عشق، عشق کے اثرات اوصاف پر فلسفیانہ نگاہ ڈالی ہے۔ غم اور عشق کے تعلقات کو سمجھنے اور ان کے سہارے ایک خاص سلیقے سے زندگی بسر کرنے کی کوشش بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ ولی کے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ تفکر و ہمت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ فلسفۂ زندگی اور رموزِ حسن و عشق کی گہرائیوں سے کوئی بحث نہیں کرتے۔ ان کے یہاں میر کی طرح گہری مجازی چوٹ یا حادثہ کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ ان کے یہاں عشق کا تصور دراصل ایک بامراد عاشق کا تصور ہے۔ ان کا ذوقِ جمال پرستی کسی ایک فرد یا پیکر میں مقید نہیں بلکہ بھنورے کی طرح ہر پھول کا شیدائی اور پروانے کی طرح ہر شمع کا جاں نثار ہے۔" اس عمومی احساسِ جمال اور تصورِ حسن نے ان کے یہاں ایک خوبصورت پیکر تراشی اور حسن کی مجسمہ سازی کا رنگ پیدا کر دیا ہے جو میر یا ان کے معاصر شعرا کے یہاں نظر نہیں آتا۔ بیانِ حسن اور صفاتِ حسن کی تکرار نے ولی کے یہاں عیب کی صورت نہیں بلکہ حسنِ بیان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے سراپا نگاری اور حسن کی مجسمہ سازی میں انھیں عراقی اور جامی کا ہم رنگ قرار دیا ہے۔

ولی کا تصورِ حسن یا ذوقِ جمال دراصل میر سے نہیں بلکہ اصغر گونڈوی سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اصغر کا بیان بہت زیادہ پرتخیل، مرصع، رنگین اور پرتکلف ہے اور ولی کا بیان سادہ، سچا اور بے تکلف ہے۔ ولی محبوب کی سراپا نگاری یا بیانِ حسن میں کسی خارجی سجاوٹ کے قائل نہیں ہیں وہ لکھنوی شعرا کی طرح صرف محبوب کے اعضائے جسمانی اور ملبوسات اور زیورات کے نام نہیں گنواتے بلکہ حسن کے اثرات وکیفیات کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں اس لئے ان کے بیان سے طبیعت میں محض ہیجان پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کی روحانی خوشی بھی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ فراق گورکھپوری کی رباعیوں اور عبدالحمید عدم کی غزلوں کے سوا حسن کی تجسیم کا یہ رنگ کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا بطورِ مثال ولی کی دو غزلیں اس رنگ میں دیکھئے۔

صحنِ گلشن میں جب خرام کیا
سروِ آزاد کو غلام کیا

وہ بھواں ہم سوں کیوں نہ ہوں بانکی
ماہِ نو نے جسے سلام کیا

غمزۂ شوق نے بہ نیم نگاہ
کام عشاق کا تمام کیا

جن نے تجھ قد کو دیکھ مثل الف
خوش قداں کا تجھے امام کیا

تجھ دہن ہے کہ سیم معنی ہے
دل سیماب میں مقام کیا

تا کہے خلق تجھ کو ماہِ تمام
زلف تیری کو حق نے لام کیا

گل رخاں خوف سے ہوئے کیسو
تجھ نگہ نے جب اہتمام کیا

طاق ابرو ترا حرم دستا
محرم اس کا عرب عجم دستا

خط ترا سرنوشت عاشق ہیں
حرفِ تقدیر کا رقم دستا

لوحِ محفوظ ہے ترا رخسار
زلف اس پر مگر قلم دستا

تجھ زنخداں کے چاہ کنعاں ہیں
یوسفِ مصر دم بدم دستا

خط ترا مرز ورلشکرِ حسن
کاکل اس کے اُپر علم دستا

جانِ من غصہ و غضب تا کے
ولیٔ مشتاق بر کرم دستا

ان اشعار میں حسن کی خارجی و بے کیف تصویر نہیں ہے بلکہ داخلی تاثر ہے اس کا گہرا تعلق ہے اور یہی تعلق ولی کے یہاں حسن کو دوسرے سراپا نگاروں کے رنگ سے الگ کرتا ہے حسن و عشق کی ان مجازی تصویروں میں جہاں ایک طرف شاعر کی داخلیت نے جذب و کشش کا سامان پیدا کیا ہے وہاں مقامی ماحول کو غزل میں رچا دینے کی کامیاب کوشش نے ولی کی غزلوں کو ہماری توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ ولی نے عربی و فارسی تراکیب اور بعض خیالات سے یقیناً اکثر جگہ استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان پر تقلید کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی غزل کا ایک انفرادی رنگ ہے جو فارسی اور مقامی رنگوں کی آمیزش سے وجود میں آیا ہے۔ یہی سبب تو ہے کہ ان کا رنگ مختلف رنگوں کے درمیان بھی آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے بات یہ ہے کہ انھوں نے فارسی سے استفادہ کرنے کے ساتھ مقامی رسم و رواج حسن و عشق کی روایات تلمیحات، محاورات اور تشبیہ و استعارات کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے سوچنے کا انداز ان کی تلمیحیں اور تشبیہیں اکثر مقامی ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ اور محاورات کو اسی

انداز سے استعمال کیا ہے جو میرؔ و دردؔ کا طرۂ امتیاز خیال کیا جاتا ہے۔

لیکن مجموعی حیثیت سے ولیؔ کی غزل گوئی کا کمال موضوعات کے تنوع حسن کی سراپا نگاری، مقامی ماحول کی رنگ آمیزی اور متصوفانہ خیالات کی آمیزش سے کہیں زیادہ ان کے حسنِ بیان یا طرزِ ادا میں پوشیدہ ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں یہ چیز بڑی اہم ہے کہ شعر میں کیا بات کہی گئی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ بات کس طرح کہی گئی ہے۔ غزل خاص طور پر اس اصول کی سختی سے پابند ہے، وہ موضوعات کو نظر انداز کر کے کسی نہ کسی طور پر زندہ رہ سکتی ہے لیکن حسنِ بیان کو نظر انداز کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ ولیؔ کے یہاں غزل کی نزاکت کا یہ احساس ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو جس صفائی سادگی اور روانی کے ساتھ غزل میں ڈھال دیا ہے اس سے پہلے اس کی مثال اردو میں نہیں ملتی چند اشعار دیکھئے :-

زندگی جامِ عیش ہے لیکن	فائدہ کیا اگر دوام نہیں
اثرِ بادۂ جوانی ہے	کر گیا ہوں سوال کچھ کا کچھ
باعثِ رسوائی عالم ولی	مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی
خوبرو خوب کام کرتے ہیں	اک نگہ میں غلام کرتے ہیں
کیونکہ سیری ہو حسن سے تیرے	دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا ہے
کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی	کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجاوے
تجربے سے ہوا مجھے ظاہر	ناز مفہوم بے نیازی ہے
راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں	تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن
تو سر سوں قدم تلک جھلک ہیں	گویا ہے تصیدہ انوری کا
عشق کی راہ کے مسافر کو	ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے
وفا ترک مت کر ہرگز اے ولی	محبت ہے وفا بن سست بنیاد
جسے عشق کا تیر کاری لگے	اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
شغل بہتر ہے عشق بازی کا	کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

ان اشعار کی زبان، لب و لہجہ اور طرزِ ادا پر آج کا گمان ہوتا ہے حالانکہ یہ اب سے پورے ڈھائی سو سال پہلے کہے گئے ہیں۔ ان میں زبان و بیان کی وہی سادگی و پرکاری ملتی ہے۔ جو ایک طرف ولیؔ کے ہاتھوں اردو غزل کا مزاج متعین کرتی ہے دوسری طرف اردو غزل کے بابا آدم کو بیسویں صدی کے دوسرے غزل گو شعراء مثلاً جگرؔ، اصغرؔ، فانیؔ اور حسرتؔ کی طرح ہماری توجہ کا مرکز بناتی ہے۔

کس نے تعمیر کرایا؟

مقالہ نگار:-
کنور سین

تلخیص و ترجمہ:-
ثریا جبیں ایم۔اے

عرصہ ہوا اس موضوع پر کنور سین کا مقالہ دسمبر ۳۲ء کے پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل میں شائع ہوا تھا جو اپنی تحقیق کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کو اُردو میں بھی پیش کیا جائے اور یہ خدمت ہم نے ثریا جبیں ایم۔اے کے سپرد کی جو فی الحال سر سید کالج کراچی میں انگریزی کی لکچرر ہیں اور میری بھانجی بھی ہوتی ہیں۔
یہ ترجمہ گو ملخص ہے مقالہ کا لیکن اس میں بحث کے تمام پہلوؤں کو صاف زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین گرامی اسے پسند فرمائیں گے۔

"نیاز"

قطب مینار کا بانی کون تھا؟ اس سوال کے سلسلے میں متعدد سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں:-

۱- کیا اس کا بانی سکندر لودھی تھا جس کا نام اس کے صدر دروازے پر کندہ ہے-؟

۲- کیا اسے فیروز شاہ تغلق فرمانروائے دہلی نے تعمیر کرایا جس کے متعلق ایک کتبہ پر یہ عبارت منقوش ہے کہ "این مقام را عمارت کرد"

۳- کیا یہ علاؤالدین خلجی کا کارنامہ ہے جس کا نام بھی دیوناگری کتبات میں ایک جگہ منقوش ہے اور تاریخ علائی میں بھی ایک مینار تعمیر کرانے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

۴- کیا یہ شمس الدین التمش کی یادگار ہے جس کا نام مینار کی دوسری اور چوتھی منزل کے کتبات میں اس طرح مندرج ہے (امر باتمام ہذہ العمارت) ---- (امر بہذہ العمارت)

۵- کیا یہ قطب الدین ایبک کے نام سے موسوم ہے جس نے دہلی کے مختلف مندروں کو توڑ کر ان کے پتھروں سے

قطب مینار کی ملحقہ مسجد "قطب الاسلام" یا "قوۃ الاسلام" یا قبۃ الاسلام" تعمیر کرائی۔

۶۔ کیا اس یادگار کا قائم کرنے والا دہلی کا پہلا چوہان فرمانروا پرتھوی راج تھا جس نے ۱۱۹۱ء میں شہاب الدین غوری کو شکست دی تھی۔

۷۔ کیا اس کا بانی ابتدائی زمانے کا کوئی ہندو بادشاہ یا فاتح تھا جس نے اپنی عظمت کی یادگار قائم کرنے کے لئے یہ "جیاس تھمب" (فتح کا مینار) یا "کرتی ستھمب" (شہرت کا مینار) بنوایا۔

۸۔ کیا یہ کسی مسجد کا مینار ہے جو منارۂ اذان کا کام دینے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

یہ ہیں وہ چند سوالات جو تعمیر قطب مینار کے سلسلے میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور اہلِ تاریخ اور ماہرین آثار کے لئے معمہ بنے ہوئے ہیں۔

پچھلی صدی کے وسط میں سرسید احمد خاں اور مسٹر جے۔ ڈی۔ بگلر (محکمۂ آثار قدیمہ کے ایک کارکن) اس نظریہ کے حامل تھے کہ یہ لاٹ کسی ہندو فرمانروا کی تعمیر ہے۔ اوّل الذکر اپنی تصنیف "آثار الصنادید" اور مؤخر الذکر اپنی اس رپورٹ میں (جو ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی) اپنی تحقیقات کی بنا پر یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ مینار یا کم از کم اس کی پہلی منزل شہاب الدین غوری نے فتح دہلی سے پہلے تعمیر کرائی تھی۔

ہرسیل کارگل اور سر تھامس مٹیکاف بھی انہیں کے ہم رائے تھے۔

دوسری طرف نواب زین الدین (لوہارو) اپنے اس مقالے میں جو انھوں نے ۱۸۵۲ء میں دہلی کی آثار قدیمہ کی سوسائٹی کے سامنے پڑھا تھا اور اس محکمہ کے پہلے ڈائرکٹر جنرل الیگزنڈر کلنگھم اس بات کے مدعی ہیں کہ اس مینار کا خالق کوئی مسلمان فرمانروا تھا۔

مسٹر کارسٹیفن مصنف (Archaeology of Delhi) اور مسٹر برگس جو مسٹر جیمز فرگسان کی History of Architecture کے ایڈیٹر تھے نواب صاحب اور سر الیگزنڈر کے ہم خیال ہیں لیکن مسٹر فرگسان کی کتاب کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ان کے نزدیک یہ لاٹ ایک "جیاس تھمب" ہے اور "ماذنہ" کبھی بھی نہ تھا۔

اس موضوع پر جتنا بھی مواد موجود تھا اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد میں نے قطب مینار کی بابت پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی لاہور کے سامنے دسمبر ۱۹۶۳ء اور مارچ ۱۹۲۱ء میں دو مقالے پڑھے تھے جس میں میں نے اس نظریہ کی تردید کی تھی کہ یہ ہندوستان کے پہلے غلام بادشاہ قطب الدین ایبک (۱۱۹۳ - ۱۲۱۰) کے حکم پر تعمیر ہونا شروع ہوا تھا۔ میں نے جنرل کننگھم کے "نظریۂ ماذنہ" پر بھی نکتہ چینی کی تھی اور مسٹر جیمز فرگسان کے بیان کو بھی محل نظر قرار دیتے ہوئے ظاہر کر دیا تھا کہ قطب مینار یقیناً ایک "جیاس تھمب" یا "کرتی ستھمب" ہے کیونکہ یہ اپنی ساخت کے لحاظ سے ہند و فنِ تعمیر کا منظر

اسی طرح مسٹر گارڈن سینڈرسن، رائے بہادر دیارام ساہنی اور ڈاکٹر مارو ٹز کے مقالات سے بھی اختلاف کیا تھا۔ رائے بہادر دیارام ساہنی کے نتائج جو دیوناگری کتبہ سے ماخوذ ہیں البتہ میرے اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ یہ عمارت ایک "کرتی ستھمب" ہے جسے کسی ہندو فاتح نے تعمیر کرایا تھا اور منارۂ اذان نہ تھا۔ لیکن رائے بہادر دیارام کو چونکہ دیوناگری کتبہ کی اہمیت اور افادیت کا پوری طرح احساس نہ تھا اس لئے وہ اس عمارت

کے ہند و تعمیر کا دعویٰ نہ کر سکے۔

ڈاکٹر ہارڈٹز نے قطب مینار کے عربی اور فارسی کتبات کا گہرا مطالعہ کیا لیکن یہ مطالعہ بھی ان کے نظریات کو تقویت نہیں پہونچاتا۔ ان کا یہ دعویٰ کہ مینار کی تعمیر قطب الدین ایبک کی مرہون منت ہے یا شمس الدین التمش کے ایماء سے پایۂ تکمیل کو پہونچی بے بنیاد نظر آتا ہے۔ میں نے اپنے دوسرے مقالے کے اختتام پر چند ادبی، تاریخی، کتباتی اور فنی دلائل کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس عمارت کی نچلی منزل کسی صورت سے بھی قطب الدین ایبک کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

اس کے ماذنہ ہونے کی تردید میں میرے دلائل یہ ہیں:-

۱۔ عموماً مساجد کے ایک نہیں دو مینار ہوتے ہیں جس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

۲۔ آج تک کوئی ایک مینار کسی مسجد کا حقیقی ماذنہ نہیں ہوا ہے اس سلسلہ میں کوئل مینار، مینار غزنی بیانہ مینار اور علائی مینار کی مثالیں غیر مستند ہیں۔

۳۔ قطب مینار جگہ کی موزونیت اور فن تعمیر کے لحاظ سے قطب الدین ایبک کی بنوائی ہوئی ملحقہ مسجد سے کسی صورت میں بھی متشاکل نہیں ہے اوّل تو ماذنہ ہونے کی حیثیت سے یہ بہت زیادہ اونچا ہے اور اس کی جائے وقوع غلط ہے۔ علاوہ بریں دونوں عمارتیں پائداری اور مسالہ کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۴۔ اس دور کے مصنفین اور مورخین نے مینار کے ماذنہ ہونے کا اپنی تصانیف میں کہیں ذکر نہیں کیا ۔

۵۔ ابوالفدار کا بیان سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے ان کے زمانے میں چونکہ مینار کا مسجد سے الحاق ہو چکا تھا اسی لئے وہ مینار کو ماذنہ کہتے ہیں۔

۶۔ امیر خسرو اس عمارت کو ماذنہ کے بجائے " مینارہ " کہتے ہیں لیکن ان کا بیان زیادہ تر شاعرانہ ہے۔ سرسید کی رائے میں امیر خسرو نے " قطب علائی " کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ ابن بطوطہ اس کو " صومعہ " یعنی حجرۂ زاہد ظاہر کرتا ہے۔

۸۔ ماذنہ مسجد کا لازمی جزو نہیں ہوتا جیسا کہ " تاج الجامع " مسجد کی مثال سے ظاہر ہے۔

۹۔ بارھویں صدی کی مساجد کی تعمیر میں ماذنہ چاروں کونوں پر تعمیر ہوتا تھا اور مسجد کی تعمیر سے مناسبت رکھتا تھا۔

مسٹر پیج کی یہ رائے کہ دوسری منزل کے دونوں قرآنی کتبات مینار کے ماذنہ ہونے کو ظاہر کرتے ہیں درست نہیں کیونکہ اوّل تو یہ آیتیں کسی اور مسجد کے "ماذنہ" پر نظر نہیں آتیں اور دوسرے یہ کہ اگر یہ اس اہمیت کی حامل تھیں تو انھیں مینار کے صدر دروازے یا نچلی منزل پر کندہ کرنا چاہیے تھا۔

ایک بات اور قابل غور ہے وہ یہ کہ قطب الدین ایبک کے دور میں مینار کی تعمیر دوسری منزل کے وسط تک ہوئی تھی اس لئے اگر اس مینار کا بانی ایبک تھا تو ان آیات کو نچلی منزل پر منقش ہونا چاہیے تھا۔ دوسری

منزل کی تکمیل التمش کے دور میں اس وقت ہوئی جبکہ مینار کو ملحقہ مسجد سے ملا دیا گیا تھا اور غالباً یہ آیات التمش ہی کے ایما سے درج کی گئی ہونگی۔

اگر ہم مینار کے بانی کا کھوج لگانا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ اس عمارت پر نصب شدہ تمام کتبات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں۔

تاریخی عمارات میں عام طور پر عمارت کے بانی کا نام اور سنِ تعمیر سنگ بنیاد کے آس پاس یا صدر دروازے کی لوح پر درج ہوتا ہے۔لیکن قطب مینار میں اس قسم کا سنگ بنیاد جس میں یہ ساری تفصیلات درج ہوں آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔صدر دروازے کی لوح اہمیت سے خالی نہیں۔ اس عبارت کو جس طرح میں نے اور ڈاکٹر ہارونز نے پڑھا ہے وہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ آپ خود اندازہ لگا سکیں کہ ہم میں سے کس کی رائے صحیح و درست ہے ۔

میں نے اس عبارت کو اس طرح پڑھا ہے :۔

" [قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من بنا مسجد اللّٰہ] تعالیٰ یبنی اللّٰہ لہ فی الجنتہ بیتاً مثلہ] عمارت منارہ بندگی حضرت سلطان السلاطین شمس الدنیا و الدین] مرحوم مغفور طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ شکست شدہ بود منارۂ مذکور] و درزبندی مرتبہا بالا مرمت کردہ مرمت کنانید] در عہد دولت سلطان الاعظم والمعظم] والمکرم سکندر شاہ بن بہلول سلطان] خلد اللّٰہ ملکہ و سلطانہ واعلیٰ امرہ و شانہ عمل] خانزادہ فتحخان بن مسند علی خواص خان جوناگڈ ھی] السدۃ من ماہ ربیع الآخر سنۃ تسع وتسعمائۃ ۔"

ترجمہ :۔

" خدا کے رسول نے فرمایا کہ جو شخص راہ خدا میں مسجد تعمیر کرتا ہے پاک پروردگار اس کے لئے جنت میں گھر بناتا ہے۔ یہ عمارت جو شاہوں کے شاہ دین و دنیا کے آفتاب کی خانقاہ تھی شکستہ حال ہونے کے باعث عالیجاہ سلطان سکندر شاہ پسر بہلول سلطان کے دور میں مرمت پذیر ہوئی اور اس کی بالائی منزل کے شگافوں کی درزبندی ہوئی۔ یہ کام ماہ ربیع الاول ۹۰۹ھ میں خانزادہ فتح خان پسر مسند علی خواص خان کے زیر ہدایت انجام پذیر ہوا "

ڈاکٹر ہارونز نے اسے اس طرح پڑھا ہے :-

" قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنا مسجد اللہ] تعالی بنی اللہ[فی الجنة بیتاً مثلہ] عمارت منارہ گنبدی سلطان السلاطین شمس الدنیا والدین] مرحوم و مغفور طاب ثراہ وجعل الجنة مثواہ شکست شدہ بود منارہ مذکور] در عہد دولت سلطان الاعظم والمعظم] والمکرم سکندر شاہ بن بہلول سلطان] خلد اللہ ملکہ و سلطانہ واعلی امرہ و شانہ وعمل] خانزادہ فتحخان بن مسند علی خواصخان جونا گنبدی الغرہ ماہ ربیع الآخرۃ تسع وتسعمائۃ "

مندرجہ بالا عربی عبارات کے بارے میں میرے اور ڈاکٹر ہارونز کے درمیان کچھ اختلاف ہے

i۔ ڈاکٹر ہارونز لفظ " حضرت " کو چھوڑ جاتے ہیں حالانکہ یہ لفظ بہت واضح اور نمایاں ہے

ii۔ ڈاکٹر ہارونز " عمارت منارہ " کے بعد لفظ "گنبدی" پڑھتے ہیں جو یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ یہ عمارت ایک مینار ہے گنبد نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ " عمارت منارہ " کے بعد لفظ " بندگی " لفظ "حضرت" کے ساتھ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس عبارت میں شمس الدین التمش کے بجائے درویش صفت "قطب الدین بختیار کاکی روشی" کا تذکرہ ہے جن کے نام کے ساتھ " طاب ثراہ " " جعل الجنة مثواہ " اور " حضرت " جیسے الفاظ کا استعمال زیادہ موزوں ہے۔

iii۔ معانی کے لحاظ سے " درگنبدی و جونا گنبدی " کے بجائے " درزبندی " و " جونا گڈھی " زیادہ بہتر ہے

iv۔ لفظ " من " کتبہ میں نمایاں طور پر کندہ ہے۔ میری رائے میں " الی غرہ من " ٹھیک ہے۔ کیونکہ " من " کے لفظ کا " الغرہ " کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔

۷۔ اسی طرح میں کتبہ کے دس غلط جڑے ہوئے ٹکڑوں کی ترتیب جس طرح کرتا ہوں وہ ڈاکٹر ہارونز کی ترتیب سے مختلف ہے۔

الغرض ان کتبات سے مندرجہ ذیل حقائق کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۔ پندرھویں صدی عیسوی کے لوگ اس عمارت کو " ماذنہ " کی حیثیت سے نہیں بلکہ " منارہ " کی حیثیت سے جانتے تھے۔

۲۔ ان کے نزدیک یہ " منارہ " ملحقہ مسجد کا لازمی جزو نہیں تھا۔

۳۔ یہ " مینارہ " حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے نام سے منسوب تھا اور قطب صاحب کی لاٹ کہلاتا تھا اور قطب الدین بادشاہ کے نام سے موسوم نہ تھا۔

بہرصورت صدر دروازے کی عبارت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سکندر لودی نے اس کی تعمیر کرائی تھی بلکہ صرف یہ کہ سکندر لودی نے شکستہ مینار کی مرمت اور "درزبندی" کے علاوہ اور کچھ نہ کیا تھا۔

یہ دعویٰ کہ مینار فیروز شاہ تغلق نے بنوایا تھا بہت آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے کیونکہ مینار کی پانچویں منزل کے کتبہ پر یہ عبارت منقوش ہے :-

"این مقام را عمارت کرد"

اور لفظ "این مقام" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق پورے مینار یا اس کی دوسری منزل سے نہیں ہے۔ کتبہ کی مکمل عبارت سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

"درین منارہ مشہور سنہ سبعین وسبعماۃ آفت برق خلل راہ
یافتہ بود بتوفیق ربانی برگشیدہ عنایت سبحانی فیروز سلطانی این
مقام را با احتیاط تمام عمارت کرد خالق بیچوں مر این مقام
را از جمیع آفات مصون دارا۔ .... آمین"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۷۷۰ھ میں یہ مینار بجلی کے صدمہ سے شق ہو گیا تھا۔ اس لئے فیروز شاہ تغلق نے اس کی از سر نو تعمیر کی۔ مینارہ کی تیسری منزل کا پیلے رنگ کا دیوناگری کتبہ بھی جس میں ۱۵ پھاگن ۱۴۲۵ سمبت درج ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مزید برآں "فتوحات فیروز شاہی" کا مورخ اس مینارہ کو معز الدین سام سے منسوب کرتا ہے اور فیروز شاہ تغلق شمس الدین التمش یا قطب الدین ایبک کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۶۸ء تک اس عمارت کو "قطب مینار" نہیں کہا جاتا تھا۔

رہا علاؤالدین خلجی سو "تاریخ علائی" کے مطالعہ سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے پرانے مینار کی مرمت کرائی تھی اور ایک دوسرے "مینار علائی" کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا تھا جو مکمل نہ ہو سکا۔

مسٹر منشی اپنے کتابچہ "قطب مینار" میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مینار کا خالق شمس الدین التمش تھا۔ یہ رائے وہ دوسری اور چوتھی منزل کے دو کتبات کے مطالعہ سے قائم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری اور تیسری منزل کے مدحیہ کتبات میں التمش کا جو ذکر آیا ہے وہ بھی انھیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ مینار ضرور التمش ہی نے تعمیر کرایا ہوگا لیکن دوسری منزل کے دروازے کی پہلی لوح ظاہر کرتی ہے کہ التمش نے اس عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے :-

"امر باتمام ہذا العمارت الملک المؤید من السماء شمس الحق
والدین التمش القطبی نصیر امیر المومنین"

یہاں پر لفظ "اتمام" اور "عمارت" قابل غور ہیں۔ چوتھی منزل کے کتبہ کی عبارت درج ذیل ہے :-

"امر بہذۃ العمارت فی ایام الدولۃ السلطان الاعظم مالک
رقاب الامم مولی ملوک الترک والعجم شمس الدنیا والدین معز
الاسلام والمسلمین ذوالامن والامان وارث ملک سلیمان ابو المظفر

التمش السلطان ناصر امیر المومنین "

یہ کتبہ واضح طور پر واضح کرتا ہے کہ مینار کی تعمیر کا حکم التمش نے صادر کیا تھا لیکن ڈاکٹر ہارڈنز، جنرل کننگھم اور مسٹر بیج سارے ماہرین آثار اس امر پر متفق ہیں کہ التمش نے مینار کی اولین منزل نہیں بلکہ دوسری منزل کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ التمش کا نام دوسری اور تیسری منزلوں کے کتبات پر تو کندہ ہے لیکن نچلی منزل کے کتبات میں کہیں نظر نہیں آتا۔

میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم عمارت کی نچلی منزل کی ساخت، اس کے کتبات اور اس کی تختیوں کا مطالعہ کریں تو آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ مینار کس کے اختراعی ذہن کا نتیجہ تھا۔

مسٹر بیج بغیر کسی ثبوت کے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ مینار کی نچلی منزل کی تعمیر کی ابتدا قطب الدین ایبک نے کی تھی لیکن اس کی تکمیل سپہ سالار معز الدین محمد غوری نے کی اور اس طرح وہ ڈاکٹر ہارڈنز سے بھی چار ہاتھ آگے نکل جاتے ہیں۔ جو کتبات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مینار کی پہلی منزل کی تعمیر اس زمانے میں ہوئی جب قطب الدین صرف گورنر تھا اور معز الدین اپنے بھائی غیاث الدین غوری کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھا۔

نچلی منزل کے عربی کتبات کی عبارت بہت مدھم پڑ گئی ہے۔ پھر بھی اس سے اس دعویٰ کی توثیق نہیں ہوتی کہ مینار کی تعمیر قطب الدین ایبک کے حکم پر شروع ہوئی تھی اور اس کی پہلی منزل کی تکمیل شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ہوئی۔

یہ امر قابل غور ہے کہ عربی کے ان کتبات پر "قطب الدین" کا نام یا اس کا لقب "ایبک" کہیں بھی منقوش نہیں ہے۔

قطب الدین اگر اس عمارت کا بانی ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی کتبہ پر "مقصد تعمیر" درج کراتا کیونکہ اس نے اپنے عہد میں جتنی بھی عمارات بنوائیں ان پر تعمیر کا مقصد ضرور درج کرایا (مثلاً مینار کی ملحقہ مسجد اور پالول کی جامع مسجد) لیکن یہاں کسی کتبہ میں مقصد تعمیر مندرج نہیں ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ قطب الدین ایبک مینار کا بانی نہیں تھا۔

ڈاکٹر ہارڈنز ان کتبات کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں لیکن ان کو بھی فقرہ " الامیر الاسفہسالار الاجل الکبیر" کے سوا اور کچھ دستیاب نہ ہو سکا لیکن ان الفاظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مینار کی تعمیر کا سہرا قطب الدین ایبک کے سر ہے۔ کیونکہ " الامیر الاسفہسالار الاجل الکبیر" کے خطاب یا لقب کو صرف قطب الدین ہی نے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ شمس الدین التمش کے سپہ سالار" سنقر تگین" کا لقب بھی یہی تھا جیسا کہ مسجد پالول کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ان الفاظ کا استعمال قطب الدین کے لئے ہوا ہے تو بھی اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قطب الدین نے اس کی تعمیر کرائی تھی بلکہ صرف یہ کہ قطب الدین کی گورنری کے زمانے میں یہ مینار موجود تھا۔

اگر اس مینار کو قطب الدین ایبک یا شہاب الدین غوری نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر یا اذان

کی حیثیت سے تعمیر کرایا ہوتا تو ان کتبات پر ان کا نام اور سنِ تعمیر ضرور مندرج ہوتا۔ قطب الدین ایبک ان معاملات میں بہت محتاط تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پالول کی مسجد اور قطب الاسلام مسجد میں ہمیں یہ عبارت کندہ ملتی ہے :۔

بنیت هذا العمارت فی ایام دولة الملک العادل
المعظم ابوالفوارس ایبک نصیر امیر المومنین
الاسفهسالار الاجل الکبیر الملک الموید رباللہ
دام اللہ علیه فی شهر المبارک سنة سبعة
وستمائة "

مزید برآں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ " تاج المآثر " " کاملۃ التواریخ " " تاریخ جہاں کشا " اور طبقات ناصری " کے مؤرخین بھی ایبک ، التمش اور محمد بن سام کے حالات میں اس مینار کی تعمیر کا ذکر کہیں نہیں کرتے۔ یہ تمام مورخ اپنی تصانیف میں صرف اس مسجد کا ذکر کرتے ہیں جو ستائیس مندروں کو منہدم کرکے بنائی گئی تھی۔ اگر یہ پٹھان بادشاہ مینار کو بطور "جیاس تھمب" یا کرتی استھمب " تعمیر کراتے تو مسلمان مورخین مثلاً علاؤالدین جوینی ابن اثیر اور حسن نظامی ضرور اس کا ذکر کرتے۔

اگر بالفرض تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ مان بھی لیں کہ ایبک نے اپنے دورِ گورنری میں ان کتبات کو کندہ کرانے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ مینار کا تصور ایبک کے ذہن کی پیداوار ہے۔ مینار کی اولین منزل کی تعمیر کا آغاز ایبک کے برسرِ اقتدار آنے سے آٹھ دس سال پہلے ہوا ہوگا کیونکہ فنِ عمارت سازی کے پیشِ نظر یہ منزل ایک دو سال میں پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں نچلی منزل کے پہلے کھنڈ کے کتبات زبردست تاریخی اہمیت رکھتے ہیں جن کے رسم خط، طریقۂ حکاکی اور آرائشی حاشیے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کتبات کے ابتدائی منصوبے میں شامل نہ تھے جو منزل کی تزئین کے لئے تجویز ہوا تھا۔ جب ہم ان کا موازنہ اوپر کی منزلوں کے کتبات سے کرتے ہیں تو ہمیں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ بڑے حیرت کا مقام ہے کہ آج تک کسی ماہرِ آثار کی باریک بین نگاہیں کتبات کی اس غیر مماثلت کو محسوس نہ کر سکیں یہاں تک کہ جنرل کننگھم بھی کتبات کے اس فرق کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں عربی کتبات اور گھنٹیوں اور کنول والی منقش پٹی کے حاشیے میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ چنداں اہم نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ کتبات ایک ہی وقت میں نصب ہوئے ہیں تو ان کے حاشیوں کے درمیان اتنا فرق کیوں پایا جاتا ہے۔

جنرل کننگھم کے علاوہ دوسرے ماہرین بھی اس مقام پر آکر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور رمز بر چھان بین نہیں کرتے۔ میرے دلائل مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ سنگتراشی کے لحاظ سے پہلے کھنڈ کے کتبات کے نقوش (جن میں امیر الاسفهسالار کا لفظ بار بار آتا ہے) نہ صرف دوسرے کھنڈ کے آرائشی حاشیہ سے مختلف ہے بلکہ ان چار کتبات سے بھی بہت مختلف ہے جن پر قرآنی آیات مندرج ہیں اور جن میں معزالدین سام اور غیاث الدین کی تعریف کی گئی ہے۔ بالائی منزلوں کے کتبات کا رسم خط زیادہ ابھرا ہوا ہے اور پہلے کھنڈ کے کتبات کی

ہموار ہے۔ اوپر اور نیچے کے کتبات کے اس عظیم فرق کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی جدت پسندی کا نتیجہ ہے۔

۲- دوسرے اور تیسرے کھنڈ کے کتبات کی آرائشی گگر پہلے کھنڈ کے کتبات کے کناروں پر نہیں پائی جاتی۔ دوسرے اور تیسرے کھنڈ کے نقوش میں کنول اور گھنٹی بھی پائی جاتی ہے اور سب سے نچلے کھنڈ میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔

۳- جائے وقوع اور تناسب تعمیر کے لحاظ سے بھی نچلا کھنڈ اوپر کے کھنڈوں سے مختلف ہے۔

۴- اس کھنڈ کے عربی کتبات کا مضمون اور ان کا درمیانی فاصلہ بھی فن تعمیر کی خامیوں کو ظاہر کرتا ہے۔

ا- نچلی منزل کے حلقۂ اول اور حلقۂ دوم کا درمیانی فاصلہ بہ نسبت حلقۂ دوم و سوم اور حلقۂ سوم و چہارم کے کم ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتبات کے بنیادی منصوبہ میں ہرگز شامل نہ تھے۔

ب- حلقۂ پنجم و ششم کے درمیان فاصلہ برائے نام ہے، حلقۂ ششم کے حاشیہ کا نقشہ بھی مختلف ہے

س- نچلی منزل کے حصۂ اول، دوم و چہارم پر بتدریج قطب الدین، شہاب الدین اور غیاث الدین کے بارے میں تعریفی کلمات درج ہیں جبکہ حلقۂ سوم، پنجم اور ششم کے کتبات پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔

د- اگر قطب الدین اس مینار کا خالق ہوتا تو اپنے نام کے لیے وہ ہرگز کتبات کے اس غیر موزوں حلقے کا انتخاب نہ کرتا۔

ر- حلقۂ اول و ششم کے کتبات دوسرے کتبات سے بہت مختلف ہیں۔ لیکن مسٹر بگلر ان کی تاریخی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔

حصۂ اول کے یہ عربی کتبات اگر ابتدائی منصوبہ میں شامل ہوتے تو عمارت میں ہمیں تین قسم کے پتھر الگ الگ ملتے :-

۱- ایسے پتھر جن پر عربی عبارت درج ہوتی۔
۲- نقش و نگار کے گگر والے پتھر۔
۳- سادے پتھر۔

نچلی منزل میں دو تین مقامات پر ہمیں یہ تینوں پتھر یکجا نظر آتے ہیں جس سے ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ وفادار سنگتراش نے متوازی لکیروں کے دائرے کے وسطی حصہ کے پتھروں کو نکال کر ان پر عربی عبارات یا نقش و نگار کے حاشیے کندہ کئے اور پھر انھیں ان کی جگہ پر نصب کر دیا۔

ان کتبات کے علاوہ مینار کی کھڑکیوں کی نوکدار محراب بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نوکدار محراب اپنے نمونے میں قوۃ الاسلام مسجد کے صحن کی اس دیوار کے محرابوں سے مشابہت رکھتی ہے جو التمش نے مسجد کو وسیع کرنے کے لئے بنوائی تھی اور اسی مماثلت کی بنا پر مؤرخین مینار کے اسلامی ماخذ ہونے کا دعوے

کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان محرابوں کا غور سے مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ محراب زیادہ تر کھڑکیوں کے بیرونی حصوں پر کھود دی گئی ہے (غالباً نگراں ماہرینِ تعمیرات نے معماروں کی ہدایت کے لئے ایسا کیا ہوگا) پھر بھی متعدد کھڑکیوں کی محرابوں کا خم ان کے اناڑی پن کو ظاہر کرتا ہے۔ نچلی منزل کی دوسری کھڑکی کی ساخت مختلف ہے یعنی اس کھڑکی کی محراب ہندو عمارات کی طرح ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ساری کھڑکیوں کی محراب نوکدار ہے تو یہ ان سب سے مختلف کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کھڑکی سے اوپر ہوا کے لئے ایک دریچہ ہے اور اگر اس کھڑکی کی محراب کو اس سے ملا دیا جاتا تو بھدا پن پیدا ہو جاتا۔ لیکن دراصل معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مینار کی نچلی منزل کا معمار وہ شخص نہیں تھا جس نے اوپر کی منزلیں تعمیر کرائیں اور اول اول اس مینار کی تمام کھڑکیوں کی محراب ہندو وضع کی تھی جن کو مسلمان بادشاہوں نے نوکدار محرابِ مسجد کی صورت دے دی۔

اگر یہ مینار قوۃ الاسلام مسجد کی تعمیر کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا تو اس کی کھڑکیوں کی محرابیں یکساں ہوتیں اور ہوا کے دریچے متناسب فاصلے پر تعمیر کئے جاتے۔

فنِ تعمیر کے یہ باریک نکات میرے اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ قطب الدین کے دورِ گورنری میں مینار کی نچلی منزل تعمیر ہو چکی تھی اور منزل اوّل کے کتبات کو جاہ پسند قطب الدین نے نصب کرایا تاکہ ہر شخص آسانی سے اس کے نام کو پڑھ سکے۔

اگر ہم اوّل منزل کے حاشیہ کا دوسری منزل کے حاشیہ سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے گگر میں یکساں حجم والے کنول کے پھول۔ گھنٹیاں اور ہار کے نمونے موجود ہیں جو مینار کی سطح سے ایک انچ ابھرے ہوئے ہیں اور یہ حاشیے اندرونی مندرج عبارت کے مقابلے میں زیادہ فرسودہ اور قدیم نظر آتے ہیں۔

دوسری منزل کے علاوہ یہ حاشیے تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل کے کتبات کے کنارے پر بھی موجود ہیں اور غالباً یہ وہ پتھر ہیں جن کی ابھری ہوئی ہندو تصاویر کو مٹا کر ان پر عربی کلمات درج کر دیئے گئے۔ چنانچہ مسٹر بیج کی پلیٹ نمبر ۹ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مینار میں نصب شدہ پتھروں کے ایک رُخ پر ہندو تصاویر تھیں۔ اور انھیں اکھاڑ کر دوسرے رُخ پر عربی کے وہ کلمات درج کر دیئے گئے جو آج ہمیں مینار کے کتبات پر جابجا نظر آتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں نچلی منزل کی سنگتراشی ہندو فنِ تعمیر کا نمونہ تھی لیکن آگے چل کر ان پتھروں کا رُخ بدل کر عربی عبارتیں نقش کی گئیں۔

مسٹر بگلر کے دلائل بھی میرے نظریات کو تقویت بخشتے ہیں

ایک بات اور وہ یہ کہ نچلی منزل کے دروازے کا رخ شمال کی طرف ہے اور بقیہ تمام منازل کی کھڑکیوں کا رخ مغرب کی طرف۔ جو بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

الغرض ان تمام شواہد کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نچلی منزل کی تعمیر کسی ہندو فرمانروا کے عہد میں اس وقت ہوئی تھی جبکہ مینار کے قرب و جوار میں مسجد کے بجائے کوئی مندر ایستادہ تھا۔

نچلی منزل کے دو دیوناگری کتبات بھی قابل غور ہیں ۔ صدر دروازے کے دائیں جانب زرد رنگ کے
مر پر سمبت ۱۲۵۶ درج ہے (جو ۱۱۹۹ء کے مطابق ہے)
اسی طرح بائیں طرف بھی یہی تاریخ منقوش ہے ۔ اسی کے ساتھ بائیں بازو کے اندرونی حصہ پر دیوناگری
بان میں عبارت [illegible] (پرتھی بادشاہ) منقوش ہے ۔ لیکن اس عبارت کے طرز تحریر
سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو کسی ایسے شخص نے کندہ کرایا ہے جو سنسکرت سے نابلد تھا ۔ علاوہ بریں پرتھوی راج
راس کا بانی اس لئے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کی اہم تاریخ "پرتھوی راج وجایا" میں اس مینار
، تعمیر کا ذکر نہیں ملتا ۔ حالانکہ اگر پرتھوی راج نے یہ مینار بنایا ہوتا تو اس کے درباری شاعر چندر بردائی نے
پرتھوی راج رسا" میں ضرور اس کا ذکر کیا ہوتا

اس میں شک نہیں کہ مینار کی تعمیر پرتھوی راج سے پہلے شروع ہوئی اور اس کے زمانے تک جاری رہی
اگر ہم مینار کے اصلی بانی کا کھوج لگانا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ پرتھوی راج کے پیشرو فرمانروایانِ دہلی
، تاریخ کا جائزہ لیں ۔

تمام محققین اس امر پر متفق ہیں کہ قطب مینار کی چوکور اور زاویہ دار تعمیر اجمیر کے "اڑھائی دن کا جھونپڑا"
ے ستونوں سے بہت مشابہت رکھتی ہے ۔ یہ عمارت اپنی ابتدائی شکل میں ایک دھرم شالہ یا پاٹ شالہ
ی جس کو التمش نے منہدم کرکے اس کی جگہ مسجد تعمیر کرائی تھی اور جس طرح قطب الدین نے دہلی میں مینار
ے ملحقہ مندر کی دیواروں اور برجوں کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا تھا اسی طرح التمش نے بھی اجمیر کے اس
ٹ شالہ کی دیواروں اور فصیل کو بدستور قائم رکھا ۔

ہربلاس سارداا اس پاٹ شالہ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ اس دھرم شالہ کو
ندوستان کے پہلے چوہان بادشاہ" ویسال دیو" نے ۱۱۵۳ء میں تعمیر کیا تھا ۔ اگر ہم اس عمارت کا
قابلہ " دھار" کے "راج بھوج پاٹ شالہ" سے کریں جو مندر سے مسجد میں تبدیل ہوا تھا تو سارے
لوک مٹ جاتے ہیں کیونکہ ان کو بھی مسجد بناتے ہوئے زیادہ تبدیلیاں نہیں کی گئی تھیں بلکہ صحن کی
شت پر محراب کی خاطر صرف ایک دیوار بنوا دی گئی اور اس کے پاس ایک منبر تعمیر کرا دیا ۔ صحن کے
بوترے ستونوں اور ان کے برجوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی ۔

"اڑھائی دن کا جھونپڑا" کی ابتدائی تاریخ عربی کے ان کتبات سے عیاں نہیں ہوتی جن میں مسجد کا
ن تعمیر درج ہے بلکہ اس کا حوالہ سنسکرت کے ان کتبات سے ملتا ہے جن کو جنرل کننگھم نے صحن فا
ے بازیافت کیا تھا ۔ یہ کتبات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ہندوستان کے چوہان بادشاہ " ویسال دیو"
نے اس کو پاٹ شالہ کی حیثیت سے تعمیر کرایا تھا جو نہ صرف بڑا فاتح بلکہ جید عالم ۔ عالی مرتبت شاعر اور
لم و ہنر کا سرپرست بھی تھا ۔

اس عمارت کا سن تعمیر ۱۱۵۳ء ہے ۔

میری رائے میں دہلی کے قطب مینار ، اجمیر کے " جھونپڑا" اور " اشوکا مینار" ان تینوں عمارات کا بانی ایک

ہی شخص تھا۔

ویسال دیو جسنے اپنی فتوحات کو جاوداں بنانے کیلئے قطب مینار کی صورت میں "جیاس تھمب" تعمیر کرایا۔"

"جیاس تھمب" تعمیر کرانا ہندو بادشاہوں کی عام روایت تھی۔ یہ "جیاس تھمب" فن تعمیر کی صناعیوں کا نادر نمونہ ہوتے تھے جو بڑی کوشش کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچتے تھے۔ چنانچہ قطب مینار کی تعمیر میں بھی ۴۴ سال کا عرصہ لگا۔ اس کی تعمیر ویسال دیو کے حکم پر ۱۱۵۶ء میں شروع ہوئی اور پرتھوی راج کے دور حکومت میں یعنی ۱۱۷۵ء میں یہ زیر تکمیل تھا اس کے بعد جب ۱۱۹۳ء میں دہلی پر مسلمان فاتح قابض ہو گئے تو ہندو مندروں کی طرح اس مینار کا روپ بھی انھوں نے بدل دیا۔

انتخاب از کلام

قرۃ العین ـــــ زرّین تاج

بابی تحریک کی میراثی

نیاز فتحپوری

مثنوی

بیا ساقی ای شاہباز فتوح — ایا عی کرم کن زصہبای روح
یکی جام می باز سازم کرم — کہ سوزد سراپای من تا قدم
بیا ساقیا دہ یکے جام مے — کہ از دل رود جملۂ غمہائے دے
حیاتی زنو بخش بر مردگاں — ایا عی کرم کن بہ افسردگاں
سمندر صفت چوں دریں آتشم — کرم ساز ساقی مئے بی غشم
ز روی مہ افکن درایندم نقاب — درآور وہ دہ تو جام شراب
زجام ظہور تو سرشار کن — بجانم تجلی از آن یار کن
چو موسیٰ کنم منصعق خود ز لوز — نمانند کہ ایں کوہ تن نیز طور
بسوزاں وجودم ہمہ سربسر — کہ از دو جہانم نباشد خبر
بایں غم نشیں ساقیا می بیار — پریشاں ندارم چو زلف نگار
زصہبای دوشیں خمارم دگر — زجام دگر بر تو شوشم زسر
بزلف تو ساقی چو دل بستہ ام — زقید دو عالم ہمہ رستہ ام
مرا از ازل مذہب و دین نبود — بجز فہم تو ہیچ آئین نبود
بعہد ازل می نمایم قرار — ز ایمان کنم حب تو اختیار
چو حب ترا کردہ باشم قبول — بدہ جامی از می ندارم ملول
کرم ساز جام میم دمبدم — کہ مستغرقم من بدریای غم
نسازد کفایت مرا جام می — مرا بر تو ساقی سر بحر وی
کہ تا اندر آں بحر غوص آورم — فناگشتہ از خویشتن بگذرم
زعمان دل بشکنم ایں صدف — من آں گوہر جاں بیارم بکف

بیا ساقیا شد جہاں نوبہار — زمیں چون زمرد شد از سبزہ زار
بہار است بشگفتہ شد گلستاں — بساطی بیفگن تو در بوستاں
مغنی نوازد نی و چنگ و رود — بعشاق دلخستہ آرد سرود
برون شو تو ساقی ازاین پیرہن — قمیص بہشتی در آور بتن
عبیر از سر گیسوی حوریاں — بسوزاں تو در مجمر زرفشاں
باہل جناں بار عشرت کشا — برضوانیاں خود تجلی نما
تو از بہر خدمت زخلد بریں — بگو حور و غلماں شود در زمیں
برقص طرب گلرخاں سربسر — دو ایں بزم تاباں شود چوں قمر
شود زہرۂ چرخ در مہ بری — عیاں بنگری ماہ با مشتری
بساطی بیفگن تو اندر زمیں — کہ گوید فلک دو فلک آفریں
بخلق جہاں ساقیا دہ نوید — کہ شد شام غم صبح عشرت رسید
بغمدیدگان دہ تو جام صفا — بعشاق دلخستہ بر زن صلا
دعین ظہور ازل آمدہ — جمال خدائی ہویدا شدہ
بایں مژدہ گر جاں فشانم رواست — ازایں مژدہ خوشوقت رب علاست
زحق جلوہ گر آمدہ نور او — سراسر جہانی شدہ طور او
یکی جام می در دہم ایں زماں — کہ در مدح ایں شہ کشایم زباں
قبولش اگر نیست ایں مدحتم — چہ سازم کہ گردیدہ است عادتم
ز دور ازل منتم ایں فتاد — سرادا پہ از حب او شیر داد
شہا من بوصفت چہ سازم بیاں — ثناخواں تو خلق کون و مکاں
توی آنکہ خلاق ایں عالمی — خدا یا تو قیوم و ہم قائمی
شدم منفعل خوانمت من خدا — خدا باشد از بندگانت بیا
انا اللہ زنان بندگان تواند — خدا با کناں چاکران تواند
بامر تو شد جملہ ذرات خلق — توی نقطہ اول ما سبق
چو نور جمال تو آمد عیاں — ثمر خواندت از لطف رب بیاں
مراد از شجر نیست غیر از ثمر — شجر از ثمر میشود جلوہ گر
بیاں از تو تکمیل گردیدہ شد — ہمہ سر پنہان حق دیدہ شد
نبودار وجودت نبودی بیاں — نماندی در عالم ز ایماں نشاں
ز نوم تقمع امر حق آمدہ — جلال خدا با ہویدا شدہ

تو مقصود دیں ہر زمان بودۂ تجلی بہر دور فرمودۂ
نہ ختمی کہ آخر بدانم ترا نہ بدوی کہ اول بخوانم ترا
در عالم خود آن اول و آخری بذرات عالم تو جلوہ گری
بہر قوم گردیدہ ای رہنما پرستش نمایند ایشاں ترا
بہ اسمی ز اسماء تو ساجدند برت جملگی خاضع و خاشعند
منور ز نورت کلیس و حرم توئی مظہر ذات وجہ قدم
کجا من کجا وصفت ای محترم عدم چوں کند وصف ذات قدم
ہمہ شرک محض است توحید من منزہ تو ہستی ز تحمید من
اگر مشرک کافرم از توام اگر خاطی قاصرم از توام
خطا آمدہ شیوۂ بندگان شدہ لطف عفو از خداوندگاں
یکی جام از لطف سازم کرم کہ سوزد ہمہ کفرام ای محترم
ز جام محبت کرم کن میم فنایم اگر بخش خود ہستیم

ای ز اشراق جمال المقتدر سوختی احجاب قدسی سربسر
دیگر ای رب قدیر یا بہا لبس نماندہ قدر ز رذری بجا
از حجابات سراد قہای مجد از مقامات مستر ہای حد
یا الٰہا سوختم ای کردگار از شراربات زبانی نضار
یا الٰہا ہیچ نبود غیر او اوست وجہ اللہ حق بے گفتگو
یا ربم در باب از احسان و جود تا مشرف آیم از جذب الوجود
یا جمیل و یا عزیز و یا بہاء اشرف اللوح من النار البداء
سوختم ای کردگار مقتدر از شراریات افلکیات شر
پاک بنما یا حبیب العارفین قلب را از آنچہ نافی یالیقین
تا مرفع آیم اندر بسط عدل وارہم از شان عنبریات ہزل
یا الٰہا غیر تو نبود مرا جز توام نبود نصیر از ماسوا
یا الٰہا حق آں شاہنشہان متکی بر مسند احسان عیاں
جملگی بگزشتہ از اقیاد ہست مست و سرخوش از منادی الست
دیدن بگذشتی بگذاشتند آنچہ را بایستشان برداشتند
یا الٰہا ہمت اعلا ایشاں آفریں بر ہمت والا بشاں
غیر وجہ پاکت ای رب ودود جملۂ عالم فنای حرف بود

زا را تفاع ہمت و قدر و بیاں | در ترفع تا انبساط لا مکاں
بس مکیں در صدر انملطالرفیع | جملۂ ذرات از ایشاں بدیع
یا الٰہا از تفضلہا ی تو | یا فتند این قدرت ابہای تو
لیک یارب بایدم عفر خدین | نزد آں ذری کز ایشاں شد لعین
زانکہ ایشاں اسبقند واشرفند | ذی وجود امنعند وارفعند
یا الٰہا خود بایشان داشتی | داشتی و داشتی و داشتی
کردۂ ایشاں مقام لامثال | پردہ ایشاں الیٰ بیت الجلال
بردی از ایشاں شئون خود داد | آنچہ را خود بودہ او را کردۂ
یا الٰہا در منزہ بایدم | ذکر تقدیسی ز ایشاں شایدم
شایدم لطفت نماید دستگیر | وارہم از این شئونات حقیر
یا ہیچ را از من بگیری ای حبیب | ہستی محض آوری بیروں ز جیب
یا الٰہا حق این شاہنشہان | وارہم من از شئونات خسان
یا الہ الحق رب العلمین | یا حبیب الصدق خیر الغافرین

ترجیع بند

بود سوی تو ام راز نہانی | کہ زانم ہست عیش و کامرانی
شدم چوں آشنای یار جانی | ببزم قالی از بیگانۂ تو

ای ماہرویم ایشک موریم
یارم توئی تو ایشیر یارم

بعرش جان چو تو جانانہ بود | کہ قہر از عارضت افسانہ بود
بزبردام زلفت دانہ بود | بدامم در فگند آں دانۂ تو؟

در محفل خود بارم دہ ای یار
پیش رقیباں منما تو خورم

فراق رویت ای سلطان خوباں | چو زلفت کردہ عالم را پریشان
بہر بزمے در آیم ہمچو طفلاں | کہ شاید بشنوم افسانۂ تو

گر بر لب آری یکبار نامم
در خاک پابت صد جان فشانم

زدرد عشقت ایماہ حبیباں رسیدند از مدام طبیباں
خوش آمدم کہ علی رغم رقیباں شرابی نوشم از پیمانہ تو
ایدلستانم جز تو ندارم
جانم نثارت ای تاجدارم
منم ای سروقد دیوانۂ تو از آن دو نرگس مستانۂ تو
شدم از عارض جذبانۂ تو اسیر عشق جاویدانۂ تو
مردم بکوبت در آرزویت
جز وصل رویت قصدی ندارم
زعشقت گر بسوزد استخوانم بجز نام ترا بر لب نرانم
بپای آنکسی صد جاں فشانم کہ یکبارم برد بر خانۂ تو
گاہ از وصالت شادم نمای
گاہ از فراغت سازی نزارم
چناں گرم از میت ای دلستانم کہ دلبر دار بہشت جاودانم
من آں مرغ رمیدہ ز آشیانم کہ نشناسم بجز کاشانۂ تو
باز آ بہ بیشم بین قلب ریش
تاکی گذاری در انتظارم
شدہ ہر موی زلفت یک کمندم دبر عشق تو کردہ پای بندم
شدم ای دلبر بالا بلندم ہلاک از غمزۂ فتانۂ تو
قد بلندت سرو روانم
زلفت کمندت مشک تتارم
چناں ز ابر لقا بارید گوہر کہ افتاد از نظر ہا سنبل تر
ندارد قدر آنجا مشک عنبر کہ باشد سنبل ریحانۂ تو
چوں پادشاہی گاہی نگاہی
بر این اسیرت ای شہسوارم

عید آمد

عید آمد عید آمد ایں عید مبارک باد مبعوث جدید آمد ایں عید مبارک باد
شد عیدی خداوندی باشید بخرسندی کز چرخ نوید آمد ایں عید مبارک باد
ایں عید سعید آمد از خلد پدید آمد ایام وحید آمد ایں عید مبارک باد

ہاں طرز دگر سازم این عید سعید آمد — انوار خداوندی از پردہ پدید آمد
ای عید مبارک بی یا نحن ہیّا لک — خلقی بوجودت حی یا نحن ہیّا لک
وہ وہ طرب است امروز عجب ست امروز — دل در طلب است امروز یا نحن ہیّا لک
خلقی بنوا از تو جمعی بہ بہا از تو — وین فر و ضیا از تو یا نحن ہیّا لک
ای ذات تو لا من شیٔ یکساں بتو موت و حی — ظلمت بظہورت طی یا نحن ہیّا لک
مستم ز می خامت دارم طرب از نامت — آسودہ در ایامت یا نحن ہیّا لک
طوبیٰ لک طوبیٰ لک جان از تو بروں از شک — برشو بنوا اینک یا نحن ہیّا لک
برخیز و طرب راشو سر سلسلۂ ما شو — بیرون زمن و ماشو یا نحن ہیّا لک
مہمان سرخوانت جمعی ز دل و جانت — جبریل مگس رانت یا نحن ہیّا لک
برگو بطرب ہر دم با نغمہ زیر و بم — درماں ز تو شد دردم یا نحن ہیّا لک

ای (قرۃ) بگو ہر دم با قلب تہی از غم
کز طلعت شہ خرم یا نحن ہیّا لک

یا حی یا قیوم

قرۃ العینم بیا اندر نوا — با نوا ہای نوای بینوا
تار ہای جملۂ ذرات نور — ریزی از اشراق وجہی تا ز طور
جان من برخیز با شور و شرر — در نگر با چشم ساقی در نگر
کو فتادہ جملہ ذراتیاں — در صعید وعدۂ اما صعقیاں
خیز از جا نور چشم انظرم — باب ایشاں را بجذب قدرم
تا بکی در قعر باشی طرحیہ — تا بکی مانی تو سرخافیہ

باختہ جان بولایش ہمہ شاہد باشید — ایستادہ بو فایش ہمہ شاہد باشید
روز اوّل کہ رسیدم بمقام ازلی — محو بنمودہ سوایش ہمہ شاہد باشید
دورہا کوزدہ این چرخ مدوّر رحیق — ایستادم بو فایش ہمہ شاہد باشید
نیست مقصود مرا غیر رضایش باللہ — آمدم عین رضایش ہمہ شاہد باشید
(قرۃ العین) نگر با نظر پاک صفی — کیست منظور بہایش ہمہ شاہد باشید
خواہم از فضل خداوندی قیوم قدیم — ریزدم خوں بہ بہایش ہمہ شاہد باشید
رنجہائے کہ کشیدم ز مرور ایام — در رہ قرب ولایش ہمہ شاہد باشید

نبودم ذرۂ از پاک زکل مفقود ازمن از فضل و عطایش ہمہ شاہد باشید

خواہم از مدح برون آوردم از ابداع
تاکنم جان بفدایش ہمہ شاہد باشید

بدیار عشق تو ماندہ ام زکسی ندیدہ عنایتی
بفریدہم بنما نظر تو کہ پادشاہ ولایتی

شمس الٰہی جلوہ گر گردید و جان عاشقاں
در ہوای طلعتش چوں ذرہ رقصان آمدہ

قطعہ

ای عاشقان العاشقان، شد آشکار او جہ حق ۔ رفع حجب گردید ہاں، از قدرت رب الفلق
خیزید کاین دم بے بہا، ظاہر شدہ وجہ خدا ۔ بنگر بصد لطف و صفا، آن روے روشن چون شفق
یعنی زخلاق زماں، شد اینچہاں خرم چناں ۔ روز قیام است ایمہان، معدوم شد لیل غسق
آمد زمان راستی، کژی شد اندر کاستی ۔ آنشد کہ آن میخواستی، از عدل و قانون و نسق
شد ار میاں جور و ستم، ہنگام لطف است و کرم ۔ ایدون بجلۓ ہہقم، شد جانشین قوت و رمق
علم حقیقی شد عیاں، شد جہل معدوم از میاں ۔ برگو بشیخ اندر زماں، برخیز و برہم زن ورق
بود ار چہ عمری واژگوں، وضع جہان از چند و چوں ۔ ہاں شیر آمد ہائے خون، باید بگر دانی طبق
گرچہ بأنظار ملل، ظاہر شدہ شاہ دول ۔ لکن بلطف لم یزل، برہا ندا ز ایشاں علق

قطعہ

ہاں صبح ہدی فرمود، آغاز تنفس ۔ روشن ہمہ عالم شد، زآفاق و ز انفس
دیگر نشیند شیخ، بر مسند تزویر ۔ دیگر نشود مسجد، دکان تقدس
ببریدہ شود رشتہ تحت الحنک ازدم ۔ نہ شیخ بجا ماند، نہ زرق و تدلس
آزاد شود دنیا ز اوہام و خرافات ۔ آسودہ شود خلق، ز تخئیل و توسوس
محکوم شود ظلم، ببازوۓ مساوات ۔ معدوم شود جہل، ز نیروے تفرس
گستردہ شود در ہمہ جا فرش عدالت ۔ افشاندہ شود در ہمہ جا تخم تونس
مرفوع شود حکم خلاف از ہمہ آفاق ۔ تبدیل شود اصل بتاین و تجانس
یاندیمی قم فان الدیک صاح ۔ عن لی بنیا و ناول کاس راح

دست اعبر عن جلبی لحظۃ — ہل الیہ نظرۃ منی تباح
بذل روحی فی ہمنواہ ہین — تجمد القوم السریٰ عند الصباح
قاتلتنی لحظۃ من غیر سیف — اسکرتنی عینہ من دون راح
قد کفتنی نظرۃ منی الیہ — من بہائی فی عذاء فی رواح
ہام قلبی فی ہواہ کیف ہام — راح روحی فی نقاہ این راح
لم یفارقنی خیال منہ قط — لم یزل ہو فی فؤادی لا یراح
ان یشاء یحرق فؤادی فی النویٰ — او یشاء یقتلنی لہ قتلی مباح

قطعہ

در وصل تو میز نند احباب — افتح یا مفتح الابواب
چہ شود گر بر تو رہ یابند — کم تقوا ناظرین خلف الباب
تا کہ از حضرت تو صبر و شکیب — طال تطوا فہم وراء حجاب
در پس پردہ تا بکی حسرت — ارہم نظرۃ بلا جلباب
از تو بجز از تو مدعا ئی نیست — مالدیہم سوا لقاک ثواب
سکروا فی ہوای ثم صحوا — مالہم من لدی سواک مثاب
از سبب ہا گذشتہ اندر حجب — خرقوا الحجب وارتقوا الاسباب
بنما آفتاب را بے ابر — بکشا از جمال خویش نقاب
تا بمانند عاقلان حیران — خشک مغزان شوند اولوالالباب
با خود آیند بیخود ان ہوا — ہوشیاران شوند مست و خراب
بندہ و خواجہ درہم آویزند — لاعبید یری ولا ارباب

قطعہ

بخیالت ای نکورو بمدام باشد اینِ دل — بجمالت ای نکوخو، بکلام باشد اینِ دل
چہ نمودہ ای بافسون، بدل حزین پرخون — کہ مسلسل از نظارہ، بہیام باشد اینِ دل
بجمال حسن رویت، بتتار مشک مویت — بحصار بزم کویت، بمرام باشد اینِ دل
چہ بخوانیش بہ محضر، برلیش بعز منظر — بجلال و شوکت و فر بنظام باشد اینِ دل
چہ بجذب روے مہوش، شدہ ام غریق آتش — نہ شود دگر کہ سرخوش، بغمام باشد اینِ دل
بہ تلطف و تکرم، بہ تعطف و ترحم — بر باز ما تو ہم، کہ ہمام باشد اینِ دل
چہ زماسوی برانی، زخودش بخود رسانی — ز بلاء خود چشانی، بدوام باشد اینِ دل
زدلم شرارہ بارد، کہ نسب زنار دارد — زچہ رو ثمر نیارد، کہ بکام باشد اینِ دل

قطعہ

ای صبا بگوازمن آں عزیز ہائے را | اینچنیں روا باشد طلعت بہائی را
بر لطف آں محبوب نحو رشحہ میبارد | بر ہیاکل مطروح محو سرّ ہائی را
نسمۂ عرافیش میوزد بسی روحا | زندہ مینمایند او ہیکل سوائی را
باب رکن عزتیش شد مفتح ابواب | لطف او رشدہ سائل اہل فتح طائی را
یا بیان نور یہ جملگی بروں آئید | از حجاب ہائی غر بنگرید فنائی را
طلعت مبین ناگہ طالع از حجاب غر | مشنوا لیعز بزمن نطق لن ترانی را

قطعہ

چشم مستش کرد عالم را خراب | ہر کہ دید افتادہ اندر پیچ و تاب
گردش چشم وی اندر ہر نظر | میبر باید جملۂ اہل لباب
گرچہ آید زین دل مجنون محض | کوزہ در خیمۂ لیلی قباب
خیمۂ آتش نشنیاں پر شرر | آتش یا شعلہ زد در ہر حجاب
گرہنا شد نار موسیٰ در ظہور | از چہ کل محو ند و اندر اضطراب
خواہم از ساقی بہ جام طفحۂ | تا بگویم با تو سرّ ا حباب
ہاں نگر برما بعین باصرہ | تا بہ بینی وجہ حق را بے نقاب
آمد از شطر عمائے در نزول | با تجلی رخی چوں آفتاب

مظہر کبریا[۱]

در رہ عشقت ای صنم، شیفتۂ بلامنم | چند معاہرت کنی، با غمت آشنا منم
پردہ بروی بستۂ، زلف بہم شکستۂ | از ہمہ خلق رستۂ، از ہمگاں جدا منم
شیر توئی شکر توئی، شاخہ توئی ثمر توئی | شمس توئی قمر توئی، ذرہ منم ہبا منم
نور توئی تتق توئی، ماہ توئی افق توئی | خوان مرا فتق توئی، شاخہ ہند وا منم
نخل توئی رطب توئی، لعبت نوش لب توئی | خواجۂ با ادب توئی، بندۂ بے حیا منم
من زیم تو نیم نم، نی زکم وزبیش ہم | چوں بتو متصل شدم، بے حد و انتہا منم
شاہد شوخ دلبرا، گفت بسوی من بیا | رستہ زکبر و از ریا، مظہر کبریا منم

طاہرہ خاکپای تو، مست می لقامی تو
منتظر عطائی تو، معترف خطا منم

بابُ المراسلہ والمناظرہ

مولانا عرشی امرتسری

مجھے اپنے قصورِ بیان کا اعتراف کرلینا چاہیئے کہ آپ میرے عریضے (مطبوعہ نگار اگست ۱۹۶۳ء) میں وہ بات نظر آئی جو کبھی میرے خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ " خداع رفریب) مطلق صورت میں مذموم و معیوب نہیں " یہ الفاظ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ہیں، میرے نہیں اس کی صحیح تشریح جو ان کے ذہن میں ہے، وہی کرسکتے ہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ " رسول اللہ کی بلند اخلاقی تعلیم " میں کسی کو فریب دینا مطلق صورت میں یعنی علی الاطلاق بلا قید و بے تکلف جائز ہے تو ایسے " اسلام " کو میں ایک لمحے کے لئے بھی قبول نہیں کرسکتا۔ رسول اللہؐ تو رسول اللہؐ یعنی " بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر " انؐ کی اُمّت کا کوئی بھی فردِ صالح اس کا روادار نہیں ہوسکتا کہ فریب کو بے تکلف (مطلق صورت میں) جائز قرار دے ۔ وہ کتابِ اقدس وا علیٰ جو " لعنت اللہ علی الکاذبین " کہہ کر دروغ پر وعید شدید کی تہدید کررہی ہے وہ فریب کو جو دروغ کی مذموم ترین اور مضر ترین شکل ہے کس طرح جائز قرار دے سکتی ہے۔ میں اس باب میں بالکل آپ کے اس قول کا ہم نوا ہوں کہ یہ

" مجھے تسلیم نہیں ۔ کیونکہ یہ رسول اللہ کی بلند اخلاقی تعلیم کے بالکل منافی ہے " (بحوالہ ایضاً)

میں نے اپنے عریضے میں واضح کردیا ہے کہ " حرب " کا اسلامی قتال وجہاد سے کوئی واسطہ نہیں۔ لہذا حدیث میں جو " الحرب خدعۃ " کہا گیا ہے تو اس کا وہی مطلب صحیح ہے جو آپ نے عینی شارح بخاری

اور ابن اثیر کے حوالے سے تسلیم کیا ہے یعنی ایسی جنگیں جو اعلائے
کلمۃ اللہ ایسے بلند اسلامی مقاصد سے محروم ہوں اور صرف سلب ونہب
اور سرکشی کے لئے برپا کی جائیں۔ جیسے اکاسرہ وقیاصرہ کی جنگیں کہ وہ
سرتاپا خدعہ ہی ہوتی ہیں۔
مولانا دریابادی کو ایسا فقرہ (خداع مطلق صورت میں مذموم ومعیوب
نہیں) لکھنے کی ضرورت غالباً اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ اسمائے الہٰی
میں ایک اسم صفت "خادع" قرآن مجید میں مذکور ہے میں اس کی
شرح اپنی تحقیق کے مطابق اپنے سابقہ عریضے میں کرچکا ہوں کہ یہ قانون
خداوندی کا اقتضا ہے کہ فریب دینے والا دراصل اپنے آپ سے فریب
کررہا ہوتا ہے اس لئے بنیادی طور پر تو وہ خود ہی اپنے خدع کا شکار ہے
جیسا کہ میں نے اس آیت سے دلیل بھی دی تھی

" وَمَا يَخْدَعُونَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ "

چونکہ اس قانون کا واضع خدا ہے لہٰذا جوابی طور پر یہ لفظ یا اس کے
قریب المعنی بعض دوسرے الفاظ اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کئے گئے
ہیں۔ نتشے نے اپنے ایک ایذا دینے والے کو خطاب کرکے کہا تھا۔

> " تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے میں تو سہہ لوں گا لیکن
> اس ارتکاب سے) اپنے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کا کیا
> چارہ ہوگا "

یہ بالکل وہی بات ہے جو قدیم زمانے سے سنتے آئے ہیں :——

پنداشت ستمگر کہ ستم بر ما کرد
سرگردن او بماند و از ما بگذشت

اسلامی جنگ (قتال یا حرب) میں ضرورت کے وقت جس چیز کی اجازت
ہے اُسے " تحرّف " اور " تحیّز " سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ
فرماتے ہیں :۔

> " ومن یولھم یومئذ دبرہ الا متحرفاً
> لقتال اور متحیزاً الیٰ فئۃ باء وابغضب
> اللہ وماواہ جہنم وبئس المصیر (انفال ۱۶)
> مسلمانو! دشمن سے مقابلے کے وقت پیٹھ نہ دکھانا۔ ہاں جو شخص جنگ
> کی مصلحت سے پینترا بدلے، یا اپنی پارٹی کی طرف پلٹنا چاہے اور

اس طرح اپنے مقام سے ہٹ کر ادھر ادھر ہو جائے تو اس کا
مضائقہ نہیں .... الخ

مولانا عثمانی مرحوم اس پر حاشیہ لکھتے ہیں :-

" اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا
زیادہ مؤثر ہے یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے
جدا ہو گئی ہے وہ اپنے بچاؤ کے لئے پسپا ہو کر مرکز سے ملنا
چاہتی ہے تو ایسی پسپائی جرم نہیں ...... الخ "

متحارب قوتیں ایک دوسرے کو فریب دیتی ہیں، عہد شکنی کرتی ہیں اور ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتی ہیں، دشمن کو شکست دینے کے لئے اور خود فتح مند و ظفر یاب ہونے کے لئے۔ لیکن اسلام کی فتح و شکست کا معیار بالکل مختلف ہے، فریب پر اعتماد تو کجا وہ اپنی قوت وجمعیت پر بھی بھروسے کی اجازت نہیں دیتا۔ تمام امکانی تیاریوں کے بعد وہ اللہ تعالیٰ پر توکل اور اللہ کے احکام کی سختی سے پابندی کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ایک خط میں حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھتے ہیں :-

" تم کو یہ بات یاد رہے کہ رسول اللہ ؐ کے عہد میں ہم دشمن کی
بڑی فوج کو اپنی بڑی فوج سے شکست نہیں دیتے تھے اور نہ
خدا ہماری بڑی فوج کی وجہ سے ہم پر فتح نازل کرتا تھا۔ بلکہ اکثر
خدا دشمن کی بڑی فوج کو اس کے بل بوتے پر (فخر کرتے ہوئے)
چھوڑ کر الگ ہو جاتا جس کے زیر اثر وہ کمزور ہو جاتی اور شکست
کھا جاتی اور اس کی زیادہ تعداد اس کو کچھ فائدہ نہ پہونچاتی "

ایک اور طویل خط میں یہ الفاظ ملتے ہیں :-

خدا کی قسم، اگر دشمنوں سے ہم اپنے بل بوتے پر لڑا کرتے تو وہ مار کے
ہم کو تباہ کر چکے ہوتے ہم تو اپنے مالک کے بھروسے پر لڑتے ہیں
اور اپنے بل پر بالکل اعتماد نہیں کرتے اور اس سے نصرت و رحمت
کی التجا کرتے ہیں "

مقام غور ہے کہ کیا ایسے لوگ جو " اپنے بل پر بالکل اعتماد نہیں کرتے " کیا وہ " خداع " پر اعتماد کریں گے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یہ ہے اصلی توکل۔ پوری مستعدی سے میدانِ جنگ میں اترتے ہیں۔ لیکن اپنی مستعدی کو بھی معبود نہیں بنا لیتے چہ جائیکہ شیطانی حربوں کے

سامنے گھٹنے ٹیک دیں۔

ایک خط میں سعد بن ابی وقاص کو لکھتے ہیں :-

" تمہارا کوئی فوجی اگر مذاق سے بھی کسی فارسی کو امان دے
یا ایسا اشارہ کرے .... تو اسے لفظ یا اشارہ سے امان
نافذ کر دو۔ دشمن سے جو وعدہ کرو اسے ہر حال میں پورا کرو
وفا تو بے وفائی کے موقع پر بھی اچھا اثر دکھاتی ہے
لیکن غداری دفریب ، خلاف وعدہ اگر غلطی سے بھی کی
جائے تو اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ..... میں تم کو
اس طرز عمل سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہوں جس سے مسلمانوں
کے نام کو بٹہ لگے اور ان کی طاقت کو صدمہ پہونچے "

میرے مخدوم مولانا ! اسلامی لٹریچر عقیدہ و عمل کی ایسی تجلیات و انوار سے جگمگا رہا ہے اور آپ مجھ سے زیادہ اس پر نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ میری یہ سطور اس غلط فہمی کو جو میرے قصور بیان کی وجہ سے پیدا ہوئی رفع کر سکیں گی۔ انشاء اللہ۔

(نگار)

مولانا ! میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کے سابق مکتوب گرامی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔ اگر آپ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام نے کبھی " خدعۃ " (بمعنی مکروفریب) کی اجازت نہیں دی خواہ وہ قتال مذہبی ہو یا "حرب دنیاوی" تو پھر میرے آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ مجھے تو اختلاف ہے جناب عبدالماجد دریابادی کے اس خیال سے کہ وہ خدعۃ کو مکروفریب بھی کہتے ہیں اور اسی مفہوم کو وہ ابن عباس کی حدیث "الحرب خدعۃ" پر بھی چسپاں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اصل سوال تو یہ ہے کہ حدیث مذکورہ صحیح ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوسکتا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو اس کی وضاحت بھی فرما دیجئے۔

رہا لفظ " خادع " کو خدا کے اسماء صفات میں شامل کرنا۔ سو مجھے اس سے بھی اختلاف ہے خدا کے بہت سے نام ایسے تسلیم کر لئے گئے ہیں جن سے میں متفق نہیں ہوں۔ لیکن خیر، یہ بحث جدا ہے۔ اس پر آئندہ کسی وقت اظہار خیال کروں گا۔

باب الاستفسار

۱

شاعری میں "مستزاد" کی نوعیت

(محمد اکرم خاں ۔ پشاور)

"فنِ شعر میں "مستزاد" کا موجد کون ہے اور کب سے
اس کا آغاز ہوا ہے ۔ نیز یہ کہ اس کا تعلق عروض سے
کس حد تک ہے ۔ اور اس کی صحیح نوعیت کیا ہے؟"

(نگار) میں نہیں کہہ سکتا کہ مستزاد کا موجد کون تھا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عربی شاعری میں یہ چیز نظر نہیں آتی ۔ فارسی میں البتہ اس کا رواج ہوا ۔ لیکن اس کے آغاز کی نشاندہی مشکل ہے تاہم فارسی کے قدیم شعراء کے یہاں اس کی مثالیں ہم کو ملتی ہیں اور اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فارسی میں اس کا رواج اب سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ابن حسام، فخری اور امیر خسرو کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ ابن حسام کا صحیح زمانہ متعین کرنا مشکل ہے لیکن فخری کا ذکر قزوینی نے "آثار البلاد" میں انوری، عسجدی اور اوحدی کرمانی کے ساتھ کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فخری ساتویں صدی ہجری کا شاعر تھا ۔ اور یہی زمانہ امیر خسرو کا بھی تھا ۔

بہر حال اس سے انکار ممکن نہیں کہ فارسی میں مستزاد کا رواج اب سے چھ سات صدی پہلے ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے عمومیت نہ اس وقت حاصل کی نہ بعد کو ۔ اردو میں بھی اس کا رواج زیادہ نہیں ہوا اور اگر کسی نے اس طرف توجہ بھی کی تو صرف تفنن کے طور پر ۔

مستزاد سے مراد ہے ہر مصرع یا ہر بیت کے اختتام پر ایک ٹکڑے کا اضافہ کر دینا ۔ جو بعض کے نزدیک (جن میں صاحب مناظر الانشاء و مجمع الصنائع بھی شامل ہیں) نثر کا ٹکڑا ہونا چاہیے خواہ وہ مسجع ہو یا نہ ہو اور بعض کے نزدیک اس کا نظم ہونا ضروری ہے ۔ گو اس کا اصل مصرع یا بیت کے ہم وزن ہونا ضروری نہیں ۔ لیکن ام

یہی ہے کہ فقرۂ مستزاد بھی مصرع یا بیت کی بحر میں ہو۔
صاحب "ہفت قلزم" نے مستزاد کی تعریف میں لکھا ہے کہ :-

"اس سے مراد نثر مسجع کا وہ ٹکڑا ہے جو ہر بیت یا
مصرع کے بعد بڑھا دیا جائے اور کلام ماسبق و مابعد سے
معنوی ربط بھی رکھتا ہو۔"

ہر مصرع کے بعد فقرۂ مستزاد کی مثال میں اس نے پہلے رباعی کا ایک شعر پیش کیا ہے :-

ہر چند کہ گلرخاں دہر اند بسے (با رنگ وصفا)
مثل تو بہ نیکوئی ندیدند کسے (اے عشوہ نما)

اور پھر پوری رباعی :-

فارغ ز شراب صاف گلرنگ مباش (چوں درد کشاں)
بے بادہ و مطرب خوش آہنگ مباش (در دیر مغاں)
چوں لالہ قدح گیر و چوگل خنداں شو (در گلشن دہر)
یعنی کہ بساں غنچۂ دل تنگ مباش (در باغ جہاں)

اسی سلسلہ میں فخری کی چند ابیات مسلسل بھی مثالاً پیش کئے ہیں جن میں پورے شعر کے بعد "مستزاد" کا اضافہ پایا جاتا ہے :-

رفتم بہ طبیب، گفتمش بیمارم
از دل شب تا بسحر بیدارم (درمانم چیست)
بنمنم چو طبیب وید گفت از سر لطف
جز عشق نداری مرضے پندارم (محبوب تو کیست)
رو پیش وے و حال دل خویش بگو
وز لعل لبش بوسہ دوا خویش بجو (بتوانی زیست)
رفتم بر یار و گفتمش بیمارم
داغے ز غم عشق تو بر دل دارم (در من نگریست)
گفتا تو کدام دردمندی چہ کسی
صد عاشق چو نتو در سلاسل دارم (گو نام تو چیست)

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقرۂ مستزاد نثر مسجع نہیں ہوتا بلکہ بیت یا مصرع کے ارکان کی طرح وہ بھی انھیں کا ہم وزن ہوتا ہے جیسا کہ تمام مذکورۂ بالا اشعار کے فقرات مستزاد سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مثالیں بحر رباعی کی ہیں اور ایسے فقرات مستزاد کی جو اصل شعر سے معنوی ربط تو رکھتے ہیں لیکن اگر انھیں نکال دیا جائے تو بھی شعر کا مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن امیر خسرو نے ایک رباعی ایسی بھی لکھی ہے کہ فقرات مستزاد اس کا

جزو اصلی ہیں اور اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

تا خط معنبر ز رخت بیروں جست
از بادۂ اشک خویش ہر عاشق مست (در خ گلگوں کرد)
در جوئے جمال تو مگر آب نماند
کاں سبزہ کہ زیر آب بودے پیوست (سر بیروں کرد)

ہرچند مستزاد کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں لیکن فارسی میں بحر ہزج کو رباعی کے لئے زیادہ پسند کیا گیا

اردو میں بحر کی کوئی قید نہیں۔ مختلف شعراء نے مختلف بحروں میں طبع آزمائی کی ہے جیسا کہ صاحب قواعد العروض کی پیش کی ہوئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے :۔

:۔ دل اپنا پہلے زنگ کدورت سے صاف کر (مانند آئینہ)
پھر تو بغور دیکھ کہ اس آرسی میں ہے (کیا حسن جلوہ گر)

یہ شعر بحر مضارع کا ہے جس میں پہلے مصرع کا فقرۂ مستزاد مصرع کا ضروری جزو نہیں لیکن دوسرے مصرع کا فقرۂ مستزاد جزو ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

بحر:۔ کیا قہر ہے نتھنوں کی پھڑک اور بُتِ بیباک (عشاق ہیں غمناک)
اور اس پہ غضب ہے تری خود بینی و نخوت (نکتوڑی کی عادت)

یہ شعر بحر ہزج کا ہے (وزن رباعی سے علیحدہ) جس کے فقرات مستزاد شعر کا ضروری جزو نہیں۔

بعض شعراء نے دو دو مستزاد فقرے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً شیخ محمد جان شاد کا شعر ہے :۔

نالہ زن باغ میں ہو بلبل ناشاد نہیں (بند رکھ کام و زباں، کرنہ فریاد و بکا)
ڈر یہی ہے کہ خفا ہو ستم ایجاد نہیں (باغباں دشمن جان، گھونٹ ڈالے گا گلا)

یہ شعر بحر رمل کا ہے اور دونوں مصرعوں کے فقرات مستزاد اپنی اپنی جگہ پورے مصرع ہیں اور اصل شعر کا جزو ضروری نہیں۔

انشاء اللہ خاں نے توحد کر دی اپنی ایک ریختی میں ہر مصرع کے بعد پانچ پانچ ٹکڑے مستزاد کے شامل کر دیئے :۔

میں پھاند کے دیوار جو کل رات نہ جاتی
(کنڈی نہ ہلاتی، جاکر نہ جگاتی، نیند اس کو نہ آتی، جوبن کی دُمانی۔ تیوری نہ ملاتی)
اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اڑانی
(ہاتھوں پہ نچاتی، گاتی نہ بجاتی، کھانے کو نہ کھاتی، پھر تو نہ بلاتی، سو سو بلے گاتی)

بہرحال اردو میں مستزاد کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں تاہم بحر رمل و ہزج ہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہیں اور اسی لئے انھوں نے زیادہ تر انھیں دونوں بحروں میں مستزاد لکھے ہیں۔

مستزاد نگاری کا تعلق محض تفنن و صناعت شعری سے ہے حقیقی شاعری سے نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ موسیقی میں سم پر آنے سے پہلے تال کے وقفوں کو بڑھا کر انھیں تان سے پورا کیا جاتا ہے بالکل یہی صورت مستزاد کی ہے جس میں ایک مصرع کے بعد وہ بحر میں وقفہ پیدا کرتے ہیں اور یہی وقفہ مستزاد ہے

اس سلسلہ میں ایک بات اور میرے ذہن میں آئی وہ یہ کہ آجکل جدید شاعری میں جو طویل نظمیں لکھی جاتی ہیں وہ بھی زیادہ تر مستزاد قسم کی ہوتی ہیں جن میں اصل بحر کے وقفوں کو بڑھا کر انھیں مستزاد فقروں سے پُر کرتے ہیں

لفظ "بیگانہ" کا استعمال

جناب شفقت کاظمی۔ ڈیرہ غازیخاں

میں نے اپنے حسب ذیل شعر :-

بیگانہ ملے ہیں جب ملے ہیں
یاروں سے ہمیں بہت گلے ہیں

لفظ بیگانہ بیگانہ وار کے معنوں میں استعمال کیا ہے عرصہ ہوا کراچی کے ایک پرچے میں جناب گاچیں کرنالی نے اعتراض کیا تھا کہ لفظ بیگانہ، بیگانہ وار کے معنوں میں غلط استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے اس بابت میں جناب جوش ملسیانی، جناب اثر لکھنوی، اور جناب ماہر القادری سے رہنمائی کی درخواست کی تھی۔ مولانا ماہر صاحب نے لکھا تھا کہ بیگانہ، بیگانہ وار کے معنوں میں یہاں فٹ آتا ہے مگر جناب جوش اور جناب اثر نے معترض کی تائید فرمائی تھی چنانچہ میں نے لفظ بیگانہ کو آزردہ سے بدلا تھا مگر کچھ دن ہوئے میں نے ظہیر فاریابی کے دیوان میں حسب ذیل شعر دیکھا ہے جس میں لفظ بیگانہ، بیگانہ وار کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

زبس کاں بیوفا با من سر بیگانگی دارد
خیالش نیز در چشمِ دلم بیگانہ می آید

اگر مندرجہ بالا شعر کا مفہوم سمجھنے میں میں نے غلطی نہیں کی تو میں نے بھی لفظ بیگانہ کا استعمال درست کیا ہے ممکن ہو تو آپ اپنی گرانقدر رائے سے مطلع فرما کر میری مشکل دور فرمائیں۔

زو اصلی ہیں اور اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

تا خط معنبر ز رخت بیروں جست
از بادۂ اشکب خویش ہر عاشقِ مست (رخ گلگوں کرد)
در جوئے جمال تو مگر آب نماند
کاں سبزہ کہ زیر آب بودے پیوست (سر بیروں کرد)

ہر چند مستزاد کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں لیکن فارسی میں بحر ہزج کو رباعی کے لئے زیادہ پسند یا گیا

اردو میں بحر کی کوئی قید نہیں۔ مختلف شعراء نے مختلف بحروں میں طبع آزمائی کی ہے جیسا کہ صاحب اعدالعروض کی پیش کی ہوئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے :۔

:۔ دل اپنا پہلے زنگِ کدورت سے صاف کر (مانند آئینہ)
پھر تو بغور دیکھ کہ اس آرسی میں ہے (کیا حسن جلوہ گر)

یہ شعر بحر مضارع کا ہے جس میں پہلے مصرع کا فقرۂ مستزاد مصرع کا ضروری جزو نہیں لیکن دوسرے مصرع کا فقرۂ مستزاد جزو ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

بحر:۔ کیا قہر ہے نتھنوں کی پھڑک او بُتِ بیباک (عشاق ہیں غمناک)
اور اس پہ غضب ہے تری خود بینی رنخوت (نکتوڑی کی عادت)

یہ شعر بحر ہزج کا ہے روزن رباعی سے علیحدہ، جس کے فقراتِ مستزاد شعر کا ضروری جزو نہیں۔
بعض شعراء نے دو دو مستزاد فقرے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً شیخ محمد جان شاد کا شعر ہے :۔

نالہ زن باغ میں ہو بلبلِ ناشاد نہیں (بند رکھ کام و زباں، کر نہ فریاد و بکا)
ڈر یہی ہے کہ خفا ہو ستم ایجاد نہیں (باغباں دشمنِ جان، گھونٹ ڈالے گا گلا)

یہ شعر بحر رمل کا ہے اور دونوں مصرعوں کے فقرات مستزاد اپنی اپنی جگہ پورے مصرع ہیں اور صل شعر کا جزو ضروری نہیں۔

انشاء اللہ خاں نے تو حد کر دی اپنی ایک ریختی میں ہر مصرع کے بعد پانچ پانچ ٹکڑے مستزاد کے شامل کر دیئے :۔

میں پھاند کے دیوار جو کل رات نہ جاتی
(کنڈی نہ ہلاتی، جا کر نہ جگاتی، نیند اس کو نہ آتی، جوبن کی دُہائی۔ تیوری نہ ملاتی)
اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اڑاتی
(ہاتھوں پہ سجاتی، گاتی نہ بجاتی، کھانے کو نہ کھاتی، پھر تو نہ بلاتی، سو سو بلے گاتی)

بہر حال اردو میں مستزاد کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں تاہم بحر رمل و ہزج ہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔
دراسی لئے انھوں نے زیادہ تر انھیں دونوں بحروں میں مستزاد لکھے ہیں۔

مستزاد نگاری کا تعلق محض تفنن و صناعت شعری سے ہے حقیقی شاعری سے نہیں ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ موسیقی میں سَم پر آنے سے پہلے تال کے وقفوں کو بڑھا کر انھیں تان سے پورا کیا جاتا ہے بالکل یہی صورت مستزاد کی ہے جس میں ایک مصرع کے بعد وہ بحر میں وقفہ پیدا کرتے ہیں اور یہی وقفہ مستزاد ہے

اس سلسلہ میں ایک بات اور میرے ذہن میں آئی وہ یہ کہ آجکل جدید شاعری میں جو طویل نظمیں لکھی جاتی ہیں وہ بھی زیادہ تر مستزاد قسم کی ہوتی ہیں جن میں اصل بحر کے وقفوں کو بڑھا کر انھیں مستزاد فقروں سے پُر کرتے ہیں

لفظ "بیگانہ" کا استعمال

جناب شفقت کاظمی ۔ ڈیرہ غازیخاں

میں نے اپنے حسب ذیل شعر میں :-

بیگانہ ملے ہیں جب ملے ہیں
یاروں سے ہمیں بہت گلے ہیں

لفظ بیگانہ بیگانہ وار کے معنوں میں استعمال کیا ہے عرصہ ہوا کراچی کے ایک پرچے میں جناب گلچیں کرنالی نے اعتراض کیا تھا کہ لفظ بیگانہ، بیگانہ وار کے معنوں میں غلط استعمال کیا گیا ہے ۔ میں نے اس بارے میں جناب جوش ملسیانی، جناب اثر لکھنوی، اور جناب ماہر القادری سے رہنمائی کی درخواست کی تھی ۔ مولانا ماہر صاحب نے لکھا تھا کہ بیگانہ، بیگانہ وار کے معنوں میں یہاں فٹ آتا ہے مگر جناب جوش اور جناب اثر نے معترض کی تائید فرمائی تھی چنانچہ میں نے لفظ بیگانہ کو آزردہ سے بدلا تھا مگر کچھ دن ہوئے میں نے ظہیر فاریابی کے دیوان میں حسب ذیل شعر دیکھا ہے جس میں لفظ بیگانہ، بیگانہ وار کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے ۔

زلبس کاں بیوفا بامن سر بیگانگی دارد
خیالش نیز در چشم دلم بیگانہ می آید

اگر مندرجہ بالا شعر کا مفہوم سمجھنے میں میں نے غلطی نہیں کی تو ظہیر نے بھی لفظ بیگانہ کا استعمال درست کیا ہے ممکن ہو تو آپ اپنی گرانقدر رائے سے مطلع فرما کر میری مشکل دور فرمائیں ۔

(نگار) بیگانہ فارسی لفظ ہے اور اس کا مفہوم وہی ہے جو غیر یا اجنبی کا۔ لفظ وار ایک جداگانہ لفظ ہے جو فارسی میں، وش، وند، آسا کی طرح مانند کا مفہوم پیدا کرتا ہے جیسے رحور وش، خداوند، شیر آسا، خواجہ وار اور بیگانہ وار کے معنی ہوں گے:۔ (اجنبی کی طرح۔ غیر کے مانند) اسلئے بیگانہ کو بیگانہ وار کی جگہ استعمال کرنا درست نہیں۔ ہاں اگر محاورہ یا انداز بیان سے یہ مفہوم پیدا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ ظہیر فاریابی کا جو شعر آپ نے نقل کیا ہے وہ بھی اسی قبیل کا ہے۔ اس شعر میں لفظ بیگانہ، بیگانہ وار کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ یہ مفہوم پیدا ہوا ہے محاورہ سے۔ آپ نے دوسرے مصرع کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس میں محاورہ "بچشم آمدن" مستعمل ہوا ہے جس کے معنے ہیں "نظر آنا" بنابراں "بچشم بیگانہ آمدن" کا مفہوم ہوگا "بیگانہ نظر آنا"

اگر وہ صرف" بدلم بیگانہ می آید" لکھتا تو بیشک اس سے بیگانہ وار کا مفہوم لیا جاتا لیکن چونکہ ایسا لکھنا محاورۂ زبان کے خلاف ہوتا اس لئے لفظ چشم کا اضافہ اسے کرنا پڑا۔

بہرحال فاریابی کا یہ شعر تو آپ استناداً پیش نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں لفظ بیگانہ، بیگانہ ہی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، بیگانہ وار کے معنی میں نہیں ـــــ لیکن اس سے ہٹ کر جب میں آپ کے شعر پر غور کرتا ہوں تو ایک صورت استعمال "بیگانہ" کے جواز کی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

آپ نے پہلے مصرع میں "ملے ہیں" دو جگہ نظم کیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں جگہ آپ نے ایک ہی مفہوم میں اس کا استعمال کیا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے جدا ہے۔

ملنا اُردو میں مختلف مواقع پر مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ملاقات یا یکجا ہونے کا مفہوم تو خیر بالکل سامنے کا ہے جسے عام طور پر سبھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس کا ایک مفہوم "نظر آنا" دکھائی دینا اور پایا جانا بھی ہے۔ اس لئے اگر آپ کے مصرعہ میں "بیگانہ ملے ہیں" کا مفہوم "بیگانہ نظر آئے ہیں" لیا جائے اور دوسری جگہ قافیہ میں ملاقات یا یکجا ہونے کا تو پھر یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ بیگانہ "بیگانہ وار" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس صورت میں مصرع کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ :۔

"بیگانہ نظر آئے ہیں وہ جب بھی ملے ہیں"

بیگانہ کو آزردہ کر دینے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اوّل تو "آزردہ ملنا" کوئی محاورہ نہیں دوسرے یہ کہ بیگانہ کی جگہ آزردہ کا استعمال بھی اسی صورت سے درست ہو سکتا ہے کہ "ملے ہیں" کا مفہوم "نظر آئے" قرار دیا جائے۔

چند الفاظ کے معنی

سید دل محمد فضا۔ خانیوال۔

استفسارات ذیل کے جوابات لکھ کر ممنون پذیر کیجئے :ـــــ

ابن یمین کے اس شعر کا ترجمہ لکھیئے۔ نظم کا عنوان کجروی روزگار با اہلِ ہنر:۔

دریا صفت کہ منصب خاشاک اندرو
بالائے عقد گوہر و سلک دُرر بود

اس کا ترجمہ لکھ دیجئے

اس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

رسمیست در زمانہ کہ ہر کم بضاعتی
ز اہلِ ہنر بمرتبہ ہا بیشتر بود

اس کا ترجمہ نہ لکھیئے

ان الفاظ کے معنی بتائیے:۔

۱ آکام
۲ بابام (ہمایوں نامہ سے)

استعمال (۱):۔
"دریں اثنا حضرت آکام گفتند کہ شما از فرزند من غافل اید"
استعمال (۲):۔
"وحضرت پادشاہ بابام را از جہت تشویش درون بردند"

لک لک کس جانور کا نام ہے؟

استعمال
"کنجشک در آشیانہ لک لک خانہ ساختے"

(نگار) (۱) ابنِ یمین کے دونوں شعروں کو ملا کر پڑھیئے تو مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے "زمانہ میں کم بضاعت کا مرتبہ ہمیشہ اہلِ ہنر سے زیادہ رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ دریا میں خس وخاشاک اوپر رہتے ہیں اور موتی نیچے"۔

(۲) (آکا) ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں اس لئے آکام کے معنے ہوں گے میرا آکا یا میرا بڑا بھائی۔ اسی طرح بابا کا لفظ فارسی میں باپ، دادا اور نانا کے لئے استعمال ہوتا ہے اور بابام کے معنی ہوں گے۔ میرا باپ یا دادا وغیرہ۔

(۳) لک لک کو عربی میں لقلق کہتے ہیں اور اردو میں لگلا جو جھیل یا دریا کے کنارے مچھلیاں پکڑ پکڑ کر کھاتا رہتا ہے۔ فقرہ کا مطلب ظاہر ہے کہ کنجشک (گوریا) نے اپنا گھونسلہ لک لک کے گھونسلہ میں بنایا۔

طیار یا تیار

اصغر علی خانصاحب ۔ منجھن پور

یہاں ایک صاحب جو اُردو کے پروفیسر ہیں انھوں نے میری ایک تحریر میں لفظ طیار دیکھ کر اعتراض کیا کہ اس کو تیار لکھنا چاہیے۔ میں نے کہا حضرت نیاز ہمیشہ طیار لکھتے ہیں لیکن انھوں نے اس کو غلط بتایا۔

اس باب میں ذرا تفصیل کے ساتھ لکھئے کہ اس کا صحیح املا کیا ہے

(نگار) آپ نے بالکل صحیح کہا کہ میں ہمیشہ طیار لکھتا ہوں اور میرے نزدیک یہی املا درست ہے۔ لفظ طیار کا مادہ طیر ہے جس کے معنی اڑنے کے ہیں اور طیار کے معنی نہ صرف اُڑنے والا بلکہ مستعد اور مہیا کے بھی ہیں یعنی بالکل وہی مفہوم جو انگریزی میں لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی میں وہ گھوڑا جو تیز و چالاک ہو "فرس طیار" کہلاتا ہے اور چڑیا کا بچہ جس کے پر نکل آئیں اسے بھی طیار کہتے ہیں۔

فارسی شعراء نے بھی ہمیشہ طیار ہی لکھا ہے۔ واعظ قزوینی کا شعر ہے:۔

دارد چو مرغ عمرت پرواز بہ سرعت
اسباب عیش و عشرت طیار گو نباشد

اشرف مازندرانی کہتا ہے:۔

میبرد از ہوائے عشق او رنگ از رخم
گرچہ باز نجیر موج بادہ طیارش کنم

قدیم نسخوں اور تذکروں میں دونوں شعروں کا طیار اسی طرح لکھا ہوا پایا گیا ہے۔

عربی میں لفظ تیار بھی مستعمل ہے۔ لیکن اس کا مفہوم ہے شوریدہ سر، لاف زن جو طیار کے مفہوم سے مختلف ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں طیار کو موڑ کر کے تیار لکھنا چاہیے تو یہ بالکل لایعنی سی بات ہوگی۔ کیونکہ اردو میں سیکڑوں الفاظ عربی کے جوں کے توں استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کے املا میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ پھر طیار نے کیا قصور کیا ہے۔ اردو میں طیاری جسم کی اس فربہی کو کہتے ہیں جو ورزش سے پیدا ہوتی ہے اور یہ مفہوم طیاری سے پیدا ہوتا ہے تیار سے نہیں۔

شیعی اور رافضی

سید کرامت حسین۔
شیعی جماعت کو رافضی کیوں کہتے ہیں اور کس وقت سے ان کو یہ لقب دیا گیا ہے

(نگار) اس میں شک نہیں کہ متعصب اہل سنّت شیعوں کو رافضی بھی کہتے ہیں۔ غالب نے بھی اپنی مشہور رباعی میں رافضی و شیعی کو ایک ہی قرار دیا ہے۔ کہتا ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی و دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی
صوفی کیونکر ہو ماورا رالنہری

مولانا حالی نے بھی اسی رباعی کے سلسلہ میں تشیع و رفض کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے۔ لیکن اگر اس لفظ کے تاریخی ماخذ پر غور کیا جائے تو حضرات شیعہ کو رافضی کہنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اس لفظ کا تاریخی ماخذ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب امام زین العابدین کے فرزند جناب زید نے (جو امام ولد تھے) خروج کا ارادہ کیا تو ۴۰ ہزار کوفیوں نے آپ کی حمایت و امداد میں بیعت بھی کر لی لیکن جب خروج کا وقت آیا تو یہ سب پھر گئے اور جناب زید نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "رفضتمونی" (تم لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا) اور اسی وقت سے ان کو رافضی کہا جانے لگا۔ گو اس کے بعد بھی آپ نے ۵۰۰ رفقاء کے ساتھ یوسف بن عمر والی کوفہ کے خلاف خروج کیا اور قتل ہو گئے لیکن جس جماعت نے آپ کا ساتھ چھوڑا تھا وہ بدستور آپ سے منحرف رہی۔

اس لئے اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اوّلاً رافضی ان لوگوں کو کہا گیا تھا جنھوں نے خاندانِ حضرت علی کی مخالفت کی تھی نہ کہ موافقت۔ اور اس بنا پر اس لفظ کا اطلاق میری رائے میں غیر شیعی جماعتوں پر ہونا چاہیئے۔ اور اس لقب کے مستحقین میں سب سے پہلا درجہ خارجیوں کا ہے اور اس کے بعد اہل سنّت کا۔

شبنم رومانی

وجہ تحریر ایک استفسار ہے "عرصہ محشر" معنوی اعتبار سے کہاں تک درست ہے؟ کیا فارسی یا اُردو کے مستند شعراء نے یہ ترکیب جائز رکھی ہے اور محشر کو حشر کے معنی میں لیا ہے؟ آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟ مفصل جواب کے لئے ممنون ہونگا
یہ بھی تحریر فرمائیں کہ "مسیحا" کا الف ندائیہ ہے یا حرفِ زاید؟

(نگار) محشر عربی لفظ ہے جو محشَر و محشِر (بہ فتح شین وسکون) دونوں طرح مستعمل ہے جس کے معنی علی الترتیب جائے حشر و وقتِ حشر کے ہیں۔ اس کا مصدر حشر ہے لیکن عربی میں قاعدہ ہے کہ مصادر ثلاثی کے اول میں میم بڑھاکر (بروزن مفعل) مصدری معنی پیدا کرتے ہیں اور اسے مصدر میمی کہتے ہیں۔ جیسے نظر سے منظر۔ ضرب سے مضرب۔ اس لئے محشر کے معنی حشر کے بھی ہوسکتے ہیں۔ راسخ کا شعر ہے

دکھائیں گے وہ جلوۂ دلربا
بپا ہوگا محشر قیامت کے بعد

لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ عرصہ کے ساتھ حشر ہی لکھا جائے تاکہ دو ظرف زمان ایک جگہ جمع نہ ہوجائیں۔ داغ کا شعر ہے:۔

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

(۲) مسیحا کا الف ندائیہ نہیں ہے بلکہ تعظیمی ہے فارسی میں الف کم از کم ۳۲ مختلف معانی پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے انہیں میں ایک مفہوم تعظیم یا تحقیر کا بھی ہے۔ فردوسی کہتا ہے:۔

بہ پیچید بر خویشتن بیش تا
کہ چوں رزم آرد برہنہ تنا

اسی طرح مسیحا کا الف بھی تعظیمی ہے۔ الف تحسین کلام کے لئے بھی فارسی میں مستعمل ہے لیکن زیادہ تر فعل کے ساتھ۔
جیسے گفت سے گفتا۔

۷

میر کا شعر، چمن زارِ غزل، وامق و عذرا

جناب قمرالزمان ۔ بوریوالہ، ملتان

اگر زحمت نہ ہو تو میرے درج ذیل استفسارات کا جواب دے کر ممنون فرمائیں:۔

۱۔ میر کے اس مطلع کا کیا مطلب ہے:۔

بار ہا گور دل جھنکا لایا
اب کے شرط وفا بجا لایا

۲۔ "چمن زارِ غزل" کی ترکیب درست ہے؟

۳۔ "وامق و عذرا" کی داستان محبت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

(نگار) (۱) میر کا شعر صاف ہے۔ آپ غالباً "گورِ دل" اضافتِ توصیفی کے ساتھ پڑھتے ہوں گے اس لئے آپ الجھ گئے۔ اس مصرع کی نثر یوں ہوگی۔

"دل بار ہا گور جھنکا لایا"

۲۔ "چمن زارِ غزل" ترکیب درست ہے۔

۳۔ "وامق و عذرا" کے نام سے لوگوں کو یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ اس داستان کا تعلق شاید سرزمین عرب سے ہے حالانکہ عرب سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ قصہ سب سے پہلے پہلوی میں لکھا گیا اور پھر فارسی میں منتقل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اول اول جب امیر عبداللہ بن طاہر (وفات ۲۳۰ھ) والیٔ نیشاپور کے سامنے اس کا نسخہ پیش کیا گیا (جو خسرو انوشیرواں کے نام سے منسوب تھا) تو اس نے حکم دیا کہ اسے ضایع کر دیا جائے کیونکہ یہ زردشت کی تصنیف ہے۔ بعد کو سب سے پہلے عنصری نے اسے نظم کیا اور پھر فصیحی جرجانی نے (۴۴۲ھ) اس کے بعد چھ منظوم ترجمے اس کے اور ہوئے جن میں ایک لامعی کا بھی تھا (تاریخ وفات لامعی ۹۳۷ھ ہے) اخیر میں مرزا محمد صادق نامی نے بارھویں صدی ہجری میں اس کو منظوم کیا۔ دولت شاہ، عرفی اور براؤن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ترکی میں اس کا ترجمہ بہشتی نے کیا اور انگریزی میں گب (Gibb) نے۔

خلاصۂ داستان یہ ہے کہ وامق، خاقان چین کا بیٹا تھا اور کسی دوسرے بادشاہ کی لڑکی (عذرا) کے حسن کی شہرت سن کر اس کا فریفتہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ اس کی جستجو میں نکلا اور پریوں کی مدد سے تمام دشوار گزار منزلوں کو طے کرکے دیارِ محبوب میں پہونچا۔ لیکن یہاں دشمن اسے پکڑ کر ہندوستان لے گئے اور اسے آگ میں ڈال کر

جلانا چاہا لیکن جب آگ نے اپنا کام نہ کیا تو وہ سمجھے کہ یہ کوئی دیوتا ہے اور اس کی پرستش کرنے لگے ۔ لیکن یہ وہاں سے چھپ کر بھاگ آیا اور اپنی محبوبہ کے پاس پہونچ گیا ۔

رہا یہ سوال کہ وامق و عذرا کے نام کہاں سے آ گئے ۔ سو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ فارسی شعرا کی اختراع ہے اور بالکل ایسی ہی جیسے زلیخا کہ اس نام کی بھی اصلیت نامعلوم ہے ۔

خاقان اور فغفور

مرزا سلطان علی بیگ ۔ برہانپور

چین کے بادشاہوں کا لقب خاقان اور فغفور دونوں سنا گیا ہے ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے ؟

(نگار) یہ بالکل درست ہے کہ چین کے بادشاہوں کو خاقان بھی کہتے تھے اور فغفور بھی ۔ لیکن ان دونوں القاب کا تعلق دو مختلف زمانوں سے ہے ۔

خاقان دراصل معرّب ہے ترکی قاغان کا جو لقب تھا ساتویں صدی عیسوی میں ترک فرمانرواؤں کا ۔ لیکن یہ لفظ خود انھوں نے اپنے چینی اسلاف سے مستعار لیا تھا جو چینی زبان میں اپنے آپ کو روان روان کہتے تھے ۔ قدیم نقوش میں قآن کا لفظ بھی پایا جاتا ہے جو غالباً قاغان کا مخفف ہے اور خان اسی کی دوسری صورت ہے ۔

کچھ زمانہ کے بعد خاقان کا مفہوم بڑا قآن یا خآن ہو گیا ۔ لفظ قاآن جو مغلوں کے زمانہ میں رائج تھا اسے ترکوں نے خاقان کر لیا اور جب چین پر ان کا قبضہ ہوا تو یہی لقب اختیار کر لیا ۔

"فغفور" اوستا کے لفظ "بغ پتر" کی مسخ شدہ صورت ہے جس کا مفہوم (خدا کا بیٹا) ہے ۔ اور "بغ پتر" خود ترجمہ ہے چینی لفظ تین تسو کا جس کے معنی "آسمانی بیٹا" کے ہیں ۔ بعد کو بغ پتر، بغ پور ہو گیا اور عربوں نے فغفور کر لیا ۔ جب تک مغل وہاں نہیں پہونچے تھے قدیم چینی بادشاہوں کو فغفور ہی کہتے تھے لیکن مغل فتوحات کے بعد وہ خاقان کہلائے جو ان کا اصل ترکستانی لقب تھا ۔

۹

کشمیر میں آغاز اسلام

جناب ارجمند خان ۔ لاہور

ازراہ کرم مطلع فرمائیے کہ کشمیر میں آغاز اسلام کب ہوا تھا

اور مغل حکومت میں کس وقت شامل ہوا۔

(نگار) کشمیر میں اسلامی اثرات کا آغاز (۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء) سے ہوا جب راجہ سینا دیو وہاں کا فرمانروا تھا۔ اس راجہ کے زمانہ میں یہاں ایک درویش شاہ میر آیا (۷۱۵ء) اور راجہ کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ راجہ سینا دیو کی وفات پر جب اس کا بیٹا راجہ رنجن مسند نشین ہوا تو اس نے شاہ میر کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ راجہ رنجن کی وفات پر جب اس کا بیٹا انند دیو مسند نشین ہوا تو اس نے بھی شاہ میر کو بدستور وزیر رہنے دیا۔ شاہ میر کا اثر نہ صرف راجہ بلکہ تمام رعایا پر اس قدر وسیع ہوگیا تھا کہ راجہ نے از راہ حسد برہم ہوکر اسے دربار میں آنے سے روک دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ میر نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے وادیٔ کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ راجہ اس کے مقابلہ میں ناکام رہا۔ جب ۷۲۷ھ میں راجہ صرف بیوی (کولا دیوی) کو چھوڑ کر انتقال کر گیا تو شاہ میر نے اس کو مسلمان کرکے شادی کرلی۔ اور اس طرح شاہ میر سارے کشمیر پر قابض ہوگیا۔ (بعض مورخین کا بیان ہے کہ شادی سے قبل ہی کولا دیوی نے خنجر مار کر جان دے دی تھی)

شاہ میر کے بعد جینے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کرکے ۷۴۵ھ تک حکومت کی اس کا بیٹا جمشید تخت نشین ہوا لیکن صرف ۱۴ ماہ کی حکومت کے بعد اس کا چھوٹا بھائی علاء الدین اسے ہلاک کرکے خود تخت نشین ہوگیا اور تیرہ سال تک حکمراں رہا۔ اس کے بعد حکومت کشمیر اسی خاندان کے قبضہ میں رہی۔ عہد اکبر میں جبکہ علی شاہ یہاں کا فرمانروا تھا۔ ملا عشقی اور قاضی صدر الدین دہلی سے یہاں آئے اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور علی شاہ کی بھتیجی (دختر حسین شاہ) کی شادی شاہزادہ سلیم (جہانگیر) سے ہوگئی۔ جب علی شاہ ۹ سال حکومت کرنے کے بعد مرگیا اور اس کا بیٹا یوسف چک دہلی چلا گیا اور نظر بند ہوگیا (۱۵۸۶ء) تو اس کا بیٹا یعقوب چک، کشمیر کا فرمانروا ہوگیا۔ جب ۹۵۹ / ۱۵۸۸ میں اکبر نے یعقوب کو شکست دیکر کشمیر کو مسخر کرلیا تو وہ حکومت دہلی میں شامل ہوگیا۔

اشاعتِ آئندہ کے چند استفسارات

۱۔ خان اور پٹھان کی لغوی و تاریخی حقیقت
(سراج الحسین خان ۔ بنتیا ۔ چمپارن)

۲۔ ایطار خفی وجلی کی صراحت
(بزمی بھارتی ۔ گنور (بدایوں)

۳۔ مسئلۂ جبر و قدر .... (محمد یامین خان ۔ محلہ چاہ شیریں بجنور)

۴۔ ابن رشد کی زندگی اور اس کے کارنامے .... (مشتاق احمد صدیقی ٹیکسلا ۔ راولپنڈی)

۵۔ امام شخص واحد ہے یا جماعت بھی اس کی قائمقام ہوسکتی ہے ۔ آیت توریث میں حسص کی حیثیت۔
(ابتہاج الدین خرم (راولپنڈی)

"صبا" حیدرآباد دکن کا تبصرہ "نیاز نمبر" پر

یوسف سرمست

نیاز اردو ادب کی سب سے منفرد شخصیت ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اور صرف وہی اردو ادب کے تنہا VERSATILE GENIUS ہیں تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر ذہانت نے ادب کے سوا بہت سی جولانگاہیں ڈھونڈلی تھیں حالانکہ بنیادی طور پر وہ بھی انشاپرداز ہی تھے۔ مشہور ماہر نفسیات ٹرمین کے ایک شاگرد کی تحقیق کے مطابق انشاپرداز کئی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ وہ بہت سے میدانوں میں اہم کارنامے انجام دے سکتے ہیں اس کا کہنا ہے:۔

"غیر افسانوی ادب لکھنے والے ممتاز انشاپرداز سب سے
زیادہ تعداد میں قابلیتیں رکھتے ہیں وہ اکثر دس مختلف قسم
کے کاموں کو انجام دینے کی اعلیٰ اہلیت رکھتے ہیں"

یہ اردو ادب کی بدنصیبی رہی کہ مولانا آزاد کی مختلف صلاحیتوں نے انھیں اس سے چھین لیا لیکن اس بدنصیبی کی تلافی اس خوش نصیبی سے ہوگئی کہ نیاز کی پرجوش قوت تخلیق صرف اردو ادب کے لئے مخصوص رہی۔ حد یہ ہے کہ ان کے مذہبی جہاد نے بھی ادب کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ "من ویزداں" کے خیالات سے خواہ کوئی کتنا ہی اختلاف کرے لیکن "من و یزداں" کی ادبی قدر و قیمت سے انکار ایک ایسا کفران ادبی ہوگا جس کا ارتکاب ایک بے تعصب ادب کے طالب علم سے ممکن ہی نہیں۔ نیاز نے اردو ادب کے مختلف شعبوں میں اور اس کی ہر صنف میں اتنا وقیع، اس قدر اہم کام کیا ہے کہ وہ کہیں سنگِ میل نظر آتے ہیں تو کہیں چراغ منزل۔ نیاز نے اپنی انشائیہ نگاری، ناول نگاری، افسانہ نویسی، تنقید، مکتوب نگاری، مقالہ نگاری، مضمون نویسی اور مزاح نگاری کی صورت میں اردو کو ایسا سرمایہ دیا ہے جس کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ ہمیشہ ان کی رہین منت رہے گی۔ اس کے علاوہ نیاز نے اردو کی اس قدر مختلف النوع اور گوناگوں خدمات انجام دی ہیں کہ مستقل ادارے اپنی سالہا سال کی محنت کے بعد بھی انجام نہیں دے سکتے۔ ان کی صحافتی خدمات بھی بڑی ہی گراں قدر ہیں۔

نگار کے ذریعہ بیالیس سال سے نیاز مسلسل اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ بذات خود ایک مثالی چیز ہے۔ انھوں نے خشک تاریخی واقعات، علمی مباحث اور مذہبی مسائل کو ادبی چاشنی کے ذریعہ اس درجہ شگفتہ اور

جاذبِ توجہ بنا دیا کہ وہ قابل قبول عام ہو گئے جس کی وجہ سے اُردو داں طبقہ نیاز کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔
نیاز نے جواب اور استفسار کے سلسلے میں جتنی معلومات اکٹھا کر دی ہیں وہ خود اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا کی سی حیثیت رکھتی ہیں اردو میں اب تک سچ پوچھئے تو لے دے کے یہی انسائیکلوپیڈیا جیسی چیز ہے۔ خواہ کتنا ہی نامکمل سہی۔ ان تمام باتوں سے ہٹ کر نیاز کا اردو ادب پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اس کو کئی ادیب دیئے ہیں ایسے ادیب جنھوں نے اُردو کو بہت کچھ دیا۔ بہت سے ادیبوں کی صلاحیتیں نیاز اور "نگار" کی وجہ سے اُبھر سکیں اور نکھر سکیں۔ بہت سے ادیب "نگار" کی وجہ سے رُوشناس ہوئے۔ کتنے ایسے ہیں جو نیاز اور "نگار" کے پیدا کردہ اعتماد سے اردو ادب میں سر بلند ہو سکے لیکن کتنی عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ وہ شخص جس نے اردو ادب کی اتنی عظیم خدمات انجام دی ہوں اس پر ایک کتاب بھی نہیں لکھی گئی (شاید ہند و پاک کی کسی بھی یونیورسٹی میں نیاز پر ریسرچ نہیں ہو رہا ہے حالانکہ ریسرچ کے لئے نیاز بہترین موضوع ہیں) اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ اس طرف توجہ کی جاتی۔ آخر کار نیاز صاحب کے "نگار" ہی نے یہ اہم ذمہ داری اپنے سر لی لیکن نیاز صاحب "نگار" کے لئے یہ مناسب نہ سمجھتے کہ وہ اس ذمہ داری کو اٹھائے اگر "نیاز نمبر" کے مرتب فرمان فتح پوری اپنے پرخلوص اصرار سے نیاز صاحب کو مجبور نہ کر دیتے کہ وہ نیاز نمبر نکالنے کی اجازت دیں۔ فرمان فتح پوری کا یہ کام حد درجہ لائق ستائش ہے۔

فرمان فتح پوری نے اس سالنامے کو بڑے ہی سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ "نیاز نمبر" دو حصوں پر مشتمل ہوگا زیر نظر نمبر پہلا حصہ ہے۔ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں "ادب اور زندگی" کے عنوان سے مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں۔ اس میں نیاز کی زندگی کے تمام حالات، ان کی ادبی زندگی کی تعمیر اور تشکیل جس طرح ہوتی رہی اس کا پورا خاکہ موجود ہے اس سے نیاز فتح پوری بیک نظر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ نیاز صاحب کی مختصر سی آپ بیتی بھی اس میں شامل ہے۔ مختلف اہل قلم نے مختلف زاویوں سے نیاز کی زندگی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے، اس حصہ کے لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ارشد تھانوی، مالک رام، کوثر چاند پوری، رئیس احمد جعفری، عشرت رحمانی، آفتاب علی خاں، ملا واحدی، خانم ممتاز مرزا، سلیم حامد رضوی اور فرمان فتح پوری ہیں۔ دوسرا حصہ "فکر و فن اور شخصیت" سے متعلق ہے اس حصہ میں نیاز کی فکر و فن کے ہر گوشے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بحیثیت مجموعی ان کے فکر و فن ہی سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ فکر و فن کے وہ پہلو بھی ہیں جو ان کی شخصیت سے منور ہوتے ہیں یا پھر شخصیت کے اس پہلو کو لیا گیا ہے جس تک رسائی ان کے فکر و فن کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ اس حصہ میں لکھنے والے ہیں ل۔ احمد، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی پروفیسر خان رشید، پروفیسر مجتبیٰ حسین، فضل حق قریشی، پروفیسر ممتاز حسین، برہم ناتھ دت، پروفیسر منظور حسین شور، پروفیسر نظیر صدیقی، محمد طفیل، منہت پرکاش شوق، یوسف سرمست، صلاح الدین پرکار، عائشہ خان اور سید حامد حسین۔

تیسرا اور آخری حصہ "تخلیق و تنقید" کا ہے جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبدالقیوم پروفیسر عبدالسلام۔ ڈاکٹر رشید حسن خاں، پروفیسر حسرت نعمانی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر عصمت اللہ خاں حسن، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر ارشد کاکوی، محمد خورشید عالم، ڈاکٹر سید شاہ علی، ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی

شمیم رضوی، نے نیاز کی تنقید، افسانہ، مکتوب نگاری، مقالہ نگاری، ناول نگاری، شاعری اور نفسیات پر اظہار خیال کیا ہے۔

ہرچند کہ یہ پہلا حصہ ہے لیکن صرف اسی حصے میں (۵۱) مضامین اور انشائیے ہیں جو نیاز کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا تقریباً پوری طرح احاطہ کر لیتے ہیں۔ اُردو ادب میں نیاز کو جو مقام حاصل ہے اس کو سمجھنے کے لئے صرف یہی حصہ کافی ہے لیکن "نیاز نمبر" کی سب سے امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ "کتاب المناقب" نہیں بن گیا ہے۔ اس میں ہمیں نیاز سے اختلاف کرنے والے بھی ملتے ہیں اور ان پر اعتراضات بھی۔ یہ اختلاف و اعتراض کہیں بجا ہے تو کہیں بے جا بھی ہے۔ اس طرح ہم نیاز کو ہر زاویۂ نگاہ سے پوری طرح دیکھ سکتے ہیں۔ نیاز کی شخصیت اور ان کے کام اس قدر پہلودار اور دلچسپ ہیں کہ ان کا مطالعہ ہمیشہ دلچسپی سے کیا جائے گا۔ چونکہ "نیاز نمبر" میں اس بات کا مکمل اظہار ہوا ہے اس لئے یہ نمبر بھی بے حد دلچسپ اور بڑا ہی مفید بن گیا ہے۔ یہاں اکاون مضامین کا جائزہ، اپنا اور ان پر انفرادی طور پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ میں نے اوپر لکھنے والوں کی فہرست دے دی ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہندوپاک کے چوٹی کے اہلِ قلم نے معاونت کی ہے۔ اس میں بعض تو یقیناً ایسے ہیں جنھوں نے "برائے نام" نیاز نمبر کے لئے لکھا ہے لیکن بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ "نیاز نمبر" کے لئے مضامین لکھوانے کے لئے فرمان فتحپوری کو جو مصیبت اٹھانی پڑی ہوگی اس کا اندازہ تو کچھ ایڈیٹر صاحبان ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود فرمان فتحپوری نے بہت ہی قلیل مدت میں بڑا ہی جامع نمبر نکال لیا ہے۔ یہ نمبر سوا تین سو صفحات پر محیط ہے۔ اور اس کی قیمت چار روپے ہے۔ ہندوستان میں اس کا ملنا دشوار ہے اور پاکستان سے اس کا آنا دشوار تر۔ یہ نمبر ایسا ہے کہ اس کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لئے از بس ضروری ہے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ناگزیر ہے۔

منظومات

بازارِ جہاں

منظور حسین شور

تاریکیٔ مشرق میں کلیساؤں کے تاجر
صبحِ عرب و شامِ عدن بیچ رہے ہیں

جمہور کے نیلام میں مغرب کے دکاں دار
"رنگِ حبش و روحِ یمن" بیچ رہے ہیں

میراثِ جم و کے ہے کہیں رونقِ بازار
کچھ تبت و تاتار و ختن بیچ رہے ہیں

کچھ بیچتے ہیں نیل کے ساحل پہ سفینے
کچھ "موجِ لبِ گنگ و جمن" بیچ رہے ہیں

کعبے میں ہے کچھ کوثر و تسنیم کا نیلام
کچھ دیر میں اصنامِ کہن بیچ رہے ہیں

غربت کدۂ سندھ کے بازار میں کچھ لوگ
تاریخِ امیرانِ دکن بیچ رہے ہیں

کچھ ہاتھ مزاروں کی تجارت میں ہیں مصروف
کچھ قلبِ شہیدوں کے کفن بیچ رہے ہیں

کچھ چاند کی وادی میں ہیں سرگرمِ سفر لوگ
کچھ آدم و حوّا کا وطن بیچ رہے ہیں

کچھ لوگ چمن میں بھی گرفتارِ قفس ہیں
کچھ لوگ قفس میں بھی چمن بیچ رہے ہیں

گفتار کے بازار میں جو سِل گئے وہ ہونٹ
انسان کو ماتھے کی شکن بیچ رہے ہیں

ہم ظلمتِ ایّام کے سینے میں اُتر کر
ماحول کو سورج کی کرن بیچ رہے ہیں

ہر "خشت" سے کہتے ہیں غمِ دل کا فسانہ
ہر سنگ کو ہم نطق و دہن بیچ رہے ہیں

ہر دل ہے جہاں برف کی اک قاش وہاں ہم
اپنے دلِ سوزاں کی جلن بیچ رہے ہیں

کفرِ چمن و بندگیٔ برقِ تپاں سے
دینِ گل و آئینِ سمن بیچ رہے ہیں

اندھے ہوں جہاں جلوؤں کے نقاد وہاں ہم
آذر کدۂ شہرِ سخن بیچ رہے ہیں

"حلقے" ہوں جہاں فکر کے دلال وہاں ہم
سحر نگہ و معجزِ فن بیچ رہے ہیں

لکھتی ہے جنھیں خون سے جمہور کی تاریخ
وہ گیت سرِ دار و رسن بیچ رہے ہیں

یہ شب گزیدہ سحر

فضا ابنِ فیضی

اب بھی ہیں بال فشاں خانقہوں میں جبریل
مگر آنکھوں میں ہے بے رُوح تصوف کا خُمار
ہے جبینوں پہ وہی خام عقیدوں کا غُبار
وہ عقیدے جو ہیں خود کاشتہ رسموں کی دلیل

اب بھی ہے مدرسوں میں "اہلِ بصیرت" کا ہجوم
خود انھیں پر مگر اسرارِ جنوں فاش نہیں
کھو چکے اپنی چمک ان کی نگاہوں کے نگیں
اب وہ جلوے ہیں نہ وہ "تابشِ ایمان و علوم"

اب بھی ہوتا ہے اُسی شوق سے "کعبے کا طواف"
پھر بھی مشکل ہے دل و روح و نظر کی تطہیر
سرد پھر بھی ہے تپش خانۂ احساس و ضمیر
ہو سکا چاک نہ کرنوں سے بھی کہرے کا غلاف

اب بھی مسجد کے مناروں پہ مچلتی ہے اذاں
مگر اس نغمے کی گیرائی کہیں سوتی ہے
وہ لپک گُم ہے وہ برنائی کہیں سوتی ہے
جس کی لَو دیتی تھی خاموش چراغوں کو زباں

اب بھی محراب و مصلّا کا غنیمت ہے وجود
پھر بھی اک سجدہ نہیں صاحبِ طاعت کا دُرست
بے مآل و غلط اندیش و کم آسودہ و سست
ہائے یہ عاد کے فرزند یہ ابنائے ثمود

اب بھی تابندہ و رخشاں ہیں مساجد کے کلس
پرتوِ سجدہ سے چہرے نہیں روشن، پھر بھی
محرمِ برق نہیں سینوں کے خرمن پھر بھی
گرمیٔ سوزِ یقیں سے ہوئے محروم نفس

آج بھی ہیں وہی "اخلاق کے پاکیزہ اصول"
لیکن اس شے کا یہاں کوئی خریدار نہیں
دُور تک عفتِ جذبات کے آثار نہیں
دیر سے ملتِ اسلام کی قدریں ہیں ملول

آج بھی ہونٹوں پہ کھلتے ہیں وظائف کے کنول
ناتواں رُوح کی کھیتی نہیں شاداب مگر
جہل کی دھند میں لپٹی ہے ضمیروں کی سحر
دونوں بشکستہ ہیں، مضرابِ یقیں، سازِ عمل

اب بھی آنکھوں سے "مناجات کے آنسو" ہیں رواں
دل میں لیکن ہوس و جرم کے منصوبے ہیں
ایک ابھرا جو کنارے پہ تو سو ڈوبے ہیں
ہائے یہ بے خبریٔ کشمکشِ سُود و زیاں

اپنے ماحول میں ہے آج بھی انسان بلند
کھائے جاتی ہے مگر سُبحہ و زنّار کی قید
یہ کم آزار ہیں خود اپنے ہی فتراک کے صید
ان کے ادراک پہ اسرار کے دروازے ہیں بند

اب بھی ہیں "بندگی و زہد" کے لاکھوں محمل
کوئی لیلےٰ مگر اس "محملِ تقوےٰ" میں نہیں
قید وہ شگفتگی، پیراہنِ مینا میں نہیں
اب یہ محفل ہے خود اپنے ہی چراغوں سے خجل

دو پہرِ دین و صداقت کی ڈھلی جاتی ہے
روشنی سائے میں تحلیل ہوئی جاتی ہے

غزل

سعادت نظیر

کب گریں قفس سے دُور بجلیاں؟ خُدا جانے — راکھ ہو گئے کتنے آشیاں؟ خُدا جانے
ہیں بہاریں، ہم دم! تھا کہاں؟ خُدا جانے — ہو گئے بیاباں کب گلستاں؟ خُدا جانے
چار سُو اُجالا ہے راہِ شوق میں، اے دل! — پھر بھی کیوں بھٹکتا ہے کارواں؟ خُدا جانے
آرزو ہے ملنے کی، اور گریز ملنے سے — کون ہے؟ جو حائل ہے درمیاں، خُدا جانے
سرکشی پہ انساں کی سوچتا ہوں رہ رہ کر — زیرِ خاک ہیں کتنے آسماں؟ خُدا جانے
پھول، پتیاں، کلیاں سب کی سب پریشاں ہیں — یہ بہار کی رُت ہے یا خزاں؟ خُدا جانے

آنسوؤں سے لیتا ہوں کام لفظ و معنی کا
وہ کہاں ہے؟ جو سمجھے یہ زباں، خُدا جانے

راہِ دشوار

از شاہ عبداللطیف بھٹائی

مترجم:- اقبال شوقی

اے دل، اسے میری ناتوانی ہے عزیز — سُن لیتا ہے، کہ لن ترانی ہے عزیز
الفت کا مزا، دار پہ پایا میں نے — واللہ، مصائب کی کہانی ہے عزیز

عشاق کو آزما رہی ہے یارو — دار اپنی طرف بلا رہی ہے یارو
ہاں رقص کرو، رقص کرو، رقص کرو — مژدہ! کہ وہ مسکرا رہی ہے یارو

آزار ہے کیا عشق میں لذت کیا ہے — معلوم بھی ہے راز محبت کیا ہے؟
دار اپنی طرف بلا رہی ہے، دوڑو — اور اس سے زیادہ سر کی قیمت کیا ہے؟

آلامِ وفا سے جی چُراتے ہیں کہیں؟
شمشیر و سناں سے خوف کھاتے ہیں کہیں؟
مقتل میں فزوں ہوتی ہے بیتابیٔ شوق
یہ پائے ثبات لڑکھڑاتے ہیں کہیں؟

قرباں گہِ شوق میں مئے شوق پیئے
عشاق کھڑے ہیں جاں ہتھیلی پہ لئے
سر دے کے کرو عہدِ وفا مستحکم
مدت ہوئی اس کو دل کا بیعانہ دیئے

اس ہوش رُبا ناز پہ جاں دیتا ہوں
اس جاں طلب آواز پہ جاں دیتا ہوں
وہ کُند چھری سے ذبح کرتا ہے مجھے
قاتل کے اس انداز پہ جاں دیتا ہوں

چلتی ہے جو گردن پہ چھُری چل جائے
محبوب کا شکوہ نہ زباں پر آئے
اے عشق خبردار، شکایت کیسی
اے ضبط، فغاں نہ لب پہ آنے پائے

عاشق وہ ہے جو خوشی سے آلام سہے
اندوہِ گراں اٹھائے اور کچھ نہ کہے
محبوب کو دی ہے اس لئے کُھٹلی چھری
کچھ دیر تو گردن پہ چلے ربط رہے

آنکھوں میں تری بال کشا موجِ شراب
جیسے کسی میکدہ کے وا ہوں ابواب
آ خُم کے قریب اور جی بھر کے پی
آتی ہے رگِ تاک سے کھچکر مئے ناب

معدوم سا فرقِ عدم و ہستی ہے
دشوار مگر رندی و سرمستی ہے
سر رکھ کے قریبِ خُم مے جاں دیدے
ان داموں مئے ناب بہت سستی ہے

سرمدؔ مظہری

وہ بدنصیب سوختہ ساماں کدھر گئے
اے شمع تیرے رات کے مہماں کدھر گئے

تجھ بن بھری بہار میں سنسان ہے چمن
وہ انبساط کے سروساماں کدھر گئے

سرمدؔ! غمِ حیات نے دیوانہ کردیا
جانے خیالِ دوست کے عنواں کدھر گئے

گذشت

دکتر ایرج دهقان

شکست عہد من وگفت : ہرچہ بود گذشت
بگریہ گفتمش: آری، ولی چہ زود گذشت
بہار بود و تو بودی وعشق بود و امید
بہار رفت و تو رفتی و ہرچہ بود گذشت
شبی بعمر گرم خوش گذشت، آں شب بود
کہ درکنار تو بانغمہ و سرود گذشت
چہ خاطرات خوشی در دلم بجای گذاشت
شبی کہ با تو مرا درکنار رود گذشت
کشود لبں گرہ آں شب، زکار بستہ ی ما
صبا، چو از برآں زلف مشک سود گذشت
غمیں مباش و میندیش از ایں سفرکہ ترا
اگرچہ بر دل نازک غمی فزود گذشت

شارق میرٹھی ایم۔اے

امیری ہے نہ وہ عالم پناہی　　فقیروں کی وہی ہے کج کلاہی
تبسم آ گیا اُن کے لبوں پر　　مجھے راس آ گئی اپنی تباہی
کہیں افشا نہ کر دے راز الفت　　سرِ محفل کسی کی کم نگاہی
بس اُن کا نام لیکر چل دیئے ہیں　　نہ پوچھو ہم ہیں کس منزل کے راہی
کسی دن رنگ لائے گی جہاں میں　　گنہگارانِ غم کی بے گناہی
نشیمن کے اُجڑنے کا نہیں غم　　نہ دیکھوں میں گلستاں کی تباہی
زمانے میں ہوئے مشہور دونوں　　کسی کا ظلم میری بے گناہی

کہیں رونے سے رک سکتی ہے شارق
جو لکھی ہے مقدر میں تباہی

بیاضِ نیاز

کا

ایک ورق

سعدی

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست امّا دیگراں ——— باز می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی ست ——— گدا اگر ہمہ عالم بہ او دہند گداست

گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم ——— چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

خسرو

ماجرا اے دوست پرسیدی کہ چوں بگزشت حال ——— اے سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گزشت

غمزۂ تو بر دلِ سلطاں زند ——— ورنہ رنجی بر دلِ درویش ہم

می روی و گریہ می آید مرا ——— ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد

خوش آں زماں کہ بر رویش نظر نہفتہ کنم ——— چو سوئے من نگرد او نظر بگردانم

دلم می خواستی برہم عفاک اللہ چناں دیدی ——— مرا می خواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

حافظ

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید ——— دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود ——— ز زہدِ ہمچو توئی یا ز فسقِ ہمچو منی

گر کنند میل بخوباں دلِ من عیب مگیر ——— کایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

کس ندانست کہ منزلگہِ مقصود کجاست ——— ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

فغانی

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ——— بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مطبُوعاتِ مَوصُولہ

نقد ادب
ل۔احمد
ناشر:۔ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ناظم آباد۔کراچی۔

نقدادب" پروفیسر ایبرکومبی (LASCELLE ABER COMBIE) کی مشہور کتاب PRINCIPLE OF LITERARY CRITICISM کا اردو ترجمہ ہے۔تنقید کے نظری مسائل پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور برابر لکھا جارہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی مغرب کے معیار تنقید کو نہیں پہونچ سکی۔ اس کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ناقدین اگرچہ مغرب کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں اور چیدہ چیدہ اقوال سے اپنے مقالات کی زینت بھی بڑھاتے ہیں لیکن چونکہ یہ اقوال عموماً سیاق وسباق سے بے نیاز رہ کر نقل کر دیئے جاتے ہیں اس لئے وہ کسی مسئلے کو ذہن میں واضح کرنے کے بجائے مغالطہ پیدا کر دیتے ہیں

اُردو تنقید کو مغربی اصولِ انتقاد کا یکسر پابند بنانا نہ مفید ہے نہ ضروری۔لیکن اگر ان اصولوں کی مدد سے اُردو تنقید کے لئے راہیں کھولنی ہیں تو پھر مغربی تنقید کی ساری معیاری کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا ہوگا۔اردو کے ممتاز صاحب قلم۔ل۔احمد نے غالباً اسی ضرورت کے پیش نظر ایبرکومبی کی مشہور کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔اصل کتاب شعروادب کے بنیادی نظری مسائل سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اسے معنوی خصوصیت کے ساتھ اردو میں منتقل کرنا آسان نہ تھا لیکن ل۔احمد چونکہ مشرقی ومغربی علوم پر یکساں دسترس کے ساتھ فنی لطافتوں اور نزاکتوں کا احساس بھی رکھتے ہیں اس لئے وہ اس منزل سے آسان گزر گئے ہیں۔انھوں نے مشکل سے مشکل اجزا کے ترجمے میں کچھ اس درجہ شگفتگی، روانی اور سلاست سے کام لیا ہے کہ ترجمہ پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے

ل۔احمد اصطلاحات کی مشکل میں گھر کر نہیں رہ گئے۔انھوں نے ہر ادبی اور انتقادی اصطلاح کے مناسب ترین الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جہاں ضروری خیال کیا ہے وہاں تصریحات وتوضیحات سے بھی مدد لی ہے نتیجۃً ترجمہ اردو خواں طبقہ کے لئے نہایت مفید بن گیا ہے۔

تین کتابیں
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ شعری مجموعہ جدید اُردو شاعری کے تین معروف شعراء محبوب خزاں محبّ عارفی اور قمر جمیل کے کلام پر مشتمل ہے۔مختلف شعراء کے انتخابات کے مجموعے تو نظر سے

بہتیرے گذرے تھے لیکن اس نوعیت کا کوئی شعری مجموعہ جو تین دواوین کی حیثیت رکھتا ہو اور بہ یک وقت تین معاصر شعراء کی نمائندگی کرتا ہو۔ نظر سے نہ گذرا تھا۔ کئی دواوین کو اک ساتھ شائع کرنیکی یہ جدت، صاحبان کلام کی جدت طبع کا پتہ دیتی ہے۔

اس مجموعہ میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ نظموں پر اس اشاریت وابہام کی چھاپ ہے جو جدید شاعری کا طرۂ امتیاز خیال کی جاتی ہے اور غزلوں میں وہی رجحانات کارفرما ہیں جو زندگی کی موجودہ کشمکش اور ہل چل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسطرح یہ مجموعہ میلانات عصری کا ترجمان بھی ہے اور جدید شاعری کا بلند نشان بھی۔

بہ حیثیت مجموعی غزلوں کا حصہ، نظم کے مقابلے میں بھاری ہے اس لئے کہ ان غزلوں میں سوچ بچار کے نئے پہلوؤں کے ساتھ زبان و بیان کا وہ رکھ رکھاؤ بھی ملتا ہے جو کلاسیکل غزل سے تعلق رکھتا ہے اور جس کے بغیر ندرتِ خیال کے باوجود غزل، غزل نہیں ہوتی۔

کتاب سفید کاغذ پر اچھی طباعت وکتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ پچاس پیسے میں مکتبہ آسی کراچی ۱۹ سے مل سکتی ہے۔

مجاہد الجزائر

نسیم احمد شائق کا تاریخی ناول ہے اور ناول کے فن سے کہیں زیادہ تاریخ و سوانح کے فن سے قریب ہے۔ اس میں مصنف نے اسلامی دنیا کے مشہور و معروف امیر البحر خیر الدین باربروسہ کی شخصیت و سیرت اور شجاعت و فتوحات کی داستان کچھ اس انداز سے چھیڑی ہے کہ اس میں سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کے ساتھ اسلام و عیسائیت کی وہ ساری نبرد آزمائیاں زیر بحث آجاتی ہیں جو قرون وسطیٰ کی تاریخ کا اہم باب خیال کی جاتی ہیں۔

خیر الدین باربروسہ مسلم مجاہدین میں یوں خاص شہرت رکھتا ہے کہ خلافت کی از سر نو شیرازہ بندی میں اسکا بڑا ہاتھ ہے۔ الجزائر کا حاکم اعلیٰ بننے کے بعد اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنی انفرادی حیثیت دنیائے تاریخ سے منوا لیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ الجزائر کو خلافت عثمانیہ کے حوالہ کرکے صرف ایک گورنر کی حیثیت سے کام کرنا پسند کیا۔ اس کے اس اقدام سے دوسری اسلامی مملکتوں میں باہم مل جلکر رہنے اور مرکزی خلافت کو مستحکم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور اس جذبے کا یہ اثر ہوا کہ مسلمان، عیسائی فوجوں کی اس یورش کو دبانے کے اہل ہوگئے جو سلطنتِ عثمانیہ کو تحس نحس کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس طرح باربروسہ نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ بلکہ ساری دنیائے اسلام کو عیسائیوں کے نرغوں سے بچایا ہے بلکہ اس کے ساتھ اس نے حوصلہ مندی و شجاعت اور ایثار و اطاعت کی ایسی مثالیں یادگار چھوڑی ہیں کہ بحری جنگوں کی تاریخ میں اس کے کمالات فن کا اعتراف دوست دشمن دونوں کرتے ہیں۔

کتاب کا کاغذ چونکہ خراب ہے اس لئے طباعت پر اس کا اثر پڑا ہے۔ سرورق غنیمت ہے۔ ۲۴۴ صفحات کی یہ کتاب تین روپیہ میں ملک سراج الدین اینڈ سنز۔ پبلشرز۔ کشمیری بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

گفتنی

از۔ مخمور سعیدی
ناشر:۔ مکتبہ تحریک دہلی۔ قیمت دو روپیہ

"گفتنی" مخمور سعیدی کا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں نظموں اور غزلوں کے ساتھ رباعیات و قطعات بھی شامل ہیں۔

ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمور سعیدی ہر صنف سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور بعض دوسرے شاعروں کی طرح وہ اظہار خیال کے لئے مخصوص شعری ہیئت کو اختیار کرنے کے لئے مجبور نہیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر شاعر کے گرہ میں کہنے کے لئے کچھ ہو اور وہ اظہار و ابلاغ کا ملکہ و سلیقہ بھی رکھتا ہو تو پھر اسے "روشناس خلق" ہوتے ہیں دیر نہیں لگتی۔ محمور سعیدی اسی قسم کے شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے کلام میں ایسی پختگی و شائستگی نظر آتی ہے جو برسوں کی مشق کے بعد میسر آتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے نئے کہنے والوں میں انھوں نے بہت جلد ایک نمایاں جگہ بنالی ہے اور اب وہ اس کے محتاج نہیں رہے کہ کوئی ان کی شاعری کا تعارف کرائے۔

قائم

مرتبہ:- عابد رضا بیدار

ناشر:- نیا خواب رامپور - قیمت:- سو نئے پیسے۔

قائم چاند پوری، اُردو غزل کے اُن اولیں معمار و ں میں ہیں جن میں درد، سودا، میر اور مصحفی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ لیکن چونکہ اب تک نہ ان کا دیوان شائع ہوسکا اور نہ ان کی زندگی و کلام پر کوئی سیر حاصل تحقیقی کام ہوا اس لئے اُردو غزل کے اس جوہر قابل کو وہ قبول عام نہ حاصل ہوسکا جس کا وہ مستحق تھا۔

عابد رضا بیدار کی توجہ اور "نیا خواب" رامپور کی اعانت سے "قائم" کے نام سے ایک مختصر سا انتخاب البتہ منظر عام پر آگیا ہے۔ انتخاب کیا ہے گویا قائم کے کلام کا عطر ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو بھی یہ انتخاب اس لحاظ سے اہم اور قابلِ قدر ہے کہ اس کے سوا قائم کا کلام ہماری دسترس سے فی الوقت باہر ہے۔

انتخاب کلام کے ساتھ مرتب نے قدیم تذکروں کی مدد سے قائم کی زندگی اور شاعرانہ حیثیت کا ایک ایسا خاکہ بھی سامنے رکھ دیا ہے جو اب تک عام نظروں سے اوجھل تھا۔ اس لئے یہ چھوٹا سا کام اہمیت و افادیت سے خالی نہیں ہے۔ قائم کے سلسلے میں "مختار اشعار" کا حوالہ مؤلف نے البتہ نہیں دیا حالانکہ اس میں قائم کے متعلق بعض نہایت مفید مطلب باتیں مل جاتی ہیں۔

ادب وشعور

از:- ممتاز حسین

"ادب و شعور" ممتاز حسین کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جس میں اگرچہ عملی تنقید کے نمونے بھی شامل ہیں لیکن اس کا وزنی حصہ وہ ہے جو نظری تنقید سے تعلق رکھتا ہے یوں تو تنقید کے نظری مسائل پر کم و بیش اُردو کے ہر نقاد نے قلم اٹھایا ہے لیکن جن حضرات کے نام اس سلسلے میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور ممتاز حسین کے نام آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک کوئی نداق ادب اور تجزیاتی ذہن کے ساتھ ساتھ بعض علوم خصوصاً تاریخ، عمرانیات، فلسفہ اور نفسیات پر دسترس نہ رکھتا ہو وہ نظری مسائل کی بحث میں کوئی انفرادی نقش نہیں چھوڑ سکتا۔

"ادب و شعور" کے مقالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے زندگی اور ادب دونوں کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا ہے چنانچہ وہ کسی بات کو تسلیم کرنے میں محض جذبہ یا ذوق پر کلیتہً اعتماد کرلینے کے قائل نہیں ہیں بلکہ سارے تمدنی زندگی کے ارتقائی اصولوں کو سامنے رکھ کر استنباط نتائج کرتے ہیں۔ ان کے فکر کا یہ پہلو اگرچہ دیباچہ سے لیکر آخری مضمون تک پوری طرح نمایاں ہے لیکن ان کے علم و فکر اور ادبی و تنقیدی شعور کا اندازہ کتاب کے ابتدائی دو مقالے

نثر معلیٰ اور "رسالہ در معرفت استعارہ" کے فوراً ہی بعد ہوجاتا ہے۔ ان مقالات میں زبان و بیان کی کے حقائق محرکات رموز و علائم اور بدلتے ہوئے اثرات و عوامل پر نہایت مدلل طریقے سے بحث کی گئی ہے۔

"ہمارا کلچر اور ادب" ۱۸۵۷ء سے پہلے اور ۱۸۵۷ء کے بعد کا مقالہ بھی نہایت اہم ہے اور زبان و ادب کے حوالے سے برصغیر کے بعض ایسے سیاسی و سماجی پہلوؤں کو زیر بحث لاتا ہے جن پر اب تک توجہ نہیں کی گئی" ادب و شخصیت، "راشد کی شاعری"، "غالب"، "حالی" اور "کردار نگاری" کے عنوانات سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ان سے بھی نہ صرف مصنف کے منفرد طرز فکر کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ بعض ایسی باتوں کا انکشاف بھی ہوتا ہے جو اب تک دوسروں کی نظر سے پوشیدہ تھیں یا بعض مصالح کی بنا پر دوسرے ان کے اظہار سے جھجکتے تھے۔ ہر چند کہ مصنف نے اکثر مسائل میں مغربی مفکرین کے خیالات ہی سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن یہ استفادہ تقلیدی نہیں اجتہادی ہے۔ وہ اردو کے بعض ناقدین کی طرح مغربی ناقدین یا مفکرین سے مرعوب نہیں بلکہ ان کے افکار پر پوری جرح و بحث کے بعد کوئی رائے قائم کرتے ہیں "ادب و شخصیت" کے سلسلے میں انھوں نے شخصیت اور کردار کے بارے میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ہربرٹ ایڈ سے جو اختلاف کیا ہے وہ یونہی نہیں بلکہ دلائل سے مضبوط ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور چار سو سے زائد صفحات کی یہ کتاب دس روپیہ ں اردو مرکز لاہور سے مل سکتی ہے۔

تصانیف مولانا نیاز فتح پوری

انتقادیات مولانا نیاز فتحپوری کے معرکۃ الآرا ادبی تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی، ہر مقالہ اپنی جگہ حرف آخر اور معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اردو زبان، اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر ٹرے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے قیمت چار روپے ۵۰ پیسے

مذاہب عالم کا تقابلی مقابلہ مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتداء مذہب کا فلسفہ ارتقار مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے

مشکلات غالب غالب کے تمام مشکل اشعار اردو کا نہایت صاف وصحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے قیمت ۲ روپے

عرض نغمہ ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہوگیا تھا وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ معہ ایک بسیط مقدمہ کے۔ قیمت ایک روپیہ

ترغیبات جنسی مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات، ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

تاریخ کے گمشدہ اوراق حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلندترین معیار قائم کرتے ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دل کش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشانے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت ۲ روپے

جذبات بھاشا مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ اور عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کرکے ان کی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں قیمت ۱۲۵

ایک شاعر کا انجام حضرت نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جس سے افسانہ نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اس کا ایک ایک جملہ حسن و عشق کی تمام نشہ کش کیفیات سے معمور ہے یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قیمت ایک روپیہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان طریقت اور علمار کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت واجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہوتا رہا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے رکھتا ہے۔ قیمت :- ۷۵ پیسے

شبنمستان کا قطرہ گوہریں مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں ہر افسانہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

منیجر نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

طبیعت میں گرانی محسوس ہو
تو صبح اٹھتے ہی فرحت بخش گریپ سالٹ کی ایک خوراک
لے لیجئے اور دن بھر چاق وچوبند رہیئے۔
گریپ سالٹ
کی ایک بوتل ہمیشہ ساتھ رکھئے
GRAP
SALT
SUPER
EFFERVESCENT
FRUIT
SALINE
گریپ سالٹ
• سُوءِ ہضم • تیزابیت
• قبض • سر چکرانا
• سینے کی جلن • نفخ
کا مجرب ترین علاج ہے۔
ہر کیمسٹ سے دستیاب ہے
ایسٹرن فارماسیوٹیکل لیبوریٹریز لمیٹڈ۔ کراچی (پاکستان)
EPLA-1/63
Crescent
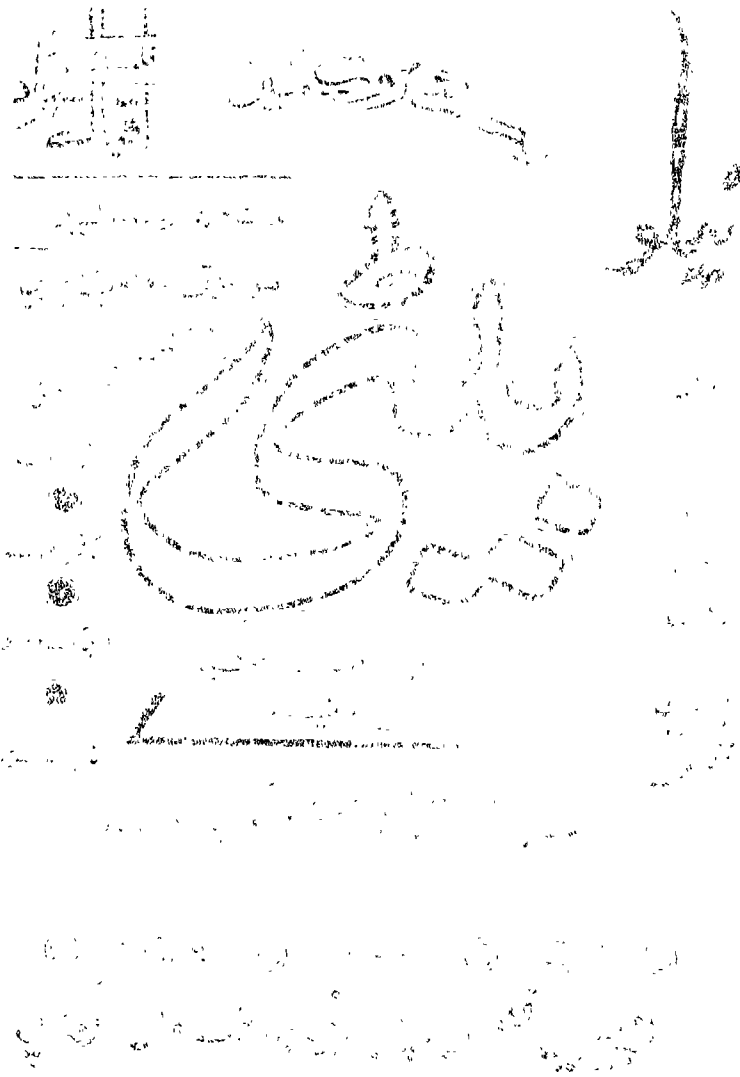
خدا نمبر

قارئین کے اصرار پر

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں

شائع کیا جا رہا ہے

[illegible]

★

قیمت: تین روپے

مشّاق اور
ہوشیار ملاح
STANDARD BANK LTD